خزینہ شریعت و معرفت

سالکین راہ محبت اور عام دینداروں
کے لئے دستورالعمل

مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

مرتب محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

400-بی لطیف آباد نمبر 4 حیدرآباد

خزینۂ شریعت و معرفت

سالکین راہ محبت اور عام دینداروں
کے لئے دستور العمل

مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

مرتب محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
400-بی لطیف آباد نمبر 4 حیدر آباد

کتاب کا نام: خزینہ شریعت ومعرفت
تالیف: مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ
مرتب: محمد موسیٰ بھٹو
کمپوزنگ: اسلامک کمپیوٹر کمپوزنگ سینٹر
۴۰۰ بی لطیف آباد نمبر ۴ حیدر آباد 3861864 _022
کمپوزر: اشفاق احمد بھٹو - امتیاز احمد بھٹو
قیمت: ۱۵۰ روپیا
اشاعت: دسمبر ۲۰۰۷ء
پیسٹر: سہیل "سلام" بھٹو

ناشر:
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
۴۰۰ بی - لطیف آباد نمبر ۴ حیدر آباد

فہرست مضامین

تعارف

زیر نظر کتاب حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات کی مختلف کتابوں کی تلخیص پر مشتمل ہے، ہر کتاب کی تلخیص کے آغاز میں کتاب کا نام وغیرہ دیا گیا ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، شریعت وطریقت کے بارے میں بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے۔ زندگی کے اہم معاملات میں شریعت کے تقاضے کیا ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت کی رہنمائی کیا ہے۔ گھریلو، خاندانی، کاروباری اور معاشرتی زندگی کے آداب واطوار کیا ہیں۔ دوست واحباب، عزیز واقارب اہل محلہ اور ساتھیوں سے معاملات کے وقت سلیقہ اور حکمت وبصیرت کیا ہونی چاہئے۔ معاشرہ کے فتنوں سے بچاؤ کی صورت کیا ہے۔ فرد کی زندگی میں صحبت سے کس طرح انقلاب برپا ہوتا ہے۔ جوہر انسانیت سے بہرہ وری کے لئے کن اصولوں اور آداب کی ضرورت ہے۔ اہل مذہب میں رواداری اور باہمی قربت ومحبت پیدا ہونے کی صورت کیا ہوسکتی ہے۔ اختلافات کے باوجود باہمی تعاون کی صورتیں کس طرح ممکن ہیں تصوف واحسان کی صحیح شکل اور اس کے آداب وشرائط اور اصول کیا ہیں۔ اور اصلاح نفس کے سلسلہ میں اس کی ضرورت کیوں ہے۔ صحیح اور غلط تصوف کو پرکھنے کے معیار کیا ہیں۔ نفس کی خرابیاں کیا ہوتی ہیں۔ وہ کس طرح پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں ہر طرح کے افراد کے لئے اصلاح نفس کا طریقہ کیا ہے۔ رزائل نفس کے لئے معالج کو کن حکیمانہ صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہئے، موجودہ دور کے نفسی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل میں بہتر رہنمائی کی صورت کیا ہوسکتی ہے۔ مذہبی اداروں اور دینی شخصیات میں خرابیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور ان کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے۔ انسانی نفسیات میں موجود ہمہ گیر وہمہ جہتی بگاڑ کیا ہے۔ اور نفس پرستی کی قوتیں افراد کو ساری زندگی کس طرح نفسی بتوں کی پوجا میں مصروف رکھنے کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ مادہ پرستی کے سیلاب سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ مسلم ملت کی وہ بڑی بنیادی خرابیاں کیا ہیں، جو ان کے زوال کا موجب ہیں۔ ان خرابیوں سے نجات کی صورت کیا ہے۔ اسلام میں دعوتی کام کی اہمیت اور اس کام کی ادائیگی کے لئے کن حکیمانہ صلاحیتوں کا ہونا ضروری

ہے۔ پیری مریدی کے مروجہ طریقہ تصور شیخ اور تصوف کے نام پر ہونے والا بگاڑ اور اس کی بھرپور نشاندہی وغیرہ الغرض کہ زیر نظر کتاب میں انفرادی واجتماعی زندگی اور دین ودنیا کے سیکڑوں معاملات میں ایسی حکیمانہ رہنمائی موجود ہے کہ یہ کتاب زندگی کے دستور العمل کی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔ اور دور جدید کا ہر فرد جو جماعتوں، گروہوں اور شخصیتوں کے سحر کا اسیر نہیں، وہ اس کتاب سے صحیح فہم دین کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کے معاملات میں صحیح، معتدل اور متوازن لائین حاصل کر سکتا ہے اور فہم وفراست اور حکمت وبصیرت کا حامل ہوسکتا ہے۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ زیر نظر کتاب میں صحیح فہم دین، تصوف اور مسلم نفسیات اور زندگی گزارنے کے آداب کے علوم کو یکجا قلمبند کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ سے دینی علوم کی تجدید اور مسلم نفسیات کی تشکیل جدید کا وہ کام لیا ہے کہ اس سے استفادہ کی صورت میں جہاں ہم ذہنی، روحانی اور اخلاقی بحران سے عہدہ برآ ہوکر اپنی ملی زندگی کے عروج سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں، وہاں ہم زندگی کے رواں دواں قافلہ میں دنیا بھر کی قوموں کی رہنمائی وقیادت کے مقام پر بھی فائز ہوسکتے ہیں (اس لئے کہ دنیا، اس وقت جوہر انسانیت سے محرومی کی وجہ سے ہلاکت سے دوچار ہے) مولانا کی فکر ہمیں قرآن وسنت کے سلف بہ فکر سے وابستہ رکھکر اپنے تسلسل کو قائم رکھنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔

اس عاجز نے مولانا کے ثقیل الفاظ اور جملوں کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے، اگرچہ ایک لحاظ سے یہ گستاخی میں شمار ہوتا ہے، لیکن اس کی ضرورت واہمیت اس لئے ہے، تاکہ مولانا کی عظیم الشان فکر کو جدید افراد کی علمی اور ذہنی سطح سے ہم آہنگ کیا جائے، اور ان کی، مولانا کی فکر تک آسانی سے رسائی ہوسکے۔ اگرچہ کتاب کے مواد کو مزید آسان بنانے کی ضرورت تھی، اگر موقعہ ملا تو ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی مزید کوشش کی جائی گی۔

واضح ہو کہ زیر نظر کتاب کا آخری حصہ جو تقریبا سو صفحات کے لگ بھگ ہے، وہ ۱۹۹۲ء میں "ہمارے نفسی واجتماعی مسائل حکیم الامت کی نظر میں" کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ بعد میں اس میں مزید اضافہ کر کے تین سو صفحات کے لگ بھگ کتاب "تعلیمات حکیم

الامت" کے نام سے شائع ہوگئی تھی، کتاب کے نئے ایڈیشن میں کافی اضافہ کیا گیا ہے۔

اب الحمدللہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر دیندار فرد اس سے دین وایمان اور جوہر انسانیت کے ہزارہا قیمتی نکات حاصل کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مسلم ملت افراد کی دلوں کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علوم سے استفادہ کے لئے کھول دے۔ (آمین)

محمد موسیٰ بھٹو

۷ نومبر ۲۰۰۷ء

دوسرا ایڈیشن

اصلاح نفس کا لائحہ عمل کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے، اس ایڈیشن میں دو تغیر وتبدل واضافے کئے گئے ہیں۔ ایک تو اس کی ملفوظات کی شکل تبدیل کرکے، اسے نکات کی صورت دی گئی ہے۔ تاکہ کتاب سے ہمارے سلسلہ سے باہر کے افراد کے لئے استفادہ کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، ویسے بھی ان نکات کی حیثیت حضرت مرشدی ڈاکٹر غلام مصطفٰیؒ کے زبان قال کی تھی بھی نہیں۔ وہ ان کا بالواسطہ کا فیض ہے۔ (بعض دوستوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ اصلاح نفس کے حوالے سے کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کے انگریزی ترجمہ کی اجازت دی جائے ہماری طرف سے اس کتاب اور ہماری دوسری کتابوں کی اشاعت پر کوئی پابندی سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہماری ساری کتابیں خالص دعوتی نوعیت کی ہیں۔

کتاب میں ایک اہم اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ سارے نکات کو ذیلی عنوانات کی صورت دی گئی ہے۔ اس طرح اب یہ کتاب ان افراد کے لئے بھی استفادہ کی حامل ہوگئی ہے، جو وقت نہ ہونے کی وجہ سے کتاب کے مطالعہ سے قاصر ہیں۔ فہرست مضامین کے ملاحظہ سے ہی وہ کتاب میں موجود مواد سے ایک حد تک مستفیض ہوسکتے ہیں۔

تمنا تھی کہ کتاب میں مزید اضافہ کیا جائے، اس کے لئے کافی مواد تیار بھی ہوگیا تھا، لیکن دوسرے علمی کاموں کے دباؤ کی وجہ سے اس خواہش کو عملی جامہ دینے کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔

یہ عاجز اپنے مربی حضرت قبلہ حکیم محمد رفیق صاحب مدظلہ کا ممنوں ہے کہ انہوں نے از راہ شفقت کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لئے وقت نکالا، ان کی محبت وشفقت کے لئے یہ عاجز دل کی گہرائیوں سے ان کے لئے دعاگو ہے۔ ان کی شخصیت اس عاجز کے لئے حضرت قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفٰیؒ کے قائم مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان جیسی شخصیت کی صحبت سے ہی دل کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں۔ اس وقت موصوف کی عمر اسی سال کے لگ بھگ ہے، اس عمر میں بھی وہ دن بھر خدمت خلق کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

محمد موسیٰ بھٹو

کچھ تبصرے وتجزیے

زیر نظر کتاب کے آخری دو حصے (جو "ملفوظات کمالات اشرفیہ اور "الافاضاۃ الیومیہ" کی تلخیص پر مشتمل ہیں) وہ ۲۰۰۱ء میں "تعلیمات حکیم الامت" کے نام سے کتابی صورت میں چھپے تھے، اس وقت ملک کے مختلف رسالوں میں کتاب پر جو تبصرے شائع ہوئے تھے، وہ ذیل میں دیئے جارہے ہیں، اگرچہ اب کتاب، مواد کی ترتیب، ضخامت اور قیمتی اضافی مواد کی وجہ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوگئی ہے، تاہم ان تبصروں سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے فاضل تبصرہ نگاروں نے حکیم الامت کی تعلیمات کی اس پیشکش کو کس نظر سے دیکھا ہے اور وہ حکیم الامت کی فکر کو جدید افراد کے سامنے سادہ اسلوب وزباں میں پیش کرنے کے سلسلہ میں کیا تاثرات رکھتے ہیں۔ (مرتب)

ماہنامہ الفاروق، کراچی، شعبان المعظم ۱۴۲۲ ہجری

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو تجدیدی کام کیا، وہ محتاج تعارف نہیں، مختلف موضوعات پر انہوں نے تقریباً گیارہ سو کتابیں تحریر فرمائیں، ہر کتاب اپنے موضوع پر علم، معلومات اور فہم وروحانیت کا ایک خزانہ ہے، قرآن وحدیث اور دوسرے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ انہوں نے تصوف کے شعبے میں جو کام کیا اور سالکین کے روحانی اور باطنی امراض کی نشان دہی، ان کے علاج وتربیت اور ان کی الجھنوں میں دینی رہنمائی اور احیاء دین کی جو خدمات انجام دیں، انہیں دیکھ کر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس دور کے مجدد ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے رجال کار اور عقیدت مند بھی عطا فرمائے تھے، جنہوں نے ان کے ملفوظات، ان کے مواعظ اور ان کے افادات کو آنے والی نسلوں کے لئے لفظ بلفظ محفوظ کیا، جن سے آج تک امت برابر استفادہ کرتی چلی آرہی ہے، ان کے مواعظ وملفوظات کی تسہیل وتشریح کا کام بھی اللہ جل شانہ مختلف لوگوں سے

لیتے رہے ہیں اور انہیں تسہیل وترجمانی کی توفیق ملتی رہی۔

زیر تبصرہ کتاب اسی توفیق خداوندی کی ایک جھلک ہے، جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے بہت خوبصورت انداز میں آج کی روز مرہ زبان کی رعایت سے حضرت تھانویؒ کے ملفوظات وتعلیمات کو سہل اسلوب میں پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہم چونکہ دین کی صحیح تفہیم کے سلسلے میں تقابل وتجزیاتی مطالعہ کرکے ایک طویل دشوار گذار مرحلے سے گذرے ہیں، اس سلسلے میں ہمیں مولانا (تھانوی) کی فکر، جدید وقدیم دور کے بڑے بڑے فضلاء سے زیادہ اہم، متاثر کن، علم واستدلال سے بھرپور نظر آئی، اس لئے مولانا کی فکر کو عام فہم اور آسان انداز میں پیش کرنے کے لئے ہمیں فکر دامن گیر ہوئی ہے، اس سلسلے میں ہماری یہ ابتدائی کوشش ہے، ان شاء اللہ اس سلسلہ کی مزید جلدیں لائی جائیں گی، زیر نظر کتاب مولانا کے ملفوظات کی دو کتابوں "ملفوظات کمالات اشرفیہ" اور "الافاضاۃ الیومیہ" (دس جلدوں پر مشتمل) کے خلاصے اور انتخاب پر مشتمل ہے، ہم نے ملفوظات کی زبان کو سادہ اور عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔"

کتاب کی ابتدا میں جناب موسیٰ بھٹو نے حضرت تھانویؒ کی اسلامی تعلیمات کی تشریح وتفہیم اور اسلوب پر ایک جامع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔

ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور، نومبر ۲۰۰۱ء

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ معروف عالم دین، بہت بڑے واعظ اور سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے زندگی کے ہر پہلو پر لکھا ہے، آپ کا بہت بڑا کارنامہ آپ کے وہ مواعظ اور ملفوظات ہیں، جو آپ نے نہایت آسان زبان میں خداداد صلاحیت کے ساتھ عوام الناس تک پہنچائے ہیں۔ ان ملفوظات میں جہاں عام لوگوں کے لئے راہ نمائی کا سامان موجود ہے، وہاں اہل علم ودانش بھی ان سے یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مثالوں کے ساتھ بڑے بڑے مسائل سمجھانا آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ جناب محمد موسیٰ بھٹو نے بڑی کاوش کے ساتھ حکیم الامت کی ملفوظات کی کتابوں سے اقتباسات اکٹھے کرکے انہیں اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ مرتب نے ان اقتباسات کو نہایت سلیقے کے ساتھ ترتیب دے کر قاری کے لئے

استفادہ آسان تر بنادیا ہے۔ اکثر اقتباسات آب زر سے لکھنے اور ذہن میں محفوظ رکھنے کے قابل ہیں۔ اگر اس کتاب کو نورانی کرنیں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا، کیونکہ عام قاری قدم قدم پر دلپذیر پندونصائح سے اپنے قلب وذہن کو منور کرتا ہے۔ چونکہ انداز نہایت مؤثر اور دلائل انتہائی مضبوط ہیں، اس لئے ہر نصیحت دل میں اترتی جاتی ہے۔ دیکھئے، قرآن مجید میں دنیا کو دھوکے کا سامان کہا گیا ہے، اس بات کو مولانا کس انداز سے سمجھاتے ہیں:

''دنیا کی مثال ایسی ہے، جیسی کوڑے پر سبزہ جما ہوا ہو، جسے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ ایک چمن ہے اور اس کے ظاہری رنگ وروپ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوجائے اور جب وہاں پہنچے تو گندگی بھری ہوئی نظر آئے۔ یہی حال دنیا کا ہے کہ اس کا ظاہر تو بہت بھلا ہوتا ہے، مگر اس کے اندر نجاست بھری ہوئی ہے.........''

کتاب حکمت وموعظت کا خزانہ ہے۔ اس کا مطالعہ کسی صورت رائیگاں نہیں جائے، گا، بلکہ اخلاق وکردار پر نہایت اچھے اثرات مرتب کرے گا۔

ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ، لاہور، جون ۲۰۰۲ء، تبصرہ، طالب ہاشمی صاحب

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کا شمار چودھویں صدی ہجری کے سرآمد روزگار علماء، صالحین اور مصلحین میں ہوتا ہے۔ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے کتاب کی تقریظ میں بالکل درست لکھا ہے کہ ''حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے اسلام کے بنیادی علوم میں توضیح وتشریح کے سلسلے میں جو عظیم علمی خدمت سرانجام دی ہے، وہ دین کے لئے ان کے تجدیدی کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔'' برکوچک کے نامور عالم دین اور مصنف مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''یادرفتگان'' میں مولانا تھانویؒ کے مقام ومرتبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا تھانویؒ کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے اپنی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنارکھا تھا اور انہوں نے اپنی تحریر وتقریر سے وقائق ایمانی، حقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اسی لئے دنیا نے ان کو حکیم الامت کہہ کر پکارا۔''

زیر تبصرہ کتاب مولانا تھانویؒ کے ملفوظات کی دوکتابوں ''ملفوظات کمالات

اشرفیہ'' اور الافاضات الیومیہ (۱۰ جلدوں پر مشتمل) کے خلاصہ اور انتخاب پر مشتمل ہے۔ اسے سندھ کے معروف دانشور اور مبلغ اسلام جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ملفوظات کی زبان کو انہوں نے بہت سادہ اور عام فہم بنادیا ہے، تاکہ کم تعلیم یافتہ قارئین بھی ان سے مستفیض ہوسکیں۔ کتاب کے آغاز میں فاضل مرتب کا مبسوط مقدمہ بھی جامعیت کے اعتبار سے معرکے کی چیز ہے۔

مولانا تھانویؒ کے ملفوظات اتنے پرتاثیر ہیں کہ قاری ان میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے اور ان کے اثر سے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو اپنے تزکیہ نفس میں مدد نہ ملے۔ ناشر اور فاضل مرتب دونوں اس ایمان افروز کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے مطالعہ کے لائق ہے۔

ماہنامہ ہمدرد صحت کراچی فروری ۲۰۰۲ء تبصرہ، ڈاکٹر سید فرحت حسین

سندھ کے معروف قلم کار محمد موسیٰ بھٹو ایک عرصے سے اصلاح معاشرہ کے لئے تحریری جدوجہد اور دین کی تبلیغ واشاعت میں مصروف عمل ہیں۔ اپنی تصانیف کے علاوہ وہ سلف صالحین کے افکار اور بزرگان دین کے علمی سرمائے سے انتخاب کرکے کئی کتابیں ترتیب دے کر شائع کراچکے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ زیرنظر کتاب ''تعلیمات حکیم الامت'' مجتہد العصر عالم دین حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات کا انتخاب ہے۔

حضرت مولانا تھانوی کی تحریروں اور ملفوظات میں اسلام کے بنیادی علوم کی جو توضیح وتشریح کی گئی ہے اور فقہی مسائل کے سلسلے میں جو صحیح معتدل موقف ملتا ہے، وہ ہر دور میں ملت اسلامیہ کے ہر مکتبہ فکر کے لئے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس لئے ان کے افکار وملفوظات کی صحت وافادیت آج کے دور میں بھی اتنی ہی موثر اور تروتازہ ہے، جتنی پہلے تھی۔

جناب محمد موسیٰ بھٹو نے مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات پر مشتمل دوکتابوں سے عہد حاضر کی ضرورت کی مناسبت سے انتخاب'' تعلیمات حکیم الامت'' کے نام سے ترتیب دے کر قابل قدر دینی کام انجام دیا ہے جو وقت کا تقاضا ہے۔ فاضل مرتب نے اپنا مبسوط مقدمہ بھی شامل کتاب کردیا ہے، جس میں مولانا تھانوی کی مجموعی تعلیمات پر مفصل

روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی یہ کاوش معاشرے کے عقائد ورسوم کی اصلاح کے لئے بھی مفید اور کارگر ہے اور ملکی اشتراک واتحاد کے لئے بھی مددومعاون ہے، جو آج کی اہم اور اولین ضرورت ہے۔

معاشرے کا درد رکھنے والوں اور دین کی خدمت انجام دینے والوں کو بالخصوص اور عوام الناس کو اصلاح نفس کے لئے بالعموم اس کتاب کے مطالعے سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔

ہفت روزہ ایشیا لاہور، ۱۴ اگست ۲۰۰۲ء

ماضی قریب کے علماء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ انہوں نے برصغیر کے مزاج وحالات کے پس منظر میں سماجی رسومات اور انسانی نفسیات کے لحاظ سے جوگراں قدر خدمت سرانجام دیں، اس نے انہیں دوسرے علماء کے مقابل اور بھی لائق احترام ٹھہرایا۔ وہ بیک وقت قرآن، حدیث، فقہ اور باطنی علوم کے ماہر تھے اور سماجی رسوم ورواج پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ تصوف سے استفادہ کا جو طریقہ مولانا تھانویؒ مرحوم نے بتایا ہے، وہ بہت سے متخالف طبقات میں راہِ اعتدال بھی ہے اور خالی از فائدہ بھی نہیں۔ ان کی کتاب ''تربیت السالک'' (تین حصے) نے نفسی وروحانی بیماریوں کا علاج ہی نہیں کیا، بلکہ یہ اہلِ مغرب کو اہلِ مشرق کا ''نفسیات'' میں ایک بہترین تحفہ ہے۔ ''بہشتی زیور'' مولانا کے دور سے آج تک خاص وعام میں مقبول ہے۔ ان کے اندازِ تزکیہ وتبلیغ کا ایک اہم پہلو خواتین کی اصلاح کو مناسب مقام عطا کرنا ہے۔ مولانا کی کئی اہم کتب ''مشکل'' ہونے کے باعث عام قارئین کے مطالعہ میں نہیں آرہی تھیں، حالانکہ یہ کام خود مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سید سلیمان ندویؒ کو سونپا تھا۔ سندھ کے مشہور دانشور صحافی محمد موسیٰ بھٹو نے اس طرف توجہ کی اور مولانا کی کتب کی آسان زبان میں تلخیص کا کام کرکے، اسے استفادہ عام کا ذریعہ بنایا۔ ''تعلیمات حکیم الامت'' اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں مولانا کی ملفوظات کی دو کتب ''ملفوظات کمالات اشرفیہ اور'' الافاضاۃ الیومیہ'' کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ۳۰۰ کے قریب صفحات پر محیط یہ ملفوظات عقائد واعمال کی درست، بیعت وطریقت کے اسرار، سماجی برائیوں اور ان کے انسداد کی تدابیر اور آخر میں مسلمانوں کی

ترقی اور حکومت الٰہیہ جیسے موضوعات پر چھوٹے چھوٹے آسان پیرائے میں روشنی ڈالتے ہیں۔ ''الافاضاۃ الیومیہ'' میں ترقی اور کامیابی کے حصول، کے تحت لکھا گیا ہے ''دوسری قوموں نے مسلمانوں کے گھر سے بہتر باتیں اور عمل چراکر ان پر عمل شروع کردیا، چونکہ ان اعمال کی خاصیتیں ترقی تھا، اس لئے وہ ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئے۔ لیکن چونکہ یہ چوری ادھوری تھی۔ چور کو مسلمانوں کے گھر کے سارے خزانے کا علم نہیں تھا۔ ایمان، عقائد اور دین کے بنیادی فرائض کی قدر وقیمت کا ان کو اندازہ نہیں ہوسکا۔ اس لئے چور نے چند چیزوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اگر مسلمان اپنے گھر کی ان چیزوں پر عمل کرتے تو آج ان کو وہ ترقی حاصل ہوتی، جسے دوسری قومیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتیں۔''

''مناظرے کے نقصانات'' کا آغاز یوں کرتے ہیں کہ'' تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو مناظرے سے کبھی فائدہ نہیں ہوا۔ نفع جتنا بھی ہوا ہے، تبلیغ سے ہوا ہے اور وہ بھی اسی تبلیغ سے جو جادلھم بالتی ھی احسن کے تحت ہوئی۔'' بعض جگہوں پر مولانا کا مؤقف آج کے مسلمان کے لئے مسئلہ کا حل نہیں۔ اور حافظ محمد موسیٰ بھٹو کے ''مقدمہ'' میں مبالغہ آرائی نظر آتی ہے، لیکن کتاب بہرحال لائق مطالعہ ہے۔

مولانا تھانویؒ کی تعلیمات وفکر کے کچھ امتیازی پہلو

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے اسلام کی جو خدمت سرانجام دی ہے، وہ بے مثال ہے، دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جس میں انہوں نے کارہائے نمایاں سرانجام نہ دیئے ہوں، قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، عملی زندگی کے مسائل میں دینی رہنمائی، سالکین کے روحانی اور باطنی امراض کی نشاندہی اور ان کا علاج، تعلیم وتربیت غرض کہ اسلام کی اشاعت وترویج اور مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کرکے افراد تیار کئے اور ایسا لٹریچر تخلیق دیا، جو آج بھی ہماری ذہنی اصلاح اور صحیح اسلامی فکر کی نشاندہی کے سلسلہ میں بہتر اور مؤثر کردار ادا کر رہا ہے۔ مولانا کی ہمہ جہتی دینی خدمات اور ان کے وقت اور کام میں برکت اور لٹریچر کی اثر پذیری اور باطنی امراض کے مؤثر علاج کو دیکھ کر بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس دور کے مجدد ہیں۔ اور ماضی میں اللہ تعالیٰ، مجددوں سے احیاءِ دین اور خدمت دین کا جو کام لیتا رہا ہے، اس دور میں اللہ تعالیٰ نے وہی کام حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ سے لیا ہے۔ مختلف موضوعات پر گیارہ سو سے زیادہ کتابیں لکھنا، اور ہر کتاب میں علم، معلومات، اسلامی مسائل کے فہم اور روحانیت کا خزانہ منتقل کرنا اور تاثیر کی یہ حالت کہ بات دلوں میں اتر چلی جاتی ہے اور سارے شکوک وشبہات اور اشکالات دور ہوتے چلے جاتے ہیں، یہ مجدد ہی کا شان ہے۔

آج مسلم معاشرہ انتشار، تفریق اور ہمہ جہتی زوال کی جس صورتحال سے دوچار ہے۔ اس سے نجات کی صورت ہم سب کا ایک مشترکہ مسئلہ ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں جب کہ ہمارے ہاں اسلام کی کئی طرح کی تشریحات طاقتور صورت میں موجود ہیں، ان تشریحات کے تحت مسلم ملت مختلف گروہوں، جماعتوں اور مسلکوں میں بُری طرح منقسم ہے، اس طرح کی صورتحال میں کیا ہمارے لئے نجات کی صورت ممکن ہے۔ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہی ہے۔ ان حالات میں ضرورت ہے کہ ہم اسلام کی ایسی تشریح پر متفق ہوجائیں، جس میں سبیل المؤمنین کی نشاندہی ہو اور جس سے ہمارا فہم اسلام، اسلاف کے فہم اسلام سے ہم آہنگ ہوسکے اور جس سے ہمارے لئے ذاتی اصلاح، معاشرہ کی اصلاح اور

اجتماعی نظام کی اصلاح کا راستہ بھی وا ہوسکے اور ہم جزوی اختلاف کے باوجود بنیادی مقاصد کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت، تعاون اور اشتراک عمل کے لئے تیار ہوسکیں۔

صحیح فہمِ اسلام، وقت کی اہم ضرورت

مسلم معاشرہ کے مذہبی طبقات اور دینی جدوجہد کے لئے اس طرح کا فہم اسلام اور تشریح اسلام ہمارے اس دور کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نقطہ نگاہ میں وسعت کا پیدا ہونا، رواداری اور تحمل کی صلاحیت کا ابھرنا اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جدوجہد کا ہمہ گیر وہمہ جہت ہونا اور کفر کی داخلی وعالمگیر طاقتوں کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ وقت کی یہ اہم ضرورت ہمارے لئے موت وحیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے لئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی فکر میں رہنمائی کا جو انتظام موجود ہے، وہ قدرت کی طرف سے ہمارے لئے نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ اس لئے کہ ایسی جامع، کامل اور متوازن اسلامی فکر پیش کرنا، جس میں عالم، فاضل اور مفکر اپنے دور کے ہنگامی حالات سے متاثر ہوئے بغیر سلف کی ساری رہنمائی کو پیشِ نظر رکھ کر مجتہدانہ شان سے قرآن وسنت کی تعلیمات کی تشریح کرے، یہ مجدد ہی کا کام ہوتا ہے۔ مجدد اپنی فکر کے ذریعہ امت کو گروہوں میں منقسم کرنے اور ملت میں ایک نئے گروہ کے اضافہ کی بجائے وہ امت کی وحدت کو برقرار رکھ کر اس کی بنیادوں کے استحکام کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مجدد کا یہ کارنامہ ہوتا ہے کہ خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے دین کے ہر شعبہ میں افکار واعمال اور بدعات وخرافات کے حوالے سے جو خرابیاں اور بگاڑ پیدا ہوچکا ہوتا ہے، وہ اس کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے اور صحیح اسلامی فکر کو وہ اتنی بلند آہنگی سے پیش کرتا ہے کہ ذہن اور دلیں مسخر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور لوگ ان کی فکر سے متاثر ہوکر سبیل المؤمنین کی راہ پر گامزن ہونے لگتے ہیں۔

سبیل المؤمنین سے دور ہونے کے اثرات

موجودہ مسلمان معاشرہ کی افراط وتفریط کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب نتیجہ اس بات ہے کہ ہم اجتماعی حیثیت سے سبیل المؤمنین (سلف صالحین کا راستہ) گم کر چکے ہیں۔ اگرچہ ہمای فکر کی بنیاد بظاہر قرآن وسنت ہی ہے اور ہر گروہ اور ہر جماعت اس

بات پر شاداں و فرحاں ہے کہ وہ صراط مستقیم پر گامزن ہے، لیکن کیا صراط مستقیم پر گامزن ہونے کا نتیجہ افتراق، انتشار، صلاحیتوں و توانائیوں کا ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہونا، اپنے دائراتی گروہوں ہی کو برسر حق سمجھنا، دوسروں کے عقائد، ایمان و یقین، اخلاص اور اعمال بلکہ ان کے سارے اسلام کو مشکوک سمجھنا، امت کی قوت میں اضافہ کی بجائے اس کی قوت کو کمزور کرنے میں بالواسطہ طور پر شریک ہونا، کیا صراط مستقیم کا نتیجہ یہی ہوتا ہے؟

صراط مستقیم پر حامل افراد کا جو لائحہ عمل ہوسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ فکر آخرت، اللہ سے تعلق و محبت کے مرکزی نکتہ کی بنیاد پر اپنی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح کے لئے صلاحیتیں صرف ہوں، مسلم امت کے مختلف طبقات کو جوڑنے کے لئے کام ہو، ایمان و یقین اور نفس مطمئنہ کے حصول کے لئے جدوجہد ہو، تعلیم و تربیت اور تزکیے کی فکر ہو اور اس کے لئے معاشرہ کی از سر نو صف بندی ہو۔ اگر قوت حاصل ہو تو منکر کے خلاف بھی جدوجہد ہو، بدی کے خلاف وہ چاہے گھر کے اندر فحاشی کے پروگرام دیکھنے اور اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے یعنی نماز نہ پڑھنے وغیرہ کی صورت میں موجود ہو یا معاشرہ میں مادیت پرستی کے مظاہر کی صورت میں ہو، اس کے خلاف اپنی بساط کے مطابق کام ہو یا کم از کم اس کے خلاف نفرت تو ضرور موجود ہو۔ ساتھ ساتھ اکرام مسلم کا جذبہ بھی ہو، بلکہ اس کا عملاً مظاہرہ ہو۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، وہ ایک دوسرے کے لئے نرم دل اور رحم دل ہوتے ہیں، جب کہ وہ کفار کے لئے سخت ہوتے ہیں۔ اس تعلیمات خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا عملی مظاہر ہو۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر ایسی حرکت سے بچنے کی کاوش ہو، جس سے مسلم معاشرہ اور مسلم امت کی وحدت متاثر ہو۔

صراط مستقیم پر گامزن ہونے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حاملین صراط مستقیم کے فکر و عمل میں حکمت، بصیرت، فراست، دور بینی و دور رسی شامل ہوتی ہے۔ وہ جذباتیت، انتہا پسندی، غلو، عدم توازن اور کوتاہ نظری جیسی چیزوں سے بلند و محفوظ ہوتے ہیں۔ ان کے فکر و عمل میں وسعت نظری، علم کی گہرائی اور مشاہدہ و تجربات کی نمود شامل ہوتی ہے، اس اعتبار سے اگر موجودہ مذہبی و دینی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو حیرت و حسرت اور افسوس و دکھ کے اظہار کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔

مذہبی زندگی اور مسلم معاشرہ کے افراد کا مختلف گروہوں، اور دائراتی خولوں میں بند ہونے اور ملت کی قیمت پر مختلف گروہوں کی طرف سے مستحکم ہونے کی کاوش کا سبب وہ فکر

ہی ہے، جو زعماء کی طرف سے سبیل المؤمنین سے اخذ فیض کئے بغیر یا ہنگامی حالات سے متاثر ہو کر یا نفس پرستی کے جذبات سے مغلوب ہو کر یا فہم، بصیرت و بصارت یا گہرے مشاہدہ و تجربات سے محرومی کے نتیجہ میں دیا گیا ہے، زعماء کی اس فکر نے یہ صورتحال پیدا کر دی ہے کہ مسلم ملت تقسیم در تقسیم کی راہ پر گامزن ہے، اس کی اصلاح کے لئے ہونے والی بیشتر کوششیں اصلاح کے ساتھ ساتھ خود نئے نئے دائراتی خولوں کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں۔

معاشرہ کی مذہبی تقسیم میں بعض زعماء کے فکر کا کردار

سبیل المؤمنین یعنی سلف صالحین کی فکر سے بھرپور طور سے اخذ فیض کئے بغیر یا وقتی حالات سے متاثر ہو کر زعماء کی طرف سے فکر دینے کے نتیجہ میں جس طرح دائراتی حلقے اور گروہ مستحکم اور طاقتور ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ موجودہ معاشرہ میں متحرک اور سرگرم بعض مکتبہائے عمل سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہندی معاشرہ میں روحانیت، ہندو یوگ، ویدانت اور ہندی کلچر سے متاثر ہو کر بعض علماء نے عقائد و اعمال اور رسوم کی بعض خرابیوں کو یا تو نظر انداز کیا یا ان کے اثرات و نتائج بد کے فہم سے قاصر ہو کر انہوں نے ان کے جواز کی تاویلیں کیں، چنانچہ اس کی وجہ سے معاشرہ میں ایک بڑا گروہ ایسے افراد کا پیدا ہوا اور مضبوط ہوا، جس کے ہاں دین کے نام پر شرک، بدعات، خرافات اور قبر پرستی اور ارواح سے استفادہ اور استعانت کے نام پر بہت سارے مظاہر و رسوم موجود ہیں، یہ بعض زعماء کی فکر کا ہی نتیجہ ہے کہ معاشرہ میں تصوف، روحانیت اور اسلام کے نام پر افراد کا طاقتور گروہ موجود ہے، جو اس راہ پر گامزن ہے اور وہ اسلام کے نام پر دور دراز کی تاویلوں کا سہارا لے کر نئی نئی بدعات کو رواج دیتا چلا جا رہا ہے۔

بعض زعماء وہ ہیں، جنہوں نے اسلام میں سیاست، اقتصادیات اور لوگوں کے دنیاوی اجتماعی مفادات کو غیر معمولی اہمیت دے کر ایسی فکر دی، جس کے تحت دین کی نصب العینی تعلیم سیاست، اقتصادیات اور اجتماعیت کی ایسی تشکیل ہے، جس میں مفاد عامہ کا تحفظ ہو۔ اس فکر میں اسلام کی کلی تعلیمات کے ایک بنیادی جزو کو لے کر اسے اسلام کی نصب العینی تعلیم کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں بعض دائراتی گروہ طاقتور ہوئے، جن کی جدوجہد میں معرفت نفس، معرفت رب، عبد و معبود کے درمیان ذاتی تعلقات کی استواری، آخرت کی ہمیشہ کی زندگی میں نجات کی فکر، تزکیہ نفس، اخلاص، تقویٰ، ایمان و

یقین کی مضبوطی، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت، کردار کی بلندی جیسے کام ثانوی اور جزوی حیثیت اختیار کر گئے، سرگرمیوں کا مرکزی نکتہ سیاست، اقتصادیات اور اجتماعیت بن گئی۔

بعض زعماء نے جدیدیت سیکولرزم، ترقی پسندی اور اسلامیت کو ساتھ چلانے کے لئے فکر دی، کتابوں اور رسالوں کا اجراء کیا، تعلیمی ادارے بھی مستحکم ہوئے، اس کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ میں جدیدیت سے متاثر بلکہ اس سے مرعوب ایک ایسا مؤثر طبقہ پیدا ہوا اور طاقتور ہوا، جو اسلام کی جدید ترقی پسند ایڈیشن کا علمبردار ہے، جس میں ترقی اور مادی خوشحالی اور مسلمانوں کے دنیوی عروج کے حوالے سے وہ اسلام کی ایسی پابندیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، جسے جدید معاشرہ رجعت پسند قرار دیتا ہے۔ تجدد پسندی کی اس تحریک کو سیکولرزم، آزادی اور عیش وعشرت کی موجودہ عالمگیر فضا نے غیر معمولی تقویت پہنچائی ہے۔

ہمارے ہاں ایک قابلِ ذکر حلقہ وہ بھی ہے، جو ذاتی اصلاح اور دعوت وتبلیغ کے محاذ پر قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے، لیکن ہمارے ان نیک افراد کو مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور مسلم امت کو فکری، نظریاتی، معاشی وسیاسی طور پر درپیش ہولناک چیلنج جیسے مسائل کا نہ صرف یہ کہ ادراک حاصل نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ان مسائل کو غیر اہم سمجھتا ہے، اس لئے ان مسائل کے حل کے سلسلے میں وہ اپنے کردار کی ادائیگی کو غیر ضروری تصور کرتا ہے۔ ذاتی اصلاح اور دعوتی محاذ پر توانائیاں خرچ کرنے کے ساتھ اگر شعوری طور پر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے ہمدردی ہو اور ضمنی طور پر ان مسائل کے حل کے لئے بھی معمولی توانائی صرف ہو تو آخر یہ کام دعوت کے منافی کیسے ہوسکتا ہے، لیکن چونکہ اصلاح اور دعوت کے ایک خاص دائرے سے آگے بات سننے کے راستے بند ہیں، اس لئے وسعت فکر و وسعت نظر پیدا ہونے نہیں پاتی۔

کچھ صاحبانِ علم وفکر وہ ہیں، جو قرآن وسنت کے ذریعہ فروعی اور جزوی مسائل میں پوری امت کی تردید، تکفیر وتنقید کی راہ پر گامزن ہیں، وہ ائمہ کی تقلید کو شرک قرار دیتے ہیں، وہ لاکھوں اولیائے کرام جنہوں نے اللہ کی عبادت میں اپنی زندگیاں صرف کیں اور جو کروڑہا مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنے، قرآن وسنت کے یہ علمبردار، ان اولیاء کرام کی بھی تردید میں اپنی توانائیاں صرف کررہے ہیں۔ قرآن میں جن آیتوں میں یہود ونصاریٰ اور مشرکوں کی مذمت کی گئی ہے، توحید کے یہ مدعی ان آیتوں کو کھینچ کھانچ کر امت کے نیک اور صالح بندوں پر چسپاں کرکے خارجیوں والا کردار ادا کررہے ہیں۔ جن کے بارے میں

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا تھا کہ انہوں نے وہ آیتیں جو کافروں کے بارے میں اتری ہیں، مسلمانوں کی طرف منسوب کرکے ان کی تکفیر کی۔ یہی فریضہ مدعیان قرآن وسنت کا یہ گروہ سرانجام دے رہا ہے، یہ سارا کام علم کی کمی، عقل کے غلط استعمال، غور وفکر کے نقص اور انا پرستی کی وجہ سے ہورہا ہے، اس کی وجہ سے محض فروعی مسائل کی بنا پر امت میں تفریق کا کام کیا جارہا ہے۔

حکیم الامت کے متوازن فکر سے استفادہ کی صورت

اس طرح کے حالات میں حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی کی فکر ایسی ہے، جو قرآن وسنت کے صحیح فکر وفہم کا دروازہ کھولتی ہے۔ اسلام کے صحیح نصب العینی فکر کا تعین کرکے سلف صالحین کے فہم اسلام سے رشتہ جوڑتی ہے۔ اسلامی تصوف میں ہندو یوگ اور ویدانت کی آمیزش اور روحانیت اور بزرگوں سے عقیدت کے نام پر موجود خرافات او بدعات کی ایک ایک کرکے نشاندہی کرتی ہے اور اسلامی تصوف کو اس طرح صاف کرکے پیش کرتی ہے کہ تصوف، شریعت کے خادم کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی تصوف باطن میں چمک پیدا کرنے، ریاضتوں کے ذریعہ عبودیت کے ملکہ کو مستحکم کرنے اور افراد میں انسانیت کے جوہر کو مستحکم کرنے کا کارنامہ سرانجام دیتا ہے، مولانا کی فکر میں وہ اجتہادی شان، علمی تبحر، وسعت نظر، مسائل کے سارے پہلوؤں پر نگاہ، قرآن و سنت کے مقاصد کے فہم اور اس سے مسائل اخذ کرنے کی وہ صلاحیت موجود ہے کہ عقل او وجدان عش عش کر اٹھتا ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، اس موضوع کا کوئی پہلو بھی تشنہ طلب نہیں چھوڑتے، وہ مسائل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان کا اسلامی حل پیش کرتے ہیں۔ انہیں قرآن وسنت، فقہ، تصوف اور اجتماعی زندگی کے مسائل کا وہ درک وفہم حاصل ہے کہ اس دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

افراد کی روحانی ونفسی بیماریوں، ان کی تشخیص اور علاج کے سلسلہ میں انہیں جو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے، اس کا اندازہ ان کی کتاب "تربیت السالک" (تین حصوں کے) مطالعہ سے بآسانی ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب انسانی نفسیات کے مسائل کی گہرائیوں کے فہم اور نفس انسانی کی مختلف سطحوں اور تحت الشعور کی قوتوں کی تفہیم کے سلسلہ میں لاجواب کتاب ہے۔ انسانی نفسیات کی بیماریوں کی نشاندہی اور ان کے علاج کے سلسلہ میں اس طرح کی

کتاب تاریخ میں اب تک سامنے نہیں آئی، جس میں ہزاروں سالکوں کے نفسی حالات، ان کی بیماریوں کی نوعیت اور ان کا علاج پیش کیا گیا ہے۔

مولانا کی ملفوظات پر مشتمل کتابوں اور مواعظ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سینہ علوم و ارادات و حقائق سے بھرا رہتا تھا، قرآن و سنت سے مسائل کے اخذ کے سلسلہ میں بہتر، موثر اور متوازن رہنمائی کے لئے جب وہ بولتے ہیں یا قلم اٹھاتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے وجدان پر علوم کی بارش ہوتی ہے، جس سے خشک دلیں سیراب ہو رہی ہیں اور علم کے متلاشی اپنی اپنی طلب اور فہم کے مطابق جھولیاں بھر رہے ہیں۔

قرآن وسنت سے فہم کی راہ میں حجابات کی شاندہی

بدقسمتی سے اس دور میں بالخصوص ایک بہت بڑا نکتہ جو نظر انداز ہوا ہے، (جس کے نتائج ہم بھگت رہے ہیں) وہ یہ ہے کہ جب تک قرآن وسنت کے الفاظ معنی، مفہوم و مطلب اور اس کے اندر پوشیدہ نور تک رسائی نہ ہو، اس وقت تک قرآن وسنت کی تفہیم و تشریح اور ترجمانی کا کام ہاتھ میں لینا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ معنی، مفہوم اور نور تک رسائی کے ذریعہ وہ سارے تقاضے پورے ہوجاتے ہیں، جس سے فہم اسلام کا ملکہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اگر ایک بھی شرط کی کمی رہ جاتی ہے تو افراد پر قرآن وسنت کے مقامات کا دروازہ نہیں کھلتا اور وہ حجابات در حجابات کے دائروں سے نکلنے نہیں پاتے۔ فہم قرآن و سنت کے لئے محض ظاہری علمی صلاحیت کا ہونا بھی کافی نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے نفس کی گہرائیوں میں اپنی پرستش کے ایسے بت موجود ہیں کہ جب قرآن وسنت کے انوار وتجلیات کے زیر اثر، ان داخلی بتوں کا ادراک ہوکر پوری قوت سے ان کی نفی نہیں ہوتی، اس وقت تک الفاظ کا علم و مفہوم علماء و زعماء کو اپنی علمی برتری، مان و مرتبے کے حصول کے لئے علم کے استعمال سے روک سکے، یہ بہت زیادہ مشکل ہے۔

مولانا کی نظر میں مسلم معاشرہ کے بڑھتے ہوئے زوال کا بنیادی سبب وہ نفسی اور باطنی خرابیاں ہیں، جن سے حب مال، حب جاہ اور انا، کبر، حرص و حسد اور غیظ و غضب وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ ظاہری اعمال کی تو آسانی سے اصلاح ہوسکتی ہے، مثلاً نماز کی پابندی نہیں، معمولی کوشش سے نماز کی عادت مستحکم ہوسکتی ہے، لیکن باطنی بیماریوں کی اصلاح غیر معمولی

کاوشوں اور مسلسل جدوجہد اور فکرمندی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ تصوف دراصل باطنی اصلاح کا ہی دوسرا نام ہے۔

موصوف یہ نکتہ بھی بلاتامل پیش کرتے ہیں کہ مذہبی زندگی کا بھی بیشتر فساد، تقویٰ، اخلاص، ایمان ویقین اور محبت و معرفت کی کمی کا نتیجہ ہے۔ جب دل کی گہرائیوں میں ایمان ویقین، تقویٰ و اخلاص کی حقیقت مستحکم ہوجاتی ہے تو دعویٰ سے دستبرداری ہوجاتی ہے اور ضد، بحث و مباحثہ اپنے علاوہ دوسروں کی تکذیب و تردید کی روش کی بجائے انکساری، عاجزی، رواداری، تحمل و بردباری کی صفت پیدا ہونے لگتی ہے۔ باطنی بیماریاں جو افراد اور معاشرہ کے لئے انتہائی مہلک ہیں، ان کی اصلاح محض علم سے نہیں ہوتی، اس کے لئے تربیت کے عمل سے گذر کر نور نبوت کے اجزاء کو مزاج، نفسیات اور وجدان کا حصہ بنانا ضروری ہے، تربیت کے ذریعہ نور نبوت کی منتقلی کا کام تصوف کے ذریعہ ہی سرانجام ہوتا ہے۔ اگرچہ فطرت سلیمہ کے حامل بعض افراد کے اندر نور نبوت کے یہ اجزاء علم نبوت کے ساتھ از خود منتقل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ استثنیٰ ہے۔ کلی اصول نہیں۔ نفس شیطان کا بھی استاد ہے۔ عزازیل کو، شیطان، نفس نے ہی بنایا تھا، حالانکہ عزازیل، عالم اور عابد بھی تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم اور عبادت سے نفس کے شیطان سے گلوخلاصی مشکل ہے۔ اگر علم کے ساتھ تربیت، تزکیہ اور نور نبوت کے اجزاء نہیں تو ایسا علم ڈاکوؤں کے ان خوفناک ہتھیاروں کی طرح ہے، جس سے ان کے لئے خوفناک وارداتوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ لوٹ مار کا سامان جمع کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس طرح کی صورتحال میں علم، علم سے ٹکراتا ہے۔ مناظروں کی بازار گرم ہونے لگتی ہے۔ اور صاحبان علم پر ایک ہی فکر مسلط رہتی ہے کہ حریف عالموں کی حیثیت، مان و مرتبہ اور ان کے وقار کو تباہ کیا جائے اور ان کی عزت، شہرت اور وقار کی قیمت پر معاشرے سے اپنی حیثیت تسلیم کرائی جائے۔

تربیت، تزکیے اور نفس کی اصلاح کا عمل بذریعہ صحبت بزرگان، یہ ہمارا تسلسل ہے۔ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی صحبت سے براہ راست اخذ فیض کیا۔ تابعین نے صحابہ کی صحبت سے نور نبوت کے اجزاء حاصل کئے، اس طرح مسلسل بزرگوں کی صحبت کے ذریعہ یہ عمل اب تک منتقل ہوتا رہا ہے۔ صحبت فیض کے اس تسلسل کی کوئی کڑی ٹوٹی ہوئی نہیں، اس تسلسل کا انکار ممکن نہیں۔ جب تک معاشرے میں صحبت کے ذریعہ باطن کی اصلاح اور اخلاق کی اصلاح کا عمل جاری رہا، اس وقت تک مسلم معاشرہ بہت ساری خرابیوں سے بچا

http://knooz-e-dil.blogspot.com/

رہا اور وہ ایک حد تک طاقتور رہا۔ لیکن جوں ہی صحبت کے اس عمل یعنی تصوف سے بے نیازی اختیار کی گئی۔ یا اس کی اہمیت کا انکار کیا گیا تو مسلم معاشرہ انتشار و فساد سے دوچار ہونا شروع ہوا۔

صوفیاء خام کی علم و عقل دشمنی کی بے نقابی کے سلسلے میں مولانا کا کردار

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے صوفیائے خام کی علم و عقل دشمنی، ان کے عملی تعطل اور احکام شریعت سے ان کی بے نیازی پر بھی سخت گرفت کی ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ وحی کے مقابلہ میں کشف، القا، خواب وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اسلامی شریعت کے ایک حکم پر عمل پیرا ہونا، ہزاروں کشف، الہام اور کیفیات و واردات پر بھاری ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات کا فہم نہ ہوگا تو شریعت پر عمل پیرا ہونا کس طرح ممکن ہے۔ اس لئے شریعت کا علم فرض ہے۔ جاہل صوفیاء کا یہ دعویٰ کہ وہ کشف، القا و الہام کے ذریعہ علم حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں شریعت کے ظاہری علم کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ دعویٰ سراسر باطل ہے۔ جو داعیان تصوف حضورﷺ کی تعلیمات سے سر مو بھی منحرف ہیں اور اس سے بے نیاز ہیں، چاہے بظاہر ان کی پرواز کتنی ہی بلند نہ ہو، اور عوام کی نظر میں ان کی اہمیت اور مقام کتنا ہی بڑا ہو، لیکن درحقیقت وہ صوفیاء خام ہیں، جو خود بھی گمراہی کی راہ پر گامزن ہیں تو عوام کے لئے بھی گمراہی کا ذریعہ ہیں۔ جاہل صوفیاء کی ابلہ فریبیوں اور کشف اور بلند روحانی پرواز کے ذریعہ عوام کو گمراہ کرنے والے واقعات کی قلعی کھولنے اور صحیح اور حقیقی اسلامی تصوف کے اصولوں کو اجاگر کرنے اور تصوف میں غیر اسلامی اثرات کی آمیزش کی نشاندہی کے سلسلہ میں مولانا موصوف نے جو کام کیا ہے، وہ نہایت وقیع کام ہے۔ مولانا نے اسلامی تصوف کے حدود، آداب، دائرے اور اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ بزرگان کے قائم کردہ بعض پرانے اصولوں میں حالات کی تبدیلی کے پیش نظر تغیر و تبدل کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اب صحیح اور جعلی تصوف کے درمیان امتیاز کرنا اور اسلامی تصوف کا فہم اتنا آسان ہوگیا ہے کہ ہر ایک کے لئے اس کا راستہ صاف ہوگیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ طویل عرصہ تک تصوف میں تجدید کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

تصوف میں خانقاہی نظام کی بڑھتی ہوئی خرابیوں کے پیش نظر مولانا موجودہ دور میں

خانقاہی سسٹم کو روایتی تسلسل کے ساتھ چلانے کے حامی نہیں تھے، بلکہ وہ اس کے مخالف تھے، ان کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اب کام کے لئے مدرسہ کو بنیاد بنانا چاہئے اور درس و تدریس کے اس کام کے دوران جو اللہ کے بندے اللہ کا نام پوچھنے آئیں اور جن کو اپنی تربیت کی فکر ہو تو انہیں اللہ کا نام بتانے کے ساتھ ساتھ ان کی باطنی تربیت کا انتظام بھی کرنا چاہئے۔ ورنہ الگ سے خانقاہ قائم کرنے کا سلسلہ اب موقوف ہونا چاہئے، اس لئے کہ خانقاہی سسٹم سے ایک ہی خاندان میں قوت مجتمع ہوتی ہے اور قوت سے اس خاندان کے افراد میں خرابیاں پیدا ہوجاتی ہے اور روحانیت و تصوف کے نام پر دولت، دنیا، ترفع اور حکمرانی آجاتی ہیں، اس لئے خانقاہیت خاندان کے افراد کی اصلاح کی بجائے ان کے اندر فرعونیت اور انانیت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اسلامی نظام کی جدوجہد کے سلسلہ میں مولانا کا موقف

مولانا، اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کے حامی تھے۔ اس سلسلہ میں جب ریشمی رومال اور خلافت تحریک زور شور سے شروع ہوئی تو مولانا کا جو موقف سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ غیروں کی حکومت کا خاتمہ اور اسلامی نظام کا قیام ایسا مسئلہ نہیں، جو جذباتی اور ہنگامی تحریک کے ذریعہ ممکن ہو، اس جدوجہد کے حامل لوگ اگر اس کاوش کے دوران اپنی انفرادی اور تحریکی زندگی میں اسلامی احکامات اور اس کی تعلیمات کی خلاف ورزیاں کرنے لگیں اور اسلام ان کی اپنی زندگیوں میں نافذ نہ ہوسکے اور اس تحریک کے کارکنوں کی زندگیاں اسلام سے خالی بلکہ خلاف اسلام سرگرمیوں سے پُر نظر آنے لگیں تو اس طرح کی تحریکی جدوجہد سے اسلامی نظام ہرگز نافذ نہ ہوسکے گا، بلکہ اسلام کے نام پر نفس پرستی کا نظام قائم ہوگا۔ اسلامی نظام کی تحریک کا فطری طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے داعیوں اور کارکنوں کی روحانی، اخلاقی اور ذہنی تربیت کا عمل شروع ہو اور یہ عمل بڑے پیمانہ پر شروع ہو۔ ساری جدوجہد اس ایک مرکزی نکتہ کے تحت ہو۔ جب نیک، متقی، تربیت یافتہ افراد کا قابلِ ذکر طبقہ تیار ہوگا تو اس کے بعد حالات کے مطابقت سے اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ اسلام کی بالادستی کے لئے ہمہ گیر تحریک چلائی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے ملفوظات میں کام کے بہت اہم نکتے موجود ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا مرکزی نکتہ، مولاناؒ کی نظر میں

مولانا تھانویؒ کی نظر میں اسلامی تعلیمات کا مرکزی نصب العینی نکتہ اللہ کے ساتھ تعلق کو مستحکم کرنا، اس کے ساتھ محبت کرنا اور اپنی پوری زندگی کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں بسر کرنا اور اپنی ساری چاہتوں اور مسرتوں کو اس کے سپرد کرنا، بلکہ اس کے لئے فنا ہوجانا ہے۔ یہ ایسا نصب العین ہے، جو افراد کی ساری زندگی کو اللہ کے ساتھ وابستہ کردیتا ہے اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا باقی نہیں رہتا، جو اس کی اطاعت کے دائرے سے خالی ہو۔ اللہ کی یہ اطاعت اس کے ساتھ محبت کے تعلق کے بغیر ہونا ممکن نہیں۔ اللہ کے ساتھ بندوں کی محبت کا یہ تعلق جہاں ایک حد تک ذہن کی شعوری سطحوں سے تعلق رکھتا ہے، وہاں اس کا سب سے زیادہ گہرا تعلق قلب کی گہرائیوں سے ہے۔ جب قلب میں محبت الٰہی کا سرچشمہ پھوٹنے لگتا ہے تو افراد لذت، خوشی اور مسرت کے لازوال احساسات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کامل اطاعت، لذت اور مسرت کا دوسرا نام بن جاتی ہے۔ جب محبت کے لازوال احساسات سے دل روشن ہوجاتا ہے تو اس سے ذہن کو بھی روشنی ملنے لگتی ہے اور عقل بھی محبوب حقیقی کے مشاہدہ کے احساسات سے جھومنے لگتی ہے اور اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ باقی نہیں رہتا۔ اس طرح اللہ سے محبت کا تعلق، وجدان، روح اور عقل کو منور کرنے کا ذریعہ ہے اور ساری زندگی اللہ کے سپرد کرنے کا نام بھی ہے، افراد کے اندر اللہ کی یہ محبت اللہ والوں کی صحبت کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہے۔

دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے زوال اور عروج کے جداگانہ قوانین

مولانا اپنے مواعظ و ملفوظات میں ایک نکتہ جو نہایت شد و مد کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیاوی مسائل میں ناکامی، ان کا زوال، ذلت اور محتاجی کا بنیادی سبب خدا سے ان کی بے پرواہی کی روش ہے۔ اگر اللہ کی رضامندی کا راستہ اختیار کیا جائے اور کام سوچ سمجھ کر اسلامی شریعت کے مطابق کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں انفرادی و اجتماعی زندگی میں ایسی خیر و برکت ظاہر ہوگی کہ ساری ناکامیاں کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوں گی اور افلاس، محتاجی اور ذلت وغیرہ سب ختم ہوجائے گا اور سیاست، معیشت و معاشرت اور ساری اجتماعی زندگی پاکیزہ ہوجائے گی۔

دنیا کی دوسری قوموں کی ترقی و کامیابی کے اسباب خالص مادی نوعیت کے ہوسکتے

ہیں، مثلاً انہوں نے ساری توانائیاں اسباب میں صرف کردیں۔ محنت، تلاش و تحقیق، قومی اتحاد کے لئے ظاہری کاوشیں وغیرہ کیں، اس سے وہ ترقی کی راہ پر فائزہ ہوسکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کی کامیابی اور ترقی کا راز اسباب سے ماورئی میں ہے اور وہ راز یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی فکر کی جائے۔ اس کے احکامات اور تعلیمات پر یکسوئی، دل جمعی اور اخلاص و محبت کے ساتھ عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں معمولی مادی اسباب سے وہ ترقی حاصل ہوگی کہ دنیا کی قومیں حیرت زدہ ہوجائیں گی۔ دور اول کے مسلمانوں کی ترقی کا بنیادی سبب یہی تھا اور دنیا کی قوموں کے لئے ان کے عروج اور کامیابی کے راز کو سمجھنا مشکل رہا۔

مسلمانوں کی کامیابی کا راز اللہ کے احکامات پر صدق دلی کے ساتھ عمل پیرا ہونے میں اس لئے ہے کہ انہوں نے خدائے واحد کے ساتھ اطاعت و وفاداری کا عہد کیا ہے اور امت وسط ہونے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ یعنی اپنے پاکیزہ کردار، عمل اور قول کے ذریعہ دنیا کی دوسری قوموں تک اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو پہنچانے کا کام ان کی منصبی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اتنی اہم ذمہ داری پر فائز ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے ان کے ساتھ نوازشوں اور رحمت کا خصوصی معاملہ ہے۔ اس لئے صادق مسلمانوں کے لئے اللہ کی طرف سے لگے بندھے قوانین کو معطل تک کردیا جاتا ہے اور اسباب کو ضوابط کا محتاج بنانے کی بجائے خاص فضل کے تحت اسباب کے قوانین کی بندش اٹھادی جاتی ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کی طرف سے عہد شکنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی منصبی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کی جائے۔ سرکشی و بغاوت اور احکامات کی خلاف ورزیوں کی روش اختیار کی جائے تو اس کی سزا بھی سخت ہے۔ یہ سزا اتنی سخت ہوتی ہے کہ دوسری قوموں کے لئے عبرت کا سبب بن جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، اللہ کی رضامندی کے کام کو معمولی کام تصور نہ کیا جائے، مسلمانوں کی دین و دنیا کی ساری سعادتوں کے لئے اس کام کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سب سے اہم اور بنیادی نکتہ ہے۔

تصوف میں خیر و شر کی قوتوں کی داخلی کشمکش میں مولانا کی رہنمائی

جب فرد اللہ کے ساتھ اطاعت و محبت کے رشتے کو مستحکم کرنے کے لئے تصوف میں داخل ہوتا ہے تو فرد کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب فرد کے شب و روز عجیب

احساسات کے ساتھ گذرنے لگتے ہیں۔ صبح سے رات گئے تک وہ خوشی و رنج اور قبض و بسط اور حالات و کیفیات و واردات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ ابتدا میں ایک طویل عرصہ تک تو خیر و شر کی داخلی قوتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہوتی ہے، جس میں نفس اور شیطان کی ساری قوتیں فرد پر اپنے سارے لاؤ لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر سالک سخت پریشان ہوتا ہے اور قبض کی ہولناک واردات سے دوچار ہوتا ہے۔ جس کے تحت نیکی کی راہ میں قدم اٹھانا، اس کے لئے شدید دشوار ہوجاتا ہے اور دل میں تاریکی چھاجانے لگتی ہے۔ لیکن جوں ہی قبض انتہا کو پہنچتا ہے، رحمانی قوتیں اپنی ساری تجلیات کے ساتھ وارد ہونے لگتی ہیں اور دیکھتے ہی قبض، تاریکی، گھبراہٹ اور یاس کے احساسات کی جگہ، خوشی، لذت، والہانہ پن اور وجد کی ایسی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے، جس پر دنیا کی ہزاریں نعمتیں اور خوشیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ سالک شب و روز باطنی حالات کے اس تغیر و تبدل میں رہنے لگتا ہے، اس کے لئے باطنی طور پر اسی دنیا میں جنت و دوزخ کے حالات و مقامات شروع ہوجاتے ہیں۔ کبھی تو ذکر و مراقبہ اور اللہ کی یاد، نماز میں خشوع و خضوع اور تہجد و نوافل میں شوق و شغف اور دل کی بے پناہ آمادگی ہوتی ہے۔ گویا دل کشاں کشاں اللہ کی طرف کھچ رہا ہے اور ذوق و شوق سے نفس مطمئنہ کا سفر طے ہورہا ہے، کبھی یہ حالت ہے کہ ساری کیفیات گویا سلب ہورہی ہیں۔ اور سالک ان ساری کیفیات سے بُری طرح محروم ہونے لگتا ہے اور ذکر اور عبادت کے لئے طبیعت کو جبراً آمادہ کرنا پڑتا ہے، اس طرح شیطانی قوتوں سے کشمکش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ ایسی تھکادینے والی لڑائی ہوتی ہے، جس میں بعض اوقات سالک تھک کر چور ہوجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، اسی دوران، اللہ تعالیٰ بندے کے سارے رشتے کاٹ کر اسے اپنے ساتھ جوڑنے کے لئے اسے جسمانی تکالیف و مصائب میں بھی مبتلا کردیتا ہے۔ مثلاً اس کے معدہ کا نظام معطل کردیتا ہے تاکہ وہ مرغن غذائیں اور بھرپور غذا نہ کھاسکے، اس لئے کہ زیادہ کھانے اور مرغن غذاؤں سے دل کثیف ہوجاتا ہے اور اس کی پرواز میں کوتاہی واقع ہوجاتی ہے۔ کبھی شیطانی خیالات اور وسوسوں کا غیر معمولی غلبہ ہونا، کبھی انوارِ الٰہی کے نزول سے قلب کا مسرت و شادمانی کے احساسات سے مغلوب ہونا، یہ سالک کی وہ زندگی، جس سے تصوف میں آنے کے بعد وہ آشنا ہوتا ہے، بلکہ دوچار

ہوتا ہے۔

راہ حق کا طالب تقریباً پندرہ بیس سال تک شب و روز انہی حالات اور اسی کشمکش میں رہنے لگتا ہے، نفس اور دل و روح کی کشمکش کی اس زندگی کے ہزارہا پہلو ہیں۔ جن سے طالب ناآشنا ہونے کی وجہ سے اکثر پریشان ہونے لگتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تصوف کی اس زندگی اور سالک کے ان حالات، کیفیات و واردات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان سارے مراحل سے بہتر طور سے عہدہ برآ ہونے کے لئے طالب کی اس طرح رہنمائی کی ہے کہ وہ حوصلہ اور ہمت کے ساتھ نفس مطمئنہ کے یہ مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ چونکہ مولانا خود قبض، ہیبت، گھٹن اور واردات کی سلبی کے غیر معمولی حالات سے گذر چکے تھے، اس لئے مولانا اپنے حالات و مشاہدات کے پس منظر میں اس سلسلہ میں روحانی طالبوں کی بہت بہتر طور پر حوصلہ افزائی کے نکات بیان فرماتے ہیں۔ اس اعتبار سے مولانا نے تصوف، اہل تصوف اور سالکوں کی بتدریج رہنمائی کے لئے جو عظیم الشان کام کیا ہے۔ ہماری پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، زیرِ نظر کتاب میں کافی مواد سالکوں کی اس باطنی رہنمائی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مولانا کے اس طرح کے ملفوظات سے فائدہ صحیح سالکین ہی اٹھاسکتے ہیں۔

معاملات کی اصلاح اور کبر کا ازالہ، مولانا کی تربیت کے دو اہم نکات

مولانا تھانویؒ اپنے وسیع تر تجربات و مشاہدہ کے پیش نظر مریدوں کی اصلاح کے نقطہ نگاہ سے دو چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، ایک تو معاملات کی اصلاح ہے دوم کبر اور بڑے پن کے اثرات کا ازالہ ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ جتنی اہمیت ذکر و فکر کی ہے، معاملات کی بہتری اور اخلاق حسنہ کی اہمیت کسی بھی اعتبار سے ان سے کم نہیں، بلکہ ذکر بالذات خود مقصود بھی ہے تو اس سے یہ مقصود بھی پیش نظر ہے کہ فرد و افراد میں اخلاق رذیلہ کی جگہ اخلاق حمیدہ پیدا ہوجاتے ہیں، لیکن اگر ذکر و فکر سے یہ مقصود حاصل نہ ہوسکے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ طبیعت میں فاسد مادہ اس قدر رچ بس گیا ہے اور بعض اخلاق رذیلہ کی عادتیں اتنی مستحکم ہوگئی ہیں کہ محض ذکر و فکر ان کی اصلاح کے لئے کافی نہیں، اس کے لئے خراب عادتوں کے خلاف شعوری طور پر مزاحمت اختیار کرکے اخلاقِ حمیدہ کے لئے شروع میں طبیعت کو جبراً آمادہ کرنا پڑے گا، اگر اخلاقِ رذیلہ کے خلاف مزاحمت کی روش اختیار نہ

کی گئی تو محض ذکر وفکر سے اس کی اصلاح ہونا مشکل ہے۔ معاملات کی اہمیت کے سلسلہ میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ مولانا کے ایک خلیفہ نے اپنے ایک مرید کو خط کے ذریعہ اطلاع دی کہ میں فلاں گاڑی سے آرہا ہوں، مجھے لینے کے لئے اسٹیشن پر آنا، جب مولانا کو اس کا علم ہوا تو، مولانا سخت نالاں ہوئے اور فرمایا، اگر مرید کی پہلے سے مصروفیت ہو تو کیا وہ اپنا پروگرام اور اپنی مصروفیت کو چھوڑ کر تمہیں لینے کے لئے آجائیں۔ تمہاری اس بات سے معلوم ہوا کہ تم حسن معاشرت کے سلیقہ سے محروم ہو، اس صورت میں تم دوسروں کی کیا خاک تربیت کرسکو گے، جب کہ تمہاری اپنی تربیت بھی مکمل نہیں، چنانچہ مولانا نے اپنے ان خلیفہ کی خلافت معطل کردی (اگرچہ بعد میں بحال کردی)۔

مولانا، کبر، انا اور بڑے پن کی بیماری کو ساری بیماریوں کی جڑ قرار دیتے تھے اور اس بیماری کے ازالہ کے لئے خصوصی کاوشیں فرماتے تے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کثرت ذکر وفکر سے بڑے پن کی بیماری ناز اور عجب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، یعنی اپنے عابد، ذاکر اور بزرگ ہوجانے کی بیماری پیدا ہونے لگتی ہے۔ مولانا نفسیات کے بڑے ماہر کی حیثیت سے اس کا حکیمانہ علاج فرماتے تھے۔ مثلاً ایک بڑے عالم نے (جو ذاکر بھی تھے) یہ شکایت کی کہ میرے اندر یہ زعم پیدا ہوگیا ہے کہ علم حدیث میں مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ کوشش کے باوجود اندر سے یہ دعویٰ نہیں نکلتا، مولانا نے ان عالم کی اس بیماری کا علاج یہ کیا کہ ان سے دو ماہ تک نمازیوں کے جوتے درست کروائے۔ متعلقہ مولانا صاحب کھڑے ہوکر جوتے ٹھیک کرتے رہے، مولانا نے فرمایا کہ کھڑے ہوکر نہیں، بیٹھ کر اطمینان سے یہ کام کرتے رہیں، دو ماہ کے بعد ان مولانا کے دعویٰ کا یہ احساس ختم ہوا۔

فنا فی اللہ و بقا باللہ کا مقام، شریعت کے ساتھ استقامت سے وابستہ ہے

مولانا کی نظر میں تصوف ذکر وفکر کی مشقوں کو مستحکم کرنے اور نسبت کے باطنی تعلق کو مضبوط کرنے ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ تصوف کے ذریعہ سالکوں کی ہمہ جہتی اصلاح پیش نظر ہے۔ اس اصلاح میں اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا علاج بھی شامل ہے تو شعور وادراک کو متحرک کرنا اور اس سے بھرپور کام لینا بھی مدنظر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کام جو تصوف کے ذریعہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ دینی فرائض، واجبات اور سنن کی ادائیگی کا باضابطہ

اہتمام ہوتا ہے اور طبیعت اور مزاج میں اسلامی شریعت کے خلاف جس طرح کا منکر بھی رچا بسا ہوا ہے، اس سارے منکر کے خلاف جدوجہد کرکے طبیعت کو اسلامی شریعت کے ہم آہنگ بنانا ہے۔ تصوف میں فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کا جو مقام ہے، جسے نسبت مع اللہ کے استحکام کا نام دیا جاتا ہے، مولانا کی نظر میں بقا باللہ کا یہ مقام اس وقت تک معتبر نہیں، جب تک طبیعت اسلامی شریعت پر پوری طرح راسخ اور مطمئنہ نہ ہوجائے اور اسلامی شریعت مزاج کا حصہ نہ بن جائے، ورنہ نسبت کا یہ تعلق تو خلوت میں کثرت سے ذکر کرنے سے پیدا ہوہی جاتا ہے۔ جو چاہے بظاہر کتنا ہی مستحسن ہو، لیکن اسلامی تصوف، اسلامی تعلیمات ہی کا حصہ ہے، وہ اس کے ساتھ لازم ملزوم ہے، بلکہ اس کے استحکام کا ذریعہ ہے۔

مولانا کے ذریعہ حیرت انگیز نفسی ونفسیاتی علوم کا مدون ہونا

مولانا کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جہاں دین کے ہر شعبہ میں کام کیا ہے اور ملت کی ہر ضرورت کی تکمیل کی اپنی حد تک کوشش فرمائی ہے، وہاں انہوں نے روحانی و باطنی معالج کی حیثیت سے اپنے ہزارہا مریدوں کی باقاعدہ ایک ایک بیماری کا علاج کیا ہے۔ مثلاً اگر ایک مرید کبر کی بیماری میں مبتلا ہے تو پہلے مولانا نے اس کی اس بیماریوں کا علاج شروع کیا، کبر کا علاج مکمل ہونے کے بعد مرید کے حسد کا علاج کرنا شروع کیا، اس طرح مولانا اپنے ہزارہا مریدوں کو انفرادی طور پر وقت دے کر ان کے نفسی ونفسیاتی اور باطنی بیماریوں کا تعین کرتے تھے اور اس سے نجات کے لئے باقاعدہ حکیمانہ علاج فرماتے تھے۔ افراد کی ان نفسی بیماریوں کی تشخیص، باطنی بیماریوں کی نوعیت اور ان کے معالجہ کے سلسلہ میں مولانا کے ذریعہ جو علوم مدون ہوکر سامنے آئے ہیں، اس سے انسانی نفس کی گہرائی و گیرائی، نفس کی داخلی زندگی میں رحمانی و شیطانی قوتوں کی باہمی لڑائی اور باطن کے شدید احساسات، وہاں موجود خوف، دہشت، ہیبت، تاریکی اور احساس کمتری و احساس برتری اور مان و مرتبے کی خواہشوں کا نہ ختم ہونے والا طوفان اور ساتھ ساتھ رحمان کی طرح کی طرف فرد کی کشش کے اندرونی نظام وغیرہ کے سلسلہ میں ایسے حیرت انگیز نکات سامنے آئے ہیں کہ بڑے سے بڑا عالم، دانشور اور نفسیات کا ماہر حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں مولانا کی کتاب ''تربیت السالک'' نفسی ونفسیاتی علوم کا ایسا خزانہ ہے، جو اسلامی ماہرین نفسیات کی طرف سے مغربی ماہرینِ نفسیات کے لئے عظیم تحفہ ہے، کاش ان کے لئے اس کتاب

سے استفادہ کی صورت پیدا ہو سکے تو انسانی نفسیات کی صحیح و متوازن خطوط پر استواری کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

قرآن و حدیث سے تصوف کے اثبات کا غیر معمولی کام ہونا

یوں تو تصوف و احسان ہر دور کی ضرورت رہا ہے، لیکن اس دور میں جب کہ مادیت پرستی کا طوفان تیز تر ہو گیا ہے اور حرص و ہوس کی وبا نے انسانوں کو مفلوج کر دیا ہے اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے لذت کے نئے نئے سامان کے حصول کی خواہش و تمنا اپنی انتہائی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس طرح کی صورتحال میں لذت کی چیزوں سے دستبرداری، سامانِ دنیا سے استغنیٰ اور قناعت، سادگی اور ضروریات پر اکتفا کرنا اور دنیا کی محرومی کے تاثر کو زیادہ نہ لینا، یہ ایسی چیزیں ہیں، جو تصوف و احسان کے ذریعہ ہی پیدا ہو سکتی اور پروان چڑھ سکتی ہیں۔ چنانچہ اس دور میں اسلامی تصوف لوگوں کے لئے زندگی اور موت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس لئے کہ دنیاوی نعمتوں اور لذتوں سے محرومی کے احساسات کی وجہ سے افراد کے لئے ڈپریشن، دل کے امراض، داخلی زندگی میں مسلسل کشمکش، جھنجھلاہٹ اور اپنی ذات سے بیزاری اور خودکشی جیسے خیالات سے بچنا دشوار ہے۔ چنانچہ مولانا تھانویؒ نے اسلامی تصوف کی اس ضرورت و اہمیت کی وجہ سے قرآن کی کئی سو آیتوں سے تصوف کے اصول اور اس کے نکات و اہمیت ثابت کی۔ اور اپنی کتاب "التکشف" میں تین سو احادیث سے تصوف کی بنیادیں اور اس کے اصول اخذ کئے اور اس کے علاوہ اس موضوع کی مختلف پہلوؤں پر بیسیوں سے زائد کتابیں لکھیں۔ تاہم اسلامی تصوف کی اس اہمیت کے باوجود چونکہ مولانا مجتہدانہ شان کے حامل تھے اور معاملات کے سارے پہلوؤں پر نگاہ رکھتے تھے، اس لئے جو لوگ تصوف سے طبعی مناسبت نہیں رکھتے اور ساری کوشش کے باوجود انہیں مطلوبہ صلاحیتوں کا حامل بزرگ دستیاب نہیں تو ان کے لئے مولانا کا لائحہ عمل یہ تھا کہ وہ قرآن و حدیث سے گہرا تعلق قائم کریں اور اسلام کی ایک ایک تعلیم پر عمل کرنا شروع کر دیں اور اصلاح کے لئے غیر معمولی فکر مندی کا مظاہرہ کریں تو ان شاء اللہ انہیں مطلوب حاصل ہو جائے گا اور ان کی اصلاح کی صورت بھی نکل آئے گی۔

مولانا کی نظر میں تصوف کی اہمیت

مولانا تھانویؒ کی تعلیمات اور فکر کا قابل ذکر حصہ تصوف سے متعلق ہے۔ ملفوظات اور مواعظ کا تو موضوع ہی یہ ہے۔ مولانا نے تصوف کو موضوع بحث اس لئے بنایا کہ ایک تو یہ نورِ نبوت کی منتقلی کا ذریعہ ہے، اس سے اعمال میں قوت اور تقویت پیدا ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ یہ ہمارا تسلسل ہے، یعنی سبیل المؤمنین ہے، ساری مسلم تاریخ میں اصلاح اور رشد و ہدایت کا بیشتر کام تصوف کے ذریعہ ہی ہوا ہے۔ چہارم یہ کہ باطنی اصلاح کا کام جو پل صراط کی طرح باریک ہے۔ وہ تصوف کے ذریعہ بہتر اور مؤثر طور پر ہوتا ہے۔ بس سالک کو اپنے آپ کو راستے کے آشنا کے حوالہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کی ایک ایک باطنی خرابی اور نفسی بیماریوں کا علاج کر کے اس میں جوہرِ انسانیت بھر دیتا ہے۔ پنجم مولانا نے محسوس کیا کہ اب جو دور آ رہا ہے، اس میں عقلیت اور ظاہری حسوں کے غلبہ کی وجہ سے مادیت، لذت اور دنیا کی پرستش کی ایسی رَو شروع ہوگی کہ ایک طرف عقل اور حواس کے ذریعہ جس بات کا ادراک نہ ہو، اس کے انکار کی روش تیز تر ہوگی، دوسرے یہ کہ مادیت کو نصب العین بنانے کی وجہ سے زندگی کی اصل رونق، اس کی خوشیاں اور دل کی طمانیت رخصت ہو جائے گی اور سارے پاکیزہ احساسات اور جذبات فنا ہو جائیں گے اور مادی خوشحالی، ترقی اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور عزت و وقار کے مصنوعی بتوں کی پوجا کی وجہ سے انسانیت ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہوگی اور ہولناک باطنی خرابیوں کی وجہ سے خود مسلم دنیا انسانیت کے لئے عبرت کا منظر پیش کرنے لگے گی۔

اس پس منظر میں مولانا تھانویؒ نے اسلام کے باطنی پہلو تصوف کی اہمیت کو اجاگر کرنے، اس کے حقیقی خدوخال کو نمایاں کرنے، جدید دور کے حالات و ضروریات کے پیش نظر تصوف کی اس از سر نو تدوین اور اس کے ذریعہ سے مسلم امت میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے کام کو تیز تر کرنے کے لئے اپنی غیر معمولی توانائیاں صرف کیں۔ اور ملت کو ایسا لٹریچر دیا، جس سے ہم نئے دور کے علم نفسیات، علم طبعیات اور فکری و نظری تقاضوں کے تحت ایک طرف تو اپنی نسلوں کی اصلاح و تربیت کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں، دوسری طرف دنیا کے سامنے علوم کا بیش بہا خزانہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ مجدد کی فکر و تعلیمات میں اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت و قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے نظریاتی اور عملی رخ کو تبدیل کر کے

حالات میں انقلاب برپا کرسکتی ہے۔

تصوف کے چار بنیادی اصولوں میں تغیر و تبدل

مولانا نے اسلامی تصوف کے لئے چار بنیادی اصولوں کم کھانا، کم سونا، کم ملنا اور کم بولنا میں ترمیم کرکے، نئے دور کے حالات اور طبائع کے پیش نظر دو بنیادی اصولوں کی حذف فرمایا۔ کم کھانے اور کم سونے کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں ان دو بنیادی اصولوں کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس لئے کہ اب طبیعتیں کمزور ہیں، ان اصولوں کے ساتھ جب ذکر وفکر کی ریاضتیں ہوں گی تو صحت متاثر ہوگی۔ اس طرح سلوک کا سفر طے کرنا دشوار ہوجائے گا۔ پہلے قویٰ مضبوط تھے، اس لئے ان دو اصولوں کی بھی ضرورت تھی۔ اب صورتحال مختلف ہے۔ کم ملنے اور کم بولنے کے یہ دو اصول بھی سلوک کے سفر تک ہیں۔ منتہی ان دو اصولوں سے بھی مستثنیٰ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مولانا تھانویؒ نے تصوف میں اختیاری اور غیر اختیاری چیزوں میں امتیاز کرکے اختیاری چیزوں پر استقامت اختیار کرنے اور غیر اختیاری چیزوں کو اہمیت نہ دینے پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اختیاری چیزوں میں فرائض، واجبات، سنن، حلال وحرام وغیرہ چیزیں شامل ہیں۔ جب کہ غیر اختیاری چیزوں میں کیفیات، واردات، حالات، وسوسے، خطرات اور فرائض و واجبات کے لئے طبیعت کی عدم آمادگی اور باطنی طور پر انوار کا نظر نہ آنا وغیرہ شامل ہے، مولانا نے ان معاملات میں سالکوں کی بہتر رہنمائی کرکے، انہیں بہت سی پریشانیوں سے نجات دلائی ہے۔

دوسری دنیا کے رازوں سے آشنائی کا مسئلہ، مولانا کی نظر میں

تصوف میں فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے نتیجہ میں سالکوں کو دوسری دنیا کے رازوں سے جو آشنائی حاصل ہوتی ہے یا حضور کی زیارت، آپ کی بشارتیں، اولیاء کبائر کی ارواح سے استفادہ یا مرشد کی طرف سے عجب طریق سے فیوض و انوار کا ورود، دنیاوی معاملات میں مختلف طریقوں سے امداد و اعانت کی صورتیں، کشف، الہام وغیرہ یہ چیزیں ایسی ہیں جو ذکر وفکر میں استغراق، فنائیت، ریاضتوں، سلسلوں اور ارواح کے تصرفات کے نتیجہ میں ہوتی ہیں۔ لیکن جاہل صوفیاء کی کثرت کی وجہ سے چونکہ یہ چیزیں مقصود بن گئی تھیں اور شرعی احکامات جو بجائے خود مقصود ہیں، وہ ثانوی حیثیت اختیار کرگئے تھے۔ اس لئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے اجتہادی شان کا مظاہرہ فرماتے ہوئے ان ساری

واردات کو شریعت کے تابع کردیا، اگر شریعت پر استقامت حاصل ہے اور ان واردات و احوال میں سے کوئی چیز موجود نہیں تو سالک کو مقصود حاصل ہوگا۔ لیکن اگر اسلامی تعلیمات سے بے نیازی یا غفلت ہے اور کشف و القا ساری واردات موجود ہیں تو گویا سالک سراپا محروم ہے۔

صحبت کی غیر معمولی اہمیت

تصوف میں بیعت ضروری نہیں ہے۔ اصل چیز ذاتی اصلاح کا شوق، اس کے لئے اضطراب اور طلب ہے، پھر بزرگ سے عقیدت ومحبت ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد صحبت ہے۔ صحبت کے ساتھ تعلیم و تربیت ہے۔ جس سے تزکیہ نفس کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ صحبت میں تسلسل ضروری ہے۔ فرد صحبت کے ذریعہ سے جو چیزیں اخذ کرتا ہے، کسی اور طریق سے اخذ کی یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ اگر تم شیطان بھی ہوتو اگر تمہیں اہل اللہ کی صحبت حاصل ہے تو پھر تمہیں کوئی پرواہ نہیں، اہل اللہ کی صحبت تمہیں فرشتوں سے بھی زیادہ بلند مقام تک پہنچادے گی۔ لیکن اگر تم اپنی جدوجہد سے فرشتوں سے بھی بلند مقام پر فائز ہوگئے ہو اور تمہیں اہل اللہ کی صحبت حاصل نہیں تو تمہارے لئے شیطان بننے کے خطرات پوری طرح موجود ہیں۔

صحبت اہل اللہ کے ذریعہ قلب میں جب نور نبوت کے اجزاء منتقل ہونے لگتے ہیں تو صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) مستحکم ہونے لگتا ہے۔ ایسا فرد اگر ظاہری علم سے بہرہ ور نہ بھی ہو تو اس کا دل ہر وقت ایمان سے سرشار رہنے لگتا ہے اور برائیوں کے سیلاب اور طوفان کے موقعہ پر وہ چٹان کی طرح مضبوط رہتا ہے۔ لیکن بڑے سے بڑا عالم اور دانشور جو صحبت سے فیضیاب نہیں، اس کی عام طور پر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ وجدانی اور ذہنی طور پر ہر وقت ڈانواڈول رہتا ہے۔ معاشرہ کے مسموم غالب اثرات اگر اسے عملی طور پر نہیں تو فکری اور شعوری طور پر تو ضرور متزلزل کردیتے ہیں اور ایسے افراد اکثر مذبذب رہنے لگتے ہیں۔ صحبت وعدم صحبت کا یہ ایسا واضح فرق ہے، جس کا بآسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی موجودگی میں ہمیں آخر دوسری چیز کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس سلسلہ میں یہی کہا جاتا ہے کہ تعلیم وتربیت وتزکیہ قرآن وسنت ہی

کا حکم ہے۔ اس کام کے لئے فرد کی ضرورت ہے۔ فرد کے بغیر تربیت و تزکیہ ہونا دشوار ہے، یہ مربی و مزکی ہی ہوتا ہے، جو تربیت اور تزکیہ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ جس سے قرآن و حق کی تعلیمات اور اس کی روح کے حقیقی فہم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی قوت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مربی و مزکی کے ذریعہ تربیت و تزکیہ کا اہتمام ہونا، یہ قرآن و سنت کے منافی نہیں، بلکہ اسی کا منطقی اور لازمی تقاضا اور نتیجہ ہے۔

اسلامی تصوف کے ذریعہ عبدیت اور فنائیت کے مقامات کا طے ہونا

اسلامی تصوف میں سالک عبدیت، غلامی، عجز، انکساری، خاکساری۔ اپنی ذات کی نفی، نفس کے سرغرور کو توڑنے اور فنائیت کے مراحل اور مقامات طے کرنے لگتا ہے۔ یہ مقامات جب بڑی حد تک طے ہوجاتے ہیں تو اس کے بعد اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا لذت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اوصاف حمیدہ طبیعت کا حصہ بن جاتے ہیں اور شر کے ملکات کی جگہ خیر کے ملکات غالب ہوجاتے ہیں۔ تاہم سلوک طے ہوجانے کے باوجود نفس کلی طور پر فنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی قوت ایک حد تک موجود ہوتی ہے۔ اگر ذکر و اذکار کے معمولات ترک کر دیئے جائیں تو نفس کی بہیمانہ قوتیں کسی حد تک عود کرنے لگتی ہیں اور نفس پرستی کے اعمال کے صادر ہونے کا امکان موجود رہتا ہے۔ سلوک سے پہلے نفس کی حیثیت شریر گھوڑے کی طرح ہوتی ہے، جو ہر وقت لاتیں مارتا رہتا ہے، جب کہ سلوک کے بعد نفس اس شریف گھوڑے کی طرح ہوجاتا ہے، جو کبھی کبھار لاتیں مارتا ہے۔

اسلامی تصوف میں غیر قوموں کے اشغال کی حیثیت

اسلامی تصوف میں اشغال یا فکر کے طریق میں دوسرے مذاہب یا قوموں سے جو چیزیں لی گئی ہیں، ان کی حیثیت تدبیر اور حکمت کی سی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے جنگ خندق میں ایک غیر مسلم قوم کا دفاعی طریق جنگ اختیار فرمایا تھا، اسی طرح سلوک میں تدبیر کی حیثیت سے اشغال میں اگر دوسرے مذاہب اور قوموں سے کوئی تدبیر اختیار کی جاتی ہے تو وہ نفع اور سہولت کی وجہ سے اختیار کی جاتی ہے، اس لئے اسے غیر اسلامی یا بدعت شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی تدابیر مقاصد میں شمار نہیں ہوتی، بلکہ جزوی معاملات میں ہوتی ہے۔ مثلاً دل اور ذہن میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے، جس کا تعلق تجربے اور مشاہدہ سے ہے۔

مولانا تھانویؒ کی تعلیمات اور فکر کے بہت سارے امتیازی پہلو ہیں، جنہیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہ "مضمون" اس کا متحمل نہیں۔

مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کی فکر میں اسلام کا جامع اور کامل تصور پایا جاتا ہے۔ وہ ہر جسم، روح اور بدن کی حیثیت سے زندگی کے سارے پہلوؤں کی اصلاح کا لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ وہ افراد کی اصلاح میں اخلاق، کردار اور سیرت سازی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اس نقطہ نظر کو بھی پیش کرتے ہیں کہ بزرگ بننا آسان ہے لیکن انسان بننا مشکل ہے۔ معاملات کی اصلاح، معاشرتی زندگی میں پاکیزگی اور بلندی، کردار کی اس طرح تشکیل کہ فرد لوگوں کو دکھ، تکلیف اور اذیت پہنچانے کی بجائے ان کے لئے آرام و سہولت کا ذریعہ بن جائے، مولانا زندگی کے اس پہلو کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔

مولانا اسلامی حکومت کی اہمیت کے بھی پوری طرح قائل ہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں، برائیوں کے پھاٹک کھلے ہوئے ہیں۔ نئی نئی برائیاں پیدا ہوتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔ یہ سب اس لئے ہے، کیونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں۔ جو ان برائیوں کے سدباب کا فریضہ سرانجام دیتی۔ مولانا کو مسلمانوں میں بڑھتے ہوئے فقہی اختلافات پر بھی تشویش تھی۔ اس مسئلہ میں ان کی خواہش تھی کہ ایسی کتاب تیار کی جائے، جس میں چاروں فقہ کے مسائل کو حدیث سے ثابت کیا گیا ہو۔ تاکہ ہر فقہ سے وابستہ افراد اپنی فقہ کو احادیث سے ماخوذ تصور کرتے ہوئے اس پر عمل کریں، اور احادیث سامنے ہونے کی وجہ سے اختلافات میں بھی کمی واقع ہوجائے گی۔

دینی رہنماؤں کے لئے اخلاص کے ساتھ ساتھ وقت کے چیلنج و حالات سے آشنا ہونا ضروری ہے

مولانا تھانویؒ ایک اور کام جس کو اہمیت دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ دینی رہنمائی کا کام کرنے والی شخصیتوں کے لئے اخلاص، تقویٰ، علم کی گہرائی کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے حالات کا علم ہونا، لوگوں کے ذہنی رجحانات اور وقت کے افکار سے آشنا ہونا اور جن حالات و معاشرہ میں کام کرنا پیش نظر ہے، اس معاشرہ میں موجود فتنوں اور افکار کی یلغار کی نوعیت سے گہری واقفیت بلکہ اس کا مشاہدہ ہونا بھی از بس ضروری ہے۔ ورنہ حالات کے غلط

تجزیے اور اپنے دور کے فتنوں کی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دینی زعماء ایسی فکر دینے اور علمی رہنمائی کرنے سے قاصر ہوں گے، جس سے لوگ وقت کے فتنوں سے بچ سکیں اور الجھے ہوئے افکار و مسائل میں متوازن راہ پر گامزن ہوسکیں۔ چنانچہ دینی زعماء کے لئے اخلاص و تقویٰ کے ساتھ ساتھ تجربہ و مشاہدہ اور اپنے دور کے حالات اور فتنوں کا صحیح علم ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ جس کی طرف افسوس ہے کہ زعماء کی طرف سے کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔

اس بات پر جتنا افسوس کیا جائے، وہ کم ہے کہ مولانا جیسے عظیم مدبر، مصلح، مفکر بلکہ مجدد کی فکر (جو پوری ملت کے لئے سرمایہ ہے) اس سے نہ صرف یہ کہ استفادہ نہ کیا گیا، بلکہ اسے قابلِ ذکر اہمیت ہی نہیں دی گئی، اس کا بنیادی سبب شدید قسم کے حجابات ہیں، جو استفادہ کی راہ میں حائل ہیں۔ دائراتی سوچ کی فروغ پذیری کی وجہ سے یہی ہوتا ہے کہ مجدد و مصلح کی فکر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ مجدد خداداد بصیرت سے ملت کے سامنے صحیح اور متوازن اسلامی فکر اس بلند آہنگی اور اجتہادی شان سے پیش کرتا ہے کہ عقلی، علمی اور وجدانی طور پر سارے اشکالات دور ہوجاتے ہیں۔ لیکن جہاں ملت مختلف طبقات اور گروہوں میں منقسم ہوکر ہر گروہ اپنے لئے جداگانہ تعبیر اسلام کے حق میں وسیع لٹریچر تیار کرچکا ہوں، وہاں مجدد کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کے باوجود دائراتی خولوں میں شگاف ڈال کر افراد کو ملت کی وسیع اور حقیقی شاہراہ پر گامزن کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

مولانا کی فکر میں موجودہ دور کی ملتِ اسلامیہ کے ہر مکتبہ فکر کے افراد کے لئے قیمتی رہنمائی کا ایسا انتظام موجود ہے کہ اگر اپنے اپنے دائراتی خولوں سے بلند ہوکر ان کی فکر سے استفادہ کیا جائے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ تزکیہ کی راہ بھی ہموار ہوسکتی ہے تو فروعی اور جزوی اختلافات کے باوجود ملتِ اسلامیہ کے وسیع تر دائرے کا تقدس بھی برقرار ہوسکتا ہے، اس طرح اسلام اور مسلمانوں کی از سرِ نو نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ مولانا کی فکر میں اسلامی حکومت کے لئے کام کرنے کا جذبہ رکھنے والے افراد کے لئے بھی غور و فکر کے نکات موجود ہیں تو قرآن و حدیث کو بنیاد بنا کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے شیرازہ بندی کا فکر کرنے والے افراد کے لئے بھی فکر کا سامان موجود ہے۔ عوام کی حالت کے عدم مشاہدہ اور بزرگوں سے ان کی لامحدود عقیدت کے حقیقی تجزیہ سے قاصر زعماء کے لئے بھی مولانا کی فکر میں بہت سارے قیمتی نکات موجود ہیں، جس سے ان کے لئے بزرگوں سے استعانت،

روحوں سے استفادہ، کشف و القاء کو فیصلہ کن اہمیت دینے جیسے مسائل میں متوازن رائے قائم کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

ہمارے ایک دوست ڈاکٹر تقی الدین صاحب (جو انجینئرنگ کے ایک شعبہ میں پی ایچ ڈی ہیں، جو جرمن یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ جو باقاعدہ دینی مدرسہ کے سند یافتہ بھی ہیں اور مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب سے سلوک کے مراحل طے کرچکے ہیں) ان کا کہنا ہے کہ امت کو اس وقت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی فکر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ان کی فکر میں تہذیب نفس، ذاتی اصلاح، معاشرہ کی اصلاح، مسلمانوں کی ملی زندگی کے تحفظ و بقا اور حکومت کی اصلاح کے سارے اجزاء اپنی صحیح ترتیب کے ساتھ اس طرح موجود ہیں کہ دینی جماعتیں اگر اس فکر سے پوری طرح اخذ فیض کرکے اپنے افراد کی اصلاح اور اجتماعی تبدیلی کے لئے انہی خطوط پر کام شروع کریں تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ دینی جماعتوں اور خود معاشرہ کو وہ حقیقی بنیاد فراہم ہوسکتی ہے، جس پر عظیم الشان عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ بھی کہنا ہے کہ چونکہ مولانا کی تحریر کا اسلوب پرانہ ہے اور جدید تعلیم یافتہ افراد کی، ان کے فہم تک رسائی مشکل ہے، اس لئے ہمیں مولانا کی فکر کو جدید اسلوب اور نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ اس دور کی نئی زبان اور نئی اصطلاحوں میں پیش کرنا ہوگا۔ تاکہ نئی نسل کی مولانا کی فکر تک رسائی ہوسکے اور ملی اور عالمی سطح تک اس فکر سے استفادہ کی صورت پیدا ہوسکے۔ ڈاکٹر محمد تقی الدین صاحب کی یہ بات بہت اہم ہے۔ غالباً حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو خود بھی اپنی فکر کو جدیدیت کے حامل افراد کے سامنے ان کے اسلوب و انداز میں پہنچانے کا احساس تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا نے انتقال سے کچھ پہلے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو فرمایا تھا کہ وہ ان کی کتابوں کے اقتباسات کو اپنے انداز سے پیش فرمائیں، اس سے مولانا تھانویؒ کا مقصد یہی تھا کہ ان کی فکر کی تفصیل و تشریح کے لئے اگر جدید دور کی فاضل شخصیت کی طرف سے کاوش ہو تو اس سے ان شاء اللہ جدید دور کی نئی نسلوں تک ان کی فکر کی تفہیم کے راستے وا ہوں گے۔

ہم چونکہ دین کی صحیح تفہیم کے سلسلہ میں تقابلی و تجزیاتی مطالعہ کے ایک طویل اور دشوار گذار مرحلے سے گذرے ہیں، اس سلسلہ میں ہمیں مولانا کی فکر، جدید و قدیم دور کے بڑے بڑے فضلاء سے زیادہ اہم، متاثر کن، علم و استدلال اور نورانیت سے بھرپور نظر آئی،

اس لئے مولانا کی فکر کو عام فہم اور آسان انداز میں پیش کرنے کے لئے ہمیں فکر دامنگیر ہوئی۔ اس سلسلہ میں ہماری یہ ابتدائی کوشش ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

حصہ اول

خزینہ شریعت و معرفت

تعلیمات اشرفیہ کی روشنی میں

کتاب کا یہ ''حصہ ملفوظات حکیم الامت مقالات حکمت حصہ اول اور حصہ دوم'' سے ماخوذ ہے۔ یہ مقالات ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ ہم نے دونوں حصوں کی تلخیص کی ہے۔ زبان کو سہل بنانے کی اپنی حد تک کاوش کی ہے۔ ساتھ ساتھ ذیلی سرخیاں بھی لگائی گئی ہیں۔ (مرتب)

کاہلی کا علاج

فرمایا، ایک دوست نے لکھا ہے کہ تہجد کے وقت آنکھ کھل جاتی ہے۔ مگر کاہلی کے مارے اٹھا نہیں جاتا۔ اور دوسرا امر یہ کہ ذکر و وظیفہ سب کرتا ہوں، مگر جذب پیدا نہیں ہوتا۔ پہلی چیز کے جواب میں میں نے یہ لکھ دیا کہ اس وقت جس دم کیا کرو، کاہلی جاتی رہے گی۔ اور امر ثانی کے بارے میں یہ لکھا کہ کثرت ذکر شدت ضرب کے ساتھ مفید ہوگی۔ مگر شدت اتنی جس کا تحمل ہو سکے۔ یہ دونوں کام کی چیزیں ہیں اور مجرب بھی۔ (مقالات حکمت، حصہ اول صفحہ ۲۲)

صاحبان رتبہ کی مشکلات

فرمایا، جیسے تجلی رحمت ہے، ایسے ہی استتار بھی رحمت ہے۔ اہل حال و اصحاب تجلی بعض دفعہ اگر امور مباحہ سے بھی فائدہ اٹھائیں تو ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور تنبیہ ہوتی ہے۔ ایک عارف کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک روز روٹی کا جلا ہوا اوپر کا چھلکا کھاتے کھاتے توڑ کر الگ رکھ دیا۔ اسی پر ان کو بذریعہ الہام تنبیہ ہوئی کہ کیوں جی، اس چھلکے کے

واسطے ہمارے آسمانوں نے چکر کھائے اور زمین نے اپنے قویٰ خرچ کئے۔ پھر پس پیا کر پک پکا کر یہ آپ کے سامنے آیا اور آپ نے اس کو فضول سمجھ کر الگ پھینک دیا۔ کیا یہ سارا انتظام بیکار تھا۔ اس وقت اس عارف نے جلا ہوا چھلکا کھالیا۔ اب جلا ہوا چھلکا نہ کھانا مباح تھا، مگر اس عارف کو تنبیہ کی گئی بوجہ خصوصیت کے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین۔

ایسا ہی ایک مجذوب صاحب حال کا قول ہے کہ ہم لوگوں کو حال پر گرفت ہوتی ہے۔ تم کو قال پر۔ قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بعض اصحاب صفہ کے قصے کی یہی توجیہ کی ہے۔ یعنی ایک صاحب کے حق میں، جو آنحضرت فرماتے ہیں، جن کے ہاں سے بعد انتقال کے، ایک دینار اور ایک کے پاس دو دینار نکلے تھے۔ کہ یہ اس کے لئے جہنم کا ایک داغ ہے یا دو داغ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اصحاب صفہ کا حال و وضع درویشانہ تھا۔ سو اس صحابی نے خلاف حال کے جو جمع کیا تو اس پر عذاب ہوا۔ (مقالات حکمت، حصہ اول صفحہ ۲۷)

سلوک کے طالب کے لئے چار چیزوں کی ضرورت

فرمایا، طالب کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ دو تو بیعت سے پہلے کی ہیں اور دو بیعت کے بعد ہمیشہ تک کی۔ پہلی دو چیزیں اعتقاد و اعتماد ہیں۔ اگر شیخ پر اعتماد نہ ہوگا تو فائدہ نہ ہوگا۔ اعتقاد یہ ہونا چاہئے کہ شیخ کی تعلیم و تربیت میرے لئے سب سے زیادہ نافع ہے۔ شیخ کو دوسروں سے کامل سمجھنے کی معنی یہی ہیں۔ دوسرے اعتماد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر اعتماد نہ ہوگا تو اس کی تعلیم و مشورے کے بارے میں خلجان موجود رہے گا۔ دو چیزیں جن کی ضرورت بیعت کے بعد ہے، وہ اطلاع اور اتباع ہے۔ اطلاع کے بغیر شیخ کے لئے طالب کے لئے کوئی تجویز یا ترمیم کرنا مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ ہر شیخ کا صاحب کشف ہونا اور صاحب کشف کے لئے ہر وقت کشف کا ہونا ضروری نہیں۔ پھر اطلاع کے بعد اتباع ہے، جو چیز شیخ نے بتائی ہے، اسے کرتے رہنا چاہئے، اس میں اپنی رائے سے کمی بیشی نہ کی جائے، شیخ کے اتباع میں دشواری یا مشقت یا ضرر دیکھے تو اس کی بھی شیخ کو اطلاع کی جائے۔ شیخ کوئی مناسب تجویز کردے گا۔ (مقالات حکمت صفحہ ۲۸)

سورہ واقعہ کا فراخیٔ رزق کا ذریعہ ہونا:

فرمایا: حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ کے ہاں حزب البحر کا عمل معمول تھا۔ حالانکہ حضرت عملیات وغیرہ سے بہت مجتنب تھے۔ اس کی وجہ خود فرماتے تھے کہ اس عمل میں فراخیٔ رزق اور دشمنوں کے شر سے بچاؤ کی خاصیت ہے اور یہی دو چیزیں تنگیٔ رزق اور مخالفوں کے غلبہ، قلب کو پریشان کرکے، دل کو توجہ الی اللہ سے باز رکھتی ہیں۔ اس نیت سے اس کا عمل دین کے لئے معاون ہے اور اسی طرح سورۂ واقعہ کا پڑھنا، جو حدیث میں فراخی رزق کے لئے آیا ہے، وہ بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے۔ (مقالات حکمت صفحہ ۳۰)۔

توسل کی حقیقت

توسل کے معنی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ایک محبوب چیز سے اپنا تعلق ظاہر ہو اور یہ عرض کرنا، جیسا کہ حدیث شریف میں توسل بالاعمال کے متعلق ان تینوں، شخصوں کا قصہ ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے خالص عمل کے ذریعے سے توسل کیا تھا۔ اس طرح غار کے منہ سے پتھر ہٹ گیا تھا۔ اس کے معنی یہ تھی کہ یا اللہ! یہ اعمال آپ کے نزدیک محبوب ہیں اور ہم سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں، اس لئے رحم فرما۔ اس طرح دعا میں بزرگانِ دین کے ذریعے سے توسل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یا اللہ! یہ تیرے محبوب بندے ہیں اور ہمیں ان سے محبت و عقیدت ہے، جو تجھے پسند ہے، اس لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم پر رحم فرمایئے۔ (صفحہ ۳۲)۔

ہر چیز اپنی ایک حد تک محمود ہے:

فرمایا، جو افراد خالص توبہ کرکے ذکر و شغل میں مشغول ہوں تو انہیں گناہوں کو بار بار یاد کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ توبہ تو ہو چکی ہے، جس کی قبولیت کی امید غالب ہے۔ اب گناہوں کو زیادہ یاد کرنے سے ذکر میں ایک قسم کا حجاب ہوجاتا ہے اور ذکر میں نشاط باقی نہیں رہتی، اگرچہ گناہ کا یاد کرنا فی نفسہ اچھی بات ہے۔ مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ حد سے آگے اچھی سے اچھی چیز بھی اچھی نہیں رہتی۔ دیکھئے طبیب اگر کسی بیمار کے نسخے میں چھ ماشے سناء لکھے اور وہ مریض یہ خیال کرکے کہ یہ چیز مفید ہے، جب طبیب نے لکھی ہے

تو جتنی بڑھائی جائے گی، فائدہ ہوگا، تولہ بھریا اس سے زیادہ ڈال لے تو ظاہر بات ہے کہ سناء فائدے کی چیز تھی اور طبیب نے مفید سمجھ کر لکھی تھی۔ مگر خاص ہی مقدار تک مفید ہے اور اس سے زائد مریض کے لئے سخت مضر ہوگی۔ یہی حال اعمال باطنی کا ہے۔ نصوص میں تدبر کرنے سے اس کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر حضرت شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ارشاد ہے کہ توبہ کی قبولیت علامت گناہ کو بھول جانا ہے۔ یعنی اس خیال کا غالب نہ رہنا ہے۔ اور دیکھا گیا ہے کہ جن دوستوں میں کبھی مخالفت رہ چکی ہو، اگر حالتِ دوستی میں اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس سے ایک دوسرے کے دل پر میل آ جاتا ہے اور عورتوں میں یہ عادت زیادہ ہے کہ اتفاق و محبت کی حالت میں دشمنی کے زمانہ کے تذکروں کو لے بیٹھتی ہیں، جس سے محبت مکدر ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۳۶)

دل کا رونا

ایک بار کسی شخص نے لکھا کہ میں حج سے پہلے روتا تھا، اب رونا نہیں آتا۔ اس لئے یہ غم رہتا ہے کہ کہیں حالت پہلے سے خراب نہ ہوگئی ہو۔ ارشاد فرمایا کہ میں نے یہ جواب لکھا ہے کہ ایک رونا ہے، آنکھ کا۔ سو وہ اختیار میں نہیں اور غیر اختیاری چیز کا نہ ہونا تشویش کی بات نہیں۔ اور ایک رونا ہے دل کا، سو وہ آپ کو حاصل ہے۔ چنانچہ مغموم رہنا، اس کی علامت ہے۔ پس فکر کی کوئی بات نہیں۔ (صفحہ ۳۹)۔

نوافل سے زیادہ اہم چیز

فرمایا: نفس پر اعمال واشغال ونوافل کی کثرت تو آسان ہے، کیونکہ یہ مشاہدہ کی چیز ہے اور دوسرے بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس لئے اس میں نفس کو حظ بھی ہوتا ہے اور اس میں عجب یا ریاء کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ لیکن جو اعمال باطن سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً: نگاہوں کی حفاظت کرنا غیبت نہ کرنا وغیرہ۔ تو یہ چیزیں نفس پر بہت گراں ہیں۔ کیونکہ اس میں لذت نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں ریاء یا طلب جاہ نہیں۔ کیونکہ یہ مشاہدے کی چیز نہیں۔ اور کوئی اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتا، اس لئے ان چیزوں میں نفس کو ریاء یا طلب جاہ وغیرہ کا موقعہ نہیں ملتا۔ حالانکہ احادیث میں ان چیزوں کی تاکید زیادہ آئی ہے اور اس کو ورع کہتے ہیں۔ (صفحہ ۴۰)

رگڑتے رہنے سے محبت کا پیدا ہوجانا

فرمایا: پیلی بھیت میں ایک بزرگ تھے۔ میں نے ان سے ایک دفعہ عرض کیا کہ کوئی ایسی بات بتلائیے، جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ تم اپنے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑو۔ میں نے ان کے ارشاد کے موافق اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑا۔ فرمایا، کیوں، کچھ گرمی پیدا ہوئی۔ میں نے عرض کیا، جی ہاں۔ فرمانے لگے، بس اسی طرح رگڑتے رہنے سے محبت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ (صفحہ ۴۰)۔

استقامت کا کرامت سے افضل ہونا:

ایک شخص نے آ کر بیعت کی درخواست کی، دریافت فرمایا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ اس نے بیان کیا کہ میں ایک بارات میں آیا تھا، وہاں سے بہ ارادہ بیعت یہاں آیا ہوں۔ فرمایا کہ یہ کام ایسا نہیں، جو دوسرے کام کے ساتھ ہو۔ یہ تو دلیل بے رغبتی کی ہے۔ اس لئے اب میں بیعت نہ کروں گا۔ گھر سے خاص کر کے اس مقصد کے لئے آنا چاہئے۔ اس وقت گفتگو ہوگی۔ ارشاد فرمایا کہ ایک شخص حضرت جنیدؒ کی خدمت میں بارادۂ بیعت حاضر ہوا اور دس برس ان کی خدمت میں رہا۔ دس برس کے بعد عرض کیا کہ حضرت! میں تو آپ کو بزرگ سمجھ کر حاضر ہوا تھا، مگر میں نے یہاں بزرگی کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ فرمایا، بزرگی کی وہ بات کیا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ کشف و کرامت۔ فرمایا کہ اس دس برس کی مدت میں تو نے مجھ سے کوئی بات خلاف شریعت وخلاف سنت ہوتے دیکھی ہے۔ اس نے عرض کیا کہ خلاف شریعت تو کوئی بات نہیں دیکھی۔ فرمایا کیا یہ تھوڑی کرامت ہے کہ دس برس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔ (صفحہ ۴۱)

سلوک کا پہلا قدم طلب صادق کا ہونا

فرمایا: فرد میں جب تک اس قدر اشتیاق پیدا نہ ہو، جیسے پیاسے کو پانی کا اشتیاق ہوتا ہے، اس وقت تک اسے مرید نہ ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۴۲)

ہر جمائی شیطان کی طرف سے نہیں:

ایک شخص نے عرض کیا کہ نماز میں جمائی آتی ہے۔ فرمایا، حدیث شریف میں التثاؤب من الشیطان آیا ہے۔ لیکن اگر نماز میں ذوق شوق ہو اور اس حالت میں جمائی آئی

تو اسے شیطان کی طرف سے نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ وہ اسباب طبیعہ سے ہے اور التثاوب من الشیطان قضیہ مہملہ ہے، قوت میں جزئیہ کے ہے اور کل تثاوب من الشیطان نہیں فرمایا۔ (صفحہ ۴۵)

جذب ومحبت کے بغیر حالتِ خطرہ کا ہونا

فرمایا: شیطان جو مردود ہوا تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ سالک محض تھا۔ اس میں جذب ومحبت کا مادہ بالکل نہ تھا، اور اگر اس میں عشق ومحبت کا مادہ موجود ہوتا تو وہ اس طرح بے ادبی سے اعتراض نہ کرتا۔ سالک (عشق سے خالی فرد) کی حالت خطرہ میں رہتی ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ جذب کا مادہ بھی پیدا کریں۔ جس کا طریقہ کثرت ذکر و صحبت اہل اللہ ہے۔ (صفحہ ۴۵)۔

کشف وکرامت سے ڈرتے رہنا

فرمایا: کشف وکرامت کمال کی چیز نہیں۔ اگر اس میں کمال ہوتا تو دجال کو ایسے خوارق کیوں دیئے جاتے کہ جب چاہا پانی برسادیا۔ شیطان انسان کے رگ وپے اور خون کے اندر پھرتا رہتا ہے۔ باوجود اتنے بڑے تصرف کے، وہ مردود ہی رہا۔ بزرگوں سے جو کرامات صادر ہوتی ہیں، اس میں لوگوں کی اصلاح کی حکمت اور ان سے وابستہ افراد کے قلب کا استحکام مقصود ہوتا ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ کفار نے معجزہ طلب کیا اور حضور پرنور ﷺ نے، اللہ تعالیٰ سے معجزے کی درخواست کی۔ مگر وہاں سے حکم ہوا وما منعنا ان نرسل بالایات الا ان کذب بھا الاولون۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کی درخواست نامنظور ہوئی، جو بظاہر شانِ محبوبیت کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں تو محبوب تر اور بڑا کمال عبدیت ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ جس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود بندگی ہے، بلکہ بعض اولیائے کرام، کرامت کے صادر ہونے سے رویا کرتے تھے اور انہیں یہ خوف دامنگیر ہوتا تھا کہ کہیں عجب پیدا نہ ہوجائے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے پاس جنت سے شربت آیا۔ رونے لگے، پوچھا گیا کہ اس نعمت سے خوش ہونا چاہئے، نہ کہ رونا۔ فرمایا کہ ڈرتا ہوں کہیں یہ استدراج اور عتاب نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ معلم کے پاس دو لڑکے ہوں۔ معلم صاحب ایک کو سزا دیں، دوسرے کو چھوڑ دیں۔ یہ سوچ کر کہ کل سبق یاد کرکے نہ لایا تو خوب سزا دوں گا۔ لڑکا تو خوش ہوا کہ میں بچ گیا۔ مگر نہیں معلوم، معلم صاحب کے جی میں کیا ہے۔ طالب صادق کو چاہئے کہ فرمانبردار رہے۔ کشف وکرامت کا طالب نہ ہو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مقصود حقیقی تک پہنچے گا (صفحہ ۴۶)۔

شریعت کی اہمیت - شریعت سے بے نیاز صوفیاء پر تنقید:

فرمایا، کیسا زمانہ آگیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں شریعت کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ آج کل کے صوفیوں کی حالت یہ ہے کہ کلکتہ، عظیم آباد کی خبریں بتاتے ہیں۔ ایک نظر اٹھا کر کسی کو بیہوش کردیا۔ رنگا ہوا کپڑا پہن لیا۔ شریعت جس کا چھوٹا سا چھوٹا قانون دستور العمل بنانے کے قابل ہے۔ راستہ ایسا صاف ہے کہ نہ کہیں گھاٹیاں ہیں نہ خطرات۔ لیکن ان مدعیوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ایسے لوگ خدا رسیدہ اور مقرب بارگاہ مانے جاتے ہیں۔ وہ اہل شریعت کو گالیاں دیتے ہیں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بغیر شریعت تقرب حاصل کرنا چاہے تو ہرگز حاصل نہیں کرسکتا۔ امت محمدیہ کا ادنیٰ شخص جو ان پڑھ ہے، وہ ثواب اور اجر وعطاء میں ایک بڑے کامل عارف کے برابر ہے۔ اگرچہ فرق اس قدر ہے کہ وہ عارف ہے، یہ محض مقلد ہے۔ مگر جو عمل کے برکات ہیں، وہ غیر عارف کو بھی میسر ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ پلاؤ دو شخصوں کے سامنے موجود ہے۔ ایک شخص تو پلاؤ کے اجزاء و ماہیت سے واقف ہے، دوسرا واقف نہیں۔ مگر پلاؤ کے استعمال سے جو قوت جاننے والے کو حاصل ہے، وہی اس کو بھی حاصل ہے۔ حضور پرنور ﷺ نے ایسا سہل الاصول طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ کوئی شخص اس کے برتنے سے محروم نہ رہے۔ عارف ہو یا عامی۔ آجکل کے عارف کو اگر واردات، قلب پر ہونے لگے تو بس اپنے کو مقرب بارگاہ سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ واردات وکشف وغیرہ میں کبھی ابتلاء بھی ہوتا ہے۔ شیخ اکبرؒ نے لکھا ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: علم بلاواسطہ، اور علم بواسطہ۔ علم بلاواسطہ میں رحمت بھی ہے اور ابتلاء بھی۔ اور بواسطہ میں محض رحمت ہے۔ بواسطہ جیسے کہ بواسطہ انبیاء علیہم السلام۔ اور بلاواسطہ جس طرح کشف اور واردات۔ ارشاد فرماتے ہیں: وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ آپ تو رحمت محض ہیں۔ آپ کے واسطے سے جو ملے گا، رحمت ہی ہوگا۔ اب ابتلا کا کیا شبہ ہوا۔ نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ آپ کے قرب کے سوا دوسرے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ (صفحہ ۴۷)

قلب کا نظر آجانا، کوئی کمال نہیں:

ایک بار ایک شخص میرے پاس آئے۔ فرمانے لگے، مجھے اپنا قلب نظر آنے لگا ہے۔ مدت کی ریاضت سے یہ چیز حاصل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ! یہ کیا کمال ہوا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کی نظر دیوار تک پہنچتی ہے۔ دوسرے شخص کو دیوار کی پشت پر موجود الماری نظر آنے لگی ہے۔ یا مثلاً ڈاکٹر آلات کے ذریعے سے جگر وغیرہ دیکھ لیتا ہے۔ ایک شخص ہے کہ اپنی نظر کے زور سے لحم وشحم غشاء کو توڑ کر اندر کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ تو صاحب آلات بھی کر لیتا ہے۔ پھر کیا کمال ہوا، وہ صاحب اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے۔ پھر میں نے سمجھایا کہ دیکھئے، چار مرتبے ہیں: مرتبہ لاہوت، مرتبہ جبروت، مرتبہ ملکوت، مرتبہ ناسوت۔

مرتبہ لاہوت و مرتبہ جبروت بھی غیر مخلوق ہے۔ غیر مخلوق صفات اجمالیہ تفصیلہ اس کا جس قدر انکشاف ہے، وہ بیشک مقصود ہے۔ باقی دو مرتبے جو مخلوق ہیں، وہ حجاب ہیں۔ مرتبہ ملکوتی حجاب نورانی ہے۔ اور مرتبہ ناسوتی حجاب ظلمانی۔ تو حجاب ظلمانی سے حجاب نورانی تک پہنچ گئے۔ یہ کیا کمال ہوا۔ ایک مخلوق سے گزر کر دوسری مخلوق تک پہنچے۔ اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مرتبہ ناسوتی چونکہ حقیر ہے، اس وجہ سے چنداں حاجب نہیں۔ برخلاف مرتبہ ملکوتی کے وہ زیادہ حاجب ہے۔ (صفحہ ۴۸)

طلب سے خالی ہونا اور محض رضا کا طالب ہونا

فرمایا: سالک راہ محبت کو کسی چیز کی ہوس نہ ہونی چاہئے۔ کوئی ذوق شوق کا متمنی ہے، کوئی رقت قلب کی خواہش کرتا ہے۔ کسی کو کشف و کرامت کی تمنا ہے، کوئی جنت کو مقصود سمجھ کر اس کا طالب ہے۔ حالانکہ کسی بھی چیز کی طلب و ہوس نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ عبد کے معنی ہیں، مالک کے سامنے سر جھکا دینے کے اور جو حکم ہوا، اس پر بہ سروچشم قبول کر کے عمل کر لینے کے۔ پھر عبد ہو کر کسی چیز کی ہوس کرنا کہ مجھے یہ ملے وہ ملے۔ یہ ہوس حقیقت میں فرمائش ہے، مالک پر، اور یہ کیونکر جائز ہوگی۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ حدیث شریف میں آیا ہے: اللھم انی اسئلک رضاک والجنۃ یہاں پر جنت کا سوال کیا گیا ہے، جواب یہ ہے کہ اس سوال کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی سوال کرے کہ فلاں صاحب سے کہاں ملاقات ہوگی؟ جواب ملے کہ باغ میں! اس پر وہ شخص باغ میں جانے کا

آرزومند ہے، تو حقیقت میں وہ باغ مقصود بالذات نہ ہوگا۔ بلکہ مقصود وہ صاحب ہیں۔ مگر چونکہ وہ باغ میں ملیں گے، اس لئے اس کی تمنا ہوتی ہے۔ جو اس مقام پر رہتے ہیں۔ اسی طرح حدیث شریف میں مقصود رضا ہے، جس کو جنت پر مقدم فرمایا ہے، مگر چونکہ اس کا حصول جنت میں ہوگا، لہٰذا جنت کا بھی سوال کیا گیا۔ حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ورضوان من اللہ اکبر یہاں پر رضاء کو جنت سے اکبر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑی چیز یہی ہے۔ پھر یہ نکتہ بیان کیا کہ اس اکبر کی تحصیل کے لئے ذریعہ بھی اکبر ہونا چاہئے۔ سو فرماتے ہیں: ولذکر اللہ اکبر۔ معلوم ہوا کہ وہ ذریعہ ذکر اللہ ہے۔ تمام احکام پر عمل کرنے سے ذکر اللہ ہی مقصود ہے۔ (صفحہ ۴۹)

قبول دعا کی تین صورتیں

فرمایا: دعا کی قبولیت کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بعینہ وہ مطلوب شے مل جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی آنے والی بلا ٹل جائے۔ مگر چونکہ انسان کو خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہوا۔ کون سی بلا ٹل گئی۔ اس لئے فرد کو بہت سے اوہام اور شکوک گھیر لیتے ہیں اور عدم قبولیت کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ وعدہ ہے: اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ دعا مانگتے وقت قبولیت کا یقین رکھو۔ جب شک اور شبہ کی ممانعت ہے تو پھر دعا مقبول کیونکر نہ ہوگی۔ البتہ بعض اوقات قبولیت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ فرد آزمائش سے محفوظ ہوگیا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شے مطلوب ذخیرہ رکھ دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی نادان لڑکا روپیہ مانگے تو بعض اوقات اس کے نام سے پیسے کسی تجارت کی کوٹھی میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ اور نادانی کی وجہ سے خود اس کو نہیں دیتے کہ جب ہوشیار ہوگا، لے کر حسب مصلحت خرچ کرلے گا۔ اور اب لیکر بجز اس کے کہ ضائع کرے اور کیا کرے گا۔ حق تعالیٰ بھی اپنے بندے کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں کہ اس مسئول سے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ فرما دیتے ہیں۔ (صفحہ ۵۰)

وسیلہ اور شرک میں فرق

فرمایا: ایک اہم مثال سے شرک جس کی نسبت وعید ہے: ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ، اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کو مستحق عبادت سمجھنا۔ اور عبادت کہتے ہیں کسی کے سامنے نہایت تفرع و تذلیل سے پیش آنے کو۔ چونکہ حق تعالیٰ قادر مطلق و خالق اور

رازق ہیں، ان کو غیرت آتی ہے کہ ان کے سوا کسی دوسرے کے سامنے انتہائی تذلل سے پیش آیا جائے۔ مثلاً دو شخص ہیں۔ ایک ان میں بڑے مرتبے کا حامل ہے اور اس بڑے مرتبے والے نے کسی سائل کو کچھ دیا اور سائل بجائے اپنے دینے والے کے، دوسرے کی، ایسی ہی تعریف وتوصیف کرنے لگے، جو اس کے لئے کرنی چاہئے تھی، تو طبعی بات ہے کہ عطا کرنے والا کس قدر غضبناک ہوگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے، جو لوگ مزارات پر اولیاء اللہ سے سوال کرتے ہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ آیا محض وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں، یا معاملہ اس سے بڑھ کر ہے۔ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الٰہی سمجھ کر کرتے تھے۔ چنانچہ مذکور ہے: ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ نہ خدا سمجھ کر۔ مگر پھر بھی وہ مشرک قرار دیئے گئے۔ سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلے میں بھی دو صورتیں ہیں۔ مثال سے فرق معلوم ہوگا۔ مثلاً ایک کلکٹر ہے، اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک عاقل ہے۔ کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب وکتاب اس منشی کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک دوسرا کلکٹر ہے، اس کے پاس بھی منشی ہے، مگر یہ کلکٹر زبردست عادل ہے، اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے۔ منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا، اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے، جس کے سپرد کام ہے، کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر پیش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں دخیل سمجھ کر پیش کرے گا۔ اور اسی واسطے اس کی خوشامد کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں۔ کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے۔ گو ضابطہ کے دستخط وہی کرے گا۔ مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا۔ اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائے گی تو محض اس خیال سے کہ کلکٹر زبردست ہے۔ رعب والا ہے، اس کے سامنے کون جا سکتا ہے، اس منشی کے ذریعہ سے درخواست کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس منشی کو تقرب حاصل ہے۔ یہ وہاں پر پیش کر دے گا۔ کیونکہ کل کام خود کلکٹر دیکھتا ہے، اب دیکھئے، ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے۔ عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کے افعال اور اعمال سے یہ ظاہر ہے۔ پھر یہ شرک نہیں تو کیا ہے؟ برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے۔ پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گی گو بہ نیت توسل ہی سہی، وہ شرک ہوگا۔ غرض وسیلہ جائز، مگر تعبد التوسل شرک ہے۔ (صفحہ ۵۱)

شیطان کے خوش نما فریب

فرمایا: شیطان ایسا شریر ہے، کہ بعض اعمال کو اچھے پیرایہ میں دکھا کر اس کام میں مشغول کر دیتا ہے کہ ظاہر میں نہایت خوب معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں کچھ ابتلاء ہوتی ہے اور پھر شیطان کی طرف سے اس میں ہیجان کا اثر ہوتا ہے، جس سے اس کی پسندیدگی و مقبولیت کا شبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً سماع ہے کہ اس میں بعض افراد کو رقت طاری ہوتی ہے اور وجد ہوتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ طالب، حق میں سرگرداں ہے اور یہ شخص بھی سمجھتا ہے کہ محبت حق میں مستغرق ہوں، مگر یہ ہر حالت من جانب اللہ نہیں ہوتی۔ بے علم انسان کے قلب میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ خدا کی یہ صورت ہے، یہ شکل یہ ہیئت، ایسا جمیل ہے اور وہ اسی کو خدا تصور کرنے لگتا ہے، بعض اس کو عقیدہ بنا لیتے ہیں، جب عقیدہ ہو گیا تو جب سماع میں محبوب کے اوصاف پڑھے گئے تو اس صورت کو پیش نظر رکھ کر اس کی طلب میں بے قراری پیدا ہوئی، وجد ہوا، رقت طاری ہوئی اور جو کچھ ہوا، وہ غلط عقیدے کی وجہ سے ہوا اور شیطان کے دھوکے سے ہوا۔ شیطان کبھی ایسا کرتا ہے کہ ایک آسمان سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے، جس میں فرشتے نظر آتے معلوم ہوتے ہیں۔ جو نادان ہیں، اس کو واقعی تصور کر لیتے ہیں۔ مگر عارفین فی الفور سمجھ جاتے ہیں کہ وہ نہ آسمان ہے، نہ فرشتے، محض خیالات یا ابلیس کا لشکر ہے۔ ایسے وقت میں بغیر شیخ کامل کے کام نہیں چلتا۔ آدمی نہایت دھوکہ میں پڑ جاتا ہے۔ (صفحہ ۵۳)

مجذوب کا معذور ہونا

فرمایا: محبت میں کبھی شورش ہوتی ہے اور کبھی انس۔ اس کے رنگ مختلف ہیں۔ جب انس حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو انبساط بڑھ جاتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ، اور شطحیانہ کلام سرزد ہونے لگتے ہیں۔ (صفحہ ۵۴)

نسبت حقیقی

فرمایا: نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ ایک خاص لو لگ جائے اور یہ بات سینہ بہ سینہ آ رہی ہے اور بغیر صحبت کامل یہ نعمت میسر نہیں ہوتی، اور جو چیز سینہ بہ سینہ مشہور ہے کہ اہل اللہ کے پاس ہے، وہ یہی ہے۔ (صفحہ ۵۵)

امام غزالیؒ کا، دس برس تک حالت قبض میں رہنا

فرمایا: سلوک کی تکمیل کے بعد کسی کو مقام رجاء مل جاتا ہے۔ کسی کو خوف، کسی کو کچھ اور نیز قلب میں نسبت کا رسوخ ہو جاتا ہے۔ یہ مقامات ہیں اور احوال دورانِ تکمیل میں پیش آتے ہیں۔ کوئی حال ایسا ہوتا ہے کہ اس سے بعض کا انتقال ہو گیا۔ امام غزالیؒ کو بھی دس برس تک قبض رہا، اس کے بعد ان پر بے شمار علوم کا فیضان ہوا۔ (صفحہ ۵۶)

ترک اتباع سنت سے نور باطن کے ضیاع کا خطرہ

فرمایا: اہل باطن کا عجیب حال ہوتا ہے، ایک بزرگ نے اپنا بایاں پیر مسجد کے اندر سہوا رکھ دیا۔ گھبرا گئے۔ کسی نے دریافت کیا کہ حضرت اس قدر پریشان کیوں ہوئے؟ فرمایا، مجھے خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ترک اتباع سنت سے نور باطن جو کچھ عنایت ہوا ہے، وہ سلب نہ ہو جائے۔ موجودہ دور میں اباحت کا ایسا دروازہ کھلا ہے کہ ان امور کا تو کیا، فرائض و محرمات تک کا بھی کچھ خیال نہیں ہے۔ (صفحہ ۵۷)

مولود شریف اور مقتدا کے لئے اس میں شرکت کا مسئلہ

فرمایا: مولانا فتح محمد صاحبؒ بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب فیوضہم مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور ہمارے حضرت حاجی صاحب قبلہ مولود شریف کے جلسے میں بلائے گئے۔ حضرت مرشد قبلہ نے جناب مولانا رشید احمد صاحب سے فرمایا کہ آپ بھی چل رہے ہیں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ چلتا تو ضرور، کیونکہ اس مولود شریف میں مفاسد نہیں۔ نہایت احتیاط کے ساتھ ہے۔ مگر میں ہندوستان میں وہاں کے مفاسد کی وجہ سے لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔ اب میرا جانا سند ہوگا۔ جس پر حضرت مرشد قبلہ حاجی صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ میں تمہارے جانے سے اتنا خوش نہ ہوتا جس قدر نہ جانے سے خوش ہوں۔ (صفحہ ۶۰)

نماز میں خیالات کا مسئلہ:

فرمایا، خیالات اگر عبادت کے اندر آئیں تو فکر نہ کرنی چاہئے اور ان کی رفع کی زیادہ کوشش نہ کرنا چاہئے۔ ورنہ مزید خیالات آئیں گے۔ البتہ خیالات کا خود لانا برا ہے، جب کہ آنا کچھ بھی برا نہیں۔ قلب کی مثال دریا جیسی ہے، اس میں بے شمار موجیں ہر وقت

اٹھتی رہتی ہیں۔ اس لئے اگر خیالات آئیں تو آنے دو، بلکہ بعض اوقات اس میں یہ فائدہ ہے کہ اگر وہ نہ آئیں تو شیطان کو موقع ملتا ہے کہ قلب میں زیادہ بے ہودہ اور برے خیالات پیدا کرتا ہے۔ ع "ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ"۔ (صفحہ ۶۰)

وسعت رزق کے لئے وظیفہ

فرمایا: حزب البحر اطمینان رزق اور دشمنوں پر غلبہ کے لئے مجرب ہے اور یا مغنی کا ورد گیارہ سو مرتبہ بعد نماز عشاء اور آخر درود شریف گیارہ بار وسعت رزق کے لئے بہت مفید ہے۔ (صفحہ ۶۲)۔

حالت استغراق کا کمال نہ ہونا

فرمایا: استغراق کی جو حالت متوسطین کو پیش آتی ہے، وہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے، جیسا کہ عام لوگ سمجھ رہے ہیں۔ اگر استغراق کی حالت بڑا مرتبہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ یہ ارشاد نہ فرماتے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز کو طول دوں، مگر نماز میں کسی بچہ کی آواز سن کر کمی کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت آپ کو استغراق نہ ہوتا تھا، البتہ استغراق محمود ضرور ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہمارے مرشد حضرت حاجی صاحب کے ایک خادم اور خلیفہ خاص نے جو کہ ماشاء اللہ صاحب کشف بھی ہیں، یہ خیال کر کے کامل صلوٰۃ دو رکعت پڑھی تمام شرائط و آداب کے ساتھ، پھر شوق ہوا اس کی حقیقت دریافت کرنے کا۔ پس اس کی طرف متوجہ ہوئے کہ منکشف ہو جائے تو کیا دیکھا کہ ایک حسین عورت زیور سے آراستہ سامنے آئی، مگر اندھی ہے۔ ان صاحب کو تعجب ہوا کہ شرائط و آداب میں تو کوئی کمی نہیں ہوئی۔ پھر آنکھیں کور کیوں دیکھیں۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تو انہوں نے اپنے نور باطن سے دریافت کر کے فرمایا کہ غالباً تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہوگی۔ سو چونکہ ہمارے حضور پر نور ﷺ آنکھیں بند کر کے نماز نہ پڑھتے تھے، بلکہ آنکھیں کھلی ہوتی تھیں، یہ خلاف سنت عمل ہوا۔ اس وجہ سے یہ نقصان نظر آیا۔ (صفحہ ۶۳)

فناء نفس کے بعد مجازی حسن میں رغبت باقی رہتی:

فرمایا: شعراء کی اصطلاح میں شاہد معشوق کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ اصطلاح صوفیہ

کی ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی گواہ کے ہیں۔ مجاہدات کے بعد فنافی النفس کا امتحان یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اگر سامنے کوئی حسین معشوق آجائے اور اس کی وجہ سے قلبی حالت میں تغیر پیدا نہ ہو تو وہ معشوق گویا گواہ اور شاہد ہوگا، فناء نفس کا۔ اس لئے اسے شاہد کہتے ہیں (صفحہ ۶۳)

چاروں سلسلوں کے پیش نظر مقصود

فرمایا: ذکر دائم مقصود ہے، جس کو جو کچھ ملا، وہ ذکر اللہ واتباع سنت سے ہی ملا ہے۔ ذکر کی تحقیقاتِ جستجو ضروری نہیں۔ شیخ کی رائے سے اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ نسبت مع اللہ، ذکر اللہ سے ہی حاصل ہوتی ہے اور یہی مقصود ہے۔ ان مجاہدات کی حیثیت نفس کے علاج کی سی ہے۔ پس چاروں سلسلوں کا حاصل ایک ہی ہوا اور ہمارے مرشد حضرت حضرت حاجی صاحبؒ قبلہ چاروں خاندانوں میں اس وجہ سے بیعت فرمالیتے تھے کہ پھر کسی سلسلہ پر اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جیسا کہ استخوان فروشوں نے طریقہ اختیار کیا ہے اور حضرت میں جامعیت کی شان تھی۔ (صفحہ ۶۶)

اختلافی مسائل میں صحیح موقف

فرمایا: اختلافی مسائل میں ایک جانب کو یقینی حق سمجھنا اور دوسری جانب کو یقیناً باطل نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ بعض اوقات موت کے وقت حقیقت کا انکشاف ہوجاتا ہے۔ اس وقت فرض کیجیے، جسے باطل سمجھتا تھا، وہ اگر صحیح ظاہر ہوا تو ایسے وقت میں شیطان کو بہکانے کا موقعہ ملتا ہے کہ شاید تمہارے سارے یقینیات کا یہی حال ہو۔ حتیٰ کہ توحید و رسالت میں بھی شبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ پس ایسی حالت میں ایمان کے برباد ہونے کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۶۷)۔

حالات کا طالب خدا کا طالب نہیں

فرمایا: تجلی ذاتی منتہائے احوال میں سے ہے۔ مقاصد و مقامات میں سے نہیں ہے۔ اصل مقصود رضاء حق ہے۔ ذکر، اللہ کی رضا کے لئے ہونا چاہیئے اور زیادہ کیفیات کے درپے نہ ہونا چاہیئے۔ فاذکرونی اذکرکم۔ ارشاد ہے۔ پس ذکر پر ثمرہ مقصود یہی ہے کہ وہ ہمارا ذکر کریں، رحمت و رضا سے۔ حالات و کیفیات کے درپے ہونا، طلب حقیقی

کے خلاف ہے۔ کیونکہ حالات کا طالب خدا کا طالب کہاں ہے۔ پس ذکر دائم یعنی یادداشت ہی مقصود ہے۔ (صفحہ ۶۸)

اولیاء اللہ کو دور سے پکارنا جائز نہیں

فرمایا: اولیاء اللہ کو دور سے پکارنا جائز نہیں۔ البتہ صاحب کشف ارواح کو اگر کسی ولی کی روح کا قرب ظاہر ہوجائے اور اس حالت میں وہ اس سے استمداد چاہے اور حق تعالیٰ اس روح کو خبر کردیں تو ممکن ہے، مگر یہ امر دائمی نہیں۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے، اب لوگ اسے دائمی سمجھیں گے۔ یہ غلط ہے۔ بعض تو شیخ کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ مسجدوں میں بیٹھ کر کس قدر غلو ہو رہا ہے، خدا کی پناہ!۔ (صفحہ ۶۹)۔

اپنے وقت کو ضروری امور میں صرف کرنا:

فرمایا، حقائق کا انکشاف موت کے بعد از خود ہوجائیگا۔ حتیٰ کہ کفار کو بھی چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وبدالھم من اللہ مالم یکونوا یحسبون. تو جو چیز از خود منکشف ہونے والی ہے، اس کی تحقیق و انکشاف کی فکر میں پڑنا کس قدر غلط ہے، اس دنیا میں تو وہ کام کرنا چاہیئے، جو موت کے بعد نہ ہوسکے۔ وہ عمل اور تصدیق اختیاری و ایمان بالغیب ہے۔ لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر غیر ضروری کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ رحم فرمائے۔ (صفحہ ۷۰)

تصوف اور تقلید کی بہتر تفہیم:

فرمایا، قنوج میں ایک سب رجسٹرار ملے۔ ان کو تقلید شخصی اور طریق تصوف کے متعلق اس قسم کا تردد تھا کہ کسی تقریر و تحریر سے ان کا اطمینان نہ ہوا۔ انہوں نے وہ شبہات میرے سامنے پیش کئے۔ میں نے انہیں جواب دیا، جس سے بفضلہ تعالیٰ ان کی بالکل تسلی ہوگئی۔ طریق تصوف کے متعلق انہیں غلط فہمی لاحق تھی کہ وہ اشغال اور قیود کو تصوف سمجھے ہوئے تھے، انہیں تصوف کی حقیقت بتا کر یہ سمجھایا کہ یہ قیود اضافی چیزیں ہیں کہ انہیں مصلحتاً علاج کے طور پر برتا جاتا ہے، اس سمجھانے سے انہیں تسلی ہوگئی اور تقلید کے بارے میں اس وقت ان سے تقلید کے وجوب اور عدم وجوب پر بحث نہیں کی گئی، انہیں صرف تقلید کی ایک مصلحت بتائی گئی، جس سے انہیں اس امر میں بھی اطمینان حاصل ہوگیا، وہ مصلحت یہ تھی

کہ پہلے زمانہ میں جبکہ تقلید شخصی شائع نہ تھی، خواہشات نفس کا غلبہ نہ تھا، اس لئے ان لوگوں کے لئے عدم تقلید مضر نہ تھی، بلکہ نافع تھی کہ عمل لاحوط کرتے تھے۔ اس کے بعد چونکہ ہم لوگوں میں خواہشات نفس کا غلبہ ہوگیا، طبیعت، احکام میں اغراض تلاش کرنے لگی۔ اس لئے عدم تقلید میں اتباع نفس کا پوری طرح خطرہ موجود ہے، جو شریعت میں سخت مذموم ہے، سو تقلید مذہب خواہشات نفس کے مرض کا مؤثر علاج ہے۔ (صفحہ ۸۰)

حاکم وقت کا غلبۂ خوف:

فرمایا، ایک شخص نے شبہ لکھا تھا کہ میں حاکم مجازی کے سامنے بہت ڈرتا ہوں، جب کہ اللہ تعالیٰ سے اتنا خوف معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے ضعف ایمان کا شبہ ہوتا ہے۔ میں نے انہیں جواب لکھا کہ یہ خوف طبعی ہے، جس کا سبب مشاہدہ ہے، حاکم مجازی کا زیادہ خوف بوجہ مشاہدے کے ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں، اس لئے زیادہ خوف نہیں معلوم ہوتا، مگر انسان اس کا مکلف نہیں۔ وہ خوف عقلی کا ذمہ دار ہے، جو سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ ہی کا ہے۔ اس لئے ضعف ایمان کا شبہ نہ کرنا چاہئے۔ (صفحہ ۸۱)

مخدوم کو راحت پہنچانے کی حکمت:

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے وصال کے وقت دوات قلم منگوایا اور حضرت عمرؓ نے کہا کیا ضرور؟ جواب میں فرمایا، یہ اعتراض صرف حضرت عمرؓ پر نہیں، بلکہ اس میں تو خود حضور ﷺ پر بھی کتمان حق کا اعتراض لازم آتا ہے۔ آپ پر تبلیغ احکام فرض تھی۔ اگر کوئی حکم واجب تھا تو آپ نے ظاہر کیوں نہ فرمایا۔ اگر اس وقت دوات قلم نہیں آئی تھی تو دوسرے وقت منگا کر تحریر فرمادیتے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے بعد کئی روز زندہ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ پنجشنبہ کا ہے اور وفات دوشنبہ کو ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ حضور کو کوئی نیا حکم ارشاد فرمانا نہ تھا، بلکہ پہلے سے کسی حکم کی تجدید و تاکید مقصود تھی، چونکہ حضرت عمرؓ سمجھ گئے، اس لئے آپ نے گوارا نہ کیا کہ حضور حالت بیماری میں تکلیف فرمائیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ طبیب کسی کو زبانی نسخہ بتادے، پھر شفقت کی وجہ سے کہے، قلم و دوات لاؤ، لکھ دوں اور مریض یہ دیکھ کر کہ اس وقت انہیں تکلیف ہوگی، کہے کہ کیا حاجت ہے، اس وقت تکلیف نہ دی جائے اور جواب الزامی یہ ہے کہ قصہ حدیبیہ میں حضرت علیؓ نے صلح نامہ لکھا تھا، ہذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ، کفار

نے مزاحمت کی کہ ابن عبداللہ لکھو، کیونکہ اسی میں تو جھگڑا ہے، اگر ہم رسالت تسلیم کرلیں تو نزاع ہی کس بات کی۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس کو مٹادو۔ انہوں نے انکار فرمایا، پس ایسی مخالفت تو اس میں بھی ہوئی، جس طرح حضرت عمرؓ نے مخالفت کی تھی، پھر فرمایا کہ جواب الزامی مجھے پسند نہیں، مگر بطور لطیفہ کے اس وقت بیان کردیا۔ (صفحہ ۸۵)

مقتول فی اللہ کا مقام:۔

فرمایا، ایک شخص نے حیات نبوی ﷺ کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی۔ میں نے کہا جو لوگ مقتول فی سبیل اللہ ہیں، ان کے حق میں ارشاد ہے بل احیاء عند ربھم اور جو مقتول فی سبیل اللہ سے بڑھ مقتول فی اللہ ہیں، وہ کیونکہ زندہ نہ ہوں گے اور مسئلہ کا مدار اسی نکتہ پر ہی نہیں، بلکہ اس میں حدیث صریح موجود ہے اور یہ تائید کے درجہ میں ہے۔ (صفحہ ۸۶)

بندے کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا:

فرمایا، بندہ کے ارادہ کی حیثیت کیا ہے، حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ فرماتے ہیں عرفت ربی بفسخ العزائم یعنی میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا، بسا اوقات انسان اپنے ارادوں میں ناکام رہتا ہے، ہزاروں مصمم ارادے کئے، مگر کچھ بھی نہ ہوسکا، اسی لئے ابن عطاء اسکندریؒ فرماتے ہیں کہ ارید ان لا ارید یعنی میں نے یہ ارادہ کرلیا ہے کہ ارادہ نہ کروں گا، اس پر بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ یہ عدم ارادہ کا ارادہ بھی تو ارادہ ہے، انہوں نے خود ہی اس کا کیا اچھا جواب دیا ہے کہ ارادۂ منفیہ تو اس لئے قابل ترک ہے کہ وہ خلاف تفویض و رضا ہے، اور عدم ارادہ کا ارادہ خود عین تفویض و موافق رضا ہے اس لئے یہ منفی و قابل ترک نہیں۔ (صفحہ ۸۶)

تشبہ کی ممانعت:

فرمایا: حدیث شریف میں ہے کہ ما اکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی خوان ولا سکرجة ولا خبز له مرقق یعنی رسول اللہ ﷺ نے چوکی اور طشتری پر کھانا کھایا اور نہ آپ کے لئے کبھی چپاتی پکی۔ مشہور یہ ہے کہ جس کام کو آپ نے نہ کیا،

وہ نہ کرنا چاہئے اور اس قاعدہ کی اس سے تائید حاصل کی جاتی ہے کہ عیدین میں مثلاً اقامت اور اذان آپ کے وقت میں نہیں ہوئی، لہٰذا جماعت نہ کرنا چاہئے۔ لیکن قاعدہ کلیہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک تو ہے عدم الفعل اور ایک ہے ترک الفعل ان دونوں میں اس کے اعدام کا قصد ہوتا ہے پھر یہ قصد جس مرتبہ کا ہوگا، اس فعل کا ناپسندیدہ ہونا ثابت ہوگا اور اس فرق کو اہل اجتہاد خوب سمجھتے ہیں۔ پس عدم الفعل سے تو اس کا کرنا ناجائز نہیں ہوتا، بشرطیکہ اور کوئی قباحت شرعی لازم نہ آئے اور ترک الفعل البتہ ناپسندیدگی ہے۔ اس حدیث میں اس چیز کا بیان ہے کہ اس وقت ایسے تکلفات نہ تھے، اس سے اس دلیل عدم الفعل کا نکلتا ہے نہ کہ ترک الفعل کا۔ اب اگر کوئی طشتری میں کھائے یا چپاتی کھائے، یہ جائز ہے، مگر فخر کے ارادہ سے نہ ہو، میز پر کھانے میں چونکہ افتخار وتشبیہ کی برائی ہے، اس لیے وہ اس مستقل دلیل سے ممنوع ہوگا۔ (صفحہ ۸۸)

دنیاوی لذتوں کی اصلیت:

فرمایا: دنیا کی جتنی راحتیں اور لذتیں ہیں، کسی کے لئے بھی تو بقاء نہیں۔ اس وقت کھانے پینے کی سب نعمتیں موجود، دوسرے وقت وہ نعمتیں فنا ہوگئیں۔ جس قدر لذتیں ہیں، وہ وقتی ہیں۔ اس وقت نہایت لذیذ معلوم ہوئیں، کچھ دیر میں فنا ہوگئیں، گویا کچھ بھی نہ تھا اور شادی وغیرہ کی رسموں میں اہل دنیا کس قدر تکلف کرتے ہیں۔ بس ایک شب گزرتی ہے، نہ وہ تکلفات رہتے ہیں، نہ وہ ساز وسامان، اور بڑے بننے کی خاطر جو کام ہوتا ہے، اس کی برائی بھی سن لیجئے۔ آج ایک شخص نے ایک لاکھ روپیہ صرف کر کے شادی کی۔ بڑا نام ہوا کہ ایسا تو کسی نے نہیں کیا۔ بڑا انتظام تھا۔ اس کے بعد پھر کسی دوسرے صاحب نے اس سے زیادہ رقم خرچ کی تو لوگ کہتے ہیں جی، فلاں شخص کی کیا حقیقت، اصل کمال تو ان صاحب کا ہے۔ بس سارا فخر مٹ گیا۔ یہ ہے اہل دنیا کے فخر کی حالت اور لذتوں کے بقاء کی حالت۔ لہٰذا انسان کو آخرت ہی کے لئے کام کرنا چاہئے اور اسی کی طلب میں رہنا چاہئے کہ دائمی راحت ولذت ہے جو کبھی فنا ہونے والی نہیں۔ (صفحہ ۹۳)

قوت متخیلہ کا کرشمہ

فرمایا: بعض درویشوں کی یہ حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی شخص بیعت ہوتا ہے تو بعض مشقوں کی وجہ سے جو وہ اپنے اندر دوسرے کی قوت متخیلہ میں تصرف کرنے کی صورت

میں حاصل کر لیتے ہیں، مرید کو آفتاب و ماہتاب دکھاتے ہیں۔ یہ سب قوت متخیلہ کا تصرف ہے۔ لیکن مرید یقین کر لیتا ہے۔ توجہ سے یہ انوار نظر آنے لگتے ہیں۔ مرید ہمیشہ اسی مغالطہ میں مبتلا رہ کر برباد ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سے زیادہ آفت یہ ہے کہ بعض مقاموں پر بہت سے انوار دکھائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا نام متعین کر رکھا ہے، ارواح مشائخ کرام رضی اللہ عنہم میں سے، مثلاً یہ روح حضرت صابرؒ کی ہے، یہ حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کی اور مرید کو بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں بزرگ کی روح ہے اور حقیقت میں سب شیطانی معاملات ہوتے ہیں اور صرف قوت متخیلہ کا تصرف ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ مرید بیچارہ یقین کر لیتا ہے کہ میں نے بزرگوں کو دیکھا۔ یہ آفت اس زمانہ میں ہو رہی ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ (صفحہ ۹۵)

خواب میں زیارت کی چنداں اہمیت نہیں

فرمایا: بعض لوگ دریافت کرتے ہیں کہ کوئی ایسا وظیفہ بتایئے کہ خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا کریں اور اولیاء اور انبیاء کو خواب میں دیکھا کریں۔ افسوس! آج کل اس کو کمال درویشی سمجھا جاتا ہے۔ اولاً خواب میں زیارت ہونا غیر اختیاری چیز ہے۔ بعض اولیاء اللہ کو مدت العمر میں زیارت نہ ہوئی، ثانیاً خواب میں زیارت ہونے سے قرب حق نہیں بڑھتا۔ فرض کیجئے کہ کسی کو روزانہ خواب میں زیارت ہوا کرے، اس سے نہ کامل ہوگا، نہ اللہ سے قرب میں ترقی ہوگی، البتہ باعث برکت ضرور ہے۔ پس بخدا، ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے سے جو قرب حق حاصل ہوتا ہے، وہ خواب میں زیارت سے زیادہ ہرگز نہیں ہوتا۔ اللہ کے لئے تو اطاعت خداوندی جو شریعت سے ثابت ہے موزون ہے۔ احکام خداوندی پر جس قدر عمل ہوگا اور جس قدر اتباع شریعت ہوگا، اسی قدر اللہ کا قرب نصیب ہوگا۔ لوگوں نے جو اصل درویشی تھی، اسے ترک کر کے غیر ضروری کو ضروری میں داخل کر لیا ہے۔ دیکھئے، حدیث شریف میں اچھے خوابوں کے متعلق صرف یہ ارشاد ہے کہ رویائے صالحہ مبشرات ہیں۔ یعنی خوش کرنے والی چیزیں، جب یہ مبشرات ہیں تو ان کی فکر میں رہنا عمر کو ضائع کرنا ہے۔ اگر خواب میں زیارت ہو جائے تو باعث برکت ہے۔ ورنہ اس کو قرب حق میں کچھ دخل نہیں۔ (صفحہ ۹۶)

تعلقات میں اعتدال کی اہمیت

فرمایا: حضور پرنور ﷺ فرماتے ہیں کہ آپس میں نہ تو اس درجہ محبت کرلو کہ بالکل گھل مل جاؤ اور نہ اس طرح عداوت رکھو کہ قطعاً کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ بات یہ ہے کہ محبت کے بعد اگر عداوت پیدا ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رنج و ملال از حد بڑھ جائے گا۔ اسی طرح عداوت کے بعد اگر اتفاق سے محبت ہوگئی تو اس وقت پرانی عداوت کو یاد کرکے نہایت شرمندگی ہوگی۔ غرض کہ ہر کام میں اعتدال ہونا چاہئے۔ نہ انتہائی محبت ہو، نہ انتہائی عداوت۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ احبب حبیبک هونا ما عسیٰ ان یکون بغیضک یوما وابغض بغیضک هونا ما عسیٰ ان یکون حبیبک یوما ما۔ (صفحہ ۹۹)

تدریجی اصلاح میں نفع زیادہ ہے

فرمایا: توجہ دو طرح کی ہے۔ ایک تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا کہ نصیحت اور دعا اور شفقت سے بتدریج ان کی اصلاح فرماتے تھے۔ یہ طریقہ نفع کے اعتبار سے دیرپا ہے۔ دوسرا طریقہ مشق سے قوت تصرف پیدا کرنا، پھر اس قوت سے توجہ کرنا، مرید کے قلب پر اس کا اثر فوری ہے، مگر دیرپا نہیں، یہ اثر جلد زائل ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۱۰۰)

علم بواسطہ وحی کا سراپا رحمت ہونا

فرمایا: موجودہ دور میں لوگ ان علوم کو زیادہ حق سمجھتے ہیں، جو بذریعہ کشف والہام ہوں۔ اسی وجہ سے جو وظائف و اوراد الہامی ہیں، وہ ان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور جو بذریعہ وحی ہیں، ان کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ حالانکہ شیخ اکبر قدس اللہ سرہ نے طے فرما دیا ہے کہ جو بلا ذریعہ کشف و الہام ہو، اس میں کبھی ابتلا ہے اور کبھی رحمت اور جو علم بواسطہ وحی ہے، وہ ہمیشہ باعث رحمت ہے۔ حضور پرنور ﷺ رحمت اللعالمین ہیں۔ آپ ﷺ کے واسطے سے جو علم ہوگا وہ رحمت محض ہوگا۔ اس لئے اقرب الی الحق وہی ہوگا۔ کشف والہام کا مرتبہ وحی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ لوگوں نے شریعت مطہرہ کی قدر نہ جانی، کس قدر افسوس کی بات ہے۔ (صفحہ ۱۰۸)

صحت کی دولت کا، سلطنت سے بڑھ کر ہونا:

فرمایا: حق تعالیٰ کے احسانات بے حد و حساب ہیں۔ مثلاً صحت ایک ایسی چیز ہے کہ ساری سلطنت بھی اس کے برابر نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کو مرض لاحق ہوجائے اور ساری سلطنت دے دینے پر صحت حاصل ہو تو وہ کل سلطنت دے دے گا۔ اور مثلاً دنیا میں اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کے اسباب ایسے عام رکھے ہیں کہ ہر شخص انہیں استعمال کر رہا ہے اور بلا قیمت۔ اگر فرض کیجئے کسی کو شدت کی پیاس ہو اور پانی نہ ملتا ہو اور کروڑوں روپے کے عوض میں ایک گلاس پانی مل سکے تو آدمی غنیمت سمجھ کر کل مال صرف کردے گا اور ایک گلاس پانی خرید لے گا۔ اسی طرح دوسری نعمتوں کو سمجھنا چاہئے۔ ہم جس نعمت کو کم قیمت تصور کرتے ہیں، نہ ملنے پر اس کی قیمت معلوم ہوسکتی ہے کہ وہ کس قدر قابل قدر ہے۔ حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ ان نعمتوں کو بلا قیمت عام و خاص ہر شخص استعمال کر رہا ہے۔ اس نعمت عامہ کی قدر کرنی چاہئے کہ عنایت فرما رہے ہیں۔ (صفحہ ۱۰۸)

خطرات کے فہم کا طریقہ

فرمایا: خطرۂ شیطانی و نفسانی یہ ہے کہ اگر کوئی بُرا خیال آیا اور اس کو دفع کیا اور پھر دوبارہ بُرا خیال آگیا اور اس کو بھی دفع کیا اور پھر تیسرا خیال آگیا تو یہ خطرۂ شیطانی ہے۔ کیونکہ شیطان کو تو اغوا سے مطلب ہے۔ خواہ کوئی برا خیال پیدا ہو، اسے ایک ہی گناہ پر اصرار کرنے کی ضد نہیں۔ ہاں، کبھی خیر میں بھی خطرۂ شیطانی ہوتا ہے۔ اس کے پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی غور کرے کہ ایک خیر کو چھوڑ کر دوسرے خیر کرنے کا جو خیال آیا ہے، ان میں اعلیٰ نیکی کون سی ہے اور ادنیٰ کون سی، اگر یہ نئی خیر ادنیٰ ہے تو یہ خطرۂ شیطانی ہے، کیونکہ وہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف لا رہا ہے اور اگر بری چیز کا خیال آیا اور بار بار وہی آتا ہے تو یہ نفسانی خطرہ ہے، کیونکہ نفس کو اس میں لذت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ایک ہی گناہ پر اصرار کرے گا اور اگر خیر کے غلبہ کا خیال آیا تو وہ خطرۂ ملکی ہے اور اگر اس خیر کے لئے ایسا غلبہ ہوجائے کہ فرد اس کے کرنے پر بے چین ہوجائے تو وہ الہامی ہے۔ یعنی الہام حق ہے، یہ ہے طریقہ، معرفت کے خطرات کے فہم کا۔ (صفحہ ۱۰۹)

لباس، صوفیہ کی نظر میں:

فرمایا، صوفیہ عمدہ لباس پہننے کو جو منع کرتے ہیں تو اس سے مطلقاً عمدہ لباس پہننا مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ لباس کی کئی غرضیں ہوتی ہیں۔ کبھی تو دفع ضرورت کے لئے لباس پہنا جاتا ہے، کبھی اس کے ساتھ آسائش بھی مطلوب ہوتی ہے، کبھی ان دونوں کے ساتھ آرائش بھی مقصود ہوتی ہے، کبھی ان تینوں کے ساتھ نمائش بھی منظور ہوتی ہے۔ پھر نمائش کبھی جلب عزت کے لئے ہوتی ہے، کبھی ازالہ نقصان کیلئے۔ پھر عزت کبھی اپنے نفس کی مقصود ہوتی ہے کبھی کسی دوسرے کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ پس مذموم وہ لباس ہے، جس میں نمائش بغرض جلب عزت لاکرام نفسہ ہو، باقی سب جائز ہے۔ (صفحہ ۱۰۹)

شہوت کا ازالہ مقصود نہیں

فرمایا: بعض لوگ اس بات کو کمال سمجھتے ہیں کہ انسان میں کوئی نفسانی خواہش ہی باقی نہ رہے۔ نہ شہوت ہو، نہ غضب، یہ غلطی ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ شہوت اور غضب کا جذبہ موجود ہو، لیکن اس کا استعمال بے موقع نہ ہو اور جذبات و ہیجان دب جائے اور اگر شہوت کا بالکل ازالہ مقصود ہوتا تو حضور ﷺ یہ تعلیم نہ فرماتے کہ اگر کسی غیر عورت کو دیکھ کر طبیعت میں ہیجان پیدا ہو تو فوراً اپنی بیوی سے مشغول ہو جائے۔ بلکہ یوں فرماتے کہ جب ہیجان معلوم ہو تو شہوت کو بالکل مٹانے کی فکر میں لگے۔ اور اس غلطی میں پڑ کر بہت سے لوگ دیکھتے ہیں کہ چونکہ ہنوز ہمارے اندر شہوت باقی ہے، اس لئے وہ اپنے شیخ اور اس کی تعلیم سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ذکر سے ہمیں کچھ نفع نہیں ہوا اور اس سمجھ کی بدولت ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ (صفحہ ۱۱۲)۔

معصیت کے تقاضے پر ہرگز عمل نہ کیا جائے

فرمایا: بعض اوقات سالک کی طبیعت میں گناہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے نفس کو روکتا ہے۔ لیکن روکنے سے نفس میں گناہ کا تقاضا اور بڑھتا ہے۔ اس وقت نفس اور شیطان یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر اس وقت تم یہ کام جی بھر کر کرلو گے تو نفس تقاضے سے خالی ہو جائے گا۔ پھر یہ گناہ صادر نہ ہوگا۔ اور اس تاویل سے اس معصیت کو جائز بلکہ اس کے ارتکاب کو اس وقت ضروری سمجھ کر فرد گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سخت غلطی

بلکہ الحاد ہے۔ غلطی تو اس لئے کہ اس ارتکاب سے وہ گناہ جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر فرد بھی اس کے ازالے پر قادر نہیں ہوتا اور الحاد اس لئے کہ معصیت کو طاعت کا ذریعہ سمجھا۔ اس موقع پر نفس کو ہرگز گناہ کے ارتکاب کی اجازت نہ دینی چاہئے، اسے کامل ہمت سے روکنا چاہئے۔ باوجود روکنے کے بھی اگر تقاضائے نفس نہ بجھے تو اس کی کچھ پرواہ نہ کی جائے، کیونکہ محض تقاضائے نفس پر پکڑ نہیں۔ مواخذہ ارتکاب جرم پر ہے۔ اس روکنے سے چند بار میں پھر ہمیشہ کے لئے یہ حالت دب جاتی ہے۔ (صفحہ ۱۱۶)

انسان میں حقیقی محبوب کے لئے محبت کا ہونا

فرمایا: بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی محبت سے خالی نہیں ہے۔ مسلم، کافر سب کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ کسی کو کم، کسی کو زیادہ۔ اور اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈانٹ ڈپٹ کے لئے کفار کی شان میں فرماتے ہیں: کلا انهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون۔ پس اگر کفار خدا تعالیٰ کو دوست نہیں رکھتے تو اس حجاب کی وعید سے ان کو کیا زجر ہوا۔ اور اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ نے حج کی حکمت یہ نقل کی کہ وہ فرماتے تھے کہ ہر مسلمان کو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اگر بالکل قرب و وصال نہ ہو تو یا محبت جاتی رہتی ہے یا محبّ ہلاک ہو جاتا ہے اور یہ دونوں چیزیں مضر ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے محبت و محبّ کی حفاظت کی حکمت سے ایک مکان بنایا اور اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور جو معاملہ محبوب کے مشاہدے کے وقت عادۃً کیا جاتا ہے، یعنی طواف وتقبیل والتزام وغیرہ اس مکان کے ساتھ بھی مشروع فرمایا کہ محبین کو اگر پورا وصال نصیب نہ ہو تو اس سے کچھ ہی تسکین حاصل ہو جائے، اس کے لئے اس میں حجر اسود کو یمین اللہ کا لقب دیا کہ دست بوسی کے لئے بے قرار ہوں تو اس سے تسلی کرلیں۔ طواف کا حکم دیا کہ عاشق کی طبعی حالت ہے اور چونکہ عشق میں عادۃً دشمن سے عداوت بھی ہوتی ہے، اس لئے ایک مقام کو شیطان کی طرف منسوب کرکے، اس کی رمی کا حکم دیا (رمی جمار) وغیرہ ذالک۔ اور جب سفر حج اس حکمت سے مشروع ہوا تو اس سفر میں اگر ہزارہا تکلیف بھی ہوں تو پروا نہ کرنی چاہئے۔ (صفحہ ۱۲۱)۔

منتہی کا کام، گوشہ عافیت نہیں

فرمایا: بعض اوقات منتہی اپنے لئے گوشہ عافیت تجویز کرتا ہے، تاکہ وہ آفاقی اور انفسی آفات سے محفوظ رہے، لیکن اسے اس عافیت میں بھی بلا اختیار یا تو کوئی آفاقی آفت پیش آجاتی ہے، جو اس کے لئے عافیت سوز ہوتی ہے، یا اگر آفاقی پیش نہیں آتی تو انفسی آفات پے در پے ایسی پیش آتی رہتی ہیں کہ اسے مجبوراً گوشہ عافیت ترک کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو پھر وہ اپنے لئے کچھ تجویز نہیں کرتا، بلکہ تفویض محض کرتا ہے اور اسے عوام سے جو تکلیف پیش آتی ہیں، انہیں بھی برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر برداشت نہ کروں گا اور گوشہ تنہائی ہی کو اختیار کروں گا تو اس سے زیادہ آفات میں مبتلا ہوسکتا ہوں۔ (صفحہ ۱۲۱)

مبتدی و منتہی کے اختلاط کی نوعیت

فرمایا: مبتدی اور منتہی کا لوگوں کے ساتھ میل جول بظاہر یکساں ہے، لیکن دونوں کے اختلاط میں فرق یہ ہے کہ مبتدی کا لوگوں سے تعلق اپنی مصلحت کے لئے ہے۔ جب کہ منتہی کا تعلق لوگوں کی اصلاح کی خاطر ہوتا ہے اور باطن میں اسے تشویش ہوتی ہے، متوسط مخلوق سے بالکل علیحدہ رہتا ہے، اس لئے لوگ متوسط کو اکثر بزرگ سمجھتے ہیں اور منتہی کا پتہ نہیں لگتا۔ (صفحہ ۱۲۳)۔

تلاوت کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کو قرآن سنانا

فرمایا: تلاوت قرآن میں دل لگنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ تلاوت شروع کرنے سے قبل اس طرح سوچا جائے کہ اگر مجھے چند احباب قرآن پڑھنے کو کہیں اور میں ان کو سنانے کی غرض سے قرآن پڑھوں تو کس انداز سے پڑھوں گا۔ آیا دل لگا کر اور ترتیل سے یا یوں ہی بلا توجہ کے۔ اس کے بعد سوچا جائے کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قرآن پڑھنے کا حکم فرمایا ہے اور وہ سن رہے ہیں اور اسے خوش کرنا احباب کے دل خوش کرنے سے زیادہ ضروری ہے اور اس خیال کے بعد قرآن پڑھنا شروع کردے۔ اگر درمیان تلاوت میں اس خیال سے غفلت ہوجائے تو تلاوت بند کرکے پھر اس خیال کو تازہ کرلے۔ چند روز میں ان شاء اللہ یہ کیفیت راسخ ہوجائے گی۔ (صفحہ ۱۲۳)۔

سالک کا سرمایہ، رضا پر راضی رہنا:

فرمایا: اکثر لوگ حالت قبض میں پریشان ہوجاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ جب ایسی حالت پیش آئے تو یہ سمجھا جائے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور ہماری مصلحت کے موافق اور ہمیں نہ قبض سے غرض ہے، نہ بسط سے، نہ ان دونوں کے عدم سے۔ بلکہ ہم ہر حالت پر راضی ہیں، اور اسی کو خدا تعالیٰ کا فضل اور اپنی مصلحت سمجھتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۴)

بلاضرورت اجتماع کا موجب خطرہ ہونا:

فرمایا، فقہاء نے جو نوافل کی دعوت کو منع فرمایا ہے، اس میں یہ بھی حکمت کارفرما ہے کہ نفل جماعت تو شرعاً مطلوب نہیں۔ پس اجتماع کی ضرورت نہ رہی اور اکثر بلاضرورت مجتمع ہونے سے طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور ضروری کام بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس سے نظام عالم کے درہم برہم ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہی راز ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے جمعے کی فرضیت کے لئے سلطان یا اس کے نائب کا موجود ہونا ضروری قرار دیا ہے کہ تقدیم میں نزاع نہ ہو۔ چنانچہ ہدایہ میں اس حکمت کی تصریح ہے اور اگر مسلمان ایک شخص پر اتفاق کرکے اس نزاع کا انسداد کریں تو ایسا شخص بھی کافی ہے۔ (صفحہ ۱۲۵)

جس سے کوئی کام ہو اسے ہدیہ دینا رشوت ہے:

فرمایا، جب کسی کے پاس کوئی حاجت لے کر جاؤ تو ہدیہ لے کر نہ جاؤ۔ اس لئے کہ اول تو یہ رشوت کی صورت ہے۔ دوسرے بعض اوقات وہ شخص حاجت کو پورا نہیں کرسکتا اور اس سے اس شخص کو ہدیہ لینے میں ایک طرح کی خفت ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۲۶)

علماء پر روشن خیال افراد کا اعتراض:

فرمایا، اکثر روشن خیال لوگ علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیاوی ضرورتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ سو اول تو یہ تسلیم نہیں اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو اس لاعلمی کی تکالیف کی زندگی بہت قلیل ہے۔ لیکن معترضین جن ضرورتوں سے لاعلم ہیں یعنی دین کی بنیادی ضرورتیں، ان کی لاعلمی سے جو تکالیف انہیں ہوں گی، وہ بہت شدید اور طویل ہیں۔

پس اول انہیں اپنی خبر لینی چاہیئے، اس کے بعد انہیں اعتراض کا حق ہے۔ (صفحہ ۱۲۶)

اجتماع سے مفاسد کے خطرات

فرمایا: تمدن اور قیام سلطنت کا ایک بڑا اصول ہے کہ بلا ضرورت عوام کا اجتماع نہ ہونے پائے۔ حکومتوں کو اس کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ سو کلام مجید سے بھی یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت میں ہے۔ فاذا قضیت الصلواہ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون. انتشار کا حکم اس وجہ سے ہوا کہ ضرورت اجتماع باقی نہیں رہی۔ اگر مختلف مزاج کے لوگ بلا ضرورت ایک جگہ جمع ہوں گے تو فساد ونزاع کا خطرہ ہے، اور اسی لئے انتشروا کے بعد یہ بھی فرمادیا کہ ابتغوا من فضل اللہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد سے نکل کر بھی بے کار نہ گھومو بلکہ رزق کی طلب میں مشغول ہوجاؤ۔ آگے اس شغل بالدنیا کی خرابیوں کا علاج فرماتے ہیں کہ اذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون. تو ہر پہلو کو یکساں معتدل کیا ہے اور یہی اعتدال جو قرآنی تعلیم کے سوا کسی دوسری جگہ اس انداز سے میسر نہیں ہوسکتا۔ (صفحہ ۱۲۹)

ذکر اللہ کا، نفس پر جہاد سے زیادہ دشوار ہونا

فرمایا: انسان کے اعمال صالحہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں، جن کا کوئی ثمرہ اکثر دنیا میں بھی مرتب ہوتا ہے اور ان اعمال سے نفس کو حظ بھی حاصل ہوتا ہے، جیسے جہاد وغیرہ اور بعض اعمال وہ ہیں، جن کا ثمرہ غائب ہے اور وہ اعمال طبیعت کے لئے موجب سرور بھی نہیں، جیسے ذکر اللہ۔ پہلی قسم کے اعمال نفس کے لئے آسان ہوتے ہیں، جب کہ دوسری قسم کے اعمال بہت مشکل ہیں اور ان کی ادائیگی سے نفس پر بہت بار ہوتا ہے۔ ان کے آسان کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ ذکر سے کسی ثمرۂ عاجلہ کا ارادہ نہ کیا جائے، بلکہ محض اس نیت سے ذکر کیا جائے کہ وعدۂ خداوندی ہے فاذکرونی اذکرکم، جب ہم اسے یاد کریں گے تو وہ ہمیں ضرور یاد کرے گا اور اس کا یاد کرنا اعظم مطلوب ہے اور اس کے خلاف کا بھی احتمال نہیں۔ پس جب مطلوب حاصل ہے تو دوسری لذت اگر حاصل نہ بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ (صفحہ ۱۳۰)

مبتدی کے لئے وعظ کہنا درست نہیں

فرمایا: امام غزالیؒ نے کہیں لکھا ہے کہ مبتدی کو وعظ وغیرہ نہ کہنا چاہئے، کیونکہ تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی۔ اس سے نفس کے خراب ہوجانے کا احتمال ہے، حب شہرت وعجب وغیرہ سے، اس رائے کی تائید قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ فاعفوا واصفحوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ. یہ آیت ممانعت قتال بالکفار مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مخاطبین تازہ اسلام لائے تھے۔ تہذیب نفس کامل طور پر نہیں ہوئی تھی۔ احتمال تھا کہ شاید قتال میں نفس کا شائبہ ہوجائے اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس وقت تک صحابہؓ کا عدد کم تھا، کیونکہ مسلمانوں کو قلت تعداد سے کبھی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ آخر ساٹھ آدمی ساٹھ ہزار سے لڑے اور کامیاب ہوئے اور جب مدینے میں آئے تو چونکہ اکثر کی تہذیب نفس کامل ہوچکی تھی اور اقل تابع ہوتے ہیں، اکثر کے، اس لئے اجازت قتال دے دی گئی اور یہ آیت نازل ہوئی: اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا (صفحہ ۱۳۶)

جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے، شیخ اس کی اصلاح نہیں کرسکتا

فرمایا: قرآن میں جو ارشاد ہے: انک لاتھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء. اس آیت میں یشاء کی ضمیر جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، لیکن عربی قواعد کے موافق اس کی ایک دوسری لطیف توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص خود اپنی ہدایت کا ارادہ کرے، خدا تعالیٰ اسی کو ہدایت دیتے ہیں۔ اور اس امر کی تائید دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے کہ اگر خود ارادہ کرے تو خدا تعالیٰ بھی امداد فرماتے ہیں، ورنہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا. اور دوسری جگہ ارشاد ہے: انلزمکموھا وانتم لھا کٰرھون. یہ ملفوظ اس پر بیان کیا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے، شیخ اس کی اصلاح نہیں کرسکتا۔ (صفحہ ۱۳۷)۔

کفر پر دائمی عذاب کی سزا

فرمایا، کافر کو جو دائمی عذاب ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر حقوق خداوندی کا تلف

ہے اور خدا تعالیٰ کے صفات غیر متناہی ہیں اور ہر صفت کا ایک حق ہے۔ تو کافر نے حقوق غیر متناہی کو ضائع کیا۔ جس پر غیر متناہی عذاب مرتب ہونا چاہئے۔ اور عقل کا تقاضہ بھی یہی دائمی عذاب، معصیت میں بھی ہے، لیکن یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے معاصی غیر کفر میں دائمی سزا نہیں دی۔ (صفحہ ۱۳۷)

احوال قابل التفات نہیں، اصل چیز اتباع شریعت ہے

فرمایا: کیفیات دو قسم کی ہیں۔ ایک روحانی کیفیات، دوسری نفسانی کیفیات روحانی کیفیات مشاہدہ اور غلبہ ذکر ہے، جس کے آثار اطاعت میں سہولت اور شوق فرمانبرداری ہے اور اس پر رضائے ربانی کا وعدہ ہے۔ نفسانی کیفیات، نفسانیہ احوال کہلاتے ہیں۔ مثلاً شدتِ شوق، ہیجان و دارفتگی، یہ چیزیں مطلوب نہیں ہیں، اس لئے صاحب کمال کبھی ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ بلکہ کبھی کبھی احوال سے ضرر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جو شخص شدت شوق میں مبتلا ہے، اسے ان حالات میں سے ایک حالت ضرور پیش آئے گی، یا تو لقاء نصیب نہ ہونے سے مایوسی ہو یا غلبہ و ہیجان سے مرض یا اغوائے شیطان سے عجب و کبر وغیرہ پیدا ہوں۔ یہ سب حالتیں مذموم ہیں اور حق سے دور ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو مستجاب الدعوات ہونے کے متمنی ہوتے ہیں اور اسے کمال سمجھتے ہیں، یہ غلطی ہے، کیونکہ قبولیت دعا بھی احوال میں سے ہے، جو بعض اوقات مضر ہوتی ہے اور نیز جو شخص مستجاب الدعا ہوگیا ہے، وہ قبولیتِ دعا کے وقت غور کرلے اور دیکھے کہ اس سے قرب خداوندی میں کچھ اضافہ بھی ہوا یا نہیں۔ اگر قلب نفی میں جواب دے (اور ضرور ایسا ہوگا) تو سمجھ لے کہ مستجاب الدعا ہوجانا کوئی کمال نہیں۔ اس کے بعد دیکھے کہ اگر میں ایک مرتبہ سبحان اللہ کہتا ہوں تو اس سے کچھ قرب حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر شریعت و طریقت زیادہ قرب کا فتویٰ دے تو یقین کرلے کہ مستجاب الدعا ہوجانا، ذکر لسانی سے بھی کم درجہ کی چیز ہے۔ پس اس سے یہ بات خوب واضح ہوئی کہ حالات و کیفیات توجہ کے لائق نہیں، ہاں، خدا کی نعمت سے وہ حاصل ہوجائیں تو اس کا فضل ہے، نہ حاصل ہوں تو نجات و قرب خداوندی میں اسے کچھ دخل نہیں۔ اور اس کی تائید کہ احوال و کیفیات بذات خود مطلوب نہیں، اس حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور ﷺ نے دعا فرمائی، اسئلک شوقا الیٰ لقائک من غیر ضراء مضرہ ولا فتنہ مضلہ۔

پس اگر احوال بجائے خود مطلوب ہوتے اور ان میں ضرر اور فتنہ نہ ہوتا تو حضور ﷺ، طلب شوق کے ساتھ کہ حال ہے یہ قید نہ لگاتے۔ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اے خدا: میں تجھ سے تیرے لقاء کے شوق کا طالب ہوں، لیکن اتنا شوق نہ ہو کہ اس سے کسی ضرر (جیسے طلب شوق سے امراض وغیرہ کا لاحق ہوجانا) یا کسی فتنے میں مبتلا ہونا (جیسے بے باکی کا پیدا ہونا اور شریعت و صاحب شریعت کا ادب ملحوظ نہ رہنا) ہو۔ (صفحہ ۱۴۰)

کفار کو دنیوی نعمتوں کا صورۃ ملنا

فرمایا: کفار کو بعض اوقات جو نعمت دی جاتی ہے اور مومن کو تکلیف تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار سے جو نیکیاں عدل، رحم اور سخاوت وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں، یہ اس کی جزا ہے اور مومن کو بوجہ بعض گناہوں کے تکلیف دی جاتی ہے۔ کفار سے جو نیکیاں صادر ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ باغی ہیں، ان سے ان ہی کا صدور غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ لہذا رزق میں وسعت دی جاتی ہے مومنوں سے گناہوں کا سرزد ہونا چونکہ مبغوض عنداللہ ہیں۔ اس لئے ان پر تنگی کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کفار کو نعمت کی صورت عطا فرمائی گئی ہے، جب کہ مومن کو نعمت کی حقیقت عطا ہوئی۔ اگر کسی کو جیل خانہ کا حکم ہو اور کروڑوں نعمتیں اس کے پاس جمع ہوں تو اس کے لئے سب ہیچ ہیں۔ بخلاف ایک مزدور کے کہ گو اس کو رزق میں کمی ہو، مگر چونکہ جیل خانہ کا حکم نہیں ہوا، اس لئے وہ کس قدر راحت و چین میں ہے۔ یہی فرق ہے کفار اور مومن کے درمیان۔ (صفحہ ۱۴۸)

ہر صحابی کا مقتدیٰ ہونا

فرمایا: حدیث میں جو آیا ہے کہ حضور قیامت کے روز فرمائیں گے یارب اصحابی اور فرشتے جواب دیں گے کہ انک لا تدری ما احدثوا بعدک۔ اس حدیث میں اصحاب سے مراد صحابہ کرام نہیں ہیں، جن میں تنازعہ وغیرہ ہوا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام میں جو اختلاف ہوا ہے، اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو اصحاب بدر ہیں اور عشرۂ مبشرہ میں سے بھی بعض حضرات تھے۔ پس اگر صحابہ مراد لی جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض لازم آتا ہے کہ ایسوں کے فضائل ارشاد فرمائے۔ نیز اس سے دوسری حدیث کی مخالفت ہوتی ہے کہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ جس سے ہر صحابی کا مہتدیٰ اور مقتدیٰ ہونا ثابت ہوتا ہے، بلکہ اصحاب سے مراد مطلق متبعین ہیں، یعنی حضور فرمائیں

گے کہ یہ لوگ میری امت کے ہیں۔ اس پر ملائکہ کہیں گے کہ آپ کو معلوم نہیں، انہوں نے کیا کیا اختلاف اور بدعات آپ کے بعد پیدا کیئے ہیں۔ (صفحہ ۱۴۹)۔

علماء کے نفقہ کا قوم پر واجب ہونا

فرمایا: اکثر اہل دنیا پوچھا کرتے ہیں کہ اس دور میں عربی پڑھ کر انسان کیا کرے اور کہاں سے کھائے۔ اس کا ضابطہ کا جواب تو یہ ہے کہ اہل دنیا سے وصول کر کے اور ان کے اموال سے لے کر کھائے، اس لئے کہ عربی پڑھنے والے دین کی اشاعت اور حفاظت میں مصروف ہوتے ہیں اور لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں، تو یہ لوگ عوام اور اہل اسلام کی ضرورتوں کے لئے وقف ہیں اور یہ فقہی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کی ضرورتوں کے لئے وقف ہو، اس کا نان ونفقہ اس شخص کے ذمہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر زوجہ کا نفقہ شوہر پر اور قاضی کا نفقہ بیت المال پر اور شاہد کا نفقہ من له الشهادت پر ہوتا ہے۔ پس جب علماء مسلمانوں کے مذہبی کام میں مصروف ہیں اور ان کے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں، روز مرہ کی جزئیات میں ان کو مذہبی حکم بتاتے ہیں اور یہ شغل ایسا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا کام نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دوسرے کام میں مصروف ہیں، ان سے یہ کام نہیں ہوتا، اس لئے ان کا نان ونفقہ بھی عام مسلمانوں کے ذمہ واجب ہوگا۔ تو علماء سے یہ پوچھنا کہ عربی پڑھ کر کیا کرے گا اور کہاں سے کھائے گا، اپنی حماقت کا اظہار کرنا ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کی ذمہ داری مسلمانوں کی تھی، اس کو بجائے خود سمجھنے کے، علماء کے سامنے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ آپ ہمارا کام کرتے ہیں، لیکن ہم اپنی حماقت سے اس کام کو اپنا کام نہیں سمجھتے۔ اور باوجودیکہ آپ کی ضروریات کی تکمیل ہمارے ذمہ ہے۔ لیکن ہم اپنی عقلمندی سے اس کام کو اپنے ذمہ نہیں سمجھتے۔ پھر فرمایا کہ جس طرح اہل دنیا پر علماء کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے، اسی طرح علماء پر بھی یہ ضروری ہے کہ تعلیم وتعلم سے اصلی غرض خدمت دین رکھیں۔ نفس پروری اور جاہ طلبی پیش نظر نہ ہو، نیز اہل دنیا سے اسی قدر لیں، جس قدر ان کے ضروریات کے لئے ہو۔ تزین تجمل وہوائے نفس کے درپے نہ ہوں۔ (صفحہ ۱۵۱)

عبادات میں طبعی سستی کا ہونا

فرمایا: کلام مجید میں جو ارشاد ہے: اذا قاموا الی الصلوٰة قاموا کسالیٰ. اس میں سستی سے مراد وہ سستی ہے جو ضعف اعتقاد سے ہو۔ جیسا کہ منافقین میں تھا کہ چونکہ وہ نماز کو فرض نہ سمجھتے تھے، صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے پڑھتے تھے، اس لئے نماز ان کو سخت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ اس سے طبعی سستی مراد نہیں۔ پس کسی مسلمان کی حالت پر اس آیت کو پڑھ دینا صحیح نہیں۔ جیسا بعض کم فہم واعظ کرتے ہیں، کیونکہ مسلمان اگر عبادت میں سستی بھی کرے تو وہ طبعی ہوگی، اعتقادی نہ ہوگی۔ (صفحہ ۱۵۴)

بزرگوں سے تعلق کا استحکام

بزرگوں کے ساتھ لپٹا رہنا چاہئے، اگرچہ فرد خود کچھ نہ ہو، ممکن نہیں کہ انجن تو کلکتہ پہنچ جائے اور جو اس میں لگے ہوئے ہیں، وہ کلکتہ نہ پہنچیں۔ (صفحہ ۱۷۴)

پندرہ منٹ کے مراقبہ کی پابندی کے اثرات

برسبیل وعظ بیان فرمایا کہ تھوڑی سی دیر صرف پندرہ منٹ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرلیا جائے۔ دیکھیئے تو سہی، کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ کھٹائی کا نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے اور اللہ کا نام لینے سے قلب میں اثر پیدا نہ ہو، ممکن نہیں۔ (صفحہ ۱۷۵)

پردہ کی تاکید:

فرمایا، عورتیں گو غیروں سے پردہ کرتی ہیں، مگر اپنوں سے پردہ نہیں کرتیں۔ حالانکہ زیادہ خرابی اپنوں ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ گھر میں رات دن آنے جانے والے ہوتے ہیں، اس لئے جتنے غیر محرم عزیز قریب ہوں، ان سے پردہ لازمی ہے۔ بلکہ فقہاء نے بہ مصلحت بعض محارم شرعی (یعنی جن سے نکاح جائز نہیں) سے بھی پردہ ضروری قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ محارم شرعی دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جن سے (نکاح کرنے میں) طبعی نفرت ہوتی ہے۔ اور ویسے کوئی بیل جانور ہی ہے تو دوسری بات ہے۔ مثلاً ماں بہن وغیرہ۔ ان کی طرف طبعا میلان نہیں ہوتا۔ دوسری قسم وہ ہے، جن سے محض نفرت شرعی ہوتی ہے، جیسے جوان داماد، جوان ساس، سوتیلی ماں، بیٹے کی بیوی وغیرہ۔ ان رشتوں میں محض رشتہ کی وجہ سے شرعی حرمت ہے۔ ورنہ اگر بہو بیٹے کے نکاح میں نہ آتی تو

خود باپ اس سے نکاح کر سکتا تھا۔ اسی طرح سوتیلی ماں اگر باپ کے نکاح میں نہ آتی تو اس سے خود بیٹا نکاح کر سکتا تھا۔ لہٰذا ایسی صورتوں میں کوئی طبعی نفرت نہیں، صرف شرعی ممانعت ہے۔ سو چونکہ ایسی حالت میں خرابی کا احتمال بعید نہیں، اس لئے فقہاء نے ایسے محارم شرعی سے بھی پردہ کرنے کا حکم لگایا ہے۔ بلکہ بعض نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ چچا اپنی جوان بھتیجی کو بھی بے حجابانہ نہ دیکھے، کم از کم وہ اپنے لڑکوں ہی کے لئے تجویز کرنے کی نظر سے تو اسے دیکھے گا۔ پھر فرمایا کہ میرے والد اس پردہ کے معاملہ میں بہت اہتمام رکھتے تھے۔ (صفحہ ۱۸۴)

توجہ کے بارے میں اہم نکتہ

فرمایا: الحمد للہ، میں نے کبھی تصور شیخ نہیں کیا۔ کیونکہ تصور شیخ میں اپنی پوری توجہ کو مجتمع کرنا ہوتا ہے اور اس درجہ میں ہمہ تن متوجہ ہوئے بغیر نفعہ نہیں ہوتا۔ اور ایسی کامل توجہ کسی مخلوق کی طرف کرنا، اس سے خدا تعالیٰ کے سامنے شرم آتی ہے۔ البتہ حق تعالیٰ سے دعا کرنا اور خلوص کے ساتھ تعلیم و تلقین کرنا، یہ طریقہ سنت کے موافق ہے اور بہت نافع بھی ہے۔ رہی توجہ تو اس کا تعلق محض قوت خیالیہ سے ہے، جو مشق سے حاصل ہو جاتی ہے۔ توجہ کو مقبولیت سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن چونکہ وہ اچھے کام میں صرف کی جاتی ہے، اس لئے اچھی ہے، جیسے کشتی و پہلوانی کہ فی نفسہ عبادت نہیں، لیکن اگر اعداء دین کے مقابلہ میں اس سے کام لیا جائے تو وہ نیکی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے، جو غیر مسلم تک بھی اس کو حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی غیر متقی بھی اگر کسی کو توجہ دے تو گو وہ خود ایسا نہیں، لیکن توجہ کے اثر سے دوسرے کے قلب میں دینداری پیدا کر سکتا ہے، لیکن اس کے اثر کو بقاء حاصل نہیں۔ (۱۸۶)۔

شادی کا آسان ہونا

شادی کے متعلق فرمایا کہ جو کام نہایت ہی سہل تھا، اس کو لوگوں نے سخت دشوار بنا دیا، وہ کیا ہے شادی۔ صحابہؓ کے وقت میں ایسی خیال کی جاتی تھی، جیسے کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ دیکھئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نکاح ہوا اور حضور ﷺ تک کو خبر نہ ہوئی۔ حضور ﷺ نے کپڑے پر زرد داغ دیکھ کر پوچھا تو انہوں نے عرض کیا کہ انی تزوجت الخ۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ تک کو خبر نہیں کرتے تھے۔ نکاح ایسی سستی چیز ہے

کہ کچھ بھی نہیں لگتا۔ صرف ایجاب و قبول دو شخصوں کی موجودگی میں ہوتا ہے اور مہر بھی اس وقت ادا کرنا ضروری نہیں۔ کھانے پینے اور دیگر امور میں تو بالفعل اخراجات کی حاجت پڑتی ہے۔ (صفحہ ۱۹۷)

انبیاء علیہم السلام کی طرف سے بکریاں پالنے میں پوشیدہ حکمت

فرمایا: انبیاء کرام کی طرف سے بکریاں پالنے میں حکمت یہ ہے کہ انہیں سخت اور نرم مزاج لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، جس میں نہایت تحمل کی حاجت ہے۔ اس لئے انبیاء پہلے سے تحمل کے عادی بنائے جاتے ہیں کہ انہیں بکریاں پالنے کا حکم ہوتا ہے۔ بکریوں میں ہر قسم کی بکریاں ہوتی ہیں۔ وہ مختلف اطراف میں پھیل جاتی ہیں اور چرواہا تحمل کر کر کے انہیں جمع کرتا اور بٹورتا ہے اور ان کی اذیت کا متحمل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لوگ انبیاء سے بھاگتے ہیں اور تکالیف دیتے ہیں اور انبیاء انہیں تحمل کے ساتھ اپنی طرف لاتے ہیں اور نیز بکریوں میں مسکنت کا مضمون ہے ان کے پالنے والے میں بھی مسکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح اونٹوں میں رہنے کا یہ اثر ہے کہ اس کے نگہبان سخت مزاج ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۲۰۰)

تصور شیخ دفع خطرات کے لئے تعلیم کیا جاتا ہے

فرمایا: تصور شیخ کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ شیخ کا خیال اس عقیدہ سے کرنا کہ قبول عبادات کا ذریعہ ہے، جس طرح بعض افراد اس کی جسمانی صورت کو بھی اسی طرح کا واسطہ بناتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ نماز یا وظیفہ اہتمام کے ساتھ ایسی جگہ پڑھتے ہیں، جہاں شیخ آگے بیٹھا ہو یا خدا کو بصورت شیخ سمجھنا یہ تصور تو شرک ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شیخ کا خیال باندھنا، اس قصد سے کہ شیخ کے واردات اس کے اندر وارد ہو جائیں، یہ مباح ہے اور یہی تصور مستقل شغل ہے۔ صوفیہ کے نزدیک اسی کو رابطہ کہتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ میری طبیعت اس سے متنفر ہے اور وہ کراہت ایسی ہے، جیسے بعض کو اوجھڑی سے کراہت ہوتی ہے۔ جس کو کراہت طبعی سمجھئے اور وجہ اس کراہت کی یہ ہے کہ اس تصور میں بالکل مستغرق ہو جانا پڑتا ہے تو اس سے طبیعت منقبض ہو جاتی ہے کہ مخلوق کی طرف ایسی توجہ کے ساتھ مستغرق ہو، جس کے ساتھ دوسری توجہ جمع نہ ہو سکے۔ ایسی توجہ خاص حق ہے، اللہ تعالیٰ کا۔ تیسری صورت ہمارے حضرت کے یہاں تھی (یعنی

حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی) وہ یہ کہ اس تصور کو عبادت نہ سمجھے نہ واسطہ جانے، بلکہ تصور صرف خیال جمع کرنے کے لئے ہو کہ جس سے دفع خطرات ہوجائے اور جب خطرات دفع ہوجائیں پھر اس کو ترک کردے اور اس میں شیخ ہی کی تخصیص نہیں۔ جس چیز کے بھی تصور سے یہ بات حاصل ہو، اس کا تصور کافی ہے۔ مگر جس سے تعلق محبت والفت کا ہوتا ہے، اس کا تصور دوسرے تصورات کے دفع میں زیادہ نافع ہوتا ہے۔ سو چونکہ شیخ سے ایک خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے، اس لئے اس کا تصور اس غرض کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شیوخ کا معمول تھا کہ جب کوئی شخص ان سے بیعت ہونے کے لئے آتا تھا تو شیخ اس سے پوچھتے تھے کہ کسی سے محبت والہانہ بھی ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ محب کا خیال ایک ہی جانب ہوتا ہے، اس لئے توجہ الی اللہ کرنے کے لئے صرف ایک خیال دفع کرنے کی ضرورت ہوتی تھی ۔ وہ شیخ کی ذرا سی توجہ سے دفع ہوکر توجہ الی اللہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اگر خیالات بہت سے ہوں تو اس میں زیادہ مشقت اٹھانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بعض شیوخ نے مرید کو بھینس تک کا تصور بتایا۔ البتہ عشق ناجائز کی تعلیم کے لئے اجازت نہیں۔ بعض لوگ تصور شیخ کی بابت معترض ہوتے ہیں۔ مگر ان کو تفصیل معلوم نہیں اور نہ اس کا اندازہ ہے کہ جائز قسم میں کیا حکمت ہے۔ بات یہ ہے کہ:

در نیابد حال پختہ ہیچ خام

شیخ جو بات مناسب مرید کے دیکھتا ہے، اس پر عمل کراتا ہے اور اگر شبہ ہو کہ دفع خطرات جب ہر تصور سے ہوسکتا ہے تو حق تعالیٰ ہی کا تصور کیوں نہ کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ اللہ میاں چونکہ غائب ہیں، ان کا تصور بعض کو جمتا کم ہے۔ اس لئے دفع خیالات کے لئے موثر کم ہوتا ہے۔ اور اگر کسی شخص کو ایسا ہو کہ صرف اللہ میاں کا تصور دافع خیالات ہوسکے تو اس شخص کو تصور شیخ کی کوئی حاجت نہیں۔ (صفحہ ۲۰۱)

اپنے اعمال ناز کے قابل نہیں:

ایک شخص نے قصہ بیان کیا کہ ایک شخص کسی نہر پر غسل کرنے گیا۔ وہاں اسے پانچ سو روپے ملے۔ اس نے وہ رقم لاکر عدالت میں دے دی اور عدالت نے اعلان کیا کہ رقم جس کی ہو، لے جائے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد اسی شخص نے بہت ہی کمتر زیور کے لئے ایک لڑکے کو قتل کردیا اور جب تفتیش ہوئی تو اس نے اقرار کرلیا۔ لیکن حاکم اس کو

پہچانتا تھا۔ اس لئے اس نے تعجب کیا، اسے مجنون سمجھ کر اس کے اقرار کو غلط سمجھا۔ اس نے اپنے اقرار پر اصرار کیا۔ حاکم نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ صاحب، اس وقت دل ایسا ہی تھا اور اب دل اس طرح ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے قہر سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی مقلب القلوب ہیں۔ جس طرح چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ کسی کو اپنے اعمال پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا چاہئے اور ہر وقت دعاء واستغفار کرتے رہنا چاہئے۔ (مقالات حکمت حصہ دوم صفحہ ۳۷)

غریب فرد اور امانت کا بار:

فرمایا، جو لوگ محتاج اور تہی دست ہیں، انہیں چاہئے کہ اپنے پاس کسی کی امانت نہ رکھیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ ضرورت کے وقت نفس خرچ کرلینے پر نہ اکسائے اور اگرچہ خرچ کرتے وقت ارادہ ادا کرنے کا ہوتا ہے، لیکن ہر وقت میسر آنا تو آسان نہیں۔ علیٰ ہذا قرض بھی حتی الوسع نہ لینا چاہئے۔ اور اگر لیا جائے تو اسے بہت جلد ادا کردینا چاہئے، کیونکہ جب ہزاروں روپے کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور قرض خواہ بہت زیادہ ہوجاتے ہیں تو اس وقت قرض دار کی نیت ٹھیک نہیں رہتی۔ سمجھتا ہے کہ سب سے تو سبکدوش ہو نہیں سکتا، رسوائی تو ضرور ہوگی۔ اب ایک کی رسوائی اور دس کی، برابر ہے تو کسی کو بھی ادا نہ کرو۔ (مقالات حکمت حصہ دوم صفحہ ۳۸)

قریش سے دین کو بہت نفع پہنچا:

فرمایا، اس وقت تک اکثر امور دین میں زیادہ تر نفع، اولاد قریش ہی سے ہوا ہے۔ چنانچہ صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی یہ سب قریش ہی ہیں۔ اور ان سے دین کو بہت نفع پہنچا ہے، جس سے راز تقدم قریش کا منکشف ہوتا ہے۔ (صفحہ ۴۲)

حضور ﷺ کی اپنی امت سے شفقت:

فرمایا، جناب سرور عالم ﷺ کو اپنی امت سے اس قدر محبت تھی کہ بعض مرتبہ ساری ساری رات امت کے لئے دعائے مغفرت کی ہے۔ اور ہم نالائق امتی ہیں کہ اپنی حالت کیسی ابتر کرلی ہے اور حضور ﷺ کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ کبھی نہ سنا ہوگا کہ کسی نے تمام

حاجی امداداللہ صاحبؒ مہاجر مکی) وہ یہ کہ اس تصور کو عبادت نہ سمجھے نہ واسطہ جانے، بلکہ تصور صرف خیال جمع کرنے کے لئے ہو کہ جس سے دفع خطرات ہوجائے اور جب خطرات دفع ہوجائیں پھر اس کو ترک کردے اور اس میں شیخ ہی کی تخصیص نہیں۔ جس چیز کے بھی تصور سے یہ بات حاصل ہو، اس کا تصور کافی ہے۔ مگر جس سے تعلق محبت والفت کا ہوتا ہے، اس کا تصور دوسرے تصورات کے دفع میں زیادہ نافع ہوتا ہے۔ سو چونکہ شیخ سے ایک خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے، اس لئے اس کا تصور اس غرض کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شیوخ کا معمول تھا کہ جب کوئی شخص ان سے بیعت ہونے کے لئے آتا تھا تو شیخ اس سے پوچھتے تھے کہ کسی سے محبت والہانہ بھی ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ محبت کا خیال ایک ہی جانب ہوتا ہے، اس لئے توجہ الی اللہ کرنے کے لئے صرف ایک خیال دفع کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ شیخ کی ذرا سی توجہ سے دفع ہوکر توجہ الی اللہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اگر خیالات بہت سے ہوں تو اس میں زیادہ مشقت اٹھانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بعض شیوخ نے مرید کو بھینس تک کا تصور بتایا۔ البتہ عشق ناجائز کی تعلیم کے لئے اجازت نہیں۔ بعض لوگ تصور شیخ کی بابت معترض ہوتے ہیں۔ مگر ان کو تفصیل معلوم نہیں اور نہ اس کا اندازہ ہے کہ جائز قسم میں کیا حکمت ہے۔ بات یہ ہے کہ:

در نیابد حال پختہ ہیچ خام

شیخ جو بات مناسب مرید کے دیکھتا ہے، اس پر عمل کراتا ہے اور اگر شبہ ہو کہ دفع خطرات جب ہر تصور سے ہوسکتا ہے تو حق تعالیٰ ہی کا تصور کیوں نہ کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ اللہ میاں چونکہ غائب ہیں، ان کا تصور بعض کو جمتا کم ہے۔ اس لئے دفع خیالات کے لئے موثر کم ہوتا ہے۔ اور اگر کسی شخص کو ایسا ہو کہ صرف اللہ میاں کا تصور دافع خیالات ہوسکے تو اس شخص کو تصور شیخ کی کوئی حاجت نہیں۔ (صفحہ ۲۰۱)

اپنے اعمال ناز کے قابل نہیں:

ایک شخص نے قصہ بیان کیا کہ ایک شخص کسی نہر پر غسل کرنے گیا۔ وہاں اسے پانچ سو روپے ملے۔ اس نے وہ رقم لاکر عدالت میں دے دی اور عدالت نے اعلان کیا کہ رقم جس کی ہو، لے جائے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد اسی شخص نے بہت ہی کمتر زیور کے لئے ایک لڑکے کو قتل کردیا اور جب تفتیش ہوئی تو اس نے اقرار کرلیا۔ لیکن حاکم اس کو

پہچانتا تھا۔ اس لئے اس نے تعجب کیا، اسے مجنون سمجھ کر اس کے اقرار کو غلط سمجھا۔ اس نے اپنے اقرار پر اصرار کیا۔ حاکم نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ صاحب، اس وقت دل ایسا ہی تھا اور اب دل اس طرح ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے قہر سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی مقلب القلوب ہیں۔ جس طرح چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ کسی کو اپنے اعمال پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا چاہئے اور ہر وقت دعاء و استغفار کرتے رہنا چاہئے۔ (مقالات حکمت حصہ دوم صفحہ ۳۷)

غریب فرد اور امانت کا بار:

فرمایا، جو لوگ محتاج اور تہی دست ہیں، انہیں چاہئے کہ اپنے پاس کسی کی امانت نہ رکھیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ ضرورت کے وقت نفس خرچ کرلینے پر نہ اکسائے اور اگرچہ خرچ کرتے وقت ارادہ ادا کرنے کا ہوتا ہے، لیکن ہر وقت میسر آنا تو آسان نہیں۔ علیٰ ہذا قرضہ بھی حتی الوسع نہ لینا چاہئے۔ اور اگر لیا جائے تو اسے بہت جلد ادا کردینا چاہئے، کیونکہ جب ہزاروں روپے کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور قرض خواہ بہت زیادہ ہوجاتے ہیں تو اس وقت قرض دار کی نیت ٹھیک نہیں رہتی۔ سمجھتا ہے کہ سب سے تو سبکدوش ہو نہیں سکتا، رسوائی تو ضرور ہوگی۔ اب ایک کی رسوائی اور دس کی، برابر ہے تو کسی کو بھی ادا نہ کرو۔ (مقالات حکمت حصہ دوم صفحہ ۳۸)

قریش سے دین کو بہت نفع پہنچا:

فرمایا، اس وقت تک اکثر امور دین میں زیادہ تر نفع، اولاد قریش ہی سے ہوا ہے۔ چنانچہ صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی یہ سب قریش ہی ہیں۔ اور ان سے دین کو بہت نفع پہنچا ہے۔ جس سے راز تقدم قریش کا منکشف ہوتا ہے۔ (صفحہ ۴۲)

حضور ﷺ کی اپنی امت سے شفقت:

فرمایا، جناب سرور عالم ﷺ کو اپنی امت سے اس قدر محبت تھی کہ بعض مرتبہ ساری ساری رات امت کے لئے دعائے مغفرت کی ہے۔ اور ہم نالائق امتی ہیں کہ اپنی حالت کیسی ابتر کرلی ہے اور حضور ﷺ کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ کبھی نہ سنا ہوگا کہ کسی نے تمام

رات درود پڑھنے میں گزار دی ہو، الا ماشاء اللہ۔ (صفحہ۴۲)

محبت رسول اللہ ﷺ کے دعویداروں کی حالت:

فرمایا، اس زمانے میں اکثر لوگ سود اور رشوت کا روپیہ جمع کر کے سال میں ایک یا دو مرتبہ محفل مولود منعقد کرتے ہیں اور اسی حرام مال سے اس کا انتظام کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان کے اخلاق اور حالات کو دیکھا جائے تو نہ اعتقاد درست ہے، نہ اعمال ظاہر نہ اعمال باطن۔ معاشرت وغیرہ سب میں خلاف شرع، پھر سمجھتے ہیں کہ ہم محب رسول ﷺ ہیں، حاشا وکلا اور فرمایا کہ ہمارے دوستوں میں ایک شخص مولود کے بہت ہی شائق تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ ہم کثرت تعریف سے خوش نہیں ہوتے، بلکہ شدت اتباع سے خوش ہوتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمان صاحبؒ گنج مراد آبادی سے پوچھا گیا کہ آپ کے یہاں تو اتباع سنت ومحبت رسول زیادہ ملحوظ ہے۔ آپ مولود کیوں نہیں کرتے۔ فرمایا کہ ہم تو ہر وقت مولود کرتے ہیں، کیونکہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہیں۔ اگر حضور پیدا نہ ہوتے تو ہم یہ کلمہ کیونکہ پڑھ سکتے تو ذکر مولد تو ہر وقت ہماری زبان پر جاری ہے اور یہ بھی فرمایا (یعنی حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے) کہ میاں جو شخص سال بھر میں ایک دو مرتبہ یاد کر کے مدعی محبت ہو جائے اور وہ شخص جو ہر وقت درود شریف اور اتباع احکام سے یاد کرے، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ (صفحہ۴۳)

نسب کے بارے میں معتدل اظہار خیال:

فرمایا، اس زمانے میں لوگوں نے نسب کے سلسلہ میں بے حد افراط وتفریط کر رکھی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بے جا ہیں، یعنی محض نسب کو نجات کے لئے کافی سمجھنا بھی غلط ہے، کیونکہ خود حدیث میں ہے: یا فاطمة انقذی نفسک من النار۔ جس سے معلوم ہوا کہ نسب کے نافع ہونے کے لئے ایمان اور اتباع شرط ہے۔ بلکہ اس کے خلاف کی صورت میں بزرگوں کی اولاد پر زیادہ وبال کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں بھی مشاہدہ ہے کہ اگر اپنی اولاد نافرمانی کرے تو اس پر زیادہ غصہ آتا ہے، بنسبت اجنبی کی مخالفت کے۔ اسی طرح نسب کو محض بیکار سمجھنا، یہ بھی غلطی ہے۔ قرآن میں ہے: والذین آمنوا واتبعتهم ذريتهم بايمان الحقنا بهم ذريتهم الخ۔ لحوق کے معنی یہ ہیں کہ وہ اور ان کی اولاد دونوں جنت کے ایک ہی درجے میں ہے اور اولاد کے عمل کی کمی پوری کر دی جائے گی۔ یہ نفع ہے نسب کا، لیکن یہ نسب مخصوص نہیں، معنی اصطلاحی کے ساتھ۔ بلکہ مطلق انتساب الی المقبول نافع ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی دنی النسب ہو اور بزرگ ہو عند اللہ (مثلاً کوئی جلاہا) تو وہ بھی اپنی اولاد کے کام آئے گا۔ یہ نہیں کہ صرف شریف النسب ہی کام آئے اور دنی النسب کی بزرگی اس کی اولاد کے لئے کارآمد نہ ہو۔ حاشا وکلا۔ (صفحہ۴۴)

عبادات میں لذت کا مسئلہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس جواب سے کہ ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ ایک عجیب مسئلے پر استدلال ہو سکتا ہے، جو ذاکرین کے لئے بے حد مفید ہے۔ یعنی اکثر ذاکرین اپنے ذکر میں لذت کے طالب ہوتے ہیں اور وہ اللہ کو مقصود سمجھنے کے بجائے لذات کے طالب ہوتے ہیں۔ حالانکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ اللہ کی رضا ہو، گو لذت نہ ہو۔ یہ مسئلہ من الصابرین سے واضح ہوا اور تلخی امتثال پر صبر ہو، ورنہ اگر لذت مقصود ہوتی تو بجائے من الصابرین کے من المتلذذین فرماتے، مگر من الصابرین فرمایا اور صبر ہمیشہ تلخی اور بے مزگی ہی میں ہوتا ہے۔ اس سے لذت کا غیر مقصود ہونا ثابت ہو گیا۔ بلکہ بعض محققین کا قول ہے کہ جس عبادت میں لذت نہ ہو، وہ ایک حیثیت سے لذت والی عبادت سے افضل ہے۔ کیونکہ جب عبادت میں لذت مقصود ہوئی تو ممکن ہے وہ بوجہ لذت کے ادا کی گئی ہو اور امتحان اور کمال اس امر میں ہے، جو خلاف طبع ہو، مگر آج کل طالبین کا خیال اس کے برعکس ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شیوخ میں خود خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ میں اکثر خود بھی فن تصوف سے بے خبر ہیں۔ مگر بزرگی کی مسند پر فائز ہیں تن ہے اور تعلیم دیتے ہیں۔ ان کو یہی خبر نہیں ہوتی کہ طالب کا اصل مرض کیا ہے اور اس کا مناسب علاج کیا ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ضروری ہے۔ دیکھیں، اگر طبیب جسمانی مرض سے واقف نہ ہو تو اس کا علاج ہمیشہ مضر ہوتا ہے۔ اسی طرح ان خام کاروں سے مدت العمر وابستگی کے باوجود مریدوں کی تشویش دور نہیں ہوتی۔ (صفحہ۴۶)

روحانی امراض کے ازالہ پر ناز نہ ہونا چاہئے:

فرمایا، تصوف سے مقصود یہ ہے کہ اخلاق کی اصلاح ہوجائے، لیکن یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ ہاں اس پر شکر کرنا چاہئے۔ دیکھو، اگر کسی کو مرض سے صحت حاصل ہو تو کبھی اس کو فخر کرتے نہ دیکھا ہوگا۔ ہاں، شکر ادا کرتے ہیں کہ خدا نے اسے ایک مرض سے نجات بخشی۔ اس میں فخر کی کیا بات ہے۔ اور اگر کسی کو کرامات اور معارف بھی میسر آجائیں تو اس پر بھی کیا فخر کیا جائے، کیونکہ وہ اپنے اختیار سے بالکل خارج ہیں۔ بلکہ اس دولت کے حصول کے بعد یوں سمجھنا چاہئے کہ بادشاہ نے ایک چمار کو گراں بہا لعل دے دیئے ہیں کہ وہ جب چاہے، واپس لے لے۔ تو اس سے یہ چمار فخر نہیں کرسکتا۔ اسی طرح بندے کو چاہئے کہ حق تعالیٰ کی مہربانی اور عطیے پر ہر وقت شکر ادا کرے اور ہمیشہ ترساں ولرزاں رہے کہ ایسا نہ ہو کہ مجھ سے اس امانت کے ادائے حقوق میں کوتاہی واقع ہوجائے۔ باقی فخر وغیرہ یہ سب خرابی ناواقفی کے سبب سے ہے۔ (صفحہ ۴۶)

ادھار کے بارے میں احتیاط:

فرمایا میری عادت یہ ہے کہ اول تو حتی الوسع کسی کی چیز عاریۃً نہیں لیتا اور اگر کبھی کسی مجبوری سے کوئی چیز لینی پڑی تو فراغت کے بعد اسے فوراً پہنچا دیتا ہوں، تاکہ قلب مطمئن ہوجائے۔ اکثر لوگ اس سے بالکل غافل ہیں۔ حالانکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اخلاق کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی کو دوسرے سے اذیت نہ پہنچے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ کوئی اپنے بھائی کی لکڑی نہ اٹھائے، کیونکہ وہ پریشان ہوگا (لا لاعبا ولا جادا) یعنی نہ ہنسی میں اور نہ ارادۃً لے (ایسی ہنسی سے ممانعت کا سبب وہی اذیت ہے)۔ (صفحہ ۴۷)

ہدیہ کے بارے میں:

فرمایا، زیادہ ہدیہ دینے میں اگر خلوص ہو تو اس کے قبول کرنے میں مضائقہ نہیں، لیکن خلوص کا دیکھ لینا نہایت ضروری ہے۔ نیز خلوص کے ساتھ دینے والے کی گنجائش کو بھی ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ بعض اوقات مخلصین کو خلوص اور جوش محبت تو ہوتا ہے، مگر وہ اپنی

گنجائش سے زیادہ خرچ کردیتے ہیں۔ تو جب وہ ہمارے ساتھ ایسی مروت کرتے ہیں تو ہمیں بھی ان کے ساتھ مروت اور رعایت کرنی چاہئے کہ بالکل آنکھ نہ بند کرلیں کہ جو آیا، اسے قبول کرلیا۔ بسا اوقات لوگ جوش میں زیادہ صرف کردیتے ہیں اور پھر طبعاً افسوس کیا کرتے ہیں یا ان پر بار ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۵۰)

دنیا کے طالبوں کی حالت زار:

فرمایا، دنیا کے طالب صرف خداتعالیٰ ہی کے نزدیک مبغوض نہیں ہیں، بلکہ خود اہل دنیا کے نزدیک بھی وہ مبغوض ہیں۔ چنانچہ ان کے درمیان جب کبھی عداوت ہوتی ہے، تو وہ دنیا طلبی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ اہل اللہ کے ساتھ کسی کو بھی عداوت نہیں ہوتی۔ دنیا دار جس طرح دین کے معاملات میں اہل اللہ کے محتاج ہیں، اسی طرح معاملاتِ دنیا میں بھی ان کے محتاج ہیں۔ ان سے کبھی تعویذ کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی دعا کی حاجت ہوتی ہے، ان کی دعوتیں کرتے ہیں، آؤ بھگت کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ان کی بدولت دنیا حاصل ہو۔ (صفحہ ۵۱)

ضرورت سے زائد مال و جاہ کے نقصانات:

فرمایا، حب مال و جاہ سے یعنی ان کو مقصود بالذات سمجھنے سے اکثر دین کے ضیاع تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں مقصود بالعرض ہیں۔ چنانچہ خداتعالیٰ نے مال کو منفعت کا ذریعہ بنایا ہے اور اکثر لوگوں کو اتنا مال یا اس کے اسباب بسہولت حاصل بھی ہیں۔ پھر مال کی زیادہ طلبی میں کیوں کاوش کی جائے۔ ہاں اگر کسی کو اتنا مال بھی میسر نہ ہو تو اس کے لئے کوشش کرنا مضائقہ نہیں۔ لیکن جب بقدر ضرورت حاصل ہوجائے تو پھر زیادہ کی کوشش چھوڑ دینا چاہئے اور اسی طرح جاہ کو اللہ تعالیٰ نے نقصان سے بچاؤ کا ذریعہ بنایا ہے، جاہ سے ایسی منفعت حاصل کرنا، جس سے دوسروں کو ضرر ہو، حرام ہے۔ مثلاً اس عہدے سے پیسے کمانے لگے، جاہ صرف اس قدر درکار ہے، تاکہ فرو مفسدین کے شر سے محفوظ رہے۔ سو الحمدللہ ہمیں اس قدر جاہ بھی حاصل ہے۔ مثلاً پولیس اگر بیگار میں پکڑنا چاہے تو چماروں اور مہتروں کو پکڑے گی اور ہمیں چھوڑ دے گی۔ باقی اس سے زیادہ مال و مرتبہ کے درپے ہونا، تکبر تک پہنچا دیتا ہے۔ نیز جب عہدہ و حیثیت زیادہ ہوجاتی ہے تو

اس سے دو طرح کا نقصان ہوتا ہے۔ ایک تو معتقدین اور محبین میں سے کوئی ہاتھ چومتا ہے، کوئی قطب سمجھتا ہے۔ پھر اس اعتقاد سے طرح طرح کی فرمائشیں ہوتی ہیں اور جب یہ تمام اوصاف اس ذی جاہ کے کانوں تک پہنچتے ہیں تو اس کو بھی ایک طرح کی مسرت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اخلاق تباہ ہوجاتے ہیں اور اس میں پندار اور عجب پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرا نقصان مخالفین اور معاندین سے پہنچتا ہے کہ انہیں رشک اور حسد لاحق ہوجاتا ہے۔ اور اس کے ازالے کی کوشش کرتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک اپنے کام سے رہ جاتا ہے اور غیر ضروری چیزوں میں مشغول ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۵۳)

تین چیزوں کے اہتمام کی ضرورت:

فرمایا، اگر تین باتوں کا انتظام کیا جائے تو ان شاء اللہ محرومی نہ ہوگی، اگرچہ سالک جنید بغدادیؒ نہ بن سکے۔ ایک تو یہ کہ گناہوں کو بالکل ترک کیا جائے، کیونکہ گناہوں سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ عاصی اگر عبادت بھی کرتا ہے تو اس کے نور کی مثال مثل نور فانوس مشبک کے ہوتی ہے کہ اس کا نور ظلمت سے ملا جلا ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ خلق خدا پر بدگمان نہ ہوا جائے کہ اس سے کبر پیدا ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اوقات فرصت میں کچھ ذکر و شغل کیا جائے اور حضرات صوفیاء کرام سے رابطہ رکھا جائے۔ (صفحہ ۵۴)

اسرار کو پوشیدہ رکھنا:

فرمایا، اپنے حالات اور اسرار کسی کو نہ بتانے چاہیے۔ اگرچہ کوئی کتنا ہی مخلص دوست کیوں نہ ہو۔ یہ اسرار ایسے ہیں، جیسے کوئی شخص اپنے محبوب کو ہر شخص سے چھپانا چاہے۔ ایسا کون ہوگا، جو اپنی بیوی کو کسی دوست کی بغل میں دینا گوارا کرے، ہرگز نہیں۔ (صفحہ ۵۷)

ذکر و فکر سے دنیاداری کا مقصود ہونا:

فرمایا، بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں محض اس لئے رہتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکہ دے سکیں۔ اور یہ کہہ سکیں کہ ہم فلاں بزرگ کی خدمت میں بھی رہے ہیں اور وہاں سے ہمیں اجازت حاصل ہوئی ہے اور اس ذریعہ سے وہ دنیا کمانے لگتے ہیں۔ ان کا مقصود

قرب اور رضائے حق ہرگز نہیں ہوتا۔ انہیں ذرا سی بات حاصل ہوجائے تو اس پر ناز کرنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم واصل بہ حق ہوگئے۔ (صفحہ ۵۸)

بندہ کے ساتھ، اللہ کی مصلحتیں

فرمایا، حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں فرماتے۔ وہ اپنے بندوں کے احوال کو خوب جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں صحت اور خوشحالی عطا کی جائے تو شاید ان کا ایمان بھی سلامت نہ رہ سکے۔ ایسے لوگوں کو وہ اپنے کرم اور شفقت سے ہمیشہ بیمار یا کسی فکر میں مبتلا رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر انہیں بیماری ہوتی ہے یا اور کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ان کا ایمان باقی نہ رہتا۔ ایسوں کو اپنے فضل سے تندرست رکھتے ہیں اور میرے نزدیک حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو جو فرمایا کہ **ھذا عطاء نا فامن او امسک بغیر حساب**۔ اس کا مبنیٰ بھی یہی قاعدہ ہے اور فرمایا کہ اگرچہ کسی تفسیر میں نہیں دیکھا، لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ بغیر حساب کے معنیٰ یہ ہیں کہ حساب کتاب کے خوف سے مامون رہیں۔ کیونکہ اتنی بڑی عطا کے بعد حساب و کتاب کا اندیشہ طبیعت کو ضعیف کردیتا ہے، اس لئے اس سے فارغ کردیا، ان کے مناسب یہی تھا اور بعض انبیاء علیہم السلام کے لئے خود کثرت مال ہی مناسب نہ تھی، ان کو مال کثیر نہیں دیا، وعلیٰ ہذا بعض کو مبتلائے مصائب کرتے ہیں، تاکہ وہ صبر کریں اور بعض کو اس سے محفوظ رکھتے ہیں، تاکہ وہ شکر کریں۔ بعض پر خوف و خشیت کو غالب کردیتے ہیں اور بعض پر امید و رجا کو غالب فرمادیتے ہیں۔ غرض کہ جو جس کے مناسب ہوا، اس کو عطا فرمایا۔ خوب کہا ہے:

بہ گوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست
بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

(صفحہ ٦١)

اولیاء کرام کے مختلف ذوق:

فرمایا، ہم بعض بزرگوں کو دیکھتے ہیں کہ ہدایا کو بالکل قبول نہیں فرماتے اور بعض کو دیکھتے ہیں کہ وہ مطلقاً قبول کرلیتے ہیں اور بعض تفتیش بہت کرتے ہیں اور بعض غرباء سے

لیتے ہیں اور امراء سے نہیں لیتے۔ ہم ایک تو حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ ہم کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہر شخص کے ساتھ ملائمت اور نرمی سے پیش آتے تھے۔ کسی پر اعتراض نہیں فرماتے تھے اور ایک حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہ ہم کو دیکھتے ہیں۔ وہاں ہر شخص کی خبر لی جاتی تھی۔ (صفحہ ۶۲)

بزرگوں کی مختلف حالتیں:

فرمایا، بزرگ اگرچہ مختلف الاحوال ہوتے ہیں، لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے وہ ہے اللہ کے رضاء کی طلب اور وہ اختلاف احوال صرف طبائع اور زمان و مکان کے اختلاف سے ہوتا ہے۔ مثلاً بعض بزرگ روپے کو جمع رہنے دیتے ہیں اور بعض سب خرچ کر دیتے ہیں۔ بعض کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر ان کے پاس کچھ بھی رہتا ہے تو انہیں خلجان رہتا ہے اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ کسی طرح خرچ ہو جائے۔ چنانچہ حدیث میں بھی ہے کہ اگر شام کے وقت درہم و دینار سے کچھ بھی رہتا تھا تو حضور ﷺ کو اس سے ایذاء ہوتی تھی۔ (صفحہ ۶۲)

لباس کا فخریہ استعمال:

ایک روز سالکین میں سے ایک شخص سیاہ پاجامہ اور سیاہ عمامہ اور سیاہ صدری پہن کر آئے جو زیب و زینت کی ایک صورت تھی۔ اس پر فرمایا کہ تم لوگ جس غرض کے لئے یہاں آئے، ہو یہ وضع اس کے مناسب نہیں، بلکہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس ہیئت سے تکبر کی شان پیدا ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑے رئیس ہیں۔ پھر فرمایا کہ صدری پہننے کی کیا غرض ہے، سوائے اس کے کہ زینت ہو۔ خاص کر اس وقت جب کہ گرمی کا بھی موسم ہے۔ اس شخص نے اقرار کیا کہ میں نے زینت کے لئے پہنی ہے۔ فرمایا کہ جاؤ اس وضع کو بدلو اور فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے: البذاذة من الایمان، یعنی سادگی ایمان کی بات ہے۔ اس طرف کسی کو خیال نہیں ہوتا اور فرمایا کہ یہ ہیئت اگرچہ نصاب مذموم نہیں ہے، لیکن وجدان سلیم سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کونسی ہیئت کس نیت سے بنائی ہے۔ فرمایا کہ لباس فاخر اگر اپنی تفریح طبع کے لئے ہو تو جائز ہے اور وہ اس آیت کے تحت میں داخل ہے: قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ الخ اور اگر لوگوں میں

اپنا فخر جتانے کی غرض سے ہو تو حرام ہے اور اس آیت کے تحت میں داخل ہے: وزینة وتفاخر بینکم. اس تقریر سے معلوم ہوا کہ زینت کی دو قسمیں ہیں۔ (صفحہ ۶۳)

اہل کمال کا اختلاف:

فرمایا، اہل کمال میں اجتہادی امور میں اختلاف ہونا لازمی امر ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ میں کیسا اختلاف ہے۔ مگر یہ اختلاف محض اختلاف رائے تھا، اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ تھی، اس لئے ایک دوسرے سے کوئی رنجش نہ تھی۔ (صفحہ ۶۸)

فساد کا موجب، نفسانیت ہی ہوتی ہے:

فرمایا، جب کبھی فساد ہوتا ہے تو وہ محض نفسانیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی جہاں تک اختلاف آراء کا تعلق ہے تو اس میں کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وکلاء عدالت میں کس قدر بحث کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف بولتے ہیں، لیکن جب وہ عدالت سے باہر آتے ہیں تو ایک ہو جاتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ضابطہ کا اختلاف ہوتا ہے۔ (صفحہ ۶۸)

امراء سے عدم سفارش و فرمائش میں حکمت:

فرمایا، آجکل امراء کو علماء کے ساتھ اعتراض اس وقت تک ہے، جب تک کہ ان سے فرمائشیں نہیں کی جاتیں، اور جس دن سے سفارش وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوگیا، بس اسی روز سے اعتقاد بھی کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ دیکھئے یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ امراء سے کسی قسم کی فرمائش کا تعلق نہ رکھا جائے۔ تاکہ ان کو جو ہم سے دینی تعلق ہے، وہ تو باقی رہے، جس کی وجہ سے وہ ہم سے دین کا راستہ تو پوچھتے ہیں۔ (صفحہ ۷۰)

اپنی حالت پر ناز کیسا:

اکثر لوگوں کو جو اپنی عبادت یا کسی اپنی حالت پر ناز ہو جاتا ہے، اس کی بابت فرمایا کہ جب خداوند کریم، حضور پر نور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں: ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا. الا رحمة من ربک ان فضلہ کان

علیک کبیرا. یعنی اگر ہم چاہیں تو یہ سب علوم جو وحی کے ذریعے آپ کو عطا کئے ہیں آپ سے سلب کرلیں تو دوسرا کون شخص ہے کہ اپنی کسی حالت پر ناز کرسکے۔ بلکہ ہر وقت تغیر وزوال سے ترساں ولرزاں رہنا چاہئے۔ (صفحہ۷۲)

دو خوفوں کا ایک ساتھ جمع نہ ہونا:

فرمایا، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی میں دو خوف جمع نہ ہوں گے۔ جو شخص دنیا میں خائف رہے گا، وہ قیامت میں لاخوف علیهم کا مصداق ہوگا اور جو دنیا میں بیباک رہے گا، وہ آخرت میں خوف میں مبتلا ہوگا۔ تو انسان کو چاہئے کہ خائف اور امید وار رہے۔ (صفحہ۷۲)

امراء کی دعوت میں نقصان:

فرمایا، اکثر بزرگ جو امراء کی دعوت قبول نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امراء دعوت کرکے اپنا احسان ظاہر کرتے ہیں اور یہ بھی نہ کریں تو دل میں تو سمجھتے ہی ہیں اور غرباء الٹا اپنے اوپر احسان سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دعوت قبول کرلی۔ یہ تفاوت خلوص کا ہے۔ (صفحہ۷۳)

حسن اعتقادی کے ساتھ بد اعتقادی کی افادیت:

فرمایا، (تکوینی طور پر) مصلحت ہے کہ ہر شخص سے کچھ لوگ بداعتقاد اور معترض بھی رہیں، تاکہ اسے اپنی کسی حالت پر عجب پیدا نہ ہو۔ چنانچہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب مرحوم ایک مرتبہ ایک سرائے میں مقیم تھے۔ وہاں ایک ہندو مہاجن بھی مقیم تھا۔ رات کو اس بنئے کے ہاتھ سے کسی نے کپڑے نکال لئے اور مولانا بھی صبح کی نماز سے قبل ہی سرائے سے اٹھ کر تشریف لے گئے۔ چونکہ مولانا کا لباس بالکل معمولی تھا، اس لئے اس بنئے کو یہ خیال ہوا کہ کپڑے وہ بڈھا نکال کر لے گیا ہوگا۔ آخر وہ دوڑا گیا اور راستے میں آپ کو پکڑ کر سخت گستاخی سے پیش آیا۔ پھر جھنجھانہ کی پولیس میں لے گیا۔ وہاں داروغہ آپ کا معتقد تھا۔ اس نے جو مولانا کو اس حالت میں دیکھا تو اس بنئے پر سخت برہم ہونے لگا۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اس کو کچھ نہ کہنا، یہ معذور ہے، کیونکہ اس کی چیز گم

ہوگئی ہے، اور اس بنئے سے فرمایا کہ تم بھاگ جاؤ، اس واقعہ کے بعد فرماتے تھے کہ جب کبھی لوگ ہاتھ پاؤں چومتے ہیں اور نفس میں عجب پیدا ہونے کا ڈر ہوتا ہے تو اس واقعہ کو یاد کرکے نفس سے کہتا ہوں کہ تو تو بس اس لائق ہے۔ اپنی اس حالت کو یاد کرلے، بس یہ خدا کا فضل ہے کہ باوجود اس کے، خدا تعالیٰ نے تجھ کو اتنی عزت دی ہے۔ (صفحہ۷۴)۔

نہ کسی کو دھوکہ دیں، نہ دھوکہ کھائیں:

بعض طلباء غلہ تولے بغیر پنساری کو دے دیتے ہیں اور بے تولے ہی لے لیتے ہیں ایک مرتبہ ان طلباء سے فرمایا کہ ایک ترازو خرید کرلو، تاکہ دھوکہ نہ کھاسکو، کیونکہ دھوکہ کھانا بیوقوفی کی علامت ہے۔ باقی جو حدیث میں آیا ہے: المومن غر کریم. اس میں لفظ کریم گویا تفسیر ہے۔ یعنی بوجہ اپنے کرم کے ناآزمودہ کار بن جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ مومن کی عقل کم ہوتی ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ یہ حدیث مقابل ہے۔ خب لئیم کے اور خب کے معنیٰ ہیں فریب دہندہ کے۔ پس غر سے مراد ہے کہ خب نہ ہو، یعنی کسی کو فریب نہ دے، اور فریب نہ دینا، جیسا محمود ہے، ایسا ہی فریب نہ کھانا بھی محمود اور فضائل میں سے ہے۔ ہرقل نے حضرت عمرؓ کے سفیر سے دریافت کیا کہ تمہارے خلیفہ کے اخلاق کیسے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ لایخدع ولا یخدع وہ نہ فریب دیتے ہیں، نہ فریب کھاتے ہیں۔ ہرقل نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اس شخص کی دینداری تو اس سے ظاہر ہے کہ کسی کو فریب نہیں دیتا اور کمال عقل اس سے ظاہر ہے کہ وہ کسی سے فریب نہیں کھاتا۔ اور جو شخص عاقل بھی ہو اور متدین بھی وہ مؤید من الله ہوتا ہے۔ ایسے شخص کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ ان کی اطاعت ضرور قبول کرلینی چاہئے۔ مگر ان کی کسی نے موافقت نہیں کی۔ (صفحہ۷۴)

اہل ذکر کو، ذکر میں لذت کا حاصل ہونا:

حضرات صوفیاء کرامؒ کے ذکر کے متعلق فرمایا کہ ان حضرات کے تذکرے میں بہت لذت آتی ہے، بخلاف تذکرۂ علماء ظاہر کے۔ مثلاً امام رازیؒ وغیرہ کہ ان کے ذکر میں لذت نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرات صوفیاء اہل محبت ہیں۔ ان کے تذکرے میں بھی محبت کا اثر ہوتا ہے اور اس سے روح لذت یاب ہوتی ہے۔ (صفحہ۷۵)۔

دشوار علوم کا آسان ہونا:

فرمایا، حضرات اہل اللہ کو اکثر دشوار علوم آسان ہوجاتے ہیں اور جو دقائق اور حقائق اور نکات ان حضرات کو منکشف ہوتے ہیں وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتے۔ (صفحہ ۷۷)

بڑا سمجھنے کا نتیجہ:

فرمایا، جو شخص اپنے کو بڑا اور بزرگ سمجھنے لگتا ہے، وہ خدا کے نزدیک بھی خوار ہوتا ہے اور مخلوق کی نظروں میں بھی ذلیل ہوتا ہے۔ (صفحہ ۷۷)

کشف سے پابندیوں کا عائد ہونا:

فرمایا، مقربین کو حضور ﷺ کی سنن عادیہ کے ترک کرنے پر بھی تنبیہ کی جاتی ہے اور توبیخ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص عرفاء میں سے خلوت میں بیٹھے تھے۔ اس حالت میں پیر پھیلا دیئے، فوراً عتاب ہوا کہ دربارِ سلاطین میں بھی پیر پھیلا کر بیٹھتے ہو۔ پھر انہوں نے تمام عمر پیر نہیں پھیلائے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ نے کبھی پیر پھیلا کر آرام نہیں فرمایا۔ اور ایک مرتبہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ محبوب کے سامنے پیر پھیلانا گستاخی ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ ذاکر شاغل لوگ کشف و تجلی کے خواہاں ہوتے ہیں، لیکن ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کشف وغیرہ نہ ہونا بہتر ہے، ورنہ ایسی ذمہ داریاں ان پر عائد ہوں کہ زندگی وبال ہوجائے۔ (صفحہ ۸۴)

تدبیر کے اختیار کرنے کی اہمیت:

ایک شخص حضرت مولانا سے تعویذ لینے آیا کہ اس کی بہو اس کی اطاعت نہیں کرتی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کا تعویذ یہ ہے کہ تم اسے اور اپنے لڑکے کو جدا کردو۔ پھر وہ نہایت درجہ مطیع ہوجائے گی۔ دوسرے میں خود تعویذات اور عملیات نہیں جانتا۔ ہاں، دعا کرالو، ان امور میں دعا و تعویذ کا اثر اتنا ہی ہے کہ اگر کوئی تدبیر کرے تو یہ اس میں معین ہوجاتے ہیں۔ باقی فقط تعویذ اور دعا پر اکتفا کرنے سے کچھ بھی نفع نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص چاہے کہ مجھے اولاد ہو اور نکاح نہ کرے یا چاہے کہ مجھے بہت سا اناج مل جائے اور زراعت نہ

کرے، یا چاہے کہ مجھے نفع ہو اور تجارت نہ کرے، بلکہ ان سب کے بجائے بزرگوں سے دعا کرایا کرے اور تعویذ لے کر رکھ لے تو یہ کھلا جنون ہے۔ پھر فرمایا کہ اس زمانے کی عورتیں آزادی پسند ہیں۔ بعد نکاح ہی اس ادھیڑ بن میں رہتی ہیں کہ کسی تدبیر سے ساس اور سسر سے علیحدہ ہوجائیں۔ انہیں اپنے مرد کے دو چار پیسے خسر کے ہزار ہا روپے سے زیادہ مرغوب ہوتے ہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ رہ کر فاقہ کشی کو خسر کے گھر کی ریاست پر ترجیح دیتی ہیں۔ انہی خیالات کی وجہ سے گھروں میں جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۸۸)

شادی کے بعد الگ گھر کی ضرورت:

فرمایا، بعض لوگ عرفی بدنامی کے خوف سے اپنے والدین سے جدا نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ رہ کر ہمیشہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ تو راحت اور نیک نامی تو جمع نہیں ہوسکتی، مگر راحت ایسی نیک نامی سے زیادہ ضروری ہے۔ پس اس زمانے میں نکاح کے بعد یہی چاہئے کہ فرد علیحدہ رہے اور جو کچھ بھی ہوسکے، اپنی کمائی سے والدین کی جدا خدمت کرے۔ (صفحہ ۸۹)

ازخود ذکر وفکر سے نقصان کا ہونا:

ایک صاحب نے مسئلہ پوچھا کہ فلاں طالب علم آخر شب میں اٹھتا ہے اور ذکر کرتا ہے اور الا اللہ پر پہنچ کر اس کی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ اس کو بالکل ہوش نہیں رہتا۔ تو اس حالت میں وضو رہتا ہے یا نہیں؟ فرمایا، اذکار و اشغال بغیر تعلیم کے ہرگز نہ کرنے چاہئیں کہ ان سے بسا اوقات ضرر ہوجاتا ہے۔ وہ طالب علم ازخود ذکر کیا کرتا تھا۔ (صفحہ ۹۳)۔

شیطان کا وظیفہ پڑھنا:

فرمایا، ایک جاہل فقیر نے مرید کو یہ تعلیم کیا کہ یا شیطان یا شیطان کا وظیفہ پڑھا کرو اور چالیس دن تک اس کو پڑھو۔ چنانچہ اس نے پڑھا۔ جب چالیس روز پورے ہوگئے تو شیطان اس کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو کیوں پکارا کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ کل

بتاؤں گا اور اپنے پیر سے پوچھا کہ شیطان آیا تھا۔ اب میں اس سے کیا کہوں؟ پیر صاحب نے کہا کہ اول تو اس کو خدا کی قسم دینا۔ اس کے بعد کہنا کہ نزع کے وقت میرے پاس نہ آنا۔ چنانچہ اس مرید نے ایسا ہی کیا۔ شیطان بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ خیر، اب تو میں نے قسم کھالی ہے۔ اس کے خلاف نہ کروں گا اور نزع کے وقت تمہارے پاس نہ آؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ اب سلب ایمان کا خوف نہیں رہا۔ فرمایا کہ یہ سب لغو باتیں ہیں۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں ہے: انه ليس له سلطن على الذين آمنوا وعلى ربهم يتوكلون انما سلطنه على الذين يتولونه والذين هم به مشركون۔ پس اگر کوئی شخص ایمان لائے اور توکل کرے اور شیطان کے ساتھ دوستی نہ کرے، اس پر شیطان کا غلبہ ہرگز نہ ہوگا۔ شیطان کے عدم تسلط کی تدبیر تو یہی ہے، نہ کہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھ کر اس کو بلایا جائے اور پھر اس کو قسم دے کر اس پر بھروسہ کیا جائے۔ جہل سے یہ ساری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ (صفحہ ۹۴)

خاموشی کی برکات:

فرمایا تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ سکوت سے قلب میں جو بات پیدا ہوتی ہے، وہ گفتگو کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ وہ گفتگو محمود ہی کیوں نہ ہو، لیکن حد ضرورت سے زائد ہو۔ شیخ فرید رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

دل ز پر گفتن بمیرد دربدن
گرچہ گفتارش بود درعدن
(صفحہ ۹۷)

پیچھے سے پکارنے والے کو جواب نہ دینا:

فرمایا، امام ابو حنیفہ جو نہایت متقی اور نہایت حلیم اور نہایت پرہیزگار تھے۔ انہوں نے اپنی وصیت میں امام ابو یوسفؒ کو فرمایا ہے کہ اگر تمہیں کوئی پشت کی طرف سے آواز دے تو اسے جواب نہ دو اور نہ اس کی طرف التفات کرو، کیونکہ اس نے تم کو حیوان سمجھا کہ حیوان کو پشت کی جانب سے آواز دیتے ہیں اور جب اس نے تمہارے ساتھ یہ برتاؤ

کیا تو تم اس کے ساتھ انسان کا برتاؤ کیوں ضروری سمجھو۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے، اصلاح اور تنبیہ کا اور یہی نیت ہونی چاہئے، نہ کہ کبر کی۔ (صفحہ ۱۰۰)

اصلاح عملی کا زیادہ نافع ہونا:

فرمایا، حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں بلا اجازت کے خیمے میں چلے آئے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم نے اجازت کیوں نہیں لی؟ پھر فرمایا باہر جاؤ اور اذن طلب کرنے کے بعد پھر آؤ اور ایک دوسرے شخص سے اشارہ فرمایا کہ ان کو طریقہ سکھا دو۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام اور ہر معاملے کا جداگانہ طریقہ ہے۔ اس طریقہ کے مطابق ہی کام کرنا چاہئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اصلاح عملی زیادہ نافع ہے۔ (صفحہ ۱۰۰)

امراء کی صحبت کے اثرات:

فرمایا، امراء کی صحبت سے میری طبیعت نہایت ہی منقبض ہوتی ہے اور فرمایا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امراء کی صحبت میں بیٹھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا پنجرے میں بند کردیا گیا ہوں۔ (صفحہ ۱۰۳)

کمال کو عطیہ سمجھنا:

فرمایا، اگر کسی میں کوئی کمال ہو اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے تو یہ اس کا شکریہ ہے اور اگر اسی اعتقاد سے اسے ظاہر کرے تو یہ نعمت کے اظہار کی صورت ہے۔ (صفحہ ۱۰۷)

نسبت کا از خود ادراک ہوجانا:

فرمایا، اگر کسی مرید کو شیخ نے اجازت کی تلقین نہ دی ہو اور وہ اپنے اندر تلقین کی قوت پاتا ہے یا تو اسے جائز ہے کہ وہ بغیر اجازت بھی دوسرے کو تعلیم کردے۔ پس تعلیم اور بیعت لینے میں اجازت تو شرط نہیں، لیکن کسی کا مرید ہونا شرط ہے۔ مولوی عبدالعلیم صاحب نے پوچھا کہ وہ قوت کیونکر دریافت ہوسکتی ہے۔ فرمایا، خود بخود معلوم ہوجاتی ہے، جس طرح اس شخص کو جو بالغ ہوتا ہے، اسے بالغ ہونے کے لئے کسی کی شہادت دینے کی

ضرورت نہیں رہتی۔ تو اگر کسی سالک کو معلوم نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ ابھی وہ قوت پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرید میں یہ صلاحیت نشو ونما پا رہی ہوتی ہے، لیکن ابھی بالکل ظاہر نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے مرید کو اس پر اطلاع نہیں ہوئی اور شیخ کو ادراک ہو گیا، اس لئے اس نے اسے اجازت دے دی۔ ایک وقت وہ بھی ہوگا کہ یہ نسبت بالکل ظاہر ہو جائے گی اور اسے خود بھی ادراک ہونے لگے گا۔ (صفحہ ۱۰۸)۔

جنات کی تسخیر کا عمل جائز نہیں:

فرمایا، جنات کا وجود فی الواقع ہے اور وہ مسخر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا مسخر کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں غیر کے قلب پر شرعی ضرورت کے بغیر تصرف کرنا ہے، جو جبری عمل ہے، اور یہ ناجائز ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت کے لئے مرد کو تابع کرانے کا تعویذ کرانا جائز نہیں۔ ہاں، اگر وہ حقوق ادا نہ کرتا ہو تو اس سے جبرا بھی وصول کر لینا جائز ہے۔ اسی وجہ سے یہ بھی حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی توجہ سے فاسق کو فرائض اور واجبات کے ادا کرنے پر مجبور کرے تو جائز ہے۔ لیکن نوافل کے لئے درست نہیں۔ اور روپیہ وغیرہ وصول کرنے کے لئے تو اور بھی برا ہے۔ (صفحہ ۱۱۱)۔

توجہ کے وقتی اثرات:

فرمایا، ابتداء میں ہر شخص کو حالات اور واردات کا شوق ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص میرے پاس آئے اور ذکر و شغل شروع کیا۔ اتفاقا وہ ایک پیر صاحب کے پاس گئے، انہوں نے پوچھا کہ کچھ کرتے ہو؟ اس شخص نے میرے بتائے ہوئے اذکار کی اطلاع دی۔ کہنے لگے کہ ہاں خیر ثواب لیتے رہو۔ فرمایا کہ جب سے میں نے یہ قول سنا ہے، میرا اعتقاد ان سے بالکل جاتا رہا کہ انہوں نے ثواب کی تحقیر کی، حالانکہ تمام اذکار و اشغال سے مقصود حصول ثواب ہی تو ہے۔ لیکن اب اکثر حالات اور وجد کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ آخر ان پیر صاحب نے ان بے چاروں کو توجہ دینی شروع کی، جس سے قلب میں ایک قسم کی حرکت بھی محسوس ہونے لگی اور چند روز کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ قلب بالکل سیاہ ہے۔ پھر وہ چمکتا معلوم ہونے لگا۔ پھر کچھ جبال و صحاری نظر آنے لگے۔ پھر یہ ساری چیزیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ آخر پریشان ہو کر مجھے اطلاع کی۔ میں نے جواب دیا کہ

اپنا معمول قدیم شروع کرو اور سب چھوڑ دو۔ جب ان بے چارے نے ان کی توجہ وغیرہ کو چھوڑا اور اپنے اذکار و اشغال میں مشغول ہوئے۔ اس کے بعد بحمد اللہ ذوق و شوق، خشوع وخضوع اور عبدیت میسر ہوئی، فرمایا کہ جس کو اس دولت سے کچھ حصہ میسر ہو جاتا ہے، وہ حالات اور واردات سب پر لات مار دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۱۲)

نسبت کے بغیر سارے حالات کا ہیچ ہونا:

فرمایا، انسان کو چاہئے کہ پوری توجہ سے اپنے کام میں لگا رہے۔ جو کچھ اس کی تقدیر میں ہے، خود حاصل ہوگا۔ باقی فرد حالات اور وجد وغیرہ کا خواہاں نہ ہو، کیونکہ یہ چیزیں اختیاری نہیں، بلکہ اصل نسبت مع اللہ کی طلب ہونی چاہئے۔ جب یہ حاصل ہو جائے گی تو معلوم ہوگا کہ اس میں کیا لذت ہے اور معلوم ہوگا کہ اس کے مقابلے میں سب حالات ہیچ ہیں۔ کیونکہ یہ دائم اور باقی ہے اور اس نسبت کا اثر یہ ہوگا کہ فرد دوسروں کے حقوق ضائع کرنے سے ایسا بھاگے گا، جیسے بکری بھیڑیئے سے بھاگتی ہے۔ (صفحہ ۱۱۲)

آل رسول ﷺ کی تشریح:

فرمایا، میرے نزدیک **من سلک طریقی فھو الی** میں لفظ من عام نہیں، بلکہ معنی یہ ہیں کہ میری اولاد میں سے جو شخص میرے طریقے پر ہو تو میری اولاد ہے اور جو نسبتا میری اولاد ہو کر پھر میرے طریقے کے خلاف چلے وہ معنًی میری اولاد سے نہیں (یعنی مجھے اس سے کچھ واسطہ نہیں) اور یہ ایسا ہے، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے لڑکے کی شان میں آیا ہے: انہ لیس من اھلک (صفحہ ۱۱۳)

نفس قابل اعتماد نہیں:

فرمایا، انسان کو اپنے نفس پر ہرگز بھروسہ اور اطمینان نہ کرنا چاہئے۔ اگرچہ کوئی کتنا ہی بڑا صاحب کرامت ہو، کتنا ہی بڑا عالم ہو، فہیم ہو، بزرگ ہو، مگر نفس کسی کا بھی کسی حالت میں اطمینان کے قابل نہیں۔ (صفحہ ۱۱۶)

خلوت، ہر شخص سے مقصود نہیں:

فرمایا، میں مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں ایک

مرتبہ آرام کے وقت حاضر ہوا۔ پھر وہاں جا کر خیال ہوا کہ میں بے وقت آیا تو میں نے عرض کیا اور معذرت چاہی کہ میں خلاف قاعدہ خلوت خاص میں حاضر ہو گیا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا کہ خلوت از اغیار باید نہ از یار - چنانچہ حضور ﷺ نے اوقات کو تین حصوں پر تقسیم فرما رکھا تھا۔ ایک حصہ راحت اور آرام کے لئے بھی مقرر فرما رکھا تھا اور اس وقت میں بھی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو حاضری کی اجازت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلوت ہر شخص سے مقصود نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۱۱۷)

علوم کی تدوین کا نام:

فرمایا، علوم دین کی روز بروز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ اپنے حضرات کے بعد پسماندگاں کا طبقہ شاید بددینوں کے اشکالات واعتراضات کا جواب بھی نہ دے سکے اور اس لئے کبھی کبھار خیال ہوتا ہے کہ ایک رسالہ علم کلام جدید پر لکھا جائے اور دوسرا فقہ کے سلسلہ میں یعنی ملازمت، تجارت، فلاحت وغیرہ کی جو جدید صورتیں پیش آتی ہیں، ان سب کی حرمت یا حلت کو ظاہر کر دیا جائے اور تیسرا حدیث پر یعنی حدیث سے دلائل حنفیہ لکھے جائیں اور فرمایا کہ حنفیہ کے دلائل تو کتب حدیث میں منتشرا موجود بھی ہیں، تتبع کے بعد ان کی تدوین ہو بھی سکتی ہے، لیکن پہلے دو مضمون البتہ مشکل ہیں۔ اس وقت تو بحمد للہ ایسے علماء موجود ہیں کہ اگر مجھے کسی مقام پر شبہ ہو تو ان سے رجوع کر سکتا ہوں۔ (صفحہ ۱۱۸)

تقویٰ صوری اور تقویٰ حقیقی:

فرمایا، مولوی صادق الیقین صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے یہ سوال نہ کیا جائے کہ تو اس قدر متقی کیوں تھا۔ پھر اس کی تفسیر میں فرمایا کہ بعض تقویٰ صوری ہوتا ہے کہ وہ صورتا تقویٰ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی باطنی خرابی ہوتی ہے۔ قیامت میں خواص سے ایسے تقویٰ کے بارے میں باز پرس ہوگی اور ایک تقویٰ حقیقی ہے۔ وہ ہر حالت میں مطلوب عند الشرع ہے۔ (صفحہ ۱۸۸)

حالات میں قبض و بسط کا ہونا:

رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا - مشرق و مغرب کے ذکر میں اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح شمس میں طلوع و غروب ہوتا ہے، اسی طرح حالات میں بھی قبض و بسط اسی کے مشابہ ہوتا ہے، یعنی قبض میں حال سلب نہیں ہوتا، بلکہ چھپ جاتا ہے، مثل آفتاب کے کہ غروب ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۱۱۹)

نگاہ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے کپڑے سے منہ کو ڈھانپنا:

یاایہا المزمل بمعنیٰ گلیم پیچیدہ میں اشارہ اس طرف ہے کہ صوفیہ کا یہ بھی ایک طریق ہے کہ اپنے بدن کو جس میں سر بھی داخل ہے، کپڑے میں لپیٹے رہیں۔ تا کہ نگاہ منتشر نہ ہونے پائے۔ اس سے قلب بھی منتشر ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۰)

خلوت اور مجاہدوں کی توضیح:

فرمایا، ایک بار ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ حضرات صحابہؓ تو خلوت گزیں نہ تھے، بلکہ لوگوں میں ملے جلے رہتے تھے۔ آجکل فقراء نے ان حضرات کے بالکل خلاف خلوت کیوں اختیار کی ہے۔ یہ تو بظاہر بدعت معلوم ہوتی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ بدعت تو دین میں شامل نہ ہونے والی چیزوں کو دین قرار دینے کو کہتے ہیں، جب کہ فقراء، خلوت کو قربت مقصود نہیں جانتے، بلکہ اسے علاج سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ تندرست تھے، جب کہ ہم لوگ بیمار ہیں اور بیمار کو علاج کی حاجت ہوتی ہے۔ اور کبھی خلوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اطباء سے پوچھئے کہ جب وہ کسی کو مسہل دیتے ہیں تو اسے ثقیل غذا اور بار اٹھانے سے روکا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی لوگوں سے میل جول سے روکا جاتا ہے کہ اس سے طبیعت غیر دفع کی طرف مشغول نہ ہو۔ سو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو انجمن میں بھی قلب کی [illegible]ئی حاصل تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے: لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ. جب کہ ہم لوگ جو ناقص الاخلاص ہیں، تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ہماری اصلاح اس طریقے کے سوا نہیں ہو سکتی۔ یہ ساری ریاضتیں اصل مقصود کے لئے ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (صفحہ ۱۲۲)

حضور ﷺ کی، بعثت کی اطلاع کی تشریح:

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ تو میرا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ کی بعثت عام ہے، لیکن یہ خلجان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو خود حضور ﷺ تشریف لے گئے اور نہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو حضور ﷺ نے وہاں بھیجا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں منقول ہوتا، حالانکہ منقول نہیں۔ نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے کہ ایک جہاز غلط رستے پر ہولیا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا اور اہل جہاز کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔ وہاں آپ کی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ اس کا مفہوم یہ ہے بعثت کی خبر پہنچی اطلاع کے باوجود جو آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں حضور ﷺ کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہوجائے۔ اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی، اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے۔ (صفحہ ۱۲۵)

مولوی کے نفس کا بھی مولوی ہونا:

فرمایا، مولویوں کا نفس بھی مولوی ہوتا ہے، اس کو ایسی تاویلیں سوجھتی ہیں کہ دوسروں کا تو وہاں تک ذہن بھی نہیں جاسکتا۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے اور اسے پانچ سو روپے کی ضرورت تھی۔ کہنے لگے کہ کسی رئیس کے پاس آپ سفارشی خط لکھ دیں۔ میں نے عذر کیا اور کہا کہ مجھے کسی کے ساتھ اس طرح کی بے تکلفی نہیں ہے، کہنے لگے کہ آپ سے بہت سے ذی وسعت دینی تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کسی کی رضا مندی کے بغیر اس پر بار رکھنا جائز نہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے، دل کی عدم چاہت کے باوجود خرچ کرنا ایک قسم کا مجاہدہ بھی تو ہے اور تعلیم مجاہدہ کا آپ کو حق حاصل ہے۔ تو ان لوگوں کو بطور مجاہدہ کے فرما دیجئے۔ یعنی ان سے پانچ سو روپیہ خرچ کرنے کو کہئے، تاکہ ان سے بخل دور ہوجائے۔ میں نے کہا کہ اول تو کیا ضروری ہے کہ ان میں بخل کی صفت موجود ہو، ممکن ہے وہ اس سے بالکل پاک ہوں اور اگر ہو بھی تو یہ کیا ضروری ہے کہ اس کے ازالے کی میں یہی صورت تجویز کروں اور اگر ہو بھی تو یہ کیا ضروری ہے کہ

اس اتفاق کا مصرف آپ ہی کو قرار دیا جائے، اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اچھا، آپ لوگوں کے نام بتلائیے۔ میں اول ان سے پوچھوں گا کہ ایک شخص ایسا چاہتے ہیں، کیا میں سفارش لکھ دوں؟ کہنے لگے کہ یوں تو وہ قبول نہ کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں اس کے خلاف نہیں کرسکتا۔ کیونکہ لا یحل مال امرء الا بطیب نفسہ۔ آخر کہنے لگے کہ اچھا، آپ ان سے دریافت ہی کرلیجئے۔ چنانچہ ان سے دریافت کیا گیا۔ سب مقامات سے جواب میں رقوم ہی آگئیں اور اتفاق سے سب کا مجموعہ پانچ سو روپیہ تھا۔ میں نے وہ سب روپیہ ان مولوی صاحب کے حوالے کیا اور میں نے کہا کہ دیکھئے لوگ سمجھتے ہیں کہ حلال طریقے سے مال نہیں ملتا۔ یہ دیکھئے کیونکر مل گیا۔ (صفحہ ۱۲۵)

صحبت بد سے ممانعت میں مصلحت:

ایک شخص نے اعتراض کیا کہ شریعت میں صحبت بد کی منع ہے اور صحبت نیک کا امر ہے، اگر برا آدمی نیک آدمی کے پاس جائے اور نیک اس سے اجتناب نہ کرے تو وہ نیک نہ رہے گا۔ اگر نیک فرد برے فرد سے دور رہے تو پھر وہ صحبت نیک سے کس طرح استفادہ کرسکے گا۔ پس ہر حال میں صحبت نیک کا میسر آنا سخت دشوار ہے۔ فرمایا کہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب ہمیشہ متاثر ہوتا ہے اور مطلوب موثر ہوتا ہے۔ پس جب برا آدمی طالب بن کر نیک شخص کے پاس آیا ہے تو اس کو نفع ہوگا۔ اس لئے اسے اس خراب صحبت سے اجتناب ضروری نہ ہوگا اور چونکہ وہ نیک، اس بد کی صحبت کا طالب نہیں ہے، لہذا وہ اس کو مؤثر نہ ہوگی، تو ایسی صحبت نہ مضر ہوگی اور نہ اس کی ممانعت ہوگی۔ (صفحہ ۱۲۹)

ووجدک ضالا کا مفہوم:

فرمایا، ایک مرتبہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے، لیکن پہلے آپ اس آیت کا ترجمہ کردیجئے: ووجدک ضالا فھدیٰ۔ میں نے کہا، ترجمہ اس کا یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف، پس واقف بنادیا۔ یہ ترجمہ سن کر وہ بالکل خاموش ہوگئے۔ میں نے کہا کہ اب جو کچھ آپ پوچھنا چاہتے تھے پوچھئے۔ کہنے لگے کہ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے کہا کہ آپ کو غالباً کسی ترجمے میں لفظ گمراہ دیکھ کر شبہ ہوا

ہے۔ سو سمجھئے لفظ گمراہ ہماری اصطلاح میں اس شخص پر اطلاق کیا جاتا ہے، جو باوجود راہ حق کے معلوم ہونے کے، پھر بھی اس راہ سے بے راہ ہو، بخلاف عربی اور فارسی کے کہ اس میں لفظ ضلال اور گمراہی عام ہے، اس بے راہی کے بعد جو راہ بتانے کے بعد کے ہو اور اس ناواقفی راہ کو بھی جو قبل راہ بتانے کے ہو۔ (صفحہ ۱۳۲)

کثرت عبادت سے منع میں حکمت:

فرمایا، حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیشہ اور ساری شب بیداری سے منع فرمایا ہے۔ اس سے بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے کثرت عبادت سے منع فرمایا ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے آپ نے کثرت عبادت کا طریقہ بتایا ہے اور عبادت کی کمی سے روکا ہے۔ کیونکہ جب ایک شخص اپنی وسعت سے زیادہ بیدار رہے گا یا ہمیشہ روزہ رکھ کر بھوکا رہے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قویٰ کمزور ہوں گے، اس طرح معمولی عبادت کی بھی طاقت باقی نہ رہے گی اور جب کہ اعتدال کے ساتھ کام کرنے سے عمر بھر حالت دوام قائم رہ سکے گی۔ (صفحہ ۱۳۲)

بیعت کی حقیقت:

ایک صاحب نے پوچھا کہ بیعت کی حقیقت کیا ہے اور اس کی ضرورت کہاں تک ہے؟ فرمایا کہ بیعت کی حقیقت ہے دونوں جانب سے معاہدہ ہونا۔ بزرگ کی طرف سے یہ کہ میں تمہاری نگرانی کروں گا اور مرید کی طرف سے یہ کہ میں اتباع کروں گا۔ (صفحہ ۱۴۵)

وسوسوں کا علاج:

فرمایا، سالک کی چاہت اور کوشش یہ ہے کہ اس کے دل میں سوائے خیال محبوب یعنی باری تعالیٰ کے اور کوئی خیال نہ آنے پائے۔ اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے، دعا کرتا ہے، کامیاب نہیں ہوتا تو جزبز ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ غور نہیں کرتا کہ قلب کی حالت عام شارع کی سی ہے کہ اس پر جس طرح بادشاہ کا گزر ہوتا ہے، اسی طرح ایک ادنی مزدور بلکہ چمار اور مہتر بھی چلتا ہے اور جس طرح بادشاہ کے گزرنے سے سڑک عیب دار نہیں ہوتی، چمار کے گزرنے سے بھی اس میں کچھ عیب پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چمار کے نکل جانے کے لئے شاہی سواری روک لی جاتی ہے اور سرشور گھوڑوں کی لگام کس لی جاتی ہے۔ یہی معاملہ قلب کا ہوتا ہے کہ اس کی شاہراہ میں شاہی سواری (خیال محبوب) کے دوش بدوش ایرے غیرے (یعنی دنیاوی خیالات) بھی راہ چلتے ہیں اور بعض اوقات ان رذیلوں کے لئے شاہی سواری کو روک دیا جاتا ہے کہ یہ نکل جائیں اور اس کے لئے راستہ صاف ہوجائے۔ پس جب قلب کی یہ حالت ہے تو اس میں کسی خیال کے آنے کو برا نہ سمجھا جائے اور نہ ہی اس کی طرف التفات کیا جائے، حتیٰ کہ اس کے دفع کا بھی مستقل اہتمام نہ کیا جائے، بلکہ سالک کو ذکر میں مشغول رہنا چاہئے، اگر اس کے باوجود وسوسے آئیں تو سمجھنا چاہئے کہ سڑک سے ایک چمار کے گزارنے کے لئے بادشاہ رک گیا ہے اور پھر ذکر میں مشغول ہوجائے کہ دفع وساوس کی یہی موثر تدبیر ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے: ان الشیطان جاثم علیٰ قلب ابن آدم فاذا ذکر اللہ خنس واذا غفل وسوس۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ذکر کی جانب توجہ رہے گی تو فاسد خیالات نہ آئیں گے اور اکثر آئیں گے تو اسی وقت جبکہ ادھر سے خیال ضعیف ہوجائے گا۔ (صفحہ ۱۵۴)۔

قابل تحصیل چیز:

فرمایا، قابل تحصیل اور لائق قدر چیز وہ ہے، جس سے قرب خداوندی میں کچھ ترقی ہو اور جو چیز قرب میں ترقی کا ذریعہ نہ ہو، وہ قابل تحصیل نہیں۔ تو دیکھنا چاہئے کہ سلوک میں جو کشف ہوتا ہے، اس سے آیا قرب میں کسی درجے میں ترقی ہوتی ہے یا نہیں؟ جس شخص کا جی چاہے، خود کشف کے وقت غور کرے، اس وقت وہ اللہ اور اپنے درمیان ایک قسم کا حجاب پائے گا، برخلاف عبادات کے وقت کہ ایک مرتبہ بھی سبحان اللہ کہے گا تو اس سے کچھ نہ کچھ قرب ضرور بڑھا ہوا پائے گا۔ (صفحہ ۱۵۵)۔

مبتدی کے لئے وعظ کی ممانعت:

فرمایا، امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ مبتدیٔ سلوک کو وعظ نہ کہنا چاہئے، کیونکہ شروع میں نفس کی حالت اچھی نہیں ہوتی، اس سے نفس کے خراب ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

فرمایا، اس رائے کی تائید قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے: فاعفوا واصفحوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ. یہ آیت کفار سے قتال سے ممانعت کے سلسلہ میں ہے اور مکہ میں نازل ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک یہ نومسلم تھے۔ تہذیب نفس کامل طور پر نہیں ہوئی تھی۔ احتمال تھا کہ شاید طاعت میں نفس کا شبہ ہوجائے، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس وقت تک صحابہ کا عدد کم تھا، کیونکہ مسلمانوں کو قلت تعداد سے کبھی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ آخر ۶۰ آدمی ۶۰ ہزار سے مقابل ہوئے اور کامیاب ہوئے اور جب مدینے میں آئے تو چونکہ تہذیب نفس کامل ہوئی تھی، اس لئے قتال کی اجازت دے دی گئی کہ: اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا الخ. (صفحہ ۱۵۶)

صوفیاء کے حالات سے مشابہت:

فرمایا، لوگ صوفیہ کی اصطلاحات سنتے ہیں اور ان کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انہیں ظاہری معانی پر محمول کرکے، اس کے حصول کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ باتیں وہی ہوتی ہیں، جو ہر انسان پر گزر جاتی ہیں۔ کسی پر دنیاوی امور میں تو کسی پر دینی امر میں۔ مثلاً صوفیہ ایک خاص حالت کو فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے آگے کے مرتبے کو فناء الفناء کہتے ہیں۔ یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں کہ دنیاوی معاملوں میں بھی اکثر لوگوں کو پیش آتی رہتی ہیں۔ فناء کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز سے توجہ ہٹ کر صرف محبوب کا خیال دل میں رہ جائے اور فناء الفناء یہ ہے کہ فنا کا بھی خیال نہ رہے۔

تو درو گم شو وصال انیست و بس
گم شدن گم کن کمال این ست و بس

سو یہ دنیوی انہماکات میں بھی پیش آتے ہیں۔ (صفحہ ۱۵۹)

روحانی اور نفسیاتی کیفیات کی تشریح:

فرمایا، کیفیات دو قسم کی ہیں: ایک روحانی کیفیات دوسری نفسانی۔ روحانی کیفیات مشاہدہ اور غلبۂ ذکر ہے، جس کے آثار اطاعت میں سہولت اور شوق فرمانبرداری ہے اور اس پر رضائے باری کا وعدہ ہے۔ کیفیات احوال کہلاتے ہیں۔ مثلاً شدت شوق، وجد، ہیجان، وارفتگی وغیرہ یہ امور مطلوب نہیں۔ اسی لئے کاملین ان کیفیات کی طرف کبھی

توجہ نہیں کرتے۔ بلکہ کبھی کبھی احوال سے ضرر بھی ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ مثلاً جو شخص شدت شوق میں مبتلا ہوگا، مندرجہ ذیل حالت میں سے ایک حالت اس کو ضرور پیش آئے گی یا لقاء نصیب نہ ہونے سے اسے مایوسی ہوگی یا غلبہ اضطراب، اغوائے شیطانی عجب و کبر کے امراض لاحق ہونگے اور یہ سب حالتیں مذموم ہیں اور اللہ سے دوری کی ہیں، فرمایا، لوگ مستجاب الدعوات ہونے کے متمنی ہوتے ہیں۔ حالانکہ اجابت دعا بھی احوال میں سے ہے اور جو شخص مستجاب الدعاء ہوگیا ہے، وہ اجابت دعاء کے وقت غور کرے اور وجدان سے دیکھے کہ اس مرتبہ کے حاصل ہوجانے سے قرب خداوندی میں کچھ اضافہ ہوا کہ نہیں۔ اگر قلب نفی میں جواب دے (اور نفی میں جواب دے گا) تو سمجھ لے کہ مستجاب الدعاء ہوجانا کوئی کمال نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ سبحان اللہ کہہ کر دیکھے کہ اس میں بھی کچھ قرب حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر شریعت وطریقت قرب کی زیادتی کا فتویٰ دے تو یقین کرلے کہ مستجاب الدعاء ہونا ذکر لسان سے بھی کم تر ہے۔ اس سے یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ احوال وکیفیات توجہ کے لائق نہیں، مواہبت خداوندی ہیں۔ اگر حاصل ہوجائیں تو اس کا فضل ہے، حاصل نہ ہوں تو نجات وقرب میں ان چیزوں کو کچھ دخل نہیں اور اس کی تائید کہ حال علی الاطلاق مطلوب نہیں، اس حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور ﷺ نے دعا فرمائی: اسئلک شوقا الیٰ لقائک من غیر ضرار مضرہ ولا فتنۃ مضلہ ۔ پھر اگر احوال مطلقاً مطلوب ہوتے اور ان میں ضرر اور فتنہ کا احتمال نہ ہوتا تو حضور ﷺ طلب شوق کے ساتھ یہ قید نہ فرماتے۔ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ میں تجھ سے تیرے لقاء کے شوق کا طالب ہوں، مگر اس قدر نہیں کہ اس سے دنیاوی ضرر ہو (جیسے غلبہ شوق سے امراض وغیرہ لاحق ہوجاتے ہیں) یا میں کسی (دنیوی) فتنہ میں مبتلا ہوجاؤں (جیسے گستاخ ہوجاؤں اور شریعت وصاحب شریعت کا ادب ملحوظ نہ رہے۔ (صفحہ ۱۶۰)

مکاشفہ، علامتِ کمال نہیں:

فرمایا، مکاشفہ بھی احوال میں داخل ہے۔ اس لئے وہ بھی مطلوب نہیں۔ اگر کسی کو عمر بھر ایک بھی کشف نہ ہو تو اللہ کے ساتھ اس کے قرب میں کچھ بھی کمی نہیں ہوتی، بلکہ غور کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مکاشفہ کمال ہی نہیں، کیونکہ کفار کو بھی کشف حاصل

ہوتا ہے۔ مثلاً اشراقی فلاسفہ کو ہوتا تھا۔ نیز مکاشفہ ایسی چیز ہے کہ موت کے بعد خود بخود حاصل ہوجائے گا۔ دنیا میں وہ چیز حاصل کرنی چاہئے، جو موت کے بعد حاصل نہ ہو سکے۔ کالصلوٰۃ والذکر۔ دوسرے مکاشفہ بعض اوقات مضر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ایسا شخص جسے علم حاصل نہیں، اس کو اگر کشف ہونے لگے تو وہ اس کی لذت میں پڑ کر نماز روزے کو بالکل حقیر سمجھے گا۔ بالخصوص اگر اسے کچھ انوار نظر آنے لگیں تو اس سے اسے کشف کے معراج ہونے کا یقین ہی ہوجائے گا۔ لان الحجب النورانیہ اشد من الحجب الظلمانیہ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر کشف کوئی قابل التفات وتوجہ چیز ہوتی تو شارع علیہ السلام اس کی تعلیم دیتے اور قدر کے مسئلے دریافت کرنے پر صحابہؓ کو ممانعت نہ ہوتی، جن کا علم اور قوت علمیہ ہم سے ہزارہا درجے بڑھی ہوئی تھی، جن کو خاص بارگاہ نبوی ﷺ سے فیض حاصل تھا۔ (صفحہ ۱۶۱)

بلاضرورت اجتماع سے فساد کا واقع ہونا:

فرمایا، تمدن وسیاست کا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ بلاضرورت اجتماع عام نہ ہونے پائے۔ کلام مجید کی اس آیت سے فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ اس مسئلے کا پتہ چلتا ہے۔ پس نماز کے بعد منتشر ہونے میں یہ حکمت ہوگی کہ اب اجتماع کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مختلف مزاجوں کے لوگ بلا ضرورت ایک جگہ رہیں گے تو فساد کے سوا کیا ہوگا۔ اس لئے انتشروا کے بعد یہ بھی فرمادیا کہ ابتغوا من فضل اللہ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد سے نکل کر بھی غیرضروری نہ پھرو، بلکہ خدا کے رزق کی طلب میں مشغول ہوجاؤ۔ آگے اس طلب رزق کے انہماک کا علاج ارشاد فرمایا کہ اذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ اور یہی جامعیت وہ چیز ہے کہ قرآنی تعلیم کے سوا کسی دوسری جگہ میسر نہیں ہوسکتی۔ اور فقہاء نے اسی راز عدم استحسان اجتماع بلاضرورت کو سمجھ کر نفلی عبادات کی طرف بلانے کو بدعت فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ جماعت نفل کو مکروہ کہہ دیا۔ (۱۶۱)۔

اعمال کی دو قسمیں:

فرمایا، انسان کے جملہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ، جن کا دنیا میں بھی

کچھ مشاہدہ ہوتا ہے، جیسے تصنیف کتب وغیرہ۔ بعض وہ ہیں، جن کا ثمرہ دنیا میں کچھ مشاہد نہیں ہوتا، جیسے ذکر اللہ ونماز وغیرہ۔ پہلی قسم کے اعمال نفس پر آسان ہوجاتے ہیں، جب کہ دوسری قسم کے عمل مشکل ہیں اور ان کے کرنے میں نفس پر سخت بار ہوتا ہے۔ اس کے آسان کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ خاص ثمرات پر نظر ہی نہ کی جائے، بلکہ اس نیت سے ذکر کیا جائے کہ وعدۂ خداوندی ہے فاذکرونی اذکرکم جب اس کو یاد کریں گے تو وہ ہمیں ضرور یاد کرے گا اور اس کا یاد کرنا مطلوب ہے۔ پھر جب مطلوب حاصل ہے تو اس سے لذت وغیرہ اگر نہ بھی حاصل ہوئی تو کیا مضائقہ ہے اور یہی علاج ہے، قبض کا کہ جب ایسی حالت پیش آئے تو سمجھئے کہ نہ ہمیں قبض مطلوب ہے، نہ بسط اور نہ یہ ثمرۂ ذکر، بلکہ جو بھی حالت ہو، ہم اس پر راضی ہیں اور وہی خدا کا فضل ہے۔ اس لئے کہ:

دل کہ اوبستہ غم و خندیدن ست
کہ ہرچہ ساقی ماریخت عین الطاف ست

(صفحہ ۱۶۲)

طلب اور وصول:

فرمایا، ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوبؒ فرمایا کرتے تھے کہ راہ محبت میں خود طلب مطلوب ہے نہ کہ وصول، کیونکہ طلب تو بندہ کے اختیار میں ہے اور وصول اس کے اختیار سے خارج ہے اور جو چیز اختیار میں نہ ہو تو وہ انسان کی مطلوب نہیں ہوسکتی۔ اس نکتہ کو یاد رکھنے سے سالک کی ہزارہا پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں۔ (صفحہ ۱۶۳)

سیر الی اللہ اور سیر فی سبیل اللہ:

فرمایا، ایک سیر الی اللہ ہے اور دوسری سیر فی اللہ۔ سیر الی اللہ یہ ہے کہ سالک کے اخلاق کی تہذیب ہوجائے اور رسوخ فی الذکر پیدا ہوجائے اور اس کی انتہا پر سلوک ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد سیر فی اللہ کا مرتبہ آتا ہے۔ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے، جس میں مراتب طاعت وذکر وتوجہ وقرب وتصحیح معاملات مع اللہ میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

اس آیت شریفہ میں ان دونوں مرتبوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ انی ذاھب الی ربی سیھدین۔ کیونکہ ایک مرتبہ ذہاب الی الرب کا ہوا اور ایک مرتبہ حصول ہدایت یعنی وصول الی الرب کا جس کا دوسرا عنوان سیر فی اللہ ہے۔ (صفحہ ۱۶۳)

مبتدیوں کی حالت کمال:

فرمایا، جن لوگوں کو نسبت مع اللہ حاصل ہو چکی ہے، وہ اگر گناہ کی طرف راغب نہ ہوں، وہ اگر پاک باز ہوں تو یہ ان کا کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگرچہ ان پر خدا کا احسان ضرور ہے کہ ایسی کیفیات غالب ہو کر ان کے لئے حال بن گئیں۔ البتہ جن لوگوں کو ابھی نسبت مع اللہ حاصل نہیں ہوئی اور پھر بھی وہ گناہوں کے چھوڑ دینے کی ہمت کرتے ہیں اور دل پر جبر کر کے نفس کو تابع کرتے ہیں تو وہ صاحب کمال ہیں۔ اگرچہ انہیں بھی اصل توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ان کے اختیار میں کچھ نہیں۔ (صفحہ ۱۶۵)

گناہ گاروں سے نفرت کی نوعیت:

ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ نیک لوگوں کو گنہگار مسلمانوں سے بغض ہوتا ہے اور حدیث شریف میں بغض فی اللہ کا حکم بھی ہے اور بغض فی اللہ کے لئے نفرت ضروری ہے۔ جب کہ نفرت سے گناہ گار کی تحقیر ہوتی ہے اور اپنے کو بڑا سمجھنا لازم آتا ہے اور یہ تکبر ہے جو حرام ہے۔ تو بغض فی اللہ اور تواضع کیونکر جمع ہو سکتے ہیں۔ فرمایا، ہر بغض کے لئے نفرت لازم نہیں، بلکہ یہ نفرت اس شخص کے ساتھ ہوتی ہے،، جو کسی بھی اعتبار سے محبوب نہ ہو، جب کہ مومن کی حیثیت سے مبغوض ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس میں اگر گناہ بغض کا موجب ہے تو ایمان اس کے ساتھ محبت کا سبب ہے۔ مختلف اعتبار سے بغض بھی ہوگا اور محبت بھی۔ نفرت وہاں ہوتی ہے، جہاں بالکل محبت نہ ہو، جیسے کافر کے ساتھ۔ (صفحہ ۱۷۴)

نسبت مع اللہ سلب نہیں ہوتی:

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ فلاں شخص کی ولایت سلب ہوگئی۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا ولایت تو مقبولیت کا نام ہے، اس کو کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فن کے ساتھ ہر شخص کو ایک قسم کی طبعی مناسبت اور ولولہ ہو جاتا ہے اور وہ مناسبت کسی کے تصرف فاسد سے جاتی رہتی ہے اور طبیعت میں ایک قسم کی کاہلی سی آ جاتی ہے کہ اعمال میں دل نہیں لگتا۔ لیکن اس صورت میں اعمال اختیار سے خارج نہیں ہو جاتے، بلکہ وہ اسی طرح اختیار میں ہی رہتے ہیں۔ اور ایسی حالت میں عمل کرنے سے ازروئے شریعت اجر اور زیادہ ہوتا ہے۔ نیز جو امور سلب ہوتے ہیں، وہ طبعی کیفیات ہیں اور جس کو نسبت کہا جاتا ہے وہ امر موہوب ہے، کیفیت طبعی نہیں۔ لہذا وہ کسی کے تصرف سے سلب نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۱۷۹)

''فتنہ اولاد'' کا مفہوم:

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ نکاح کی تاکید میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: النکاح من سنتی الخ ۔ اور نکاح سے اولاد ہونا ظاہر ہے۔ مگر اولاد کے لئے آیت شریفہ ہے: انما اموالکم و اولادکم فتنۃ ۔ تو پھر سنت پر عمل کر کے فتنے سے کیونکر بچاؤ ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ مضرت کے نہیں۔ پس یہ آلہ ہے، امتحان کا جس کا انجام کار بعض کے لئے اچھا اور بعض کے لئے یعنی عاصی کے لئے برا ہے۔ (صفحہ ۱۸۰)

ادراک کی لطافت سے تکلیف کا زیادہ ہونا:

حدیث شریف: ما اوذی نبی کما اوذیت پر شبہ ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو تو نو سو پچاس برس تک کفار نے ایذا دی اور ایذاء بھی سخت سے سخت۔ جواب یہ ہے کہ قاعدہ ہے کہ اپنے متعلقین پر جس قدر شفقت ہوتی ہے، اسی قدر ان کی نافرمانی سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور حضور ﷺ کی لوگوں پر شفقت سب نبیوں سے زیادہ تھی۔ دوسرے یہ کہ لطافت ادراک سے بھی زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور حضور ﷺ لطیف الادراک ہوتے ہیں

سب پر فائق ہیں۔ (صفحہ ۱۸۳)۔

عالم برزخ میں سزا کی نوعیت:

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ مرنے کے بعد روح کو اس جسد سے تعلق کتنا باقی رہتا ہے۔ فرمایا کہ جیسا رزائی کو ہمارے بدن سے تعلق ہے۔ پھر ان صاحب نے دریافت کیا کہ قبر میں عذاب اسی بدن کو ہوتا ہے یا محض روح کو۔ فرمایا کہ روح کو عالم برزخ میں ایک دوسرا جسم مثالی عنایت ہوتا ہے اور اس جسم سے روح کو ایسا ہی تعلق ہوتا ہے، جیسا کہ ہمارے اس بدن سے ہے اور اس کے ذریعہ سے عذاب ہوتا ہے۔ البتہ قیامت میں روح کو پھر اسی جسم کے ذریعے سے عذاب ہوگا۔ (صفحہ ۱۸۴)

مغلوب الحالی کی توضیح:

عرض کیا گیا کہ فلاں فلاں بزرگ بڑے بڑے صاحب کمال ہیں، لیکن مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق ان حضرات نے بعض ایسی تعبیرات کی ہیں، جن سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات مغلوب حال ہیں، جب کہ مغلوب حال ہونا نقص کی علامت ہے۔ پس اگر یہ لوگ اصحاب کمال ہیں تو یہ مغلوبیت کیوں ہے اور مغلوبیت ہے تو ان کو صاحب کمال کیوں کہاجاتا ہے؟ فرمایا، بھائی! مغلوب حال ہونا کمال کے منافی نہیں۔ بعضے صاحب کمال بھی بعض اوقات کسی خاص کیفیت سے مغلوب ہوجاتے ہیں۔ البتہ مغلوب الحال ہونا تکمیل کے خلاف ضرور ہے۔ یہ حضرات اصحاب کمال ہیں، اصحاب تکمیل نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بہت بڑا متبحر عالم کسی دقیق مسئلے کے مطالعے اور حل میں مستغرق ہے۔ سو زمانہء استغراق میں بھی اس کا تبحر جاتا نہیں، البتہ وہ اس وقت تعلیم کے قابل نہیں۔ (صفحہ ۱۹۵)

پردہ کی حکمت:

سوال کیا گیا کہ عورتوں کو پردے میں رکھنے کا سبب تو یہی ہے کہ ان کی بے پردگی کی وجہ سے فتنے کا اندیشہ ہے اور یہ علامت جیسی عورتوں میں پائی جاتی ہے، نابالغ لڑکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ تو مشترکہ سبب کی وجہ سے حکم بھی مشترک ہونا چاہئے۔ پس نابالغ

لڑکوں کے لئے بھی خروج (گھر سے نکلنا) جائز نہ ہونا چاہئے۔ فرمایا، شریعت کا قاعدہ ہے کہ جس چیز میں مفاسد مخلوط ہوجائیں، اگر وہ غیر ضروری ہوتا ہے تو خود اس چیز ہی کو روک دیا جاتا ہے اور اگر وہ ضروری ہوتا ہے تو پھر اس کی ممانعت نہیں کی جاتی، بلکہ خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو عورتوں کا خروج چونکہ غیر ضروری تھا، اس لئے خرابیوں کی وجہ سے اسے روک دیا گیا۔ اور نابالغ لڑکے چونکہ چند روز میں مرد ہونے والے ہیں اور ان کے لئے مردوں کے کمالات کا حصول ضروری ہے اور وہ عادتاً گھر سے نکلنے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے ان کے خروج کو نہیں روکا گیا بلکہ خرابیوں کے ازالہ کا انسداد انذار وعید سے کیا گیا۔ (صفحہ ۱۹۹)۔

قلب کی سختی اور اللہ کی پہچان:

ایک صاحب نے عرض کیا کہ مجھ میں قساوت قلبی (دل کی سختی) پیدا ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے رونا نہیں آتا۔ فرمایا قساوت یہ ہے کہ گناہ سے نفرت نہ ہو، دین سے محبت نہ ہو، گناہوں پر ندامت نہ ہو۔ پھر ان ہی صاحب نے کہا، میرا جی قرآن شریف کے پڑھنے میں بہت لگتا ہے۔ پہلے ربع پارہ وقت سے پڑھا جاتا تھا اور اب جی چاہتا ہے کہ قرآن شریف ہی پڑھے جاؤں۔ فرمایا، یہ تو قساوت نہ ہونے کی بہت قوی دلیل ہے، کیونکہ قساوت ہوتی تو قرآن شریف کی تلاوت میں کیوں جی لگتا۔

صحبت کے بغیر اخلاق کا درست نہ ہونا:

بغیر اہل اللہ کی صحبت کے، اخلاق درست نہیں ہوتے، اگرچہ عقائد درست ہوجائیں۔ کبر، بڑے پن، حب جاہ وغیرہ جیسے اخلاق ذمیمہ باقی ہی رہ جاتے ہیں۔ (صفحہ ۲۰۲)

مومن دھوکہ نہیں کھاتا:

فرمایا المومن غر کریم کے یہ معنی نہیں کہ مومن بھولا ہوتا ہے اور اسے جو چاہے دھوکہ دیدے۔ کیونکہ یہ صفت تو محمود نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے غایت کرم سے وجہ سے صرف نظر کرتا ہے، وہ بھولا معلوم ہوتا ہے۔ نیز کسی کو خود دھوکہ نہیں دیتا، اگرچہ ذیرک و

دانش مند ہو اور کسی کے دھوکہ میں نہیں آتا، چنانچہ 'غر' کے بعد کریم کا بڑھانا اس طرف مشیر ہے۔ (صفحہ ۲۰۳)

تعویذ میں اثر کا سبب:

فرمایا، تعویذ کے متعلق میرا خیال ہے کہ اگرچہ بعض کلمات میں بھی برکت ہے، لیکن اس میں زیادہ تر دخل عامل کی قوت خیالی کو ہے اور جس کو تعویذ دیا جاتا ہے، اس کے اعتقاد کی وجہ سے، خود اس کی قوت خیالی سے بھی تقویت ہوجاتی ہے اور وہ بھی اثر رکھتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ عمل پڑھتے وقت مطلوب کا تصور رکھو اور وہ موثر ہوتا ہے، پڑھنا پڑھانا اکثر حیلہ ہوتا ہے۔ خود تصور و خیال ہی موثر ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۲۰۵)

پاس انفاس کا مطلب:

پاس انفاس کے معنی محافظت نفس (نفس کی حفاظت) کے ہیں کہ ذکر اللہ کے بغیر کوئی سانس خالی نہ جائے، سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ہونا حقیقت میں داخل نہیں۔ بعض اوقات سانس کی آمد و رفت کا خیال رکھنے سے پریشانی لاحق ہوتی ہے، اس لئے ایسے شخص کے لئے اس کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں، صرف ذکر چاہئے۔ (صفحہ ۲۰۶)

محسن کی شکریہ ادائیگی:

محسن کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ احسان کو چھپائے، کہے: 'لا نرید منکم جزاء ولا شکورا' اور جس پر احسان کیا گیا ہو، اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ موقع محل کی مناسبت سے ظاہر کرے اور کہے کہ ہم پر فلاں نے یہ احسان کیا ہے۔ اس لئے خود کسی کے احسان کا ذکر کرنے میں ذلت نہیں۔ بخلاف محسن کے بیان کرنے کے کہ اس میں محسن الیہ کی ذلت ہوتی ہے۔ (صفحہ ۲۰۶)

معاملات میں دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینا:

فرمایا، اگر معاملات کے سلسلہ میں جس میں ابتلائے عام ہوتا ہے، دوسرے امام کے قول پر جواز کی گنجائش ہوتی ہے تو اس میں فتویٰ دفع حرج (نقصان سے بچنے) کے لئے دے دیتا ہوں۔ اگرچہ وہ فتویٰ حنفیہ کے قول کے خلاف ہو اور اگرچہ مجھے اس طرح کی

گنجائش پر پہلے سے اطمینان تھا، لیکن میں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اس کے متعلق اجازت لے لی۔ میں نے دریافت کیا تھا کہ معاملات میں ضرورت کے وقت دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینا جائز ہے؟ فرمایا جائز ہے؟

ایمان میں اخفا کا مسئلہ:

اگر کوئی شخص دل سے ایمان لے آیا اور دو ایک افراد سے اس کا اظہار بھی کر دیا، لیکن عام طور پر اپنے ایمان کو مخفی رکھا تو اس پر احکام اسلام جاری نہ ہوں گے۔ مثلاً نماز جنازہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ ظاہری احکام ہیں۔ اس کے لئے عام اظہار ہونا چاہئے۔ ہاں اگر قلبی تصدیق ہے تو اسلام صحیح ہوگا اور نجات ہوگی، کیونکہ بلا عذر اسلام کا ظاہر نہ کرنا، صرف فسق ہے بصورت کفر، کفر حقیقی نہیں، اس لئے ایمان کو چھپانے کی شدید ضرورت کے بغیر ممنوع ہے۔ لیکن اگر کوئی عذر شرعی ہو، مثلاً جان کا خوف وغیرہ تو اخفاء جائز ہے۔ (صفحہ ۲۱۰)

تعصب کا مفہوم:

تعصب کے معنی ناحق کی طرفداری کرنے کے ہیں۔ باقی حق کی طرفداری اچھی بات ہے۔ اس کو تصلب فی الدین یعنی دین میں مضبوطی کہتے ہیں۔ مثلاً بے دینی کی وجہ سے لوگوں سے میل جول کم کرنا وغیرہ، لیکن ناحق کی طرفداری کرنا ناجائز ہے۔ (صفحہ ۲۱۲)

عالمگیر اصلاح کا انتظام امام مہدی کے ذریعہ ہونا:

فرمایا، برائی کے اعتبار سے جو حالت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عالم کی ہو رہی تھی، قریب قریب ویسی ہی حالت اب ہو رہی ہے۔ امام مہدی علیہ السلام کے بغیر اصلاح نہیں ہوسکتی۔ قرآن شریف میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے قبل کے زمانے کے متعلق ارشاد ہے: لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتیٰ تاتیھم البینۃ رسول من اللہ الآیۃ۔ یعنی بغیر رسول کے آئے اصلاح نہیں ہوتی۔ اسی طرح اب بھی یعنی نائب اکمل رسول ﷺ حضرت مہدی علیہ السلام کے بغیر دنیا کی اصلاح ہونا دشوار ہے۔ (صفحہ ۲۱۲)

زیادہ تعظیم سے خرابیٔ نفس کا پیدا ہونا:

فرمایا، بعض لوگ مل کر، جاتے وقت پچھلے پاؤں چلتے ہیں۔ یہ گراں گزرتا ہے۔ کسی قدر ترچھا ہوجانے میں مضائقہ نہیں، یہ طبعی بات ہے۔ زیادہ تعظیم وتکریم کرنے سے نفس خراب ہوتا ہے، فرعونیت آتی ہے۔ چنانچہ جب میں ترک ملازمت کرکے کانپور سے آیا تو یہاں کے لوگوں کے، تم کہنے سے بھی انقباض ہوتا تھا، کیونکہ وہاں پندرہ برس تک ہر وقت آپ اور جناب سنتا رہا تھا۔ حضرت رسول اللہ ﷺ نے تو اپنے لئے کھڑے ہونے کی بھی ممانعت کردی تھی۔ آپ ﷺ مجلس میں ممتاز ہوکر بیٹھتے نہ تھے، حتیٰ کہ نئے آنے والے کو پوچھنا پڑتا تھا کہ: 'من محمد فیکم' (صفحہ ۲۱۳)

معاملات سے غفلت:

معاملات میں لوگوں کو بڑی بے پروائی ہوگئی ہے۔ فرد کی اگر ایک نماز قضاء ہوجائے تو لوگ اسے فاسق سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن معاملات میں کیسی ہی کوتاہی ہو، افراد متقی کے متقی ہی رہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱۵)۔

انتظام کے لئے کچھ بخل کا ہونا:

جس کے مزاج میں بخل بالکل نہ ہو، وہ منتظم نہیں ہوسکتا۔ انتظام کے لئے تھوڑے سے بخل لغوی کی ضرورت ہے۔ البتہ زیادہ بخل مذموم ہوگا۔ (صفحہ ۲۱۸)۔

ذکر وفکر سے پہلے اصلاح اعمال:

کوئی ذکر وشغل کرتا ہو تو مجھے اس وقت تک اس کی قدر نہیں ہوتی، جب تک اس کے اعمال درست نہ ہوں۔ ذکر وشغل میں تو مزہ ہے۔ اگر فرد نہ کرے تو مر جائے۔ عمل تو وہ ہے، جس میں کوفت ہو اور پھر بھی رضاء حاصل کرنے کے لئے اسے کرے۔ اسی طرح چاہئے کہ فرد خود تنگی اٹھائے اور دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ ایک ذاکر کے ذمے قرض نکلا تھا اور انہوں نے اس کے ادا کرنے میں بہت بے پروائی کی تھی۔ ایسے موقع پر یہ کلمات فرمائے اور اسے نکال دیا اور فرمایا، قرض ادا کرنے کے بعد یہاں آسکتے ہو۔ جب تک قرض ادا نہ کرو، یہاں مت رہو۔ (صفحہ ۲۲۰)۔

باطنی بیماریوں کی تشخیص کی صلاحیت کا عطا ہونا:

مجھے کشف نہیں ہوتا اور یہ سچ کہتا ہوں، خدا کی نعمتوں کو چھپاتا نہیں، ہاں، جو خدا کی نعمت مجھے حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ تربیت باطن کے متعلق خدا نے بہت آسان طریق عنایت فرمائے ہیں۔ نیز امراض باطن کی تشخیص میں خدا نے فہم عطا فرمائی ہے۔ اس میں رائے بہت ہی کم غلطی کرتی ہے اور اکثر جو تجویز کیا جاتا ہے، وہ صحیح ہوتا ہے اور جو علاج تجویز کیا جاتا ہے، وہ نافع ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۲۳)۔

کشف قلوب کی دو قسمیں:

فرمایا: کشف قلوب کی دو قسمیں ہیں، ایک ارادۃ جس میں دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر، اس کے خطرات پر مطلع ہونا، یہ جائز نہیں، بلکہ تجسس میں داخل ہے، تجسس اسے کہتے ہیں کہ فرد جو باتیں چھپانا چاہتا ہو، اس کو دریافت کرنے کے پیچھے پڑنا، دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کے مافی الضمیر کا بلا ارادۃ انکشاف ہوجائے، اور یہ کرامت ہے۔ (صفحہ ۲۲۳)۔

صحبت کا افضل ہونا:

جس کو صحبت شیخ کی ضرورت ہو، اس کے لئے نفلوں وغیرہ سے صحبت میں حاضر رہنا افضل ہے، خواہ کچھ پڑھتا رہے یا خاموش بیٹھا رہے۔ ہاں، جب بزرگ کچھ بیان کرے تو متوجہ ہوکر سنے۔ (صفحہ ۲۲۴)۔

عشاء کے بعد قصہ گوئی میں نہ پڑنا:

فرمایا: میں نے گھر میں عشاء کے بعد ایسی بات پوچھنے کو یا کہنے کو منع کر رکھا ہے، جس میں سوچنا پڑے، کیونکہ اس کے بعد نیند جاتی رہتی ہے۔ اس سے حدیث کا راز معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کے بعد قصہ اور باتوں سے منع فرمایا ہے۔ اور جعلنا اللیل سکنا کے بھی خلاف ہے کسی چیز کی طرف توجہ دلانا، جو سکون اور آرام کے خلاف ہو۔ (صفحہ ۲۲۶)

اتباع سنت کے معنیٰ:

اتباع سنت کے معنیٰ لوگ صرف نماز و روزہ میں اتباع کرنے کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہر شے میں اتباع سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر شے کا طریقہ بتایا ہے۔ لوگوں کی معاشرت بہت ناقص ہوگئی ہے۔ بعض محققین نے اس کی ایک مثال فرمائی ہے کہ ایک کنوئیں میں پچاس ہاتھ رسی لگتی ہو اور کوئی اس میں چالیس ہاتھ رسی ڈالے تو پانی نہیں نکل سکتا۔ (صفحہ ۲۲۷)

قربت کا اطاعت سے بڑھنا نہ کہ کرامت سے:

فرمایا، جو شخص ذاکر شاغل ہو اور اس سے کشف و کرامت کا صدور بھی ہوتا ہو، میں اس سے کہتا ہوں کہ کرامت یا کشف کے بعد قلب کی طرف متوجہ ہوکر دیکھے کہ اس سے اس وقت وجدانی طور پر قرب خداوندی میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ یا ایک بار سبحان اللہ یا اللہ اکبر کہنے سے قرب خداوندی میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں واللہ، قرب خداوندی ذکر اللہ کے بعد زیادہ محسوس ہوگا۔ (صفحہ ۲۲۹)

تعظیم و عبادت میں فرق:

تعظیم و عبادت میں فرق یہ ہے کہ کسی میں الوہیت کی خصوصیت کا اعتقاد کرکے، اس کی تعظیم کی جائے یا اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا کام کیا جائے، جو اللہ کا خصوصی استحقاق ہے۔ یہ عبادت ہے اور اگر یہ صورت نہ ہو تو تعظیم ہے۔ خواص الوہیت، قدم، وجوب وجود، علم کامل، قدرت کاملہ، تصرف مستقل ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی مخلوق کی نسبت یہ اعتقاد کرے کہ یہ اوصاف گو خدا کے عطا کردہ ہیں۔ مثلاً علم و قدرت وغیرہ اس میں اس مخلوق کو استقلال حاصل ہوگیا ہے، یعنی بلا استعانت غیر کے سب کچھ کرسکتا ہے تو یہ اعتقاد بھی ناجائز اور شرک ہے اور اگر خواص الوہیت کسی میں کلا یا بعضا ثابت نہ کئے جائیں اور عظمت کی جائے، جیسے استاد یا باپ وغیرہ کی تعظیم، بشرطیکہ اور خرابی نہ ہو تو جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ عبادت اور تعظیم میں نیت اور اعتقاد کو دخل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی فعل کبھی عبادت اور کبھی تعظیم ہو فرق علیٰ! حسب الاعتقاد ہو، عبادت کے معنیٰ

غایت تذلل کے ہیں۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ (صفحہ ۲۳۰)

تقاضائے طبیعت اور واردات میں فرق:

بعض وقت کام کرتے دفعتاً مولوی سعید احمد صاحب مرحوم کا خیال آتا ہے اور تقاضا ہوتا ہے کہ ان کی قبر پر چلو۔ ایک آدھ منٹ یہ بات رہتی ہے، پھر دفع ہوجاتی ہے۔ میں اس پر عمل نہیں کرتا، کیونکہ میرے مرحوم سے تعلقات ہیں، یہ محض مقتضائے طبیعت ہے، کوئی وارد غیبی نہیں ہے اور ایسے مواقع پر طبیعت کے تقاضوں پر عمل کرنے سے اور زیادتی و شدت ہوجاتی ہے اور ناحق کی علت لگ جاتی ہے۔ البتہ واردات پر عمل کر لینا چاہئے۔ کیونکہ وارد پر عمل کر لینے سے طبیعت فارغ ہوجاتی ہے اور ان دونوں میں وجدان سے امتیاز ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۰)

استعانت کا مسئلہ:

سوال کیا گیا کہ؛ وایاک نستعین حصر استعانت معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ کام کاج میں لوگوں سے استعانت کی جاتی ہے۔ ارشاد فرمایا: مراد یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو بالاستقلال معین سمجھ کر مدد نہ مانگنا چاہئے۔ باقی جو چیزیں لوگوں کے اختیار میں ہیں، ان میں ان سے مدد لینا جائز ہے۔ کیونکہ وہاں ان کا غیر مستقل ہونا ظاہر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ افراد کو خدا اگر ابھی معذور یا بیکار کردے تو وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ اسی طرح صوفیہ فیوض باطنی میں مشائخ احیاء و اموات سے مستفیض ہوتے ہیں اور یہ کشف اور تجربہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ نفع ہوتا ہے۔ اس لئے اس نفع کا ظنا اعتقاد رکھنا جائز ہے۔ لیکن اس میں مستقل سمجھ کر اعانت کرنا جیسا کہ عوام کا اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ انہیں مستقل حاجت روا سمجھتے ہیں، بالکل ناجائز ہے۔ (صفحہ ۲۴۵)

فخر کرنے والوں کے کھانے سے ممانعت:

دریافت کیا گیا کہ فخر تو ایک باطنی معاملہ ہے۔ تو کسی شخص پر فخر کا گمان کرنا اور عمل کرنا کیا درست ہے؟ جواب میں فرمایا کہ حدیث نہی عن طعام المتبارئین میں حضور صلعم نے فخر کرنے والوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ حالانکہ زبان سے کوئی بھی اپنے فخر کا

اقرار نہیں کرتا۔ پس اگر قیاس وغیرہ سے یہ بات معلوم نہیں ہوسکتی تو اس حدیث پر عمل کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرائن وغیرہ سے فخر معلوم ہوجاتا ہے، تو اس کا اعتبار کرنا جائز ہے۔ (۲۴۵)۔

جہاں شورش کا خطرہ ہو:

ایک شخص نے دریافت کیا کہ چمار کے گھر کا پکا ہوا کھانا اگر پاکی سے تیار ہوا ہو، کھانا جائز ہے۔ پھر کھانے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ فرمایا، محض چمار کے چھونے سے کھانا نجس نہیں ہوتا، پاک اور جائز ہے۔ لیکن جہاں یہ مسئلہ ہے، وہاں دوسرا مسئلہ بھی ہے، وہ یہ کہ جہاں نجس امر مباح سے شورش پیدا ہوتی ہو، وہاں اسے ترک کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے محض شورش و فتنہ کے خیال سے حطیم کو خانہ کعبہ میں داخل نہ فرمایا۔ (صفحہ ۲۵۰)۔

روضہ اقدس کی زیارت پر اہم بحث:

فرمایا، ایک بار حضرت حاجی صاحبؒ اور ایک متشدد غیر مقلد کے درمیان مناظرہ ہوا، وہ غیر مقلد مدینہ منورہ جانے سے منع کرتا تھا۔ اس کا استدلال **ولا تشد الرحال الا الیٰ ثلثة مساجد** سے تھا۔ حضرت نے فرمایا، کیا زیارت ابوین طلب علم وغیرہ کے لئے سفر جائز نہیں۔ اس کا اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر وہ کہنے لگا: اگر جانا جائز بھی ہو تو کوئی فرض واجب تو ہوگا نہیں کہ خواہ مخواہ جایا جائے۔ حضرت نے فرمایا، ہاں شرعاً تو فرض نہیں، لیکن طریق عشق میں تو ہے، خیال کیجئے سلیمان علیہ السلام بیت المقدس بنائیں اور وہ قبلہ بن جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مسجد بنائیں اور وہ قبلہ قرار پائے اور آنحضرت ﷺ مسجد بنائیں تو وہ کیا اتنی بھی نہ ہو کہ، وہاں لوگ زیارت کو جایا کریں۔ چونکہ حضرت ﷺ کی شان عبودیت تھی اور شہرت ناپسند تھی۔ اس لئے آپ کی مسجد قبلہ نہیں ہوئی۔ اس شخص نے کہا مسجد نبوی ﷺ کے لئے تو جانا جائز ہے، مگر روضہ شریف کے قصد سے نہ جانا چاہئے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ مسجد نبوی ﷺ میں فضیلت آئی کہاں سے، وہ حضور ﷺ کی وجہ سے ہی تو ہے۔ تو مسجد کے لئے تو جانا جائز ہو اور صاحب مسجد جن کی وجہ سے اس میں فضیلت آئی، ان کی زیارت کے لئے جانا ناجائز ہو، عجیب تماشا ہے، وہ لاجواب

ہوئے، اور اگر کہے کہ آپ کی زیارت کہاں ہوتی ہے، صرف قبر کی ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایک حدیث میں آپ نے دونوں کو مساوی فرمایا ہے: **من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی**۔ اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا: **اھدنا الصراط المستقیم** پڑھتے وقت معنیٰ کا خیال کر کے پڑھا کرو اور ہدایت کی دعا مانگا کرو۔ وہ کہنے لگا، مجھے اس بارہ میں دعائے ہدایت کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے فرمایا دعا کرنے میں حرج کیا ہے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اگر حق پر نہ ہو تو خدا ہدایت کرے۔ اس کے بعد قریب ہی مغرب کی نماز میں وہ غیر مقلدی کی وجہ سے گرفتار کرلیا گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میں تو مدینہ منورہ جاؤں گا، اس وقت اسے چھوڑا گیا اور مدینہ روانہ ہوگیا۔ (صفحہ ۲۵۲)

زندگی کے کاروبار کا، اعتماد سے چلنا:

فرمایا، ہر عمل کا مدار اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً باورچی نے کھانا سامنے لاکر رکھ دیا۔ اب صرف اس کے اعتماد پر کھانا کھالیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کہیں زہر نہ ملادیا ہو (چنانچہ بعض وقت ایسا ہوتا بھی ہے) اب دیکھئے، یہاں پر زہر ملانے کے احتمال کا خیال نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا، تاجر لوگ کروڑوں روپیہ کی تجارت صرف ملازمین کے اعتماد پر کرتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات ملازم لوگ بہت سارا سامان غبن کر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کا بھی سارا کام ملازموں کے ذریعہ چلتا ہے۔ اسی طرح دین کا بھی کل کام اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کو قرآن مجید ماننا، علماء کے اعتماد پر ہے اور اس زمانہ کے علماء کو اپنے سے اگلے علماء پر، پھر ان کو صحابہ کرام پر، ان کو رسول اللہ ﷺ پر۔ پس ثابت ہوا کہ کل کام خواہ دین کا ہو یا دنیا کا، سب کا دارو مدار اعتماد ہی پر ہے۔ اب عوام کے لئے دین کے ہر کام میں دلیل تلاش کرنا عظیم غلطی ہے۔ (صفحہ ۲۵۵)

شائستہ گھوڑے اور شریر گھوڑے کی مثال:

فرمایا، کبھی منتہی کو بھی گناہ کا میلان ہوتا ہے اور یہ نقص نہیں ہے، مگر اس کے مقتضاء پر عمل نہ کرنا چاہئے اور مبتدی اور منتہی میں فرق ایک شائستہ گھوڑے اور ایک شریر گھوڑے کا سا ہے۔ شائستہ گھوڑا بھی شرارت کرتا ہے، مگر وہ ذرا سی تنبیہ پر رک جاتا ہے، بخلاف شریر کے کہ اسے زیادہ تنبیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ (صفحہ ۲۵۸)

ہماری عبادت کی حیثیت:

فرمایا، ہماری عبادت تو ایسی ہے، جیسے کوئی شخص کسی شیخ یا رئیس کی خدمت کرے اور وہ خدمت کا طریقہ نہ جانتا ہو اور شیخ اس کی خدمت کو ناپسند بھی کرتا ہو، مگر صرف اس کی دل شکنی کی وجہ سے منع نہیں کرتا، اگرچہ انہیں تکلیف بھی ہو رہی ہے۔ مگر فرد سمجھتا ہے کہ اس خدمت سے انہیں راحت ہو رہی ہے۔ اسی طرح ہماری عبادت بھی ہے کہ اللہ میاں کو پسند تو نہیں ہے، مگر صرف اپنی عنایت کی وجہ سے کچھ کہتے بھی نہیں ہیں۔ پس ہمیں چاہئے کہ اپنی عبادت پر مغرور نہ ہوں اور اس پر نظر نہ کریں اور نجات کی امید اس کی رحمت سے رکھیں۔ (صفحہ ۲۶۱)

صحابہ کرام کی انتظامی صلاحیتیں:

فرمایا، آج کل ہم لوگوں میں غفلت بہت بڑھ گئی ہے۔ جو کام بھی کرتے ہیں، بڑی بے پرواہی و بے انتظامی سے کرتے ہیں اور صحابہ کرامؓ وغیرہ کا جو کام بھی دیکھا جاتا ہے، سب میں اعلیٰ درجہ کا انتظام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا اتنا انتظام کرتے تھے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ آپ کی ایک عادت یہ تھی کہ آپ نے ایک قسم کی نو رکابیاں بنوائی تھیں۔ جب کوئی چیز حضرت رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے پاس بھیجنی ہوتی تھی، انہیں رکابیوں میں بھیجا کرتے تھے اور پھر ان کو فوراً منگا لیتے تھے اور اگر کبھی کسی کے حصہ میں کچھ کمی ہوتی تو کمی والا وہ حصہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں بھیجتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ آپ کی صاحبزادی تھیں۔ اس لئے فرماتے تھے کہ اگر کم ہو تو انہیں کے حصہ میں ہونا چاہئے۔ تمام عمر اسی طرح گزار دی۔ اب دیکھنا چاہئے کہ یہ کام کوئی ایسا نہ تھا، جس کے لئے اتنا انتظام کیا جاتا، تاہم یہ حضرات ذرا ذرا سی بات کا بھی بڑا انتظام کرتے تھے۔ حضرت نبی کریم ﷺ کو دیکھئے کہ آپ ہر ہفتہ کو مسجد قبا تشریف لے جایا کرتے تھے اور کوئی ہفتہ ناغہ نہیں ہوا اور اسی طرح ساری عمر گذار دی۔ (صفحہ ۲۶۴)۔

قبول دعا میں تاخیر کا سبب:

فرمایا، بعض اوقات دعا کا قبول نہ ہونا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ بعض اوقات قبولیت میں دیر اسلئے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا رونا گڑگڑانا پسند ہوتا ہے، اس لئے دیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی مثال دنیا میں بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات ہم لوگ اپنے گھر والوں کے لئے کوئی چیز لاتے ہیں تو جس سے کم تعلق ہوتا ہے، اسے فوراً دے دیتے ہیں اور جس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، اس کو خوب دق کر کے دیتے ہیں۔ مثلاً بچیوں کو خوب دق کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ لو، پھر جب وہ لینے لگتا ہے تو فوراً ہاتھ کو ہٹا لیتے ہیں۔ کبھی اس شے کو طاق میں رکھ دیتے ہیں، کبھی کچھ دے کر چھین لیتے ہیں۔ غرضیکہ دق کر کے دیتے ہیں، تاکہ اس کا تماشا دیکھیں۔ اگر فوراً دے دیں تو پھر تماشا کس طرح دیکھنے میں آئے۔ اسی طرح بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے بعض بندوں کا رونا چلانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے قبول دعا میں دیر ہوتی ہے۔ (صفحہ ۲۶۵)

نسبت کا سینہ بسینہ حاصل ہونا:

فرمایا، باطنی نسبت کے سینہ بسینہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ سارے فنون میں مناسبت صحبت سے ہی حاصل ہوتی ہے، کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی سینہ بسینہ کے معنی یہی ہیں۔ (صفحہ ۲۶۵)

مجاہدوں میں اعتدال کی ضرورت:

خواجہ نقشبندیؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا، صحابہؓ جو کی روٹی بلا چھنی ہوئی پھونک مار کر کھایا کرتے تھے، اس پر عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا، لیکن چونکہ اس قسم کی روٹی کھانے کی عادت کسی کی نہیں تھی، اس لئے سب کو پیٹ میں درد ہوا، اس پر خواجہ نقشبند نے فرمایا کہ بھائی ہم لوگ ضعیف ہیں، ان لوگوں کی ہمسری کرنا سوء ادب ہے، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، اس سے تکلیف ہوئی، ہمیں چاہئے کہ اسی طرح کی روٹی کھایا کریں۔ (صفحہ ۲۶۶)۔

گنبد کے نظر آنے پر قناعت کرنا:

ایک شخص نے حضرت حاجی صاحبؒ سے اس بات کی درخواست کی کہ ہمیں کوئی ایسی چیز بتلایئے کہ خواب میں حضور ﷺ کی زیارت میسر ہو۔ فرمایا کہ بھائی، تمہارا بڑا حوصلہ ہے کہ حضور ﷺ کی زیارت کی تمنا کرتے ہو۔ ہمیں اگر کبھی گنبد ہی نظر آ جائے تو بھی ہمارے لئے بہت ہے۔ (صفحہ ۲۶۶)

عاشق کا حالت مراد کو نہ پہنچنا:

ایک شخص نے حاجی صاحب سے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا، بھائی میرے پاس نامرادی ہے، جہاں مراد ہو وہاں تمہیں جانا چاہئے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ نامرادی سے حضرت کا کیا مطلب ہے۔ آخر خود ہی خلوت میں مجھ سے بیان فرمایا کہ نامرادی سے مرادِ عشق ہے۔ عاشق کبھی اپنی مراد کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ مقصود نہ پا کر آگے طلب میں اور ترقی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے۔

دلارام در بر دلارام جوئے
لب از تشنگی خشک برطرف جوے
نہ گویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند
(صفحہ ۲۶۷)

ولی کے لئے قدرت کے مصالح کو پیش نظر رکھنا:

حضرت حاجی (امداد اللہؒ) صاحب کے یہاں جب آپ تھانہ بھون میں تھے، ایک روز مہمان زیادہ آ گئے اور کھانا تھوڑا تھا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنی چادر گھر پر بھیج دی اور یہ فرمایا کہ اس کو کھانے پر ڈھانک دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خداتعالیٰ کی شان کہ اس کھانے میں اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت فرمائی کہ کھانا سارے مہمانوں کے لئے کافی ہو گیا۔ اتنے میں جناب حافظ محمد ضامن صاحبؒ کو یہ خبر ہوئی۔ انہوں نے حاجی صاحبؒ سے فرمایا کہ اگر آپ کی یہ چادر سلامت رہی تو پھر دنیا میں قحط کاہے کو پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ کی قحط میں جو مصلحتیں ہیں، اب وہ کاہے کو باقی رہیں گی، سب مفقود ہو جائیں گی۔ یہ بات سن کر بہت حضرت حاجی صاحبؒ کو ندامت ہوئی اور فرمایا کہ میں توبہ کرتا ہوں، آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ (صفحہ ۲۶۹)۔

تعلق مع اللہ کے تین درجے:

تعلق مع اللہ کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور یہ ادنیٰ درجہ کا تعلق ہے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے، محض اللہ کی رضاء کے لئے کیا جائے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو خیر اتنا تو کیا جائے کہ کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کیا جائے، ایسا کرنا واجب ہے۔ اور یہ اوسط درجہ ہے، ایسا سب کر سکتے ہیں اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ہمہ وقت ذکر اور طاعت میں مصروف رہا جائے اور یہ اعلیٰ درجہ ہے اور مندوب ہے۔ لیکن یہ مندوب اس شخص کے لئے ہے، جس کے لئے اس مشغولی میں کسی واجب کا ترک نہ ہوتا ہو، ورنہ ایسی مشغولی اس کے لئے جائز نہیں۔ (صفحہ ۲۷۰)۔

حب شیخ کا، کیمیا ہونا:

حب شیخ بہت اچھی چیز ہے۔ بڑے بڑے مجاہدوں کا کام حب شیخ سے نکلتا ہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ جس کو دو باتیں میسر ہوں، اس کی ظلمات بھی انوار ہیں اور ایک میں بھی کمی ہو تو انوار بھی ظلمات ہیں۔ اول اتباع سنت دوسرے حب شیخ۔ ریاضت و مجاہدہ سے مقصود تو اتباع احکام میں استقامت ہے اور حب شیخ سے یہ امر بہت آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب شیخ سے محبت ہو گئی تو فرد اس کا اتباع بہت آسانی و رغبت سے کرے گا۔ (صفحہ ۲۷۶)

خودرو درخت کی حالت زار:

فرمایا، خودرو درخت کہیں ٹھیک نہیں ہوتا، ناہموار اور بعض اوقات بدمزہ رہتا ہے، جب تک اسے باغبان درست نہ کرے، کانٹ چھانٹ نہ کرے اور قلم نہ لگاوے۔ اسی طرح جو شیخ کی خدمت میں نہ رہے اور خود ہی مطالعہ کتب سے فاضل اور شیخ بننا چاہے،

اس کی مثال بالکل خودرو درخت کی سی ہے۔ جب تک اسے شیخ درست نہ کرے، وہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ بلکہ بددین یا بداخلاق ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۲۸۵)۔

بعض کے لئے ذکر وشغل کی پابندی نہ ہونے میں مصلحت ہوتی ہے:

ایک شخص کہنے لگے کہ مجھ سے وظائف اور اوراد و اذکار و اشغال کی پابندی اہتمام کے باوجود نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے قلب ازحد متاسف ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا، آپ اس کے زیادہ درپے نہ ہوجئے، کیونکہ یہ خود ایک مستقل شغل ہوجائے گا، جو حجاب ہے۔ باقی رہی کوتاہی تو استغفار اس کے تدارک کے لئے کافی ہے اور بعض مرتبہ اس کوتاہی اور عدم پابندی میں بھی مختلف مصلحتیں ہوتی ہیں۔ طبیعتیں مختلف ہیں اور اللہ عز وجل ہر شخص کی طبیعت کو خوب پہچانتے ہیں۔ بعض طبیعتیں فطری طور پر ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں پابندی ہونے سے تین خرابیاں ہوجاتی ہیں۔ اول تو عجب، یعنی ہم ہر وقت کام کرتے ہیں، کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ دوم اگر اثرات مرتب ہوں تو اپنے آپ کو ان کا مستحق سمجھنا یعنی یہ کہنا کہ کیونکہ نہ ملتے، ہم تو اس کے مستحق ہی ہیں، ہمشہ اوراد و وظائف وغیرہ میں مشغول رہتے ہس۔ سوم عدم ثمرات پر اللہ تعالیٰ کا شاکی ہونا کہ ہم اتنی مشقت ومحنت وریاضت ومجاہدہ کرتے ہیں اور ہمیں ثمرے نہیں ملتے۔ تو اگر ایسی طبیعتوں میں پابندی نہ ہوتو بجائے عجز کے تواضع ہوتی ہے کہ ہم کس لائق ہیں، کام تو پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور عجز وانکسار آجاتا ہے اور ثمرات کے مرتب ہونے پر فرد اپنے آپ کو مستحق نہیں سمجھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور عدم ثمرات پر خدا تعالیٰ سے شاکی نہیں ہوتا۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کیا ہی کیا ہے، جو ثمرات ملیں۔ پس یہ مصلحتیں ہیں کوتاہی میں۔ (صفحہ ۲۸۶)

بزرگوں کے لئے روک ٹوک کا عمل:

فرمایا، بزرگوں کے اخلاق بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ کچھ روک ٹوک نہیں کرتے، جب کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اس میں مسلمانوں کو ضرر ہوتا ہے، ان کی اصلاح کا خیال کرنا چاہئے (اصلاح کے لئے حکمت سے روک ٹوک ضروری ہے)۔ (صفحہ ۲۹۲)

خاندانی افراد سے فائدہ کا زیادہ ہونا:

فرمایا، خاندانی آدمی اگر غریب بھی ہو اور وہ علم دین پڑھے تو اس سے نفع کی امید زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ اس کی نظر میں امراء کی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام جتنے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب بڑے بڑے خاندانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ (صفحہ ۲۹۲)۔

ذکر سے سارے مذموم اخلاق کی اصلاح ہونا:

فرمایا، اخلاق کی اصلاح کے سلسلہ میں صرف ذکر وفکر کے کافی ہونے کے لئے میرے دل میں ایک نئی بات آئی ہے، جو اس سے پہلے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ وہ یہ کہ چونکہ ذکر اللہ سے قلب میں ایک قسم کا نور شرح صدر حاصل ہوتا ہے اور معصیت کی چیزوں سے ظلمت وکدورت وانقباض ہوتا ہے، اس لئے جب ذاکر سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو وہ نور جو ذکر سے حاصل ہوا تھا، ظلمت وکدورت میں بدل جاتا ہے اور اسے اس سے پہلے جو لذت حاصل تھی، وہ زائل ہوجاتی ہے۔ اس لئے اسے گناہ پر فوراً انتباہ ہوجاتا ہے اور اس سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔ سارے گناہوں سے نفرت ہوجاتی ہے اور اسی طرح صرف ذکر وشغل برے اخلاق کے علاج کے لئے کافی ہوجاتا ہے، بشرطیکہ انتباہ کی طرف بھی توجہ ہو۔ اور انتباہ کے بعد اصلاح کی طرف بھی۔ (صفحہ ۲۹۸)۔

حصہ دوم

شریعت وطریقت میں بہتر اور مؤثر رہنمائی

مجالس حکیم الامت کی روشنی میں

http://knooz-e-dil.blogspot.com/

کتاب کا یہ حصہ ''مجالس حکیم الامت'' تحریر و ترتیب مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ماخوذ ہے، پوری کتاب ۳۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، ہم نے انتخاب کیا ہے، ذیلی سرخیاں بھی ہماری ہی لگائی ہوئی ہیں۔
یہ کتاب دار الاشاعت کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

فرمایا خشیۃ اللہ (خدا کا خوف) تمام حسنات و خیرات کا سرچشمہ اور بڑی فضیلت ہے، مگر وہ بھی اگر حد سے بڑھ جائے تو انسان کو معطل اور بیکار بنادیتا ہے، اس لئے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جو دعاء خشیۃ اللہ کیلئے فرمائی، اس میں یہ فرمایا:

اللھم اقسم لی من خشیتک ما تحول به بینی وبین معاصیک. یعنی یا اللہ مجھے اپنے خوف و خشیت کا اتنا حصہ عطا فرمادے، جو میرے اور گناہوں کے درمیان حائل ہوجائے۔

اس قید سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر خوف زیادہ بڑھ جائے تو وہ انسان کیلئے قابل برداشت نہیں رہتا اور تعطل کا سبب ہوجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کی ملاقات و زیارت کا شوق بھی بہت بڑی نعمت ہے، مگر اس کی دعاء میں بھی حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: **وشوقا الی لقائک فی غیر ضراء مضره ولا فتنة مضلة**۔ ترجمہ: یا اللہ، مجھے اپنی زیارت و ملاقات کا شوق عطا فرما، بغیر اس کے کہ کسی سخت بیماری یا سخت مصیبت و فتنہ کی وجہ سے موت کا طلب گار بنوں۔

اللہ تعالیٰ کی ملاقات و زیارت کا راستہ ظاہر ہے کہ موت کے سواء نہیں۔ اسلئے موت کا محبوب ہونا، اللہ تعالیٰ کی ملاقات و زیارت کیلئے بڑی نعمت ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان کسی ناقابل برداشت تکلیف و مصیبت سے موت مانگنے پر مجبور ہوجاتا ہے، وہ

مصیبت اور مذموم ہے، اس لئے لقاء اللہ کے شوق کو بھی اس قید سے مقید فرمادیا۔ (مجالس حکیم الامت صفحہ ۳۴)۔

مشورہ کی اہمیت:

'انسان کو چاہئے کہ کبھی خودرائی سے کام نہ کرے، جب تک ضابطہ کے بڑے موجود ہیں، ان کے مشورہ پر عمل کرے، جب ضابطہ کے بڑے نہ رہیں تو اپنے برابروں کے مشورہ کا پابند رہے، جب وہ بھی نہ رہیں تو چھوٹوں کے مشورہ کی پابندی کرے۔ اور فرمایا کہ ضابطہ کے بڑے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے، اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔' (صفحہ ۳۸)۔

تعلیم جدید سے پیدا ہونے والے شبہات کی اصل بنیاد:

فرمایا نوتعلیم یافتہ حضرات کے جتنے شبہات اسلامی تعلیمات کے متعلق ہوتے ہیں، ان میں غور کرنے سے سب کی بنیاد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس تعلیم کے اثر سے اللہ جل شانہ اور اس کے رسول اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت قلوب سے اٹھ جاتی ہے۔ اور جب وہ نہ رہی تو ہر حکم میں سینکڑوں سوال کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جب کسی کی عظمت دل میں ہوتی ہے تو اس کے اقوال و احکام پر سوالات ہی پیدا نہیں ہوتے۔ دیکھو، موجودہ حکومت کی عظمت جبری طور پر لوگوں کے قلوب پر چھائی ہوئی ہے، اس لئے اس کے مقرر کردہ قوانین کی لم اور حکمت پوچھنے کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی کہ ڈاکخانہ میں ڈھائی تولہ تک دو پیسے اور اس کے اوپر پانچ تولہ پر ایک آنہ لفافہ کا محصول ہے۔ اس پر سب عالم جاہل خواندہ ناخواندہ عمل کرتے جاتے ہیں، کسی کو یہ پوچھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی کہ اس قانون میں حکمت کیا ہے اور اگر کوئی کسی سے پوچھے بھی تو جواب دینے والا یہ جواب کافی سمجھتا ہے کہ بھئی، قاعدہ قانون یہی ہے، مگر اسلام کی تعلیمات و قوانین کیلئے یہ جواب کافی نہیں سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول علیہ وسلم کا یہی حکم ہے۔ یہ سب پھل پھول اسی کے ہیں کہ اللہ ورسول علیہ وسلم کی عظمت دلوں میں کم ہوگئی۔ (صفحہ ۳۸)۔

اہل جنت کے درجات میں فرق:

فرمایا، یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اہل جنت کے درجات متفاوت ہوں

گے۔ ایک درجہ اور دوسرے درجہ میں بڑا فرق ہوگا۔ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ چھوٹے درجہ والے کو بڑے درجہ والے پر اگر حسد بھی نہ ہو تو کم از کم غبطہ اور اس کے نتیجہ میں ایک قسم کی حسرت ہوتی ہے۔ جنت میں حسد تو نہیں ہوگا کیونکہ وہ فعل حرام ہے مگر یہ سوال ہوتا ہے کہ غبطہ بھی ہوا تو ایک قسم کی حسرت اور کلفت تو ہوگی۔ اور جنت سب کلفتوں سے پاک جگہ ہے وہاں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ فرمایا کہ جنت کے حالات کو دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا وہاں حق تعالیٰ سبکو ایک وصف قناعت عطا فرمائیں گے کہ ہر شخص اپنے مقام پر خوش اور مگن رہے گا بڑے درجہ کے لوگوں کو دیکھ کر اس کے دل میں کوئی حسرت و بے چینی پیدا نہ ہوگی۔ (صفحہ ۴۱)

کافر کی دعا کا بھی قبول ہونا:

فرمایا کہ آیت قرآن وما دعاء الکافرین الا فی ضلال سے استدلال کرکے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ کافر کی دعاء قبول نہیں ہوتی کیونکہ یہ آیت آخرت کے معاملہ میں ہے۔ وہاں کسی کی کوئی دعاء قبول نہ ہوگی۔ دنیا میں حق تعالیٰ سب کی دعا قبول کرتے ہیں یہاں تک اکفر الکفار ابلیس کی دعا قبول فرمالی اور دعا بھی ایسی عجیب قسم کی کہ مجھے قیامت تک عمر طویل دے دیجئے تاکہ میں اولاد آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہوں۔ حق تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول فرماکر انک من المنظرین کا اعلان فرمادیا۔ (صفحہ ۴۳)

تصوف کی حقیقت، نفس کو مرضی مولیٰ کے تابع بنانا:

ارشاد فرمایا کہ لوگ اس طریق میں سالک ہونے کو بڑی چیز سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز سالک ہونا نہیں ہالک ہونا ہے۔ یعنی اپنے کو مٹادینا۔ اور مٹادینا بھی وہ معتبر ہے کہ اس مٹانے کو بھی مٹادے کہ اس کی طرف کوئی التفات نہ ہو جیسے اصلی اور گہری نیند وہی ہے جس میں سونے والے کو اپنے سونے کی بھی خبر نہ رہے ورنہ پھر وہ نیند نہیں اس کو اونگھ کہیں گے۔

مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ!
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(انتہی) (صفحہ ۴۳)

باطنی امراض کی اصلاح سے پہلے نفلی عبادات کا مضر ہونا:

فرمایا، جس طرح لطیف غذا خلط غالب کی طرح مستحیل ہو جاتی ہے۔ جس کے جسم میں صفراء بڑھا ہوا ہے۔ غذا میں احتیاط نہ کی جائے تو وہ بھی صفراء ہی بڑھاتی ہے۔ اس لئے مسہل کی ضرورت ہے۔ مقوی غذاء بعد میں دی جاتی ہے۔ اسی طرح امراض باطنہ عجب۔ تکبر۔ ریاء کے موجود ہوتے ہوئے اذکار و اوراد کی کثرت بعض اوقات مرض کو بڑھادیتی ہے۔ یہاں بھی مجاہدات کا مسہل دینے کی ضرورت ہے، تاکہ نیک عمل کرکے عجب و کبر میں مبتلا نہ ہوجائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امراض باطنہ کی اصلاح کو اذکار و اوراد پر مقدم کرنا چاہیے۔ (انتہیٰ)

متقدمین صوفیاء میں اس کا بڑا اہتمام تھا۔ اب لوگوں کو توجہ نہیں رہی، اسی لئے مشائخ کی خدمت میں رہ کر ذکر و شغل میں مشغول رہنے کے باوجود بہت سے لوگوں کی اصلاح نہیں ہوتی۔ امراض باطنہ جو درحقیقت کبیرہ گناہ ہیں وہ جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہ کچھ خوابیں دیکھ کر اپنے کو ولی اور مقبول سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ معاصی کی عادت کے ساتھ ولایت ومقبولیت کبھی جمع نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۴۴)

سلوک کا مقصود باطنی امراض کی اصلاح:

فرمایا ہر طبقہ میں رسوم غالب آجاتی ہیں تو حقائق مستور ہوجاتے ہیں۔ سلوک و تصوف کا اصل مقصد اوراد و اشغال نہیں، یہ چیزیں معین مقصود ضرور ہیں۔ مگر اصل مقصود اعمال باطنہ کی اصلاح ہے۔ جب تک وہ نہ ہو اوراد و اشغال کا بھی پورا نفع نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات عجب و کبر میں مبتلا ہوجانے کے سبب مضر بھی ہوجاتے ہیں۔

فرمایا کہ 'اگر کوئی کہے کہ اصلاح اعمال باطنہ کے طریقے تو تصوف کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر انسان اپنی اصلاح کرسکتا ہے پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے تو جواب یہ ہے کہ بدن انسانی کے امراض کے معالجات بھی طب اور ڈاکٹری کی کتابوں میں پورے لکھے ہوئے موجود ہیں، پھر طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت کیوں محسوس کی جاتی ہے، جو ضرورت یہاں ہے، وہی امراض باطنہ میں بھی ہے' (انتہیٰ) (صفحہ ۴۵)

کشف اہمیت کا حامل نہیں:

ارشاد فرمایا غائب چیزیں یا آئندہ ہونے والے واقعات کا کشف نہ کوئی دینی کمال ہے، نہ اللہ تعالےٰ کے یہاں تقرب کی علامت ہے، اس کے لئے تو مسلمان یا عاقل ہونا بھی شرط نہیں۔ غیر مسلم کو بھی کشف ہوسکتا ہے۔ مجنون کو بھی کشف صحیح ہوسکتا ہے۔ طب یونانی کی مشہور کتاب ''شرح اسباب'' میں دماغی امراض کے ذیل میں لکھا ہے کہ بہت سے پاگلوں کو کشف صحیح ہوجاتا ہے۔ اور کافروں فاسقوں کے، کشف کے صحیح ہونے کے تو سینکڑوں واقعات دنیا میں معروف ومشہور ہیں۔

قدرۃ اللہ نامی ایک صاحب تھے، جنہیں خود بخود کشف قبور ہونے لگا تھا اور کشف بھی اکثر صحیح ہوتا تھا، مگر وہ نماز تک کے پابند نہیں تھے۔ وہ ایک قبر پر گئے تو بتایا کہ صاحب قبر کھڑے ہوئے صندل کی تسبیح پڑھ رہے ہیں، تحقیق کرنے پر ان کے ایک خاص دوست نے بتایا کہ واقعی صاحب قبر صندل ہی کی تسبیح رکھتے تھے، جس سے ان کو خاص محبت تھی، اس لئے اس دوست سے کہا تھا کہ میرے دفن کے وقت یہ تسبیح میری قبر میں رکھ دینا۔ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔

ایک مرتبہ قدرۃ اللہ صاحب ایک قبر کے پاس نماز پڑھنے لگے۔ اچانک چونک اٹھے اور کہا کہ اس قبر میں مردہ پر عذاب ہو رہا ہے اور وجہ عذاب کی یہ ہے کہ اس کے پاس کسی شخص کی امانت تھی، اس نے طلب کی تو یہ مکر گیا اور امانت واپس نہ دی۔ قدرۃ اللہ صاحب کو اس سے پہلے اس مردہ کا نام اور حال کچھ معلوم نہ تھا۔ جب تحقیق کی گئی تو اس کی بیوی نے اقرار کیا کہ واقعی بات صحیح ہے، یہ میرے شوہر تھے، انہوں نے فلاں شخص کی امانت لے کر واپس دینے سے انکار کردیا تھا۔

غرض یہ کہ مغیبات کا کشف ایک جسمانی باطنی قوت کے تابع ہے، وہ کافروں، فاسقوں اور دیوانوں کو بھی کبھی کبھار حاصل ہوجاتی ہے، اس سے کشف ہونے لگتا ہے اور کشف بھی اکثر صحیح ہوتا ہے۔ ان چیزوں کو تقرب الی اللہ اور بزرگی میں کوئی دخل نہیں۔ آج کل لوگ عجائب پسند ہوگئے ہیں۔ جسکو صاحب کشف دیکھا، اس کے معتقد ہوجاتے اور ان میں بہت سے لوگ خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

حق و باطل اور مقبول و مردود کا اصل معیار صرف اتباع شریعت وسنت ہے، جو اس

معیار پر پورا نہ اترے، وہ ولی و مقتداء نہیں، گمراہ ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی کشف صحیح ہوتے ہوں۔ (صفحہ ۵۰)۔

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ پر چند اشکالات اور لطیف جواب:

فرمایا قرآن کریم میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بغرض تکمیل علم کے سفر کرنا مذکور ہے۔ اس میں حضرت خضر نے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہی یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ ان کے کسی کام پر ٹوکیں گے نہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وعدہ پر کیوں قائم نہ رہے کہ بار بار ان کے کاموں پر ٹوکا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ وعدہ کا پورا کرنا، اس صورت میں واجب ہے کہ اس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔ خلاف شرع ہو تو وعدہ توڑنا لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسا وعدہ جس کے خلاف کرنے پر دوسرے فریق کا کوئی ضرر اور نقصان نہ ہو، اس کا ایفاء بھی واجب نہیں ہوتا۔

تین واقعے جن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر کو ٹوکا۔ ان میں ایک واقعہ تو ظاہر شرع کے بالکل خلاف تھا کہ لڑکے کو قتل کردیا۔ اور دو اور واقعے۔ کشتی توڑنے کا اور دیوار سیدھا کرنے کا، گو خلاف شرع اور ناجائز نہ تھے، مگر حالات کے تابع خلاف استحباب و مروت تھے۔ پیغمبر ان چیزوں پر صبر نہیں کرسکتے اور نہ کرنا چاہئے، اس لئے مجبور ہوکر ٹوکا۔ خصوصاً یہ بھی معلوم تھا کہ ان چیزوں پر ٹوکنے میں حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی ضرر اور نقصان نہیں۔ (انتہیٰ)

یہاں دو یا تین ادب شریعت کے متعلق اور قابل نظر ہیں۔ اول تو یہ، شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ واقعات ایسے پیش آئیں گے، جو شریعت کے خلاف ہوں، اس لیے یہ وعدہ کرلیا کہ: ستجدنی ان شاء اللہ صابرا ولا اعصی لک امــــرا ۔ یعنی آپ ان شاء اللہ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کے خلاف نہ کرونگا۔

پھر جب کشتی توڑنے کا واقعہ پیش آیا تو اس کو مروت و اخلاق کے خلاف سمجھتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے۔ لقد جئت شیئا امرا: یعنی یہ کام تو آپ نے بہت عجیب کیا کہ اپنے احسان کرنے والے کشتی بانوں کو نقصان پہنچادیا۔

اس وقت حضرت خضر نے وعدہ یاد دلایا تو موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر کر کے آگے کو وعدہ کی پابندی کا اقرار کیا۔

مگر جب دوسری مرتبہ بچے کے قتل کا معاملہ سامنے آیا جو ظاہر شریعت کی رو سے بالکل حرام تھا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر شدت سے ٹوکا۔ اور حضرت خضرؑ نے پھر پچھلا قول و قرار یاد دلایا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی نسیان وغیرہ کا عذر بھی نہیں کیا اور آیندہ کے لئے اس وعدہ پر قائم رہنے کا فیصلہ بھی نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا کہ اگر میں آیندہ آپ سے کوئی سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ایک اللہ کا نبی اپنے منصبی فریضہ کی بناء پر کھلے ہوئے خلاف شرع کام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اس کا وعدہ کرسکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تو شریعت کے آداب کی پابندی اس طرح واضح ہوئی اور دوسری طرف حضرت خضر علیہ السلام نے بھی ظاہر شریعت کے احترام کو ملحوظ رکھا کہ لڑکے کا قتل جو شریعت کی رو سے حرام تھا، اس واقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جدا نہیں کیا، بلکہ تیسرے واقعہ میں جو دیوار کے سیدھا کرنے کا معاملہ تھا، وہ کسی طرح بھی خلاف شرع نہیں تھا۔ خلاف مصلحت کہا جاسکتا تھا، اس پر بھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ٹوکا تو اس وقت فرمایا۔

ھذا فراق بینی وبینک. اب ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی کا موقع آ گیا۔

دیکھیے اس پورے واقعہ میں شریعت کے احترام کا دونوں طرف سے کس طرح اہتمام کیا گیا ہے۔ اب جاہل مدعیان تصوف نے اس واقعہ کا یہ نتیجہ نکال رکھا ہے کہ شریعت اور چیز ہے، طریقت اور چیز۔ جو چیزیں شریعت میں حرام ہیں، وہ طریقت میں جائز ہوسکتی ہیں۔ معاذ اللہ، یہ کھلا ہوا انکار شریعت ہے۔ طریقت کی حقیقت شریعت پر عمل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ جو طریقت، شریعت کے خلاف ہو، وہ الحاد و زندقہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ اس واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے خلاف شرع کام کو کیسے اختیار کرلیا، جس پر موسیٰ علیہ السلام کو اعتراض کرنا پڑا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی اللہ کے نبی اور صاحب وحی تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پاکر اس پر عمل کر رہے تھے اور شریعت کے مقررہ قانون میں خود وحی الٰہی کے ذریعہ تبدیلی اور استثنائی صورتیں ہونا کوئی امر مستبعد نہیں، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وحی کی خبر نہ تھی۔

جس نے حضرت خضر علیہ السلام کیلئے شریعت کے عام قاعدہ سے اس واقعہ کو مستثنیٰ کردیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ضابطہ شریعت کے مطابق اس پر اعتراض کرنا ضروری سمجھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جو بھائیوں کی طرف چوری منسوب کرنا مذکور ہے، اگرچہ انہوں نے چوری نہیں کی تھی۔ ایسی حالت میں ان کو چور قرار دینا شرعاً جائز نہیں تھا۔ اس کی بھی یہی توجیہہ ہوسکتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام صاحب وحی ہیں۔ ان کو بطور استثناء یہ اجازت مل گئی ہوگی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ شکل صرف اسی وقت ہوسکتی ہے، جبکہ ایسا کرنے والا نبی اور صاحب وحی ہو۔ کوئی ولی صاحب کشف و الہام ایسا ہرگز نہیں کرسکتا، کیونکہ کشف والہام کوئی حجت شرعی نہیں، اس کے ذریعہ شریعت کے کسی قاعدہ میں ترمیم یا استثناء نہیں ہوسکتا۔ جاہل صوفیوں نے جو اس واقعہ کو خلاف شرع امور کے ارتکاب کیلئے وجہ جواز بنالیا ہے، وہ سراسر گمراہی ہے۔ اب نہ کوئی نبی آسکتا ہے، نہ کسی پر وحی آسکتی ہے، نہ شریعت کے حکم کے خلاف کوئی استثناء ہوسکتا ہے۔ (صفحہ ۵۱ تا ۵۵)

ایک مختصر جامع دعا:

فرمایا نماز کے بعد کیلئے میں نے ایک مختصر جامع دعاء اختصار کر رکھی ہے، جس میں اپنے اور سب مسلمانوں کیلئے دین و دنیا کے سارے مقصد کی دعاء آجاتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ اللھم کل خیر لکل مسلم ومسلمۃ۔ (صفحہ ۵۶)

نیکی کی طرف جو قدم بھی اٹھے نفع سے خالی نہیں:

ارشاد فرمایا، قرآن کریم نے ان لوگوں کی مدح فرمائی ہے، جو آخر شب میں عبادت کیلئے اپنے بستر ے چھوڑ دیتے ہیں۔ تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع کا یہی مفہوم ہے، اس کے اصلی مصداق تو وہی لوگ ہیں، جو بستر ے چھوڑ کر وضوء کر کے نماز و عبادت میں مشغول ہوجائیں۔ لیکن اگر کوئی شخص دینی کمزوری یا سستی کے سبب یہ کچھ نہ کرسکے اور صرف بستر پر ہی اٹھ کر بیٹھ جائے اور چند منٹ کچھ اللہ کا نام لے لے۔ وہ بھی ان شاء اللہ اس صورت تعمیل کی وجہ سے کچھ نہ کچھ حصہ ان کا پالئے گا۔ (صفحہ ۶۳)

معاشی پریشانی کا حل، اخراجات گھٹانا:

فرمایا الٰہی بخش صاحب رئیس میرٹھ حکیمانہ دماغ رکھتے تھے، انہوں نے ایک بڑے کام کی بات فرمائی کہ لوگ معاشی پریشانیوں کو دور کرنے کیلئے اسکی تو بہت فکر کرتے ہیں کہ آمدنی بڑھائیں، جو عادۃً ان کے اختیار میں نہیں۔ مگر اسکی فکر نہیں کرتے کہ خرچ گھٹائیں، خصوصاً غیر ضروری اخراجات کو بہت کم کریں، حالانکہ یہ ہر ایک انسان کے اختیار میں ہے۔ (صفحہ ۶۴)

جنات تابع کرنے کا عمل:

فرمایا میں نے ایک مرتبہ حضرتؒ سے (قلمی مسودہ میں اس جگہ کسی بزرگ کا نام نہیں لکھا، معلوم نہیں کہ حضرت حاجی صاحبؒ مراد ہیں یا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) جنات تابع کرنے کا عمل پوچھا تو فرمایا کہ میرے پاس ایسے عمل ہیں اور بہت آسان بھی ہیں۔ آپ کروگے تو ہو بھی جائیں گے۔ مگر ایک بات سن لو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بندہ بننے کیلئے پیدا کیا ہے، خدا بننے کیلئے نہیں کہ دوسری مخلوق کو اپنے تابع کرتے پھرو۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے اسی وقت ایسے عملیات سے نفرت ہوگئی۔ (صفحہ ۶۷)

جہر آمین اور رفع یدین کے مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ اسماعیلؒ کا مکالمہ

فرمایا حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید دہلویؒ نے بعض حنفیوں کے غلو کو دیکھ کر خود جہر آمین اور رفع یدین شروع کردیا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے ان سے فرمایا کہ جہر آمین اور رفع یدین بلاشبہ سنت سے ثابت ہیں اور بہت سے آئمہ مجتہدین کا اس پر عمل ہے۔ اگر اس پر کوئی عمل کرے تو فی نفسہ کوئی مضائقہ نہیں، لیکن جہاں سب لوگ حنفی ہیں، وہاں اس عمل سے لوگوں کو خواہ مخواہ تشویش ہوتی ہے، جس سے بچنا بہتر ہے۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ نے عرض کیا کہ حضرت حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے، اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے، اس جگہ یہ سنت مردہ ہو رہی ہے، اس لئے میں اس کو زندہ کرتا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے فرمایا کہ میاں اسماعیل۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ تم پڑھے فاضل

عالم ہوگئے ہو، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے کہ سنت کا مردہ ہونا، وہاں صادق آتا ہے، جہاں سنت کے خلاف کسی بدعت نے جگہ لے لی ہو۔ اور جہاں ایک سنت کے مقابلہ میں دوسری سنت ہو اور آئمہ مجتہدین میں اختلاف ہو، کوئی اس سنت کو ترجیح دے کر اس پر عمل کرتا ہے کوئی اس کے مقابل دوسری سنت کو ترجیح دے کر اس پر عمل کرتا ہے، وہاں دونوں طرف سنت ہی سنت ہے، کوئی بدعت نہیں، اس لئے سنت مردہ نہیں تو پھر احیاء سنت کا اس موقع پر اطلاق کیسے صحیح ہوگا۔ کیونکہ جس طرح سنت سے جہر آمین اور رفع یدین ثابت ہے، اسی طرح اخفاء آمین اور ترک رفع یدین بھی سنت ہی سے ثابت ہیں۔ دونوں میں راجح و مرجوح کا فرق آئمہ مجتہدین کا کام ہے، ان میں سے کچھ آئمہ نے جہر اور رفع کو ترجیح دے دی، کچھ آئمہ نے ترک جہر اور رفع راجح قرار دیا۔ یہاں دونوں طرف میں کوئی بھی بدعت نہیں، جس سے سنت مردہ ہو۔ (انتہٰی بمفہومہ (صفحہ ۶۸)

تفویض و توکل کا صحیح مفہوم:

ارشاد فرمایا دعاء میں الحاح کرنا اور بار بار دعاء کرتے رہنا، یہ تفویض کے منافی نہیں۔ ہاں قبولیت دعاء کے آثار نظر نہ آنے پر پریشان ہونا، یہ منافی تفویض ہے۔ کیونکہ وہ اپنی تجویز سے پیدا ہوئی ہے اور تجویز و تفویض میں تضاد ہے۔ علمی اور عملی کمالات دینی میں بھی تفویض کا ایک درجہ یہ ہے کہ ان کے حاصل کرنے کا بھی قصد کرے اور کوشش بھی کرے، مگر اس کیساتھ عدم حصول پر بھی راضی رہے، پریشان نہ ہو۔ (انتہٰی)

احقر جامع کہتا ہے کہ حدیث میں ایک خاص دعاء جو بالفاظ ذیل آئی ہے، اس میں بھی اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ حدیث کی دعا یہ ہے۔

اللھم انی اسئلک الصحۃ والعفۃ والامانۃ وحسن الخلق والرضی بالقدر. یا اللہ میں آپ سے مانگتا ہوں تندرستی اور پاک دامنی اور امانت داری اور حسن خلق اور آپ کی تقدیر پر راضی رہنا۔

اس دعا میں پہلے تو چند دینی کمالات کے حاصل ہونیکی دعا ہے، آخر میں یہ دعا ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مشیت و تقدیر پر راضی رہوں، خواہ وہ میری تمنا اور کوشش کے خلاف ہی ہو۔

اسی لئے حضرتؒ نے آخر کلام میں ارشاد فرمایا کہ یہ طریق (یعنی طریق تصوف)

دیکھنے میں بڑا سہل ہے۔ مگر حقیقت میں بڑا دشوار کہ متضاد چیزوں کو جمع کرنا پڑتا ہے۔ (صفحہ ۷۰)۔

عبادت میں مطلوب چیز:

ارشاد فرمایا حضرت گنگوہی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ عبادت کے اندر جو وساوس اور خیالات انسان کو آتے ہیں، ان کے دفع کرنے میں زیادہ تند ہی سے پرہیز کرنا چاہئے کہ وہ مضر ہوتی ہے۔ اور فرمایا کہ یہ سوچنا چاہئے کہ مقصود اللہ تعالیٰ کا راضی کرنا ہے اور وہ اپنے حد اختیار تک قلب کو فارغ کر کے عبادت میں لگ جانے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر جو وساوس اور خیالات غیر اختیاری طور پر آتے ہیں، وہ مضر نہیں، اس لیے زیادہ الجھن میں نہ پڑنا چاہئے۔ اور اس کے باوجود وساوس و خیالات کے آنے پر فرد کو جو طبعی رنج پیش آئے گا، وہ مجاہدہ ہے، اس پر مجاہدہ کا ثواب ملتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں عبادت مع الوساوس پر اجر و ثواب زیادہ ملتا ہے، ایک عبادت کا ثواب، دوسرا مجاہدہ کا۔ (بشرطیکہ اپنے اختیار سے وساوس کی پرورش نہ کرے اور ان میں خوض نہ کرے)۔

ہر وقت حضور حق، کامل طور پر بڑے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتا اور جب اس حضور میں کوئی سالک کمی محسوس کرتا ہے تو طبعی طور رنج شدید ہوتا ہے، وہ بھی حکمت سے خالی نہیں۔ کہ اس میں صبر و تحمل کا ثواب ملتا ہے۔ (صفحہ ۷۰ - ۷۱)

صوفیہ کے اشغال کی حیثیت و نوعیت:

فرمایا جب میں مکہ معظمہ میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں مقیم تھا تو خیال آیا کہ غذائے روح میں حضرت نے جتنے اشغال نقل فرمائے ہیں، سب کو دو دو دن کر کے دیکھوں، مگر اس پر عمل کرنے سے پہلے حضرت سے اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کوئی کتاب کا سبق تھوڑا ہی ہے کہ سب کو پڑھتے چلے جاؤ، یہ تو عطار کی دکان ہے، جس میں ہزاروں دوائیں ہیں، ہر دوا ہر مریض کیلئے مفید نہیں ہوتی کہ جس کا جی چاہے جو دوا چاہے، اس دواخانے سے لے کر کھالے۔

پھر فرمایا کہ صوفیائے کرام نے جو اشغال لکھے ہیں، ان کی اصل صرف اتنی ہے کہ ان کے ذریعہ جمعیت خاطر حاصل ہو جائے۔ وساوس و خیالات سے قلب فارغ ہو جائے۔ ان اشغال کی جزئیات تو سنت سے ثابت نہیں۔ مگر اس کی اصل سنت سے ثابت ہے، نماز

میں جو نمازی کے سامنے سترہ کھڑا کرنے کا حکم ہے اس کا مقصد بھی جمعیت خاطر ہے۔

ان اشغال کو اگر کوئی شخص طاعت مقصود سمجھ بیٹھے تو وہ بدعت ہو جائیں گے، جیسے زکام بخار وغیرہ میں گل بنفشہ پینا اگر کوئی اس کو طاعت مقصود سمجھنے لگے تو وہ بھی بدعت ہوجائے گا۔ ایک تدبیر صحت سمجھ کر استعمال کرے تو جائز ہے، کیونکہ تحصیل صحت جائز بلکہ مامور بہ ہے، اسی طرح ان اشغال کو جمعیت خاطر کی تحصیل کا ذریعہ سمجھ کر کرے تو درست ہے۔ عبادت مقصود سمجھ کر کرے تو بدعت ہے، یہی حکم ذکر اللہ میں جہر کرنے کا ہے کہ جہر کو دفع وساوس اور جمعیت خاطر کی تدبیر سمجھ کر کرے تو درست ہے، خود جہر کو طاعت مقصود سمجھے تو بدعت ہے۔ (صفحہ ۷۵)۔

علامہ شبلی نعمانی کا قول کہ قوم کی اصلاح صرف مقدس اور بزرگ ہستیوں سے ہی ہوسکتی ہے:

ارشاد فرمایا مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جب دہلی میں نظارۃ المعارف قائم فرمایا تھا تو تھانہ بھون آئے تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں علامہ شبلی نعمانی سے ملا، تو مسلمانوں کی عام بے راہروی اور پریشانی اور مبتلائے آفات ہونے کا تذکرہ ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں قوم کی اصلاح کی تدبیر کیا ہے۔ علامہ شبلی نے کہا کہ قوم کی اصلاح صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں، جن کا قوم پر مکمل اثر ہو اور یہ اثر بغیر تقدس کے نہیں ہوسکتا اور تقدس بغیر تقویٰ اور کثرت عبادت و ذکر اللہ کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ (صفحہ ۷۶)

خلاف شرع سیاسی تدابیر کا غیر نافع ہونا:

ارشاد فرمایا سیاسی تدابیر جو کفر و اسلام سے مرکب ہوں، جب اسکو کفار اختیار کرتے ہیں تو اسلام سے قریب ہوتے ہیں اس لئے کامیاب ہوتے ہیں، اور جب مسلمان ان تدابیر کو اختیار کریں تو کفر سے قریب ہوتے ہیں، اس لئے ناکام ہوتے ہیں، مسلمان قوم کا ایک خاص مزاج ہے، اس کو کفار کی اقوام کے مزاج پر قیاس کرنا، ایسا ہی غلط ہے، جیسا ایک 'بوجھ بجھکڑ' کا قیاس مشہور ہے کہ:

گاؤں کا ایک آدمی کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اور اب وہاں سے اترنا چاہا تو گرنے کا خطرہ ہوا۔ شور مچایا کہ لوگو، میری جان بچاؤ، کسی طرح یہاں سے اتارو۔ لوگ جمع

ہوکر اپنے بوجھ بجھکڑ کے پاس گئے اور تدبیر پوچھی، اس نے کہا کہ ایک مضبوط لمبا رسا لو اور درخت کے اوپر پھینک دو۔ اس شخص سے کہو کہ اپنی کمر میں باندھ لے، پھر تم سب مل کر جھٹکا دو وہ نیچے آجائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سب عقلمند ہی لوگ جمع تھے، اس کے کہنے پر پورا عمل کیا۔ کھجور پر چڑھا ہوا، انسان ایک منٹ میں نیچے آیا، مگر ہڈی پسلی کوئی سالم نہ رہی اور دم توڑ دیا۔ یہ لوگ اپنے مرشد بوجھ بجھکڑ کے پاس دوڑے کہ وہ تو مرگیا۔ بوجھ بجھکڑ صاحب نے فرمایا کہ میں اس کو کیا کروں، اس کی موت آگئی تھی، اسے کون بچا سکتا تھا۔ ورنہ میری تدبیر تو بالکل سلامتی کی یقینی تھی، میں نے اسی تدبیر کو بہت سے کنویں میں گرے ہوئے لوگوں پر استعمال کر کے ان کی جان بچائی ہے۔

بوجھ بجھکڑ نے کنویں کی گہرائی پر کھجور کی بلندی کو قیاس کرلیا اور اس غلط قیاس کا نتیجہ سامنے آگیا۔

اسی طرح مسلمان اللہ کے نزدیک بلندی پر ہیں، کفار پستی میں ہیں۔ ان دونوں کی نجات کیلئے ایک ہی تدبیر مفید ہونا ضروری نہیں۔ (صفحہ ۷۷)

ایک آیت کی تفسیر سے شبہ کا ازالہ:

ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم میں آیت: لم تقولون مالا تفعلون. یعنی کیوں کہتے ہو وہ جو خود نہیں کرتے۔

اس کے ظاہر سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جو شخص خود کوئی نیک عمل نہیں کر رہا، اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو اس نیکی کی طرف دعوت دے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اس کو دعوت پر محمول کرلیا، حالانکہ یہ آیت دعوت کے متعلق نہیں، بلکہ دعویٰ کے متعلق ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ جو وصف تم میں موجود نہیں، اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام تم نے کیا نہیں یا جو وصف تم میں موجود نہیں، اس کا دعویٰ نہ کرو۔ (صفحہ ۷۹)

دعویٰ زبانی و دعویٰ عملی:

فرمایا جس طرح قولاً کسی ایسے کام یا ایسے وصف کا دعویٰ جائز نہیں، جو مدعی میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح اپنی صورت و سیرت اور چال ڈھال سے ایسا دعویٰ ممنوع ہے۔ اس سے ایک حدیث کے مفہوم پر جو اشکال ہوتا ہے، وہ بھی رفع ہوجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ صحابہ اہل صفہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا۔ مرنے کے بعد ان کی جیب میں سے ایک دینار (ساڑھے چار ماشے سونے کا ایک سکہ) برآمد ہوا۔ آنحضرت ﷺ کو کوئی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: کیۃ من النار۔ یعنی یہ دینار جہنم کی آگ کا ایک داغ ہے۔ پھر ایک دوسرے صاحب کے انتقال کے بعد جیب سے دو دینار نکلے تو فرمایا: کیتان من النار۔ یعنی یہ جہنم کے دو داغ ہیں۔

اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک دو دینار پر تو زکواۃ بھی واجب نہیں ہوتی، جس کی عدم ادائیگی کے احتمال پر جہنم کی وعید ہو سکے۔ اس کے علاوہ ایک دو دینار کے کسی کی ملک میں ہونا، کوئی شرعی جرم نہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس چالیس ہزار دینار تھے، جن کو انہوں نے اسلامی ضروریات میں صرف کیا۔ ہجرت کے وقت سات ہزار باقی تھے، جن کو ساتھ لے گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق خرچ کیے۔ حضرت عثمان غنیؓ ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۔ حضرت زبیرؓ صحابہ کرام میں بڑے مالدار حضرات تھے۔ ہزاروں دینار کے مالک تھے، ان پر رسول اللہ ﷺ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی اور ان دو صاحبوں کے ایک یا دو دینار پر اتنی شدید وعید ارشاد فرمائی، اس کی کیا وجہ ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توجیہہ یہی فرمائی ہے کہ حضرات اہل صفہ اپنی صورت اور حالت کے اعتبار سے گویا اس کے مدعی تھے کہ ہم فقیر ہیں، صاحب مال نہیں۔ چونکہ یہ عملی دعویٰ حقیقت کے خلاف ثابت ہوا، اس لیے اس پر وعید آئی۔ (صفحہ ۷۹-۸۰)

لباس میں تکلف کے حامل شخص کی حالت:

فرمایا، جب کسی کو دیکھتا ہوں کہ لباس میں تکلف کا پابند ہے تو دو چیزوں پر استدلال کرتا ہوں۔ اول یہ کہ نکما آدمی ہے، کام میں مشغول رہنے والا اس کا پابند نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ یہ پست حوصلہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں۔ اگر وہ ہوتا تو اس میں لگ کر اپنے اوقات ضائع نہ کرتا۔ (صفحہ ۸۰)

رحمت حق کا عجیب واقعہ:

ایک جاہل عورت مرنے کے وقت کچھ کلمات بول رہی تھی، جو اس کے جاہل گھر والوں کے سمجھ میں نہیں آتے تھے، وہ کسی مولوی صاحب کو بلا کر لائے اور کہا کہ ذرا دیکھو،

یہ کیا کہہ رہی ہے۔ مولوی صاحب نے قریب جا کر سنا تو عربی زبان کے یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے: ان ھذین الرجلین یقولان ادخل الجنۃ. یہ دو آدمی یوں کہہ رہے ہیں کہ تو جنت میں داخل ہو جا۔

مولوی صاحب حیرت میں رہ گئے۔ گھر کے جاہل لوگوں کو بتلایا کہ اس کو تو جنت کی بشارت دی جا رہی ہے۔ اس کے اعمال کیا تھے، جن کے بدلے میں اسکو یہ نعمت ملی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو بالکل بے عمل بلکہ بدعمل عورت تھی۔ مولوی صاحب نے فرمایا، غور کرو، اس کا کوئی اچھا عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہوگیا ہے، وہ کیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد لوگوں نے بتلایا کہ اس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ جب اذان ہوتی تو سب کام چھوڑ دیتی اور اذان کی طرف متوجہ ہو کر سنتی تھی، دوسروں کو بھی اس وقت بولنے نہیں دیتی تھی۔ مولوی صاحب نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام کی یہ عزت کرنا ہی اس کے کام آ گیا، جس نے دوسری برائیوں پر پانی پھیر دیا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی اس رحمت عامہ کا یہ واقعہ نقل فرمانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ مجھے رحمت الٰہیہ کے متعلق انشاء کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ مجھ کو آتا ہے پیار انشاء
ادھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے یہ دمبدم عنایت

احقر جامع کہتا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخ میں سب کی زبان خود بخود عربی ہو جائے گی، کیونکہ وہ ہی انسان کے اصلی وطن یعنی جنت کی زبان ہے، اسی میں اللہ تعالیٰ کی سب کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ پھر انبیاء نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے امت کو سنائے ہیں۔ (صفحہ ۸۱)

ذکر جہر اور اشغال صوفیہ اور بدعت کی حقیقت:

ارشاد فرمایا عام احادیث سے ذکر اللہ میں جہر کی ممانعت مستفاد ہوتی ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ ہمارے بزرگوں میں سب سے بڑے فقیہہ اور محتاط بزرگ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ تھے۔ ان کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہے کہ ذکر اللہ میں جہر کو کوئی شخص افضل یا زیادتیٔ ثواب کا موجب سمجھ کر جہر کرے تو بدعت ہے۔ ہاں، جمعیت خاطر اور قطع وساوس کی ایک تدبیر و علاج کی حیثیت سے کرے

تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی مثال بعینہ یہ ہے کہ زکام میں گل بنفشہ پکا کر پینے کو اگر کوئی شخص خاص عبادت اور ثواب سمجھنے لگے تو یہ بھی بدعت ہوجائے گا۔ اور محض علاج و تدبیر کیلئے کرے تو بدعت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

اس معاملہ میں امیر شاہ خان صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے ایک حدیث کی جو تحقیق نقل کی ہے، وہ اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من احدث فی امرنا ھذا فھو رد۔ یعنی جس شخص نے ہمارے دین میں کسی نئی چیز کو بڑھایا۔ وہ مردود ہے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ نے فرمایا کہ حدیث میں جس چیز کی ممانعت فرمائی ہے، وہ احداث فی الدین ہے، لیکن دین کے احکام کو بروئے کار لانے کیلئے جن ذرائع و وسائل کی ضرورت پیش آئے، اس کا حدیث و قرآن میں منصوص یا مذکور ہونا ضروری نہیں۔ وہ ہر زمانہ میں ہر کام کی مناسبت سے اختیار کئے جاسکتے ہیں، جیسے اس زمانے میں حج کیلئے ہوائی جہاز اور جہاد کیلئے ٹینک اور بم وغیرہ کا استعمال ہے کہ اس کو احداث فی الدین نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ احداث فی الدین کہا جائے گا، وہ جائز ہے۔

اسی طرح خاطر اور قطع وساوس کیلئے ذکر میں جہر یا اشغال صوفیہ میں سے کوئی شغل اختیار کرنا بھی احداث فی الدین نہیں، بلکہ للدین ہے۔ (صفحہ ۸۴-۸۵)

بعض اوقات عمل غلط ہوتا ہے مگر اس کا داعیہ صحیح اور قابل قدر ہوتا ہے۔ حضرت

جنیدؒ کی حکایت:

ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ ایک شخص کو سولی پر لٹکایا ہوا ہے۔ دریافت کیا کہ اس نے کیا جرم کیا تھا، لوگوں نے بتایا کہ یہ ڈاکو ہے۔ اول چوری میں اس کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا، مگر پھر بھی یہ چوری سے باز نہ آیا۔ تو بایاں پاؤں کاٹا گیا۔ پھر بھی باز نہ آیا تو سولی کی نوبت آئی۔ حضرت جنیدؒ آگے بڑھے اور اس کے پاؤں کو آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ فرمایا کہ میں نے اس کے پاؤں کو بوسہ نہیں دیا، بلکہ اس کے وصف استقلال و استقامت کو بوسہ دیا ہے، جو اس کے نفس میں تھا اگرچہ اس بے وقوف نے اس کو شر و معصیت میں استعمال کیا اور اس کی بجا طور پر سزا پائی مگر ہم یہ سوچتے ہیں کہ کاش ہمیں بھی خیر و طاعت کے معاملے میں ایسی ہی

استقامت نصیب ہوجائے۔ (صفحہ ۸۷)

اختلاف مسلک کی صورت میں ضابطہ تعلقات باہمی:

ارشاد فرمایا، جن لوگوں سے خاص مشرب کا اختلاف ہو، ان سے نہ از خود ملنے (اور مجالست) کی کوشش کی جائے، نہ ترک ملاقات کی۔ وقت پر جو صورت پیش آجائے، اسی میں مصلحت سمجھی جائے۔ انقباض طبعی غیر اختیاری ہے، اس کی پرواہ نہ کی جائے کہ مقتضائے غیرت بھی ہے۔ البتہ بدگمانی اور بدزبانی سے اجتناب کی سعی کی جائے۔

۲: جو لوگ، ان کے متعلق روایات و حکایات نقل کرتے ہیں، جو بدگمانی پھر بدزبانی کا سبب بنتی ہیں، ان کو ایسی روایات نقل کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

۳: اپنے ہم مشرب لوگوں میں سے اگر کوئی شخص ان سے ملتا ہے تو اس کی فکر میں نہ پڑا جائے اور اس کی طرف سے عذر یا مصلحت کی تاویل کرلی جائے اور جب تک وہ اپنے سے ملتا رہے، تعلق نباہا جائے کہ لوگ دنیا کیلئے تعلقات نباہتے ہیں اگر کوئی دین کیلئے ایسا کرے تو کیا حرج ہے۔ (صفحہ ۹۲-۹۳)

بزرگوں کی صحبت سے اصل مقصود کیا چیز ہے:

ارشاد فرمایا کہ بزرگوں کی صحبت میں رہنے سے اصل مطلوب ان کا مذاق حاصل کرنا ہے، مگر وہ درحقیقت سعی و عمل سے حاصل نہیں ہوتا۔ محض اللہ تعالیٰ کی موہبت سے، وہ جب چاہتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں، عطا فرمادیتے ہیں۔ باقی رہے اعمال و افعال، وہ اختیاری ہیں، ایک دم میں بدل سکتے ہیں، مگر مذاق صحیح بعض اوقات پچاس برس میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۹۳)

قبل از ہجرت جہاد اور مقابلہ کفار کی اجازت ہونے پر ایک اشکال و جواب:

ارشاد فرمایا قبل از ہجرت جتنے حضرات آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، وہ کسی حال ان لوگوں سے کم نہ تھے، جن کو حضرت خالد بن ولید نے جبلہ بن ایہم کے مقابلہ پر جنگ یرموک میں بھیجا تھا۔ کیونکہ جبلہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور حضرت خالدؓ نے ان کے مقابلہ کیلئے صرف تیس صحابہ کا انتخاب کیا تھا۔ جس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ کیا آپ مسلمانوں کو ہلاک کرانا چاہتے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے جواب دیا نہیں، میں نے ایسے لوگوں

کا انتخاب کیا ہے، جو ساٹھ ہزار سے کم نہیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے پھر فرمایا کہ میرا اطمینان نہیں ہوتا تو ان کے اصرار پر تیس صحابہ کا اور اضافہ کر کے ساٹھ کر دیا اور ان کو ساٹھ ہزار کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ دن بھر تلوار چلنے کے بعد ساٹھ ہزار بھاگتے نظر آئے۔

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ قبل از ہجرت حضرات صحابہ میں ضعف وقلت ضرور تھی، مگر ساٹھ کے عدد سے تو زیادہ تھے اور ان سے قوت میں کم بھی نہ تھے۔ پھر ان کو قتال سے منع کیوں کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اس وقت مجموعی حالات کے اعتبار سے موقع قتال کا نہ تھا۔ اگرچہ نفس قوت فی الجملہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

احقر جامع عرض کرتا ہے کہ شاید یہ مصلحت بھی مانع قتال ہو کہ یہ زمانہ افراد سازی کا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھوں مصائب وشدائد جھیلنے اور اس پر صبر کرنے سے ان حضرات کا تزکیہ مقصود تھا کہ ان کا ہر عمل صلح وجنگ خالص اللہ کیلئے ہوجائے، نفسانی جذبات کیلئے نہ رہے۔ اس لئے اس زمانے میں نفسانی جذبات کو کچلنے اور عفو ودرگذر اور صبر سے کام لینے کے احکام آتے رہے۔ جب تزکیہ نفوس کا اطمینان ہوگیا، اس وقت قتال کے احکام آئے۔ (صفحہ ۹۴)

فتنہ سے حفاظت کی دعا:

ایک حدیث میں یہ دعاء تلقین فرمائی گئی ہے کہ: واذا اردت بقوم فتنۃ فتوفنی الیک غیر مفتون. یعنی یا اللہ، جب آپ کسی قوم کو فتنہ ہی میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمالیں تو مجھے فتنہ سے محفوظ رہتے ہوئے موت دے دیجئے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اس دعاء سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر فتنہ کے ازالہ کی کوشش اور دعاء مناسب نہیں ہوتی، بلکہ ایسے موقع پر اپنے آپ کو فتنہ سے محفوظ رہنے کی دعاء کی جائے۔ (صفحہ ۹۶)۔

اہل اللہ کی، قیل قال اور پرجوش تقاریر سے عدم مناسبت:

فرمایا جس شخص کو معرفت حق کا مقام حاصل ہوجاتا ہے، اس کے نزدیک نظریات بھی بدیہیات بن جاتے ہیں اور بدیہی امور کے بیان کا کوئی آدمی خاص اہتمام نہیں کیا کرتا۔ نصف النہار کے وقت آفتاب کا وجود ثابت کرنے کیلئے کوئی پرجوش تقریر نہیں کی جاسکتی۔ اسی حالت کے متعلق صوفیہ کرام نے فرمایا ہے:

من عرف اللہ کل لسانہ. یعنی جس کو اللہ کی معرفت، حاصل ہوجائے، اس کی زبان گویائی سے تھک جاتی ہے۔

ایک حدیث میں جو ارشاد ہے:

الحیاء والعی من الایمان. حیا اور کلام سے عاجز ہونا، ایمان میں سے ہے۔

اس کا مفہوم بھی کلام اور تقریر سے وہ عجز ہے، جو معرفت حق کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ نااہلیت اور جہل کی وجہ سے جو عجز ہوتا ہے، وہ مراد نہیں۔ کیونکہ وہ ایمان کا شعبہ نہیں ہوسکتا۔ وہ شرعاً مذموم ہے، اس پر فرمایا کہ حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے:

کجا دانند حال ما۔ سبکساران ساحلہا

اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو دریا کے پہلے کنارے پر کھڑے ہیں، دریا کو عبور نہیں کرسکے اور جو لوگ دریا کو عبور کر کے اس کی مشکلات کو حل کر کے، دوسرے کنارے پر پہنچے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ بھی دریا کے کنارے ہی پر کھڑے ہیں، مگر ان دونوں میں بڑا فرق ہے، ان کے متعلق 'کجا دانند' نہیں کہا جا سکتا، وہ سب کچھ جانتے ہیں، مگر صورت کے اعتبار سے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے یکساں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ایک تو وہ جاہل ہے، جو کسی چیز کی حقیقت سے واقف ہی نہیں۔ اس سے کوئی سوال کیا جائے تو جواب اور گفتگو سے حقیقۃً عاجز ہوتا ہے، دوسرا وہ عارف کامل ہے، جو سب چیزوں سے اتنا واقف ہے کہ نظری چیزیں بھی اسے بدیہی معلوم ہوتی ہیں، وہ بھی زیادہ لمبی گفتگو اور بڑی تقریر سے عاجز ہوتا ہے۔ یہی وہ عجز ہے، جس کو حدیث میں جز وایمان قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۹۸-۹۹)

اتفاق واتحاد کا راز:

فرمایا، حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے' اتفاق کی جڑ تواضع ہے، دو متکبروں میں کبھی اتفاق نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو دوسرے کا تابع بنادے اور اپنی رائے کو دوسرے کی رائے کے مقابلہ میں اصرار نہ کرے اور متکبر سے یہ کام کبھی نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۰۱)

صحابہ کرام کی خصوصی شان:

ایک صاحب کو بعض حضرات صحابہ کے متعلق کچھ شبہات رہتے تھے۔ ایک مرتبہ خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ سمندر میں اگرچہ

ہزاروں گندگیاں اور نجاستیں ڈال دی جائیں، مگر سمندر ہی سب پر غالب رہتا ہے، گندگیوں کا اثر اس پر غالب نہیں آتا۔ (صفحہ ۱۰۴)

نیت کی صحت سے گناہوں کی معافی کی صورت کا پیدا ہونا:

فرمایا، حق تعالیٰ کی نظر انسان کے قلب اور اس کی نیت و ارادہ پر ہوتی ہے، اگر وہ خالص اللہ کے لئے ہو، مگر عمل میں کوتاہی ہوجائے تو وہ اکثر معاف ہوجاتی ہے۔ (صفحہ ۱۰۴)

سنت نبوی پر عمل کی اہمیت:

سوال کیا گیا کہ ایک شخص ایک کام سنت کے مطابق کرتا ہے، مگر اس کو نہ اس کا سنت ہونا معلوم ہے، نہ اس نے اتباع سنت کی نیت سے کیا۔ تو کیا پھر بھی اس کو ثواب ملے گا۔ فرمایا کہ ثواب تو بغیر نیت کے نہیں ملے گا۔ مگر موافقت سنت کی برکت سے پھر بھی محروم نہ رہے گا۔ (صفحہ ۱۰۶)

طریق صوفیاء کی اصل:

فرمایا، اس طریق میں اصل چیز صحبت شیخ اور محبت شیخ ہے۔ تعلیم و تلقین اس کے بغیر کارگر نہیں ہوتی اور صحبت بلا تعلیم و تلقین کے بھی مفید ہوتی ہے۔ پہلے بزرگوں کی عام عادت زیادہ تعلیم و تلقین کی نہ تھی۔ ان کی صحبت کی برکت ہی سے اصلاح ہوجاتی تھی۔ غالباً حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے منصب امامت میں لکھا ہے کہ بزرگوں کا فیضِ صحبت آفتاب کے مشابہ ہوتا ہے کہ اس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے۔ خواہ استفادہ کرنے والے کو اس کی خبر بھی نہ ہو اور قصداً استفادہ کرے یا نہ کرے۔ آفتاب کا فائدہ سب کو برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح خاص خاص بزرگوں کا فیضِ صحبت بھی ایسا ہی عام ہوتا ہے اور علامت ایسے بزرگوں کی یہ ہوتی ہے کہ ان کی وفات کے وقت عام قلوب میں ایک ظلمت و کدورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس کی تائید اس جملہ سے ہوتی ہے جو صحابہ کرام نے، رسول اللہ ﷺ کی وفات پر فرمایا تھا:

واللہ ما انفضنا ایدینا من التراب حتیٰ انکرنا قلوبنا. خدا کی قسم کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو دفن کرنے کے بعد اپنے ہاتھ بھی مٹی سے نہیں جھاڑے تھے کہ ہمارے

قلوب میں تغیر محسوس ہونے لگا۔

فرمایا، مشائخ کی صحبت میں رہنے والا ہر وقت اس سے نفع حاصل کرتا رہتا ہے، خواہ اس کو نفع کا احساس اور استحضار ہو یا نہ ہو۔ (صفحہ ۱۰۸)

اہل کمال کے پہچاننے کا حکیمانہ معیار:

ارشاد فرمایا، کسی عالم کے علم کا مقام اور درجہ معلوم کرنا ہو تو طلباء سے دریافت کیا جائے اور کسی صوفی بزرگ کا درجہ معلوم کرنا ہو تو اس زمانے کے مشائخ اہل طریق کا معاملہ دیکھا جائے کہ اس کے ساتھ کیا اور کیسا ہے، وہ اس کو بزرگ صادق الحال سمجھ کر اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں یا نہیں۔

پھر فرمایا کہ اس پر ایک شاہی حجام کا قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے حجام کو خط بنانے کیلئے طلب کیا، وہ اس وقت حاضر نہ ہوسکا۔ یہ بڑا پریشان ہوا کہ اب اس کی تلافی کیسے کروں۔ اس نے شاہی خدام سے بات کرلی کہ جب بادشاہ سو جائیں تو مجھے موقع دیں کہ میں خط بنادوں۔ خدام شاہی نے اس کی ہمدردی سے اس کو منظور کرلیا۔ اس نے پہنچ کر سوئے ہوئے بادشاہ کا خط اس طرح بنادیا کہ اس کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ وہ بیدار ہوئے تو خط بنا ہوا دیکھا۔ درباریوں سے پوچھا تو انھوں نے پورا واقعہ سنادیا۔ بادشاہ، اس کے کمال سے خوش ہوئے اور اس کو استاد کا شاہی خطاب دیا گیا۔ یہ معاملہ شہر میں مشہور ہوا تو ان کے رشتہ برادری کی عورتیں ان کے گھر میں بیوی کو مبارکباد دینے کے لئے جمع ہوگئیں۔ جب بیوی کو معاملہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایک بڑی دانشمندانہ بات کہی، وہ یہ کہ خطاب اگر حجاموں کی برادری یا کسی ماہر حجام کی طرف سے ملتا تو مجھے خوشی ہوتی کہ وہ اس کے کمال کی دلیل تھی۔ بادشاہ اس فن کو کیا جانے۔ اس کے لقب و خطاب دینے سے میرے نزدیک اس کی کوئی عزت نہیں بڑھی۔ (صفحہ ۱۱۰)

سالکین کے لئے ایک حکیمانہ نصیحت:

ارشاد فرمایا، اس عالم میں جیسے اسباب سے آثار پیدا ہوتے ہیں، مثلاً گرم چیز کے استعمال سے گرمی اور سرد سے سردی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح بعض اوقات آثار سے بھی اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھو، کھانا کھانے کا سبب بھوک اور کھانے کی رغبت ہے اور عموماً یہی ہوتا ہے کہ پہلے بھوک لگتی ہے اور کھانے کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کے تقاضے

سے کھانا کھایا جاتا ہے۔ مگر شیر خوار بچے کو دیکھئے کہ جب ماں باپ اس کا دودھ چھڑانا چاہیں تو وہاں پہلے سے رغبت نہیں، بلکہ نفرت و اعراض ہوتا ہے، اس کی رغبت تو صرف ماں کے دودھ کی طرف ہوتی ہے۔ مگر ماں باپ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے کچھ کھلاتے پلاتے ہیں۔ اس کھلانے سے بچے میں رغبت پیدا ہوجاتی ہے۔

جو لوگ تماکو کھانے یا پینے کے عادی ہیں، ان سے پوچھئے کہ تماکو کا عشق پہلے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا، اس کی مجبوری سے کھانا شروع کیا یا معاملہ برعکس ہوا کہ پہلے کھانا شروع کیا، اس سے عشق کے درجہ تک رغبت پہنچ گئی، اسی طرح جس طرح باطن میں کمال ایمان، انسان کے اعمال صالحہ کا سبب بنتا ہے، اسی طرح بعض اوقات دل میں داعیہ نہیں ہوتا، مگر عمل شروع کردینے سے دل میں بھی شوق و رغبت پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے سالک اور طالب کو چاہئے کہ مرشد نے جو معمولات بتلادئے ہیں، ان کے پورا کرنے میں اسکا انتظار نہ کرے کہ دل لگے گا تو کروں گا، بلکہ ہونا یوں چاہئے کہ ان کو کرنا شروع کردے۔ آہستہ آہستہ دل بھی لگ جائے گا۔ (صفحہ ۱۱۹)

اہل طریقت کیلئے ہدایت:

فرمایا، ذکر اللہ اور نوافل و عبادت میں ایک خاص لذت ہے، جو دنیا کی ساری لذتوں سے فائق ہے۔ مگر مبتدی کو اس لذت و حلاوت کی فکر میں نہ رہنا چاہیے، کیونکہ اعمالِ دین مبتدی کیلئے دوا کا حکم رکھتے ہیں۔ دواؤں میں مزا اور لذت کہاں۔ البتہ منتہی کیلئے یہی اعمالِ غذاء لذیذ بن جاتے ہیں پھر فرمایا کہ لوگ اس طریق میں مزے کے طالب ہیں، حالانکہ یہاں تو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ جب تک اس منزل سے نہ گزر جائے، لذت و حلاوت حاصل نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۱۴۳)

مبتدی اور منتہی کے حالات کا فرق:

ارشاد فرمایا، ابتداء میں انسان کا قلب اس کی نظر کے تابع ہوتا ہے، جس طرف نظر جاتی ہے، اسی طرف قلب کا دھیان لگ جاتا ہے اور رسوخ کے بعد معاملہ برعکس ہوجاتا ہے کہ نظر قلب کے تابع ہوجاتی ہے۔ اسی لئے مبتدی کیلئے خشوع حاصل کرنے کے واسطے آنکھ بند کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کاملین کو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ (صفحہ ۱۴۴)

جذب و سلوک کی بہتر تفہیم:

ارشاد فرمایا، مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت گنگوہیؒ) فرمایا کرتے تھے کہ صوفیاء کرام کی اصطلاح میں جس چیز کو وصول الی اللہ (اللہ تک پہنچنا) کہا جاتا ہے، اس کیلئے عادۃ اللہ یہ ہے کہ پہلے بندہ کی طرف سے سلوک ہوتا ہے یعنی اپنی سعی و عمل کے ذریعہ اللہ کا راستہ طے کرنا، جب انسان اپنے حد اختیار تک یہ کام کرلیتا ہے تو پھر حق تعالیٰ کی طرف سے جذب ہوتا ہے اور اسی جذب سے منزل مقصود تک رسائی ہوتی ہے۔ بغیر جذب حق کے، سلوک محض کافی نہیں ہوتا۔ مگر قدیم زمانے میں اس سلوک کیلئے محنت شاقہ اور بڑے مجاہدات شرط تھے، اس کے بعد جذب کی نوبت آتی تھی۔ اس زمانے میں انسانی قویٰ کا انحطاط ہے۔ اس لیے مجاہدات شاقہ کے بغیر ہی جذب حق نصیب ہوجاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اتباع سنت کا پورا اہتمام ہو، کیونکہ جذب علامت محبوبیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔ (اس میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے) آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو۔ اس اتباع سنت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوجاؤ گے۔ (صفحہ ۱۴۵)۔

محفل میلاد کے سلسلہ میں موقف:

فرمایا، اس کے متعلق پہلے میرا یہ خیال تھا کہ اس محفل کا اصل کام ذکر رسول اللہ ﷺ تو سب کے نزدیک خیر و سعادت اور مستحب ہی ہے۔ البتہ اس میں جو منکرات اور غلط رسمیں شامل کردی گئی ہیں، ان کے ازالہ کی کوشش کرنی چاہئے۔ اصل امر محفل مستحب کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ دراصل ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہ کا مسلک تھا۔ حضرت کی غایت شفقت و عنایت اور محبت کے سبب میرا بھی ذوق یہی تھا۔ اور یہی عام طور پر صوفیاء کرام کا مسلک ہے۔ حضرت مولانا رومی بھی اسی کے قائل ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

بہر کیکے تو گلیمے را مسوز

لیکن ہمارے فقہاء حنفیہ کا مسلک ان معاملات میں یہ ہے کہ جو مباح یا مستحب

مقاصد شرعیہ میں سے ہو، اس کے ساتھ تو یہی معاملہ کرنا چاہیے کہ اگر اس میں کچھ منکرات شامل ہوجائیں تو منکرات کے ازالہ کی فکر کی جائے، اصل کام کو نہ چھوڑا جائے۔ مثلاً مسجدوں کی جماعت میں کچھ منکرات شامل ہوجائیں تو اس کی وجہ سے جماعت چھوڑ دینا جائز نہیں ہوگا، بلکہ منکرات کے ازالہ کی کوشش مقدور بھر واجب ہوگی۔ اسی طرح اذان اور تعلیم القرآن وغیرہ کا معاملہ ہے کہ وہ مقاصد شرعیہ میں سے ہیں، اگر ان میں کچھ منکرات شامل ہوجائیں تو ازالۂ منکرات کی کوشش کی جائے گی، اصل کام کو نہ چھوڑا جائے گا۔ لیکن جو مستحبات ایسے ہیں کہ اصل مقاصد شرعیہ ان پر موقوف نہیں۔ اگر ان میں کچھ منکرات و بدعات شامل ہوجائیں تو ایسے مستحبات ہی کو ترک کردینا چاہیے مثلاً: زیارت قبور، ذکر رسول کیلئے کسی محفل ومجلس کا انعقاد کہ اس پر کوئی مقصد شرعی موقوف نہیں۔ وہ بغیر اس مجلس اور خاص صورت کے بھی پورے ہوسکتے ہیں، اگر ان میں منکرات و بدعات شامل ہوجائیں تو یہاں ایسی مجالس اور ایسے اجتماعات ہی کو ترک کردینا لازم ہوجاتا ہے۔ احادیث اور آثار صحابہ اور اقوال ائمہ میں اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں، جن کو علامہ شاطبی نے کتاب الاعتصام میں جمع فرمادیا ہے۔

جس درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کا بیعت لینا، اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا قرآن میں مذکور ہے، جب اس کے نیچے لوگوں کا اجتماع اور بعض منکرات کا خطرہ حضرت فاروق اعظمؓ نے محسوس فرمایا تو اس درخت ہی کو کٹوادیا، حالانکہ اس کے نیچے جمع ہونے والے حضرات صحابہ کوئی ناجائز کام نہ کرتے تھے۔ محض تبرکاً جمع ہوتے اور ذکر اللہ و ذکر رسول ہی میں مشغول رہتے تھے، مگر چونکہ ایسا اجتماع مقصود شرعی نہیں تھا اور آئندہ اس میں شرک و بدعت کا خطرہ تھا، اس لیے اس اجتماع ہی کو ختم کردیا گیا۔ اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات حضرت فاروق اعظمؓ اور دوسرے حضرات صحابہ سے بکثرت منقول ہیں۔ کتاب الاعتصام میں وہ مستند کتابوں کے حوالوں سے نقل کئے گئے ہیں۔ ان احادیث و آثار کی بناء پر فقہاء حنفیہ کا مسلک ایسے معاملات میں یہی ہے کہ جو امر اپنی ذات میں مستحب ہو، مگر مقصود شرعی نہ ہو۔ اگر اس میں منکرات و بدعات شامل ہوجائیں یا شامل ہونے کا خطرہ قوی ہو تو ایسے مستحبات کو سرے سے ترک کردیا جائے۔ لیکن جو امر مستحب مقاصد شرعیہ میں سے ہو یا اس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو تو اس کو شمول منکرات کی وجہ سے ترک نہ کیا جائے، بلکہ ازالہ منکرات کی کوشش کرنا چاہیے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اسی مسلک حنفی کے پابند تھے، اس لئے مروجہ محفل میلاد جو بہت سے منکرات و بدعات پر مشتمل ہوگئی ہے، اس میں شرکت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کچھ زمانے تک اس مسئلہ میں حضرت گنگوہیؒ سے بھی میرا اختلاف رہا، مگر بالآخر دلائل کی قوت اور دین کی حفاظت کے پیش نظر یہی مسلک احوط اور اسلم نظر آیا، اسی کو اختیار کرلیا، لیکن جو مسلک صوفیائے کرام نے اختیار فرمایا ہے، میں اس کو بھی بے اصل نہیں جانتا۔ فقہاء مجتہدین میں سے حضرات شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ علامہ شامی نے مصافحہ بعد الصلوٰۃ کے مسئلے میں شیخ محی الدین نووی شافعیؒ کا یہی مسلک نقل کیا ہے۔

اس لئے جو صوفیائے کرام محفل میلاد خالی از منکرات پر عامل ہیں، ان پر بھی اعتراض اور بدگمانی نہیں کرنا چاہیئے۔ (اس ملفوظ میں سب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ نہیں۔ شرح و توضیح احقر کی طرف سے شامل ہے)۔ (محمد شفیع)۔ (صفحہ ۱۶۰ سے ۱۶۲ تک)

اللہ اور نفس سے ڈرنا:

ایک مرتبہ مکہ معظمہ کے حکام حضرت حاجی صاحبؒ سے ناراض ہوگئے اور مکہ مکرمہ سے ان کے اخراج کا ارادہ کرلیا۔ حضرتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ اور اپنے نفس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عین ایمان ہے، سبھی جانتے ہیں، نفس سے ڈرنا، اس لیے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن وہی ہے، جو اس کو بے راہی پر ڈالتا اور برائیوں میں مبتلا کرتا ہے۔ (صفحہ ۱۶۳)

توبہ اور اسکی حقیقت:

بعض صوفیہ کا یہ شعر معروف ہے:

اے تو از حال گذشتہ توبہ جو
کے کنی توبہ ازیں توبہ بگو!

اس کا حاصل سابقہ گناہوں کو بار بار یاد کرکے توبہ کو مکرر سکرر کرتے رہنے سے منع کرنا ہے۔ اور یہ کہ ایک مرتبہ پورے اخلاص اور الحاح وزاری کے ساتھ توبہ کو اس کے پورے شرائط کے ساتھ کرلینے کے بعد ذہن کو اس سے فارغ کرلینا چاہیے۔ اس کی تحقیق میں حضرتؒ نے فرمایا کہ:

سابقہ گناہوں کو یاد کرکے بار بار تکرار توبہ کرتے رہنا، عوام کے لئے مفید ہے، مگر

خواص اہل اللہ کیلئے بار بار اپنے سابقہ گناہوں [illegible] یہ سوچ اور فکر ایک حجاب بن جاتا ہے۔ ایسے حضرات کو چاہیے کہ آئندہ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے کی فکر کریں، اسی پر پوری توجہ دیں، بشرطیکہ ایک مرتبہ پوری شرائط توبہ ادا کرکے توبہ کر چکے ہوں۔ اس کے بعد باز گذشت کی سوچ میں پڑنا، بعض اوقات حجاب بن جاتا ہے، جیسا کہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ:

ماضی و مستقبلت پردہ خداست

کیونکہ توبہ کی حقیقت رفع حجاب ہے اور عوام کیلئے گناہ کو یاد نہ کرنا حجاب ہوتا ہے اور خواص کو اس کا زیادہ یاد کرنا حجاب ہوتا ہے، جیسے دو شخصوں میں باہمی مخالفت کے بعد دوستی ہو جانے اور دل صاف ہو جانے کے بعد گذشتہ زمانے کی عداوتوں اور ایذاؤں کا یاد کرنا دوستی کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۱۸۰)

باطنی برکات سے محرومی کا عامل:

ارشاد فرمایا، جو شخص سب وشتم اور دوسروں پر لعن طعن میں مشغول ہوگا، اس کو باطنی برکات کبھی حاصل نہ ہوں گی۔ کیونکہ دوسروں کی عیب گوئی یا سب وشتم کا مشغلہ وہی بنا سکتا ہے، جو خود اپنے انجام سے بے خبر اور غافل ہو۔ اور جس شخص کو اپنی فکر ہوتی ہے تو اس کو ہر وقت اپنی ہی کشتی ڈانواں ڈول نظر آتی ہے، دوسروں کے معاملات میں مداخلت کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما
گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما
ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم
احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(صفحہ ۱۸۱)

خلوت میں خوف و گریہ اور جلوت میں انبساط کا ہونا:

فرمایا، حضرت یحییٰ علیہ السلام پر گریہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خندہ کا غلبہ تھا، باہم گفتگو ہوئی۔ یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا خدا تعالیٰ کا خوف نہیں، جو خندہ وہنسی میں رہتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کی رحمت سے مایوس

ہیں جو ہر وقت بکاء میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا، جس نے یہ فیصلہ کیا کہ خلوت میں تو وہ حالت بہتر ہے، جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ہے، یعنی خوف وخشیت اور حزن و بکاء۔ اور عام مجلسوں اور جلوت میں وہ حالت بہتر ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے کہ خندہ پیشانی اور شگفتہ مزاج رہیں، تاکہ خلق خدا مایوس نہ ہو۔ (صفحہ ۱۸۱)

علم میں برکت کا بزرگان سلف کے ادب سے ہونا:

فرمایا، علمی تحقیقات پر زور دینے سے زیادہ فکر بزرگان سلف کے ادب واحترام کی کرنا چاہیئے، اس سے اللہ تعالیٰ انسان میں ایک خاص بصیرت اور تحقیق کی شان بھی پیدا فرمادیتے ہیں۔ (صفحہ ۱۸۲)

اصلاح اعمال کیلئے ایک مراقبہ:

فرمایا، شرح الصدور میں علامہ سیوطیؒ نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ برزخ میں زندہ لوگوں کے اعمال ان کے مردہ آباء واجداد اور خاص عزیزوں کو دکھلائے اور بتلائے جاتے ہیں۔ اگر آدمی اس کا استحضار اور تصور کرے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ میرے باپ یا استاد یا پیر اور دوسرے بڑوں کے سامنے آئے گا تو وہ کیا کہیں گے۔ یہ تصور انسان کو بہت سی برائیوں اور گناہوں سے روک سکتا ہے۔ (صفحہ ۱۸۴)

اہل اللہ کی گستاخی کے اثرات

فرمایا:

بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات
با دردکشان ہر کہ در افتاد برافتاد

اہل اللہ کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا کوئی معاملہ کرنا، اپنا انجام خراب کرنے کی دعوت دینا ہے۔ ایسے شخص پر سوء خاتمہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ایسے حضرات سے اگر کسی مجتہد فیہ معاملے میں غلطی بھی ہو جائے تو جو شخص اس کو از روئے شرع درست نہ سمجھتا ہو، اس پر یہ تو لازم ہے کہ اس فعل پر نکیر کرے، اس کے غلط ہونے کو دلیل سے بیان کرے، مگر خود ان کی ذات پر گستاخانہ طعن اور بے ادبی کے کلمات سے بچنے کی بہت فکر رکھنا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۸۴)

خدمت خلق کی اہمیت:

فرمایا، حق تعالیٰ بعض بندوں کو بلا واسطہ اپنے ساتھ مشغول رکھنا پسند کرتے ہیں، ان کیلئے اسی میں فضیلت و برکت ہے اور بعض لوگوں کو مخلوق کی تدبیر و اصلاح میں لگا دیتے ہیں، تا کہ وہ بالواسطہ جمال حق کے مشاہدہ میں مشغول رہیں، جیسے عینک کے واسطہ سے دیکھنا۔ ان لوگوں کیلئے یہی اسلم ہوتا ہے، اسی میں انکے درجات بڑھتے ہیں۔ (اس سے معلوم ہوا کہ خلق اللہ کی دینی خدمت، تعلیم، تبلیغ و تربیت تو عبادت میں داخل ہے ہی، ان کی دنیاوی راحت کی تدبیر میں مشغول ہونا بھی اگر صحیح نیت یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کیلئے ہو تو وہ بھی عبادت میں داخل اور مشاہدہ جمال حق کا ذریعہ ہے)۔

اور فرمایا کہ محبت تو حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، اس لیے محبت تو صرف اسی سے ہونا چاہیئے اور خلق اللہ پر شفقت ہونی چاہیئے۔ اور عارف کو عام خلق پر شفقت سب سے زیادہ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ ان کو سرکاری چیزیں سمجھتا ہے۔ اور کل مخلوقات کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ سب حق تعالیٰ کی چیزیں ہیں۔ (صفحہ ۱۸۵)

رمضان شریف میں سب سے بڑی عبادت:

حاضرین خانقاہ جو عبادت ہی کیلئے یہاں جمع رہتے ہیں، ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ رمضان شریف کو تو قرآن شریف پڑھنے ہی کیلئے رکھنا چاہیئے، میں تو اگر کسی کو ذکر شغل شروع کراتا ہوں تو رمضان میں نہیں کراتا، بلکہ رمضان کے بعد کراتا ہوں۔ رمضان میں تو وہی عبادت ہونی چاہیئے، جو ماثور اور منقول ہے۔ جس کو مقدمات لگا کر عبادت بنانا نہ پڑے۔ اشغال مروجہ صوفیہ مقدمہء عبادت ہیں۔ اصل عبادت وہی ہے، جو ماثور اور منقول ہو۔ (صفحہ ۱۸۷)

غلبہء تواضع کا ایک واقعہ:

ایک صاحب نے عید گاہ کے مجمع میں حضرتؒ کے کسی فعل پر اعتراض کیا۔ وہ اعتراض اگرچہ بالکل بے جا اور غلط تھا، مگر حضرتؒ اس کے قدموں میں گر پڑے اور فرمانے لگے کہ بیشک میں بڑا خطاوار گناہگار ہوں۔ حضرتؒ پر اس وقت ایسی حالت کا غلبہ تھا، جس میں انسان اپنے آپ کو ہر چیز سے بدتر و کمتر سمجھتا ہے۔ (صفحہ ۲۱۴)

سماع کے متعلق تحقیق:

ارشاد فرمایا کہ صوفیائے کرام میں اس میں تو اختلاف ہوا ہے کہ بعض نے خاص شرائط کے ساتھ سماع (گانا سننے) کی اجازت دی اور عمل بھی کیا۔ بعض نے مطلقاً منع فرمایا، لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ گانا سننا جزء طریق یا ان معمولات میں سے نہیں، جن کو تزکیہ باطن کیلئے صوفیہ کے مختلف طبقات نے تجویز کیا ہے۔ صوفیہ کے چاروں مسلک چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ میں کسی نے گانا سننے کو سالک طریق کیلئے معمول وظیفہ نہیں بتایا۔ کسی خاص مریض کو اجازت دے دی جاتی ہے، جیسے بعض اوقات طبیب سنکھیا وغیرہ سمیات سے بیمار کا علاج کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سماع اس طریق میں کوئی غذاء نہیں، بلکہ دواء ہے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب نے سماع کے متعلق فرمایا کہ:

مبتدی را مضر باشد و منتہی را حاجت نیست

(نیست۔ صفحہ ۲۱۴)

حضرت حاجی امداد اللہؒ کی ایک اہم وصیت:

ارشاد فرمایا حضرت حاجی صاحبؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ بھائی کسی سے الجھنا نہیں۔ جب کسی کام میں جھگڑا ہو تو اس کو چھوڑ کر الگ ہو جانا۔ پھر فرمایا کہ میرا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے۔ (صفحہ ۲۱۵)۔

تصوف کا، علوم طبعیہ میں سے ہونا:

ارشاد فرمایا، اصول تصوف میں غور کرو تو وہ سب علوم طبعیہ میں سے ہیں، ذرا بھی طبیعت میں سلامتی ہو تو خود بخود آدمی کے دل میں وہی آئے گا، جو بزرگوں نے فرمایا ہے۔ (صفحہ ۲۱۶)

کشف اور کرامت میں فرق:

فرمایا، کشف کا حاصل یہ ہے کہ وہ واقعات جو عالم مثال میں ہو رہے ہیں اور عام نظروں سے مستور ہیں۔ وہ کسی کی نظر کے سامنے آجائیں ان کو دیکھ لے اور عموماً جب مادیات اور تعلقات سے قلب فارغ ہو تو ایسا ہو جانا کچھ بعید نہیں ہوتا۔ اس کیلئے مقبول عند

اللہ ہونا تو کیا، مسلمان ہونا بھی شرط نہیں۔ کافر، فاسق کو بھی حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ پاگل و دیوانے کو بھی۔ کرامت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ کرامت کے معنیٰ خداوندی اعزاز کے ہیں، جو ان لوگوں کو حاصل نہیں۔ البتہ یہی انکشاف کسی شخص کو منجانب اللہ بطور کرامت کے بھی کرادیا جاتا ہے، وہ کشف و کرامت بھی ہوتا ہے، جیسے عموماً اولیاء اللہ کے کشف ہیں۔ اور جو کشف بطور کرامت کے ہوتا ہے، اس کی خاص علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ نفس میں تواضع، پستیٔ شکستگی اور اپنا عجز محسوس ہوتا ہے، جس کشف کے ساتھ یہ علامت نہ ہو، بلکہ عجب اور فخر اپنے نفس میں محسوس ہو، وہ کرامت نہیں، بلکہ استدراج ہے جس سے پناہ مانگنا چاہیئے۔ (۲۱۸)

اہل جنت کا، ہر قسم کی حسرت سے محفوظ ہونا:

فرمایا، جنت میں نیچے کے درجات والے اپنے سے اوپر درجات والوں کو دیکھ کر حسرت نہ کریں گے، بلکہ ہر شخص اپنے حال میں مگن ہوگا۔ احقر نے سوال کیا کہ پھر تفاضل درجات کا کیا فائدہ رہے گا تو فرمایا کہ اس کا اثر عقلاً اور اعتقاداً ہوگا، طبعاً نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ مجھے دال ماش اگر اچھی پکی ہوئی ہو تو قورمے سے زیادہ مرغوب ہے، اگرچہ عقلاً جانتا ہوں کہ قورمہ افضل ہے۔ (صفحہ ۲۲۰)۔

ایک عالم، ایک عارف:

حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی جو اکابر علماء میں سے تھے اور تقویٰ میں معروف ومشہور تھے۔ ایک مرتبہ بیمار پڑے تو تکلیف کے وقت کراہنے کے بجائے اللہ اللہ کہتے تھے۔ مفتی صاحب کے ایک بھائی جو عالم بھی تھے، عارف بھی، انہوں نے دیکھا کہ مفتی صاحب تکلف کرکے آہ آہ کے بجائے اللہ اللہ کا ذکر کررہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بھائی صاحب آہ آہ کرو، جب آرام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ ان کے بھائی صاحب کو غالباً یہ محسوس ہوا کہ اللہ اللہ تکلف کرنے میں ایک قسم کا دعویٰ پایا جاتا ہے۔ اور بیماری میں حق تعالیٰ انسان کو اس کی پستی اور عاجزی متحضر کرنا پسند فرماتے ہیں۔

مولانا رومیؒ نے فرمایا:

چونکہ برمیخت بہ بندوبستہ باش
چون کشاید چابک و برجستہ باش
(صفحہ ۲۲۳)

کرامات کا متاخرین میں زیادہ ہونا؟:

فرمایا، امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے یہ سوال کیا تھا کہ صحابہ کرام سے خوارق عادات بہت کم ہوئے جب کہ متاخرین اولیاء اللہ میں ان کی بہت کثرت ہوئی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ فرمایا کہ قرب زمانہ نبوت کی وجہ سے عہد صحابہ اور قرن اولیٰ میں قلوب کے اندر، دین کی صلاحیت قوی موجود تھی۔ اور شواہد متحضر تھے، اس لئے ضرورت نہ تھی کہ ان کو عجائب دکھائے جائیں۔ بعد میں جب ایمان میں ضعف بڑھا تو اس کی ضرورت ہوئی۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب جو حاضر مجلس تھے، انہوں نے سوال کیا کہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ آج کل کرامات اور خوارق کا ظہور سب سے زیادہ ہو۔ فرمایا کہ حکمتیں ہر وقت کی مختلف ہوتی ہیں۔ آج کل خوارق کی کمی کی کوئی اور حکمت ہوگی۔

بزرگوں کا تذکرہ دیر تک رہنے کے بعد مجلس ختم ہوئی تو خواجہ عزیز الحسن صاحب نے عرض کیا کہ ان حضرات کے ذکر میں بھی عجیب دلکشی ہے۔ فرمایا کہ دلکشی کیا، آگ لگ جاتی ہے۔ میرے تو سارے جسم میں حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس وقت بھی پسینہ آرہا تھا۔ (صفحہ ۲۲۴)۔

ایک اہم ہدایت:

فرمایا، کام کرنے سے راستہ کھلتا ہے، فرد اس انتظار میں نہ رہے کہ پہلے سے راستہ نظر آئے تو آگے قدم رکھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بڑی سڑک پر، جس کے دوطرفہ درخت لگے ہوں اور سیدھی جارہی ہوں، اگر کھڑے ہوکر دیکھوگے تو کچھ دور کے بعد دونوں طرف کے درخت باہم ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھے گا راستہ کھلتا نظر آئے گا۔

مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید!
خیرہ یوسف وارمی باید دوید
(صفحہ ۲۲۵)

حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فیوض الحرمین میں فرمایا ہے کہ چند چیزوں میں میری طبیعت کے خلاف مجھے حضور ﷺ نے مجبور فرمایا۔ ایک یہ کہ مجھے طبعی طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تفضیل مرغوب تھی۔ آپ نے شیخین کو ان پر ترجیح دینے کیلئے مجبور فرمایا۔ دوسرے یہ کہ تقلید سے طبعا نفرت تھی۔ آپ نے مذاہب اربع سے خروج کو منع فرمایا۔ (صفحہ ۲۲۷)۔

وقت میں برکت:

یہ بات بہت مشہور ہے، بلکہ شاہد ہے کہ اللہ والوں کے وقت میں برکت بڑی ہوتی ہے۔ وہ تھوڑے سے وقت میں بہت بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ امام غزالیؒ کی پوری عمر پر انکی لکھی ہوئی تصانیف کو حساب سے تقسیم کیا جائے تو روزانہ سولہ جزء کی تصنیف بنتی ہے، جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی اور شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں فرمایا ہے کہ اس کتاب کے تین سو باب ہیں۔ اور ہر باب کے لکھنے پر میں نے شیخ اکبر ابن عربی کی کتاب الفتوحات پوری مطالعہ کی ہے اور یہ پوری کتاب کئی ہزار صفحات کی ہے تو کتاب الیواقیت کی تصنیف میں پوری فتوحات کا مطالعہ تین سو مرتبہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے تیس دن کے اندر تصنیف کی تو گویا روزانہ فتوحات کا مطالعہ دس دفعہ ہوا، جس کے صفحات دو ہزار سے کم نہیں۔ اس طرح کے واقعات علماء صلحاء اور بزرگان دین کے بہت معروف ومشہور ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وقت میں اتنی بڑی وسعت کیسے پیدا ہو جاتی ہے، جبکہ گھنٹہ ساٹھ منٹ سے کسی کا نہیں بڑھتا اور شب و روز چوبیس گھنٹے سے نہیں بڑھتے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہے کہ وقت کا ایک تو طول ہے، جس کو سب جانتے ہیں، یہ گھنٹے منٹ اسی طول کا نام ہیں۔ اسی طرح وقت میں ایک عرض (چوڑائی) بھی ہوتی ہے، جو عام نظروں کو نظر نہیں آتی۔ یہ بزرگ اس وقت

کے عرض میں بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ (صفحہ ۲۲۹)

امت کا بہتر فرقوں میں تقسیم:

فرمایا، حدیث میں جو آیا ہے کہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ جن میں سے ایک جنت میں جائے گا ۷۲ دوزخ میں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ۷۲ فرقے مخلد فی النار ہوں گے اور فرقہ ناجیہ کیلئے بھی یہ لازم نہیں کہ وہ دوزخ سے بالکل بری ہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ۷۲ فرقوں کو عقائد واعمال دونوں پر عذاب ہوگا اور فرقہ ناجیہ کو حفظ اعمال پر۔ خلود نار دونوں کیلئے نہیں۔ (صفحہ ۲۳۱)

اولیاء اللہ کی اہانت کے اثرات بد:

ایک صاحب کو حضرت نے کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف کہی تھی۔ تھانہ بھون سے واپس جا کر خط لکھا کہ آپ نے میری سخت اہانت کی ہے، اگر علم کا ادب مانع نہ ہوتا تو میں اس کا انتقام لیتا۔

اس کے بعد پھر ان کا دوسرا خط آیا، جس میں لکھا تھا کہ جس روز سے میں نے وہ کلمات آپ کو لکھے ہیں، اسی روز سے میری بینائی گھٹنی شروع ہوگئی اور روز گھٹتی جاری ہے۔ خوف ہے کہ اندھا نہ ہو جاؤں۔ خدا کیلئے معاف فرما دیں۔

حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ تمہارا پہلا خیال کہ میں نے تمہاری اہانت کی، یہ بھی محض وہم تھا اور یہ دوسرا خیال کہ مجھے ایسا لکھنے کی وجہ سے بینائی گھٹ رہی ہے، یہ بھی وہم ہے، مگر میں نے بہرحال معاف کر دیا اور تمہارے لئے دعاء کرتا ہوں۔ (صفحہ ۲۳۴)

ایک حدیث کی تشریح:

حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لایقص الا امیرا او ماموراو مختال۔ یعنی وعظ کہنا تین آدمیوں کا کام ہوسکتا ہے۔ ایک وہ شخص جو مسلمانوں کا امیر ہو، وہ مسلمانوں کو وعظ سنائے۔ دوسرا وہ جس کو امیر نے وعظ کہنے پر مامور کیا ہو۔ اگر یہ دونوں نہیں تو پھر متکبر ہے، جو اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھ کر وعظ گوئی کیلئے کھڑا ہو گیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس زمانہ میں کوئی امیر و مامور تو ہے نہیں اور سب کو مختال و متکبر بھی نہیں کہا جاسکتا، اسلئے میرا خیال یہ ہے کہ جن علماء سے عوام وعظ کو کہتے ہیں، وہ منجانب عوام مامور میں

داخل ہیں۔ کیونکہ درحقیقت امیر بھی تو عوام ہی کا مامور ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۴۳)

حب جاہ کا، مقبولیت عند اللہ کی راہ میں حائل ہونا:

حضرت گنگوہیؒ نے ایک شیخ اور مرید کی حکایت سنائی کہ مرید بہت عبادت و ریاضت کرتا تھا، مگر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے بہت سے وظائف تبدیل کئے اور تدبیریں اختیار کیں، لیکن اس کے باطنی حالات درست ہوتے نظر نہ آئے۔ پھر ایک تدبیر کی، جو جاہ اور ظاہری عزت کے خلاف تھی، وہ یہ کام نہ کر سکا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ طالب جاہ تھا، یہی طلب جاہ اس کے راستہ کا سنگ گراں بن گئی تھی۔

بزرگان دین نے حب جاہ کے علاج کے لئے اپنے نفس کے خلاف بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ جاہ کی تحصیل اس قدر کہ لوگوں کے ظلم سے بچ جائے اتنی جائز ہے، مگر مقصود دینی نہیں، اور اس درجہ سے زائد ہو تو دین کیلئے مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں یہ دعا سکھائی گئی ہے: اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا۔ یعنی یا اللہ، مجھے میری نظروں میں حقیر اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بنا دے۔ تو یہ دعا طلب جاہ کی دعا ہے، مگر حدیث میں صرف دعا پر اکتفا کیا گیا ہے، اسکی تحصیل کے لئے کوئی تدبیر نہیں بتائی گئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہ دراصل محض خداداد ہوتی ہے، تدبیروں سے حاصل نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۲۵۴)

ذکر اسم ذات اللہ:

بعض علماء صرف اسم ذات یعنی اللہ اللہ کے ذکر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ماثور و منقول نہیں، اسی لئے بعض علماء نے اس کو بدعت تک کہہ دیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں ہے۔ واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا۔ یعنی یاد کرو نام اپنے رب کا صبح اور شام، یہاں لفظ اسم کو بہت سے حضرات مفسرین نے مقحم (یعنی زائد) قرار دیا ہے۔ اور فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ اپنے رب کو یاد کیا کرو۔ لیکن یہ احتمال بھی کچھ بعید نہیں کہ لفظ اسم کو زائد نہ کہا جائے، تو مراد یہ ہوگی کہ اپنے رب کا نام ذکر کیا کرو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رب کا نام اللہ ہے، اس سے ذکر اسم ذات مدلول قرآنی بن جاتا ہے۔ انتہی۔

احقر کہتا ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے بھی بعض ایسی آیات کی تفسیر میں

حضرتؒ نے فرمایا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا۔ یہ سلوک طریق حق کے مبتدی کے متعلق ہے کہ مبتدی کا پہلا کام نام کی رٹ لگانا ہے، اس کے بعد دوسری آیت میں جو وتبتل الیہ تبتیلا۔ ارشاد فرمایا، یہ منتہی کا حال ہے۔ کیونکہ ابتداء اس طریق کی ذکر اللہ کی کثرت سے ہوتی ہے، اور انتہا ساری مخلوق سے کٹ کر صرف خالق کا ہو رہنا ہے۔ (صفحہ ۲۹۱)

امت پر صحیح اور غلط صوفیائے کرام کے اثرات کا تجزیہ:

فرمایا کہ صوفیہ کرام سے امت کو اتنا نفع پہنچا ہے کہ اور کسی سے اتنا نفع نہیں پہنچا، مگر گمراہ اور اہل باطل مدعیان تصوف سے امت کو ضرر بھی اتنا پہنچا کہ کسی کافر سے بھی اتنا ضرر نہیں پہنچا۔ اور فرمایا کہ نواب قطب الدین صاحبؒ مصنف مظاہر حق نے غالباً امام مالکؒ کے حوالہ سے لکھا ہے: من تفقہ ولم یتصوف فقد تقشف و من تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق و من جمع بینھما فقد تحقق۔ یعنی جو شخص فقیہ ہو جائے، مگر صوفی نہ ہو، وہ خشک بے کیف و بے نور رہتا ہے۔ اور جو صوفی ہوگیا، فقیہ نہ ہوا، وہ زندیق اور ملحد ہوگیا۔ اور جس نے دونوں کو جمع کیا، وہ محقق ہوگیا۔ (صفحہ ۲۹۲)

شمس تبریز جیسے بے زبان صوفی کے فیوض کے اثرات:

عراقی اور شمس تبریز یہ دونوں بزرگ صوفیائے کرام میں معروف و مشہور بڑے باکمال حضرات ہیں۔ دونوں ایک بزرگ کی خدمت میں فیض باطنی حاصل کرنے کیلئے جاتے تھے۔ عراقی ایک بڑے عالم ہونے کے ساتھ بڑے فصیح و بلیغ شاعر بھی تھے۔ وہ اپنے حالات نظم میں لکھ کر شیخ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ شمس تبریز لکھنے پڑھنے کے عادی نہ تھے، معمولی زبان میں حالات لکھتے اور پیش کرتے تھے۔ ایک روز شیخ نے ان سے کہا کہ آپ عراقی کی طرح اپنے حالات نظم اور بلیغ انداز میں کیوں نہیں لکھتے۔ شمس تبریز اس سوال پر دلگیر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھ میں یہ لیاقت نہیں ہے، شیخ نے انکے جواب میں فرمایا کہ غم نہ کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں ایک زبان دیگا، جس کے ذریعہ تمہارے علوم و فیوض دنیا میں پھیلیں گے۔

ان بزرگ کی پیشین گوئی مولانا رومیؒ کی شکل میں پوری ہوئی، مولانا رومیؒ شمس

تبریز کے مرید ہوئے اور ان سے باطنی فیوض حاصل کیئے، پھر اپنی مثنوی کے ذریعہ انکو بیان کیا۔ قدرت نے اسکو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی دنیا کے ہر خطے میں پڑھی جاتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نظم و نثر ترجمے کیئے جاتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جو شخص اللہ کا ہو رہے، اسمیں جو کمی کوتاہی بھی ہوتی ہے، اسکو حق تعالیٰ مختلف انداز سے پورا فرمادیتے ہیں۔ شمس تبریزؒ جیسے بے زبان بزرگ کو ایسی زبان عطا فرمادے کہ وہم و قیاس سے زیادہ انکے فیوض کو دنیا میں پہنچادیا۔ حضرتؒ نے یہ واقعہ نقل کرکے فرمایا کہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہ علوم میں معروف اور صاحب تصنیف نہ تھے، مگر حق تعالیٰ نے انکے اخلاص وعبادت کی برکت سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو انکی زبان بنا دیا، ان کے ذریعے کتنے علم و معرفت کی نہریں دنیا میں رواں ہوئیں اور انکے فیوض و برکات دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے۔

اور خود سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی دینی، تبلیغی تصنیفی خدمات اتنی ہیں کہ آخری دور میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی برکت ہے۔ (صفحہ ۲۹۳)

شیخ و مرید کے فیض و استفادہ کا عجیب و غریب نظام:

ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کتاب پڑھانے کے وقت جب مطالعہ کیا تو بعض مقامات پر اشکال پیش آیا۔ حل نہیں ہوا، سبق پڑھانے بیٹھے تو بات سمجھ میں آ گئی، یہ بلاشبہ طلبہ کی برکت تھی۔ اسی طرح بعض اوقات کسی مخلص مرید کی برکت سے حق تعالیٰ شیخ پر مشکل مقامات کھول دیتے ہیں۔ اسلئے کسی شیخ اور مصلح کو ناز نہیں کرنا چاہئے کہ ہم لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس پر کرم فرماتے ہیں اور اس سے اصلاح خلق خدمت لیتے ہیں تو اس خدمت ہی کی برکت سے انکو علوم و معارف اور درجات عالیہ دیئے جاتے ہیں، اگر وہ اس خدمت کو ترک کردیں تو سب حالات رفیعہ سے محروم ہوجائیں۔ جس کنوئیں سے پانی نکالنے والے کم ہوجائیں یا کوئی نہ رہے، اسکے سوتے بند ہوجاتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ شیخ موصل ہے، بعد وصول الی الحق کے وہ بھی علیحدہ ہوجاتا

ہے۔ بس مرید رہتا ہے اور اللہ میاں۔ اسکی مثال ایسی ہے، جیسے مشاطہ اور دولھن کہ دولھن کو خلوت میں پہنچا کر مشاطہ رخصت ہوجاتی ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا۔

جلوہ بیند شاہ و عنبر شاہ نیز
وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز

البتہ یہ بات پھر بھی رہتی ہے کہ شیخ کی مخالفت کرے گا تو سب مقامات سلب ہوجاتے ہیں کیونکہ یہ ناشکری ہے۔ (صفحہ ۲۹۶)

حق کی شناخت کا فطرت میں ودیعت ہونا:

ارشاد فرمایا، آج رات الحمدللہ ایک علم عظیم عطا ہوا، وہ یہ ہے کہ جو شخص کفار کے گھر میں پیدا ہوا، انہیں میں پلا، اسکو یہ کبھی وسوسہ بھی نہ آیا کہ میں جو کام کررہا ہوں یا اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کچھ میرا عقیدہ ہے یہ شاید غلط ہو، اسی طرح دوسرے کسی باطل کام میں جو شخص اسطرح رہا ہو کہ اسکو حق کا دھیان کبھی آیا ہی نہیں، ایسے شخص کے متعلق مجھے ہمیشہ یہ خلجان رہتا تھا کہ یہ تو معذور قرار دیا جانا چاہئے۔ جہنم ابدی عذاب میں اسکا مبتلا ہونا سمجھ میں نہ آتا تھا، کیونکہ ایسا آدمی جسکو خلاف کا وسوسہ اور دھیان بھی کبھی نہیں آیا، جس کی وجہ سے اسکو تحقیق کرنے کا موقع ملتا تو تحقیق نہ کرنا، اسکے لیے کوئی جرم نہیں کہا جا سکتا، مگر آج معلوم ہوا کہ حق کا علمِ ضروری اللہ تعالیٰ ان سب کو عطا فرمادیتے ہیں، جن کو احکام کا مکلف کیا گیا ہے، مگر بعض جگہ اسکا ظہور موانع کی کثرت کے سبب نہیں ہوتا۔ ورنہ درحقیقت فطری اور ضروری طور پر اللہ تعالیٰ نے ہر مکلف انسان کو اتنی سمجھ عطا فرمادی ہے کہ اگر وہ خالی الذھن ہوکر غور کرے تو اسکو یہ علم ضروری یقیناً حاصل ہوجائے گا۔ (یعنی کم از کم اتنا ضرور سمجھ میں آجائے گا کہ میں خود اور یہ سارا عالم خود بخود نہیں بنا۔ اسکا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور یہ بھی کہ پیدا کرنے والا سارے جہان سے زیادہ علم و قدرت رکھنے والا ہے اور وہ ایک ہی ہوسکتا ہے اور یہ کہ جس نے ہمیں اور سارے جہان کو پیدا کیا ہے اور ہر وقت اسکی طرف سے ہمیں نعمتیں مل رہی ہیں، ہمارا فرض ہے کہ اسکی پسند و ناپسند کو پہچانیں اور ناپسند چیزوں سے اجتناب کریں، اسکی پسند کے کام کریں اور جب اتنی سمجھ آ گئی تو اللہ کی پسند و ناپسند کی تحقیق کرنا، اس پر لازم ہوگیا اور ذرا تحقیق کرتا تو معلوم ہوجاتا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے پیغمبر اور اپنی کتابیں بھیجی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال

تبریزؒ کے مرید ہوئے اور ان سے باطنی فیوض حاصل کیئے، پھر اپنی مثنوی کے ذریعہ انکو بیان کیا۔ قدرت نے اسکو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی دنیا کے ہر خطے میں پڑھی جاتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نظم و نثر ترجمے کئے جاتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جو شخص اللہ کا ہو رہے، اسمیں جو کمی کوتاہی بھی ہوتی ہے، اسکو حق تعالیٰ مختلف انداز سے پورا فرما دیتے ہیں۔ شمس تبریزؒ جیسے بے زبان بزرگ کو ایسی زبان عطا فرمادے کہ وہم و قیاس سے زیادہ انکے فیوض کو دنیا میں پہنچادیا۔ حضرتؒ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہ علوم میں معروف اور صاحب تصنیف نہ تھے، مگر حق تعالیٰ نے انکے اخلاص و عبادت کی برکت سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو انکی زبان بنا دیا، ان کے ذریعے کتنے علم و معرفت کی نہریں دنیا میں رواں ہوئیں اور انکے فیوض و برکات دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے۔

اور خود سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی دینی، تبلیغی تصنیفی خدمات اتنی ہیں کہ آخری دور میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی برکت ہے۔ (صفحہ ۲۹۳)

شیخ و مرید کے فیض و استفادہ کا عجیب و غریب نظام:

ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کتاب پڑھانے کے وقت جب مطالعہ کیا تو بعض مقامات پر اشکال پیش آیا۔ حل نہیں ہوا، سبق پڑھانے بیٹھے تو بات سمجھ میں آ گئی، یہ بلاشبہ طلبہ کی برکت تھی۔ اسی طرح بعض اوقات کسی مخلص مرید کی برکت سے حق تعالیٰ شیخ پر مشکل مقامات کھول دیتے ہیں۔ اسلئے کسی شیخ اور مصلح کو ناز نہیں کرنا چاہئے کہ ہم لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس پر کرم فرماتے ہیں اور اس سے اصلاحِ خلق خدمت لیتے ہیں تو اس خدمت ہی کی برکت سے انکو علوم و معارف اور درجات عالیہ دیئے جاتے ہیں، اگر وہ اس خدمت کو ترک کر دیں تو سب حالات رفیعہ سے محروم ہوجائیں۔ جس کنویں سے پانی نکالنے والے کم ہوجائیں یا کوئی نہ رہے، اسکے سوتے بند ہوجاتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ شیخ موصل ہے، بعد وصول الی الحق کے وہ بھی علیحدہ ہوجاتا

ہے۔ بس مرید رہتا ہے اور اللہ میاں۔ اسکی مثال ایسی ہے، جیسے مشاطہ اور دولھن کہ دولھن کو خلوت میں پہنچا کر مشاطہ رخصت ہوجاتی ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا۔

جلوہ بیند شاہ و عنبر شاہ نیز
وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز

البتہ یہ بات پھر بھی رہتی ہے کہ شیخ کی مخالفت کرے گا تو سب مقامات سلب ہوجاتے ہیں کیونکہ یہ ناشکری ہے۔ (صفحہ ۲۹۶)

حق کی شناخت کا فطرت میں ودیعت ہونا:

ارشاد فرمایا، آج رات الحمدللہ ایک علم عظیم عطا ہوا، وہ یہ ہے کہ جو شخص کفار کے گھر میں پیدا ہوا، انہیں میں پلا، اسکو یہ کبھی وسوسہ بھی نہ آیا کہ میں جو کام کررہا ہوں یا اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کچھ میرا عقیدہ ہے یہ شاید غلط ہو، اسی طرح دوسرے کسی باطل کام میں جو شخص اسطرح رہا ہو کہ اسکو حق کا دھیان کبھی آیا ہی نہیں، ایسے شخص کے متعلق مجھے ہمیشہ یہ خلجان رہتا تھا کہ یہ تو معذور قرار دیا جانا چاہئے۔ جہنم ابدی عذاب میں اسکا مبتلا ہونا سمجھ میں نہ آتا تھا، کیونکہ ایسا آدمی جسکو خلاف کا وسوسہ اور دھیان بھی کبھی نہیں آیا، جس کی وجہ سے اسکو تحقیق کرنے کا موقع ملتا تو تحقیق نہ کرنا، اسکے لیے کوئی جرم نہیں کہا جا سکتا، مگر آج معلوم ہوا کہ حق کا علم ضروری اللہ تعالیٰ ان سب کو عطا فرما دیتے ہیں، جن کو احکام کا مکلف کیا گیا ہے، مگر بعض جگہ اسکا ظہور موانع کی کثرت کے سبب نہیں ہوتا۔ ورنہ درحقیقت فطری اور ضروری طور پر اللہ تعالیٰ نے ہر مکلف انسان کو اتنی سمجھ عطا فرمادی ہے کہ اگر وہ خالی الذھن ہو کر غور کرے تو اسکو یہ علم ضروری یقیناً حاصل ہوجائے گا۔ (یعنی کم از کم اتنا ضرور سمجھ میں آجائے گا کہ میں خود اور یہ سارا عالم خود بخود نہیں بنا۔ اسکا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور یہ بھی کہ پیدا کرنے والا سارے جہاں سے زیادہ علم و قدرت رکھنے والا ہے اور وہ ایک ہی ہوسکتا ہے اور یہ کہ جس نے ہمیں اور سارے جہان کو پیدا کیا ہے اور ہر وقت اسکی طرف سے ہمیں نعمتیں مل رہی ہیں، ہمارا فرض ہے کہ اسکی پسند و ناپسند کو پہچانیں اور ناپسند چیزوں سے اجتناب کریں، اسکی پسند کے کام کریں اور جب اتنی سمجھ آ گئی تو اللہ کی پسند و ناپسند کی تحقیق کرنا، اس پر لازم ہوگیا اور ذرا تحقیق کرتا تو معلوم ہوجاتا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے پیغمبر اور اپنی کتابیں بھیجی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال

تبریزؒ کے مرید ہوئے اور ان سے باطنی فیوض حاصل کیئے، پھر اپنی مثنوی کے ذریعہ انکو بیان کیا۔ قدرت نے اسکو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی دنیا کے ہر خطے میں پڑھی جاتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نظم و نثر ترجمے کئے جاتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جو شخص اللہ کا ہو رہے، اسمیں جو کمی کوتاہی بھی ہوتی ہے، اسکو حق تعالیٰ مختلف انداز سے پورا فرمادیتے ہیں۔ شمس تبریزؒ جیسے بے زبان بزرگ کو ایسی زبان عطا فرمادے کہ وہم و قیاس سے زیادہ انکے فیوض کو دنیا میں پہنچادیا۔ حضرتؒ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہ علوم میں معروف اور صاحب تصنیف نہ تھے، مگر حق تعالیٰ نے انکے اخلاص و عبادت کی برکت سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو انکی زبان بنا دیا، ان کے ذریعے کتنے علم و معرفت کی نہریں دنیا میں رواں ہوئیں اور انکے فیوض و برکات دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے۔

اور خود سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی دینی، تبلیغی تصنیفی خدمات اتنی ہیں کہ آخری دور میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی برکت ہے۔ (صفحہ ۲۹۳)

شیخ و مرید کے فیض و استفادہ کا عجیب و غریب نظام:

ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کتاب پڑھانے کے وقت جب مطالعہ کیا تو بعض مقامات پر اشکال پیش آیا۔ حل نہیں ہوا، سبق پڑھانے بیٹھے تو بات سمجھ میں آ گئی، یہ بلاشبہ طلبہ کی برکت تھی۔ اسی طرح بعض اوقات کسی مخلص مرید کی برکت سے حق تعالیٰ شیخ پر مشکل مقامات کھول دیتے ہیں۔ اسلئے کسی شیخ اور مصلح کو ناز نہیں کرنا چاہئے کہ ہم لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس پر کرم فرماتے ہیں اور اس سے اصلاحِ خلق خدمت لیتے ہیں تو اس خدمت ہی کی برکت سے انکو علوم و معارف اور درجات عالیہ دیئے جاتے ہیں، اگر وہ اس خدمت کو ترک کر دیں تو سب حالات رفیعہ سے محروم ہوجائیں۔ جس کنویں سے پانی نکالنے والے کم ہوجائیں یا کوئی نہ رہے، اسکے سوتے بند ہوجاتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ شیخ موصل ہے، بعد وصول الی الحق کے وہ بھی علیحدہ ہوجاتا

ہے۔ بس مرید رہتا ہے اور اللہ میاں۔ اسکی مثال ایسی ہے، جیسے مشاطہ اور دولھن کہ دولھن کو خلوت میں پہنچا کر مشاطہ رخصت ہوجاتی ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا۔

جلوہ بیند شاہ و غیر شاہ نیز
وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز

البتہ یہ بات پھر بھی رہتی ہے کہ شیخ کی مخالفت کرے گا تو سب مقامات سلب ہوجاتے ہیں کیونکہ یہ ناشکری ہے۔ (صفحہ ۲۹۶)

حق کی شناخت کا فطرت میں ودیعت ہونا:

ارشاد فرمایا، آج رات الحمدللہ ایک علم عظیم عطا ہوا، وہ یہ ہے کہ جو شخص کفار کے گھر میں پیدا ہوا، انہیں میں پلا، اسکو یہ کبھی وسوسہ بھی نہ آیا کہ میں جو کام کر رہا ہوں یا اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کچھ میرا عقیدہ ہے یہ شاید غلط ہو، اسی طرح دوسرے کسی باطل کام میں جو شخص اسطرح رہا ہو کہ اسکو حق کا دھیان کبھی آیا ہی نہیں، ایسے شخص کے متعلق مجھے ہمیشہ یہ خلجان رہتا تھا کہ یہ تو معذور قرار دیا جانا چاہئے۔ جہنم ابدی عذاب میں اسکا مبتلا ہونا سمجھ میں نہ آتا تھا، کیونکہ ایسا آدمی جسکو خلاف کا وسوسہ اور دھیان بھی کبھی نہیں آیا، جس کی وجہ سے اسکو تحقیق کرنے کا موقع ملتا تو تحقیق نہ کرنا، اسکے لیے کوئی جرم نہیں کہا جا سکتا، مگر آج معلوم ہوا کہ حق کا علمِ ضروری اللہ تعالیٰ ان سب کو عطا فرمادیتے ہیں، جن کو احکام کا مکلف کیا گیا ہے، مگر بعض جگہ اسکا ظہور موانع کی کثرت کے سبب نہیں ہوتا۔ ورنہ درحقیقت فطری اور ضروری طور پر اللہ تعالیٰ نے ہر مکلف انسان کو اتنی سمجھ عطا فرمادی ہے کہ اگر وہ خالی الذھن ہوکر غور کرے تو اسکو یہ علم ضروری یقیناً حاصل ہوجائے گا۔ (یعنی کم از کم اتنا ضرور سمجھ میں آجائے گا کہ میں خود اور یہ سارا عالم خود بخود نہیں بنا۔ اسکا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور یہ بھی کہ پیدا کرنے والا سارے جہاں سے زیادہ علم و قدرت رکھنے والا ہے اور وہ ایک ہی ہوسکتا ہے اور یہ کہ جس نے ہمیں اور سارے جہاں کو پیدا کیا ہے اور ہر وقت اسکی طرف سے ہمیں نعمتیں مل رہی ہیں، ہمارا فرض ہے کہ اسکی پسند و ناپسند کو پہچانیں اور ناپسند چیزوں سے اجتناب کریں، اسکی پسند کے کام کریں اور جب اتنی سمجھ آ گئی تو اللہ کی پسند و ناپسند کی تحقیق کرنا، اس پر لازم ہوگیا اور ذرا تحقیق کرتا تو معلوم ہوجاتا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے پیغمبر اور اپنی کتابیں بھیجی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال

کی تاکید اور ناپسندیدہ سے پرہیز کرنے کی ہدایات ہیں، بس یہی اصل ایمان اور حق پرستی ہے، غرض اللہ تعالیٰ نے حق کے پہچاننے کیلئے بہت راستے رکھ دیئے ہیں۔ اور ہر مشکل کا حل رکھ دیا ہے۔

درفیض است منشین نا امید این جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا
(صفحہ ۳۰۲)

صوفی کی تعریف:

ارشاد فرمایا، صوفی کا ترجمہ میرے نزدیک عالم باعمل ہے (لوگوں نے اس میں نہ جانے کیا کیا شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں، جو اسکی تعریف کا جز نہیں، بلکہ عمل کے ثمرات و برکات ہیں، جو ہر شخص کیلئے الگ الگ ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۳۰۲)

علم دین کا بیمثال ادب:

فرمایا حضرت مجدد الف ثانی ایک روز بیت الخلاء میں تشریف لے گئے، اندر جاکر نظر پڑی کہ انگوٹھے کے ناخن پر ایک نقطہ روشنائی کا لگا ہوا ہے، جو عموماً لکھتے وقت قلم کی روانی دیکھنے کیلئے لگایا جاتا تھا۔ فوراً گھبرا کر باہر آگئے اور اسکے دھونے کے بعد تشریف لیگئے اور فرمایا کہ اس نقطہ کو بھی علم کے ساتھ ایک تلبس و نسبت ہے، بے ادبی معلوم ہوئی کہ اس کو بیت الخلاء میں پہنچاؤں۔

جو لوگ ہر وقت اپنے دل کو بری چیز سے صاف رکھتے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ہر وقت اہتمام رکھتے ہیں، انکا یہی حال ہوتا ہے کہ ادنیٰ کوتاہی سے بھاگتے ہیں اور ادنیٰ سی نیکی کو بھی چھوڑتے نہیں، کیونکہ بعض اوقات ادنیٰ سی چیز محبوب حقیقی کی خاص توجہ کے حجاب بن جاتی ہے۔

فراق دوست اگر اندک ست اندک نیست
درون دیدہ اگر نیم موست بسیار است
(صفحہ ۳۰۵)

دینی مدارس کے لئے چندہ کا صحیح طریقہ:

ارشاد فرمایا، مولانا مبارک علی (سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت شیخ العرب والعجم شیخ الہندؒ مولانا محمود الحسنؒ کے سامنے کسی نے یہ شکل پیش کی کہ مدارس اسلامیہ کیلئے چندہ جمع کرنے میں بہتسی خرابیاں پیش آتی ہیں۔ لوگوں میں علم و علماء کی تحقیر پیدا ہوتی ہے۔ وغیرہ ذالک اور چندہ نہ کریں تو ان مدارس کا کام کیسے چلے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ چندہ کرو، مگر غریبوں سے کرو۔

حضرتؒ نے یہ روایت نقل کرکے فرمایا کہ یہ بالکل صحیح علاج ہے، وجہ یہ ہے کہ غریب لوگ چندہ جمع کرنے والے علماء کو حقیر نہیں سمجھتے، تعظیم کیساتھ پیش کرتے ہیں اور جو کچھ دیتے ہیں، ان پر بار خاطر بھی نہیں ہوتا۔ خوشدلی کیساتھ دیتے ہیں، جسمیں برکت ہی برکت ہوتی ہے۔

مگر اس پر یہ سوال ہوگا کہ غریب لوگوں سے چندہ ملے ہی گا کتنا، مقدار چندہ بہت گھٹ جائے گی، مگر یہ خیال اولا تو یوں غلط ہے کہ دنیا میں ہمیشہ غریبوں کی تعداد زیادہ، مالداروں کی کم رہی ہے، اگر سب غریب آدمی ایک ایک آنہ دینے لگیں تو لاکھوں کی رقم جمع ہوجائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فی الواقع چندہ کم وصول ہو تو کام کو اسی پیمانہ پر کرو، زیادہ بڑھانا کیا ضروری ہے کہ قدرت سے زیادہ بار اٹھایا جائے۔ (صفحہ ۳۱۱)

مختلف مزاج کے سالکوں کے لئے حکیمانہ مشورے:

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ریاضات و مجاہدات کا اصل مقصد یہ ہے کہ ملائکہ اللہ کے ساتھ تشبہ اور قرب ہو، وہ انسان کو جبھی حاصل ہوسکتا ہے کہ نہ بھوک کی کلفت ہو، نہ بہت کھانے کا کسل، کیونکہ جس طرح پیٹ بھرنے کا کسل قلب کو مشوش کرکے، ملائکہ سے بعد کا سبب بنتا ہے، ایسے ہی بھوک کی کلفت جو مشوش کرے، وہ بھی مانع تشبہ باملائکہ ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ اس طرح طریق میں اصل چیز جمعیت خاطر ہے، تشویش کے اسباب سے بہت بچنا چاہیئے۔ کاملین کیلئے تو بڑی بڑی چیزیں بھی دل کی یکسوئی میں خلل نہیں ہوتیں، مگر مبتدی اور ضعفاء کیلئے ذرا ذرا سی مخالف چیز تشویش قلب

کا سبب ہوکر دل کی یکسوئی کو رخصت کر دیتی ہے۔ فرمایا کہ میں تو ضعفاء کو اسی لئے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ معاش اور گذارے کا اتنا سامان کرلیا جائے، جس سے تشویش سے نجات ہو اور پریشانی نہ ہو۔

اور اصل یہ ہے کہ لوگوں کے مزاج اور مذاق مختلف ہیں، بعض کو سامان جمع ہونے سے تشویش ہوتی ہے اور بعض کو نہ ہونے سے، اسلئے ہر مزاج کیلئے نسخہ جدا ہے اور اولیاء اللہ میں دونوں طرح کے نظائر موجود ہیں۔ (صفحہ ۳۲۸)

تصوف کی کتابیں مبتدیوں کے لئے نہیں:

فرمایا، سالک کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے شیخ کی تعلیم و ہدایت کا پیرو رہے، فن کی کتابیں دیکھ کر خود عمل کرنا غلطی ہے۔ فرمایا کہ فن کی کتابیں مبتدیوں کے لیے نہیں، بلکہ منتہی اور ماہرین کے لئے ہوتی ہیں۔ مبتدی کی کتاب تو اسکا شیخ ہے، اسکو دیکھے، اس سے پوچھے اور عمل کرے۔ جیسے طب اور ڈاکٹری کی کتابیں حکیموں اور ڈاکٹروں کیلئے ہیں۔ وہ ہی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مریض خود ڈاکٹر کی کتابیں دیکھ کر دوا استعمال کرنے لگے تو اسکی جان کا خطرہ ہے۔ (صفہ ۳۲۸)

خود رائی سے بچنے کی صورت:

فرمایا کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے بڑوں کے مشورہ کا پابند رہے، خودرائی سے کام نہ کرے۔ اور فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسا ہو، جسکے سر پر کوئی ضابطہ کا بڑا موجود نہ ہو تو وہ کیا کرے، ارشاد فرمایا کہ اسکے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بھاری علم عطا فرمایا ہے، وہ یہ کہ ایسا شخص اپنے چھوٹوں کو ہی جمع کر کے مشورہ کرے، سب کی رائے سن کر جسکی رائے پر اسکا قلب مطمئن ہوجائے، اسپر عمل کرے۔ اس طریق میں خود رائی کی آفت سے بھی نجات ہوگی اور مشورہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ خیر کی طرف ہدایت بھی فرمادیں گے۔ (صفحہ ۳۲۹)۔

لباس میں تکلف کا مظاہرہ، مقصود سے بے اعتنائی کی علامت ہے:

ارشاد فرمایا کہ میں جب کسی کو دیکھتا ہوں کہ لباس پوشاک میں تکلف کا پابند ہے تو دو چیزوں پر استدلال کرتا ہوں، ایک یہ کہ یہ نکما آدمی ہے، دوسرے یہ کہ بہت پست حوصلہ

ہے، کیونکہ اگر یہ کام کا ہوتا اور کسی بڑے مقصد کی طرف اسکی نظر ہوتی تو اسمیں وقت ضائع نہ کرتا۔

نباشند اہل باطن درپئے آرایش ظاہر

(صفحہ ۳۲۹)

فتوحات عراق کے وقت حضرت فاروق اعظمؓ کی دعائے عارفانہ:

فتح عراق کے وقت وہاں کے خزائن حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں پیش ہوئے تو ان کو دیکھ کر یہ دعا کی: اللھم کثرت رعیتی ووھنت قوتی فاقبضنی الیک غیر مفتون. یعنی یا اللہ، میری رعیت زیادہ ہوگئی اور قوت کمزور ہوگئی تو آپ اب مجھے اپنی طرف اسطرح اٹھالیں کہ میں فتنوں سے محفوظ رہوں۔ اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ قرآن کریم کی آیت: زین للناس حب الشہوات۔ معلوم ہوا کہ ان چیزوں کی محبت آپ نے انسان کی فطرت میں ڈالدی ہے، اسلئے میں اسکی دعاء نہیں کرتا کہ یہ فطرت بدل دی جائے، بلکہ یہ دعاء کرتا ہوں کہ انکی محبت آپکے راستہ میں ہماری معین بن جائے۔ مانع اور مضر نہ بنے۔

حضرتؒ نے یہ دعاء نقل کر کے فرمایا کہ بس یہ ہے صاف اور سیدھا سلوک و تصوف، اسی کو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ اس طریق میں رذائل کا بالکل ازالہ مقصود نہیں، بلکہ امالہ یعنی انکو دین کی طرف مائل کرنا اور انکا رخ دین کی طرف پھیر دینا مقصود ہے۔

عارف رومی نے خوب فرمایا ہے:

شہوت دنیا مثال گلخن ست
کہ ازو حمام تقوی روشن ست

(صفحہ ۳۳۱)

شاہ شجاع کرمانیؒ کی لڑکی کا بےمثال زہد:

فرمایا، جیسے حضرت ابراہیم بن آدمؒ کا واقعہ ترک سلطنت کر کے درویشی اختیار کرلینے کا معروف و مشہور ہے۔ اسی طرح ایک بزرگ شاہ شجاع کرمانی کا واقعہ ہے، وہ بھی سلطنت چھوڑ کر درویش بن گئے تھے، مگر انکی عزت و جاہ، ملوک و سلاطین، علماء صلحاء

میں بہت زیادہ تھی، انکی ایک لڑکی جوان تھی۔ اور چاہتے تھے کہ کسی دیندار آدمی سے اسکا نکاح کردیں۔ اس زمانے میں دینداری کی بڑی علامت احسان الصلواۃ تھی۔ یعنی نماز کو پورے آداب اور خشوع کیساتھ اسطرح ادا کرنا کہ گویا یہ خدا کو دیکھ رہا ہے، یا خدا اسکو دیکھ رہا ہے۔

شاہ شجاع نیک صالح آدمی کی تلاش میں تھے۔ ایک روز مسجد میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ اچھی طرح خشوع وخضوع سے نماز پڑھ رہا ہے۔ اسی وقت ارادہ کرلیا کہ اس سے نکاح کرینگے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اسکے پاس جاکر سلام کیا اور حال پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہیں، کیا خاندان ہے۔ معلوم ہوا کہ شریف آدمی ہیں، مگر غریب اور مفلس۔

شاہ شجاع نے اس سے پوچھا کہ آپکی شادی کہیں ہوگئی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا اجی، میں ایک بہت غریب اور مفلس آدمی ہوں، مجھے کون اپنی لڑکی دینے لگا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ناامید کیوں ہوتے ہو، تم نے کہیں کوئی پیغام بھی دیا ہے۔ اس نے کہا کہ جب مجھے معلوم ہے کہ میرا پیام رد کیا جائے گا، تو کیوں خواہ مخواہ پیام دیکر رسوا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا تم اس پر راضی ہو کہ شاہ شجاع کرمانی کی لڑکی کی شادی تم سے ہوجائے۔ نوجوان نے کہا کہ حضرت کیوں میرے ساتھ دل لگی کرتے ہیں، کہاں میں اور کہاں شاہ شجاع! نام بھی لونگا تو پٹوں گا۔ اب انھوں نے ظاہر کردیا کہ میں ہی شاہ شجاع کرمانی ہوں اور اپنی لڑکی کا عقد تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اسپر بھی نوجوان نے کہا کہ اگر آپ راضی ہیں تو کیا ضروری ہے کہ لڑکی راضی ہوجائے۔ فرمایا کہ میں اس سے دریافت کرچکا ہوں، وہ راضی ہے۔

اب تو نوجوان نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میں کہاں اس قابل تھا۔ شاہ شجاعؒ نے اسی وقت نکاح پڑھا اور اسی وقت کوئی چادر یا برقع اڑھا کر لڑکی کو اٹھا کر اس نوجوان کے گھر لے گئے، جو ایک شکستہ مکان تھا۔ کسی سامان کا نام نشان نہ تھا۔ لڑکی دروازے کے اندر داخل ہوئی تو اپنے والد شاہ شجاع سے کہا کہ ابا جان آپ نے مجھے کہاں ڈبو دیا ہے۔ نوجوان نے کہا کہ دیکھئے، میں آپ سے کہتا تھا کہ لڑکی میری ایسی تنگدستی کی حالت پر کیسے راضی ہوسکتی ہے۔

اب تو لڑکی خود بولی کہ آپ نے کیا سمجھا ہے کہ میں نے اپنے والد صاحب سے

کس چیز کی شکایت کی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمھارا نکاح ایک زاہد شخص کیساتھ کرنا چاہتا ہوں، میں اسپر راضی ہوگئی۔ مگر جب میں آپ کے گھر میں داخل ہوئی تو ایک گھڑے پر باسی روٹی رکھی ہوئی نظر آئی، میں نے اسکو زہد کے خلاف سمجھا کہ روٹی باسی بچا کر رکھی جائے، اسلئے والد صاحبؒ سے شکایت کی کہ مجھ کو کہاں ڈبو دیا۔ یہ آدمی تو زاہد نہیں ہے۔ باسی روٹیاں اٹھا کر رکھتا ہے۔

اس پر نوجوان نے کہا کہ میرا آج روزہ ہے، خیال یہ تھا کہ شام کو افطار کیلئے باسی روٹی اٹھا کر رکھ دوں کہ تکلیف نہ ہو۔ لڑکی نے کہا کہ میرے نزدیک یہی تو زہد وتوکل کے خلاف ہے۔ جسکے لئے روزہ رکھا ہے، اسپر اطمینان نہیں کہ وہ افطاری بھی دیگا۔ سبحان اللہ۔

حکایت نقل کرکے حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ حکایات ہیں، عورتوں کو سنانے کی، مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ انکے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے، لیکن اسکے سننے سے انہیں اللہ کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوجائیگا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اسمیں عقل کام نہیں دیتی، جب تک دولت باطن نہ عطا ہو یہ حالت نہیں ہوسکتی، کیونکہ ظاہری عقل میں تو یہ بات نہیں آتی۔ جب تک دولت دنیا سے بڑی کوئی دولت سامنے نہ ہو۔

انکے زہد اور ترک دنیا کا یہ اعلیٰ مقام ذکر کرنے کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ اب میں آخری بات کہتا ہوں کہ یہ زمانہ ضعف کا ہے، سالکین کیلئے سہولت بہم کرنے کا ہے، بقدر ضرورت سامان کرلینا خلاف زہد نہیں، مگر اس اعلیٰ زہد والوں سے کم از کم محبت و عقیدت، تو رکھیں انکو حقیر تو نہ سمجھیں۔ (صفحہ ۳۳۱ - ۳۳۲)

امام غزالیؒ کے ایک مقولہ کی تشریح:

امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص کسی کو ہدیہ اس نیت سے دے کہ وہ صالح اور بزرگ ہے تو اگر وہ شخص واقع میں صالح نہ ہو تو اسکو ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔

حضرتؒ کے شاگرد مولوی رشید احمد صاحبؒ کانپوری نے اس پر یہ شبہ پیش کیا کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہدیہ قبول کرنا کسی کیلئے بھی کسی حال جائز نہ ہو۔ کیونکہ اگر وہ اپنے آپکو صالح سمجھے تو وہ حقیقت میں صالح نہ رہا، کیونکہ اس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا یعنی اسکو گناہوں سے پاک صاف قرار دیا، جسکی قرآن میں ممانعت آئی ہے۔ فلا تزکوا انفسکم خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپکو صالح سمجھنا، خود بینی اور تزکیہ نفس نہ ہونے کی بناء پر

حقیقت میں صالح ہونے سے مانع ہے، اسلیے ہدیہ لینا ناجائز ہوا اور اگر وہ اپنے کو صالح نہ سمجھے تو بقول امام غزالی اسکو ہدیہ لینا یوں ناجائز ہوگیا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مراد امام کی یہ ہے کہ جو شخص اپنے قصد وارادہ سے کسی شخص کے دل میں اپنے صالحؒ اور بزرگ ہونے کا اعتقاد خود پیدا کرے اور وہ اس سے متاثر ہوکر ہدیہ پیش کرے تو اسکا قبول کرنا اس کیلئے ناجائز ہے۔ (صفحہ ۳۳۵)

امت کے اصلاح کی راہ، شبلی نعمانی کی نظر میں:

فرمایا، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی روایت ہے کہ وہ شبلی نعمانی سے ملے اور ان سے پوچھا کہ آپکے نزدیک مسلم قوم کی فلاح کا کیا راستہ ہے تو فرمایا کہ جب تک قوم کے قلوب میں اعتقاد و اعتماد اچھے لوگوں کا نہ ہو، کوئی فلاح کی صورت نہیں اور اعتقاد بغیر تقدس اور اعمال ظاہرہ و باطنہ کی درستی، حاصل نہیں ہوسکتا۔ (صفحہ ۳۳۶)

کفار اور مسلمانوں کی ترقی کی جداگانہ راہوں کا ہونا:

ارشاد فرمایا، آج کل جو قومی اجتماعی ترقی کیلئے تدابیر سیاسیہ اختیار کی جارہی ہیں، وہ مرکب ہیں آثار کفر اور آثار اسلام سے۔ جب انکو کفار اختیار کرتے ہیں تو وہ اسلام سے کچھ قریب ہوجاتے ہیں، اسکی برکت سے کامیاب ہوتے ہیں اور جب انکو مسلمان اختیار کرتے ہیں تو وہ کفر سے قریب ہوتے ہیں، اسلئے ناکام ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ مسلمانوں کو کافروں پر قیاس کرنا، ایسا قیاس ہے، جیسا کہ بوجھ بجھکڑ کا قیاس مشہور ہے کہ ایک شخص کھجور کے اونچے درخت پر چڑھ تو گیا، مگر اترنا اسے مشکل ہو رہا تھا، اس نے لوگوں سے فریاد کی کہ مجھے بچاؤ۔ گاؤں والے جمع ہوگئے، کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اپنے بوجھ بجھکڑ کو بلایا، اس نے آتے ہی کہا کہ یہ کام تو بہت ہی آسان ہے، تم ایک لمبا رسا لاؤ اور کھجور پر پھینکو، اسکو کہو کہ رسا پکڑے، اپنی کمر میں باندھ لے، جب یہ کام ہوگیا تو لوگوں کو کہا کہ اب تم زور سے یہ رسا کھینچو، یہ نیچے آجائے گا۔ اس تدبیر سے وہ بیچارہ نیچے تو آگیا، مگر ہڈی پسلی سب ٹوٹ کر مردہ ہوچکا تھا۔ لوگوں نے بوجھ بجھکڑ صاحب سے کہا کہ یہ کیا ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ تدبیر تو میں نے صحیح بتائی تھی، اسکی قضاء ہی آگئی ہوگی، جو مرگیا، ورنہ اس تدبیر کے ذریعہ میں نے کنوؤں میں گرجانے والے بہت سے لوگوں کو نجات دلوائی۔ وہ اچھے خاصے نکل آئے۔

تو جسطرح اس عقلمند نے اعلیٰ کو اسفل پر قیاس کرکے ایک غریب کی جان لے لی، اسی طرح مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے علو نصیب فرمایا ہے، کفار اسفل میں ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ کنویں کی گہرائی سے کسی کو اوپر اٹھانے کی جو تدبیر درست ہو، وہ اوپر سے کسی کو زمین پر لانے کے لئے بھی درست ہو۔

کفار تو سود- قمار- حرام کاری- جھوٹ فریب کے ذریعہ بھی کامیابی حاصل کرلیں تو بعید نہیں۔ مگر مسلمانوں کیلئے یہ تدابیر باعث ہلاکت و بربادی ہیں۔ (صفحہ ۳۳۶)

اللہ کی نعمتوں کی شکر ادائیگی:

حضرت مرزا مظہر جان جاناں کو ایک درویش کی یہ حکایت پہنچی کہ انکو اگر کبھی کوئی لذیذ کھانا ملتا ہے تو اس میں پانی وغیرہ ڈال کر بدمزہ کرکے کھاتے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے فرمایا کہ وہ گستاخ ہیں کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔

(احقر جامع عرض کرتا ہے کہ یہ صورت اگر کسی مبتدی نے اپنے مصلح کے مشورہ سے بطور علاج کچھ دنوں کیلئے اختیار کی ہو تو وہ قابل ملامت نہیں)۔ (صفحہ ۳۳۷)

بیماری سے کراہنا صبر کے منافی نہیں:

حضرت فاروق اعظمؓ کو دیکھا گیا کہ ایک مرض کی وجہ سے بے چین ہیں اور کراہ رہے ہیں، لوگوں نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین، کیا آپ بھی کراہتے ہیں یہ تو صبر کے خلاف ہے، فرمایا، سبحان اللہ، حق تعالیٰ نے تو مجھے بیمار کیا، میرا عجز و درماندگی ظاہر کرنے کیلئے تو کیا میں اسکے مقابلے میں اپنی قوت وطاقت کا مظاہرہ کروں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بیشک عارفین کا یہی حال ہوتا ہے۔

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش
(صفحہ ۳۳۸)

انتخاب شیخ کا معیار:

فرمایا، تصوف و سلوک کیلئے کسی شیخ مربی کی ضرورت تو بدیہی ہے، مگر اسکے انتخاب کے طریقہ اور معیار سے لوگ واقف نہیں، جسکی وجہ سے راہ غلط ہوجاتی ہے۔ فرمایا کہ

انتخاب شیخ کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ:

۱: وہ شخص احکام شرعیہ سے واقف ہو، اگر چہ متبحر عالم نہ ہو۔

۲: فن سلوک کو جانتا ہو، اگر چہ صاحب کشف و کرامات اور صاحب احوال نہ ہو۔

۳: کسی شیخ کامل کی خدمت میں متعدبہ مدت تک رہا ہو۔

۴: اس کی مجلس میں بیٹھنے کا یہ اثر عام ہو کہ دنیا سے محبت میں کمی اور آخرت کی طرف رغبت پیدا ہو اور گناہوں سے خوف اور طاعت سے رغبت پیدا ہو، چاہے احوال و مواجید کبھی حاصل نہ ہوں۔

اگر شیخ کامل ہونے کے باوجود اسکی صحبت میں رہنے سے کوئی نفع محسوس نہ کرے تو سمجھنا چاہئے کہ مجھے ان سے مناسبت نہیں، اسلئے انکو چھوڑ کر کسی دوسرے شیخ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، مگر اسکی شان میں کبھی بے ادبی نہ کرے، جیسے ایک طبیب یا ڈاکٹر کا علاج مواقف نہ آئے تو دوسرے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، مگر کوئی سمجھدار آدمی پہلے طبیب یا ڈاکٹر کی توہین نہیں کرتا۔ (صفحہ ۳۳۸)

غیبی امداد کا کسی مانوس انسان کی شکل میں ظاہر ہونا:

ایک صاحب، جو حضرت کے خدام میں سے ہیں اور تاجر ہیں۔ یہ علیگڑھ کی نمائش میں کچھ سامان تجارت لے گئے، وہاں اتفاقاً آگ لگ گئی۔ اسی حال میں انہوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا کہ حضرت قدس سرہ تشریف لائے اور انکے سامان کا صندوق ایک طرف سے خود پکڑا، دوسری طرف سے انکو پکڑایا اور آگ سے نکال دیا۔ جب یہ واقعہ انھوں نے حضرت سے بیان کیا تو فرمایا کہ اول تو یہ حکایت میرے دل کو نہیں لگی۔ اگر حکایت صحیح ہے تو اسمیں میرا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ بلکہ بعض اوقات حق تعالی کسی شخص کی امداد رجال الغیب سے کرادیتے ہیں اور انکو کسی ایسی شکل میں بھیجتے ہیں، جو اس شخص کے نزدیک مانوس ہو۔

اور فرمایا کہ سورۂ یوسف کی آیت لولا ان رای برھان کی مشہور تفسیر جو یہ ہے کہ جس وقت زلیخا نے مکان کے سب دروازے بند کرکے، حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی طرف بلایا تو مکان کے ایک گوشہ میں انکو حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے، اسکی توجیہہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے یہ فرمائی کہ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام وہاں اپنے علم و اختیار سے پہنچتے تو یوسف علیہ السلام کی طرف سے پریشان کیوں رہتے اور تلاش کا

حکم دینے کی کیا ضرورت پیش آتی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لطیفہ غیبیہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شکل میں انکے سامنے آیا۔ یعقوب علیہ السلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو پیش آیا کہ وہ کسی کام میں متردد تھے کہ اچانک اپنے دماغ میں حضرت حاجی صاحبؒ کی یہ آواز آئی کہ اس طرح کرو۔ مولانا نے اسکے مطابق کیا، اور برکت ہوئی، مگر مولانا فرماتے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ حضرت حاجی صاحبؒ کو اسکی خبر بھی نہیں۔ (صفحہ ۳۳۹)

دینی مدارس میں معاشی فنون کا مسئلہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی نظر میں:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ زمانہ کے بعض عقلاء اور اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ مدرسہ کی موجودہ تعلیم سے فارغ التحصیل طلباء کے معاش کا کوئی انتظام نہیں ہوتا، اسلئے اسوقت تو یہ مدارس صرف ان لوگوں کے کام کے ہیں، جو آخرت کے دیوانے اور اس پر سب کچھ قربان کرنے والے ہیں۔ اگر ان مدارس میں کچھ تعلیم انگریزی کی یا صنعت و حرفت کی بھی جاری کردی جائے تو یہ تعلیم سب مسلمانوں کے لئے مفید ہوجائے۔

اس کے جواب میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ ہم سے جو کچھ ہوسکتا تھا کہ دین و آخرت کے طلبگاروں کیلئے انتظام کردیں وہ ہم نے کردیا۔ اب جس خدا کے بندہ کو توفیق ہو، وہ انکے معاش کا بھی انتظام کردے۔ اسکے بعد فرمایا کہ تجربہ شاہد ہے کہ جب نقد اور ادھار جمع ہوں تو ہر شخص نقد کو ترجیح دیتا ہے، ادھار پر راضی نہیں ہوتا۔ اب سمجھ لیجئے کہ علم دینیہ اور تعلیم آخرت بمنزل ادھار کے ہے اور فنون دنیویہ بمنزلہ نقد کے، جب دونوں جمع ہونگے تو لوگوں کا میلان زیادہ نقد کی طرف ہوگا اور علوم دین و آخرت مؤخر بلکہ غیر مقصود بن کررہ جائیں گے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ سبحان اللہ کس قدر متین اور انجام بینی کا جواب ہے، یہ محض اس نور ایمان کا اثر ہے، جو بزرگوں کی صحبت سے حق تعالی نے انکے قلوب میں ڈالدیا تھا، ورنہ ان بزرگوں کو دنیا کا تجربہ زیادہ نہ تھا۔ (صفحہ ۳۴۲)

انتظامی کاموں سے، کاملوں کی دلی و ذہنی یکسوئی کا متاثر نہ ہونا:

ارشاد فرمایا، ایک مرتبہ مدرسہ دیوبند میں ایک جلسہ ہونے والا تھا، جسکے انتظام میں مدرسہ کا پورا عملہ لگا ہوا تھا۔ مگر میں نے مہتمم مدرسہ مولانا رفیع الدین صاحب کو دیکھا کہ

نہایت اطمینان سے اپنے معمولات میں مشغول ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت پر اس وقتی انتظام اور اسکے متفرق معاملات کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ جو عام لوگوں کی عادت کے خلاف ہے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ نے فرمایا کہ یہ انتظام ہی کیا ہے، اگر سلطنت کا انتظام ہمارے سپرد کردیا جائے تو اس کو بھی انشاء اللہ تعالیٰ اس شان سے اطمینان کیساتھ انجام دینگے، حضرتؒ نے فرمایا کہ حقیقی تصوف سنت رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے کہ سب تعلقات کے حقوق ادا کئے جائیں، جیسا کہ صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ جب گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو عام لوگوں کی طرح گھر کے کام کاج میں لگے رہتے تھے، لیکن اذان کی آواز سنتے تو اس طرح سب کو چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے کہ گویا آپ ہمیں پہچانتے بھی نہیں۔

احقر جامع عرض کرتا ہے کہ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے سپرد دنیا کی خلافت و سلطنت ہوئی تو اسکے کاموں کو انھوں نے جس اطمینان سے انجام دیا ہے، وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ کاملین، جن کا تعلق اور رابطہ حق تعالیٰ کیساتھ مضبوط اور راسخ ہوجاتا ہے پھر دنیا کے ہزار انتظامات کا تفرق وتشتت بھی انکے اطمینان اور دلی اطمینان کو برباد نہیں کرسکتا۔ (صفحہ ۳۴۲)

ایک عجیب حکایت:

ایک صاحب کشف بزرگ ایک بستی میں پہنچے۔ لوگوں نے بیان کیا کہ یہاں ایک صراحی ایسی ہے، جسمیں کسی موسم میں کسی وقت پانی ٹھنڈا نہیں ہوتا، گرم ہی رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے، انھوں نے فرمایا کہ صراحی آج رات میرے پاس چھوڑ دو۔ لوگ صبح کو آئے تو صراحی انکے حوالے کردی اور فرمایا کہ اب دیکھو، اسکا پانی ٹھنڈا ہے یا نہیں۔ دیکھا گیا تو پانی ٹھنڈا تھا۔ لوگوں نے سبب پوچھا، فرمایا کہ صراحی ایک مردہ کی مٹی سے بنی ہوئی تھی اور اس مردہ کو برزخ میں عذاب ہو رہا تھا۔ اسکے عذاب کا اثر اس صراحی کی مٹی میں تھا۔ جب مجھے یہ منکشف ہوا تو میں نے اس مردہ کیلئے دعاء مغفرت کی، حق تعالیٰ نے اسکی مغفرت فرمادی اور وہ عذاب کا اثر جاتا رہا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بعض اوقات برزخ کے آثار عذاب کو حق تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے اس عالم میں بھی ظاہر فرمادیتے ہیں، جیسا کہ اس واقعہ میں مصلحت یہ معلوم ہوئی کہ اس مردہ کو انکی دعاء مغفرت سے فائدہ پہنچ گیا۔ (صفحہ ۳۴۴)

حصہ سوم

شرعی، روحانی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل اور ان کا حل

ملفوظات کمالات اشرفیہ کی روشنی میں

راہ طریقت کی دشواریوں کا، سفر کی دشواریوں سے مماثل ہونا

ایک صاحب نے کہا کہ جس زمانہ میں کوئی تکلیف نہ ہو، اس وقت تو اللہ تعالیٰ سے طبعی محبت بھی ہوتی ہے، لیکن تکالیف کی حالت میں چونکہ ان کا صدور منجانب اللہ ہوتا ہے، اسی لئے اس وقت صرف عقلی محبت رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں، جن کا اظہار کفر ہے۔ فرمایا، ایسے تغیرات طریقت کا حصہ ہیں، جس طرح سفر میں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ آبلے بھی پڑتے ہیں، ٹانگوں میں درد بھی ہوتا ہے، مگر منزل مقصود کے وصول کے بعد ان سب کا تدارک کردیا جاتا ہے۔ (صفحہ ۵۴)

جہاد کے لئے طبعی آمادگی واجب نہیں

فرمایا، جہاد کے لئے طبعی آمادگی اور رضا واجب نہیں، کیونکہ یہ اختیار میں نہیں، صرف عقلی رضا واجب ہے، جو چیز اختیاری ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر شریعت کا حکم ہو کہ موقع قتال میں حاضر رہا جائے، خواہ کیسی ہی وحشت اور دہشت ہو، تب بھی وہاں سے نہ ہٹیں گے، خواہ جان چلی جائے تو واجب کی ادائگی کے لئے بس اتنا عزم کافی ہے۔ (صفحہ ۵۵)

ذوق اطاعت کا لطف

فرمایا، خدا کے بندوں اور مقبولان حق کو اللہ کی اطاعت میں جو لطف حاصل ہوا ہے تو انہیں ان ممالکِ دنیا کی پرواہ نہیں رہی اور اگر انہیں یہ ممالک ملتے بھی ہیں تو دعا کرتے ہیں یا اللہ، انہیں تو بس وہ ذوق اطاعت ہی عطا فرمادے اور ہمیں دنیا کے عہدوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ (صفحہ ۵۶)

http://knooz-e-dil.blogspot.co

طریقت کی روح

فرمایا، سلوک کا مقصود اللہ کی رضا ہے، اس کے بعد دو چیزیں ہیں، ایک طریقت کا علم اور اس پر عمل، سو طریق صرف ایک ہے یعنی ظاہری اور باطنی احکام کی پابندی اور دو چیزیں اس طریق میں معاون ہیں، ایک ذکر (جس پر دوام ہو سکے) دوسرے صحبت اہل اللہ کی، وہ جتنی زیادہ ہو سکے۔ اور اگر زیادہ صحبت کے لئے وقت نہ ہو تو بزرگوں کے حالات و واقعات کا مطالعہ اس کا بدل ہے، اور طریقت کی راہ میں دو چیزیں رکاوٹ ہیں، ایک گناہ اور فضولیات میں مشغولی۔ دوم ان سب کے نافع ہونے کی شرط ہے، شیخ کو حالات کی اطلاع دیتے رہنا۔ اس کے بعد اپنی استعداد ہے، صلاحیتوں کے اختلاف کی بنا پر مقصود میں (یعنی وصول الی اللہ میں) دیر سویر ہوتی ہے۔ یہ ہے خلاصہ سارے طریق کا۔ (صفحہ ۵۸)

غصہ کا علاج

فرمایا، غصہ کا ایک مجرب علاج یہ ہے کہ جس پر غصہ ہے، اسے اپنے ہاں سے جدا کر دیا جائے یا خود اس سے جدا ہو جائے اور فوراً کسی کام میں لگ جانا چاہئے۔ (صفحہ ۵۸)

کبر کا علاج

فرمایا، کبر کی خرابی کا علاج یہ ہے کہ اس چیز کا تصور کیا جائے کہ ہمیں اپنے رتبہ کا کیا پتہ ہے اور اپنے عیوب کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ممکن ہے کہ دوسرے شخص میں کوئی خوبی ایسی موجود ہو، جس کا مجھے علم نہیں اور وہ حق تعالیٰ کو پسند ہو۔ اور اپنے اندر ایسے عیوب موجود ہوں، جن پر مواخذہ ہو جائے اور بڑے پن کے ہر عمل کی نشانی یہ ہے کہ ہر بات میں دوسروں کی تحقیر ہو، اس کا علاج یہ ہے کہ اہل حق کی زبان سے تعریف کی جائے اور عمل سے ان کا اکرام کیا جائے اور جو اہل باطل ہیں، ان کی بلاضرورت محض مشغلہ کے طور پر غیبت وغیرہ بالکل نہ کی جائے۔ (صفحہ ۵۹)

غیر اختیاری مجاہدہ کے ذریعہ درجات کی بلندی کا انتظام

فرمایا، اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ نیکی کرنا چاہتے ہیں اور اختیاری مجاہدہ سے اسے قاصر و عاجز دیکھتے ہیں تو غیب سے ایسے اسباب پیدا فرما دیتے ہیں، جس سے اس کے نفسانی امراض حب جاہ وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے، مثلاً اس پر کوئی مرض مسلط ہو جاتا ہے یا

کوئی دشمن مسلط ہو جاتا ہے، جو اسے ایذائیں پہنچاتا ہے، بالخصوص اسے بدنام کرتا ہے، اس کی روایات کو کوئی غلط سمجھتا ہے تو دوسرا صحیح سمجھتا ہے، اس طرح سے وہ رسوا ہو جاتا ہے، جو شروع میں نفس کو بیحد ناگوار ہوتا ہے، مگر جب وہ صبر و رضا اختیار کرتا ہے تو پھر اس میں تحمل کی ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ نہایت ہمت کے ساتھ یہ کہنے لگتا ہے۔

ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک برسرکن غم ایام را
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

پھر "ان مع العسر یسرا" یعنی بیشک تکلیف کے ساتھ آسانی ہے، کے مطابق اسے عزت اور قبول عام نصیب فرمائی جاتی ہے، جس میں اسے ناز نہیں ہوتا۔ اس کا درجہ جس قدر بلند ہو جاتا ہے، اس کی عاجزی میں اضافہ ہوتا ہے، اس طرح اسے جاہ عظیم میسر ہوتی ہے اور جاہ پسندی فنا ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۶۰)

اللہ تعالیٰ کا، اپنے مقبول بندوں کی طرف سے خود انتقام لینا

فرمایا، صوفی بیچارے ہر زمانہ میں بدنام رہے ہیں، چونکہ وہ خاموش اور صابر ہوتے ہیں، مگر معلوم بھی ہے کہ وہ صبر کیوں کرتے ہیں۔ وہ صبر کر کے حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کرتے ہیں، حدیث میں ہے کہ، جو شخص لوگوں سے اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص صبر کرتا ہے تو اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں۔ اس انتقام کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لئے ایسے غضب ناک ہوتے ہیں، جیسے شیر اپنے بچوں کے لئے غضبناک ہوا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کبھی تو دنیا میں مزا چکھا دیتے ہیں، کبھی آخرت کے لئے پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں اور دنیا میں کبھی تو ایسی سزا دیتے ہیں، جسے متعلقہ شخص خود بھی سزا سمجھتا ہے اور کبھی اس طرح میٹھی مار مارتے ہیں کہ یہ اسے انعام سمجھتا ہے، جیسا کہ ایک مجذوب نے ایک سپاہی کو، جس نے انہیں ہنٹر مار دیا تھا، بد دعا دی تھی کہ اے اللہ، اس کو تھانہ دار کر دے اور وہ چند ہی روز میں تھانہ دار ہو گیا تھا۔ (صفحہ ۶۱)

دین کے حوالے سے نااتفاقی کا مفید اور غیر مفید ہونا

فرمایا، نااتفاقی اس لئے مذموم ہے کہ یہ دین کے لئے مضر ہے اور ایسی نااتفاقی جو دین کے لئے مفید ہو، اگرچہ دنیاوی اعتبار سے نقصان دہ ہو تو ایسی نااتفاقی وہ بھی ہے، جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ,, قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذ قالوا لقومھم انا براء منکم ومما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابداً حتیٰ تومنوا باللہ وحدہ،، کیا اس نااتفاقی کو کوئی مذموم کہہ سکتا ہے، اور ایک اتفاق وہ تھا جس کے بارے میں ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں ,,وقال انما اتخذتم من دون اللہ اوثاناً مودۃ بینکم فی الحیوٰۃ الدنیا ثم یوم القیامۃ یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا وماواکم النار،، اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کفار تھے، ان میں باہم اتفاق واتحاد کامل تھا، مگر کیا اس اتفاق کی کوئی تعریف کرسکتا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو اس اتفاق کی بنیاد ہی اکھاڑ کر پھینک دی تھی، کیونکہ یہ اتفاق حق کے خلاف تھا۔ پس خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب ومحمود ہے، جبکہ وہ دین کے لئے مفید ہو اور نااتفاقی اسی وقت بری ہے، جب وہ دین کے لئے مضر ہو اور اگر نااتفاقی دین کے لئے مفید ہو تو اس وقت نااتفاقی ہی مطلوب ہوگی۔ (صفحہ ۶۲)

قرآن کا فرقان ہونا

فرمایا، قرآن کا لقب فرقان بھی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں، بلکہ وہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے۔ اہل حق کے ساتھ میلاپ کا حکم ہے اور اہل باطل کے ساتھ توڑنے کا حکم ہے۔ (صفحہ ۶۲)

شہرت کا مفید اور مضر ہونا

فرمایا، شہرت سے دین و دنیا دونوں کا ضرر ہوتا ہے، مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار و طلب سے حاصل ہو اور جو شہرت غیر اختیاری طور پر حاصل ہو، وہ نعمت ہے۔ (صفحہ ۶۳)

پردہ کے لئے ایک عجیب دلیل

فرمایا، پردہ کے بارے میں ایک بات یہ ہے کہ مجنون کو ہم قید کر دیتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ عقل کی کمی قید کا ذریعہ ہے، جس سے یہ بات مسلم ہوگئی کہ عورتوں کے لئے بھی اسی وجہ سے پردہ کے قید ہونے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان میں بھی عقل کی کمی ہے، ہاں یہ فرق ضرور ہونا چاہئے کہ جیسا نقص ہو، ویسا ہی قید ہو، کامل مجنوں کے لئے قید بھی کامل ہوتی ہے کہ اسے کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ہاتھ پیر باندھ دیئے جاتے ہیں اور مجنونِ ناقص کے لئے قید ناقص ہونا چاہئے کہ اسے گھر سے بلا اجازت نکلنے کا اختیار نہ دیا جائے۔ (صفحہ ۶۴)

گھریلو انتشار سے بچنے کی تدبیر

فرمایا، خانگی خرابیوں سے بچنے کی ایک عمدہ تدبیر یہ ہے کہ چند خاندان ایک گھر میں اکٹھے نہ رہا کریں، کیونکہ چند عورتوں کا ایک مکان میں رہنا ہی زیادہ فساد کا سبب ہے۔ (صفحہ ۶۴)

اجتماعی کام کے مضرات

فرمایا، جو کام تنہا ہوسکے، وہ لوگوں کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرنا چاہئے، دیکھا گیا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے، اکثر دنیوی کامیابی بھی نہیں ہوتی اور کبھی اگر دنیا بن بھی گئی تو دین کا تو ستیاناس ہی ہوجاتا ہے اور جو کام تنہا نہ ہوسکے، لوگوں ہی کے ساتھ ہوسکے، اس کے لئے اگر دینداروں کا مجمع میسر ہوجائے تو کرنا چاہئے۔ بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا ان میں دینداروں کو غلبہ حاصل ہو۔ لیکن اگر غلبہ دنیاداروں کو ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں۔ اس وقت آپ اس کام کے ذمہ دار نہ رہیں گے، کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے، لیکن حقیقت میں یہ مجموعۂ انتشار ہے۔ وہی حال ہوگا۔ تحسبھم جمیعا وقلوبھم شتیٰ۔

اعمال کا عطائے محض ہونا

فرمایا، جو اعمال ہم ہمیشہ کرتے رہتے ہیں، یہ محض عطا ہے، حق تعالیٰ نے آپ کے

اندر ایک داعیہ پیدا کر دیا ہے، جو کشاں کشاں آپ کو عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے تمہیں اپنے اعمال پر ناز نہ کرنا چاہئے، بلکہ شکر و نیاز ادا کرنا چاہئے۔ (صفحہ ۶۵)

محبت و معرفت کے اشتیاق کے حصول کا مسئلہ

فرمایا، بے شک اللہ کے ساتھ تعلق کا شوق انعام ہے، مگر شوق پیدا کرنے کے اسباب کو اختیار کر کے محنت کے ذریعہ شوق حاصل کرنا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی وہ خدا کے فضل سے ہی حاصل ہوگا، مگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل کے لئے بھی کچھ اسباب ایسے بنا دیئے ہیں، جن کے اختیار کرنے پر وہ عطا کے طور پر حاصل ہوجاتا ہے اور مقصود حصول عطا ہے، خواہ وہ از خود حاصل ہوجائے یا محنت سے حاصل ہو۔ پس اگر شوق از خود پیدا ہوجائے تو کیا کہنا اور اگر اسباب اختیار کرنے سے حاصل ہوجائے تو بھی صحیح ہے، دونوں حالتوں میں مقصود حاصل ہے۔ (صفحہ ۶۵)

امت محمدیہ کے بڑے لوگوں کی خاصیت

فرمایا کہ حدیث میں ہے۔ **اکبر امتی الذین لم یعطوا فیبطروا ولم یقتر علیھم فلیسالوا**۔ یعنی میری امت میں سب سے بڑے درجہ کے حامل وہ لوگ ہیں، جنہیں نہ اتنا مال حاصل ہو، جس سے وہ تکبر کرنے لگیں اور نہ ہی ان پر اتنی تنگی کی گئی ہو، جس سے وہ لوگوں سے مانگنے لگیں (یہ مانگنا عام ہے، خواہ صریح طور پر مانگیں یا ترکیبوں سے)۔ (صفحہ ۶۹)

شیخ کا ماہر فن ہونا لازم ہے

فرمایا، شیخ کا ولی ہونا ضروری نہیں، مقبول ہونا ضروری نہیں، ہاں فن کا جاننا اور اس میں مہارت کا حاصل ہونا ضروری ہے، جیسے طبیب کہ اس کا پرہیزگار ہونا ضروری نہیں۔ البتہ فن کا جاننا ضروری ہے، اسی طرح اگر اعمال صالحہ ہوں، تقویٰ ہو۔ ولایت حاصل ہوجائے گی، اگرچہ شیخ نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر شیخ ولی بھی ہو تو اس کی تعلیم میں برکت زیادہ ہوگی۔ (صفحہ ۷۱)

سلوک کا غم کے ذریعہ سے طے ہونا

فرمایا، حزن سے جس قدر جلد سلوک کے مراتب طے ہوتے ہیں، مجاہدہ سے اتنے جلد طے نہیں ہوتے، یہ بات ایسی ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ (صفحہ ۷۱)

طاعت کا نقص غیر اختیاری بھی باطن کو نافع ہے

فرمایا، روحانی امراض کا ایک علاج جیسا کہ اختیاری ہے اور اس میں اہتمام کی ضرورت ہے، دوسرا علاج غیر اختیاری بھی ہے یعنی غم وغیرہ۔ اگرچہ غیر واجبی طاعات میں کمی واقع ہوجائے یا واجبی اطاعت کی کیفیت میں کچھ نقص یا خلل ہی کیوں نہ واقع ہوجائے، تب بھی اس پر باطنی نفع مرتب ہوتا ہے۔ (صفحہ ۷۱)

ہر معاملہ میں ضابطہ کا ہونا

فرمایا، شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ **کان لہ عتاد فی کل شیء** حضور کریم ﷺ کے ہر امر میں ایک ضابطہ مقرر تھا۔ اس لئے ہر معاملہ میں ایک ضابطہ ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۷۲)

مشاہدہ جمالِ حق کا جھوٹا دعویٰ

فرمایا، مشاہدہ جمال حق کے لئے حرام محل اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ حرام میں مشاہدہ جمال حق ہوتا ہی نہیں۔ وہاں محض نفسانیت اور بہیمت ہوتی ہے، پس جو لوگ لڑکوں اور نامحرم عورتوں کو گھورتے ہیں اور دعویٰ مشاہدۂ جمال حق کا کرتے ہیں، وہ جھوٹے ہیں۔ (صفحہ ۷۳)

حق العبد میں حق تعالیٰ کی حق تلفی بھی ہوتی ہے

فرمایا، عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ بندہ کے حق میں محض بندہ ہی کا حق ہوتا ہے، حق تعالیٰ کا حق نہیں ہوتا، یہ غلط ہے۔ کیونکہ بندہ کا وہ حق اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ہے، مثلاً اللہ نے حکم دیا ہے کہ مظلوم کی امداد کرو۔ کسی مسلمان کی غیبت نہ کرو۔ کسی کو ایذا نہ دو۔ تو جب ان احکام کے خلاف کسی کو ایذا دی جائے گی تو جس طرح بندہ کا حق فوت ہوا، اسی طرح خدا تعالیٰ کا بھی حق فوت ہوا کہ ان کے حکم کی مخالفت ہوئی۔ اس لئے حقوق العباد

ضایع وتلف کرنے میں محض بندوں کی معافی کافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ سے بھی توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔ اگرچہ عام بندوں کے حقوق میں بندہ کی معافی کے بعد حق تعالیٰ اکثر اپنا حق بھی معاف کردیتے ہیں۔ مگر بعض اوقات محبوبان خاص کی تلفی میں ان کی معافی کے بعد بھی حق تعالیٰ اپنا حق معاف نہیں فرماتے۔ بلکہ مواخذہ ضرور ہوتا ہے۔ (صفحہ ۷۳)

قبض وبسط اور دولتمندی اور اخلاص کے تضادات کی تفہیم

فرمایا، بعض اوقات ایک ضد دوسرے ضد کے حصول کا سبب ہوجاتی ہے، جیسے قبض بسط کا سبب ہوجاتا ہے، مجاہدہ سے جو حزن وغم پیدا ہوتا ہے، وہ عجز وانکسار کا ذریعہ ہوتا ہے اور عجب وخود بینی کو قلع قمع کرنے کا موجب بھی۔ یا دولت، افلاس کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے کہ دولت سے بے فکری ابھرتی ہے اور بے فکری سے فضول خرچی ہوتی ہے، جس سے افلاس تک نوبت پہنچتی ہے یا افلاس سبب ہوتا ہے دولتمندی کا، اس طرح کہ عسرت وتنگی کی وجہ سے محنت وجانثاری کے ساتھ روزگار کے لئے کوشش ہوتی ہے اور اس سے افلاس دور ہوکر دولت نصیب ہوجاتی ہے، اسی طرح وسوسوں کی کثرت حضور ودلجمعی کا سبب بن جاتی ہے، یہ سوچنے سے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کیا کہئے کہ میرے دل میں خیالات ووساوس کا دریاء موجود ہے، جسے بند کرنے سے بندہ عاجز ہے۔ (صفحہ ۷۴)

توجہ مرشد کے اثرات

فرمایا، مرشد کی توجہ اس وقت نافع ہوتی ہے، جبکہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کے کہنے پر عمل کیا جائے اور اپنے آپ کو اس کے ہاتھ میں "مردہ بدست زندہ" کردیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے تم میں تصرف کرے، اس کے بعد مرشد کی جو توجہ ہوتی ہے، وہ واقعی کیمیا ہوتی ہے۔ (صفحہ ۷۴)

تفقہ فی الدین کی سعادت کا طریقہ

فرمایا، فہم سلیم اور تفقہ فی الدین اس شخص کو حاصل ہوتا ہے، جس نے توجہ سے پڑھا ہو اور ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی راضی رکھا ہو، جس طالب علم نے محض محنت کی ہو، مگر اساتذہ کو راضی نہ رکھا ہو، تجربہ کرلیا جائے کہ اسے حقیقی علم ہرگز حاصل نہ ہوگا۔ (صفحہ ۷۴)

محبّ، نتائج وغیرہ کو نہیں دیکھتا

فرمایا، عاشق کو اس چیز سے بحث نہیں ہوتی کہ میرے عمل پر کچھ ثمرہ بھی حاصل ہوتا ہے یا نہیں اور عمل سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں، وہ تو محض محبت کی وجہ سے محبوب کی خدمت میں لگا رہتا ہے، چاہے کامیابی ہو یا ناکامی۔ (صفحہ ۷۴)

معراج کی حقیقت

فرمایا، معراج کی حقیقت قرب حق ہے۔ اور اللہ کا قرب کسی خاص صورت کے ساتھ وابستہ نہیں، بلکہ کبھی بصورت عروج ہوتا ہے، جیسا کہ ہمارے رسول مقبول کو ہوا اور کبھی بصورت نزول جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ہوا۔ (صفحہ ۷۴)

مصیبت سے بھلائی کے سامان کا پیدا ہونا

مصیبت اور تکلیف کو بہتری وآسانی میں خاص دخل حاصل ہے، کیونکہ تکلیف سے نفس پامال ہوتا ہے اور عارف کو اس وقت اپنے عجز وفنا کا مشاہدہ ہوتا ہے نیز صبر جمیل اور رضا بالقضا کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جب وہ حدیث ملالی جائے کہ انبیاء پر تکالیف اس لئے زیادہ آتی ہیں، تاکہ ان کے درجات بلند ہوں، پھر تو مصیبت آسانی کا سبب ہوئی اور اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لیجئے کہ تکلیف آسانی کا باطنی سبب تو ہوتی ہی ہے۔ کیونکہ اس سے درجات بڑھتے ہیں، مگر اکثر ظاہری آسانی کا بھی سبب بن جاتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

,,انا لننصر رسلنا والذین آمنو الخ

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون، وعداللہ الذین آمنوا منکم وعملوالصالحات لیستخلفنھم فی الارض، ، الخ (صفحہ ۷۵)

عقائد کا بذات خود مقصود ہونا

فرمایا، عقائد بذات خود بھی مقصود ہیں تو عمل کے واسطے سے بھی مقصود ہیں، مثلاً مسئلہ تقدیر کے بارے میں صرف اعتقاد رکھنا ہی مقصود نہیں، بلکہ اس سے عمل بھی مقصود ہے کہ فرد مصائب کے وقت ڈٹا رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر پریشان نہ ہو، اسی طرح نعمتوں پر ناز وکبر نہ ہو، ان کو اپنا کمال نہ سمجھے، مثلاً توحید کے عقیدہ سے یہ مقصود معلوم ہوتا

ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع باقی نہ رہے۔ (صفحہ ۷۶)

تعلقات میں اختصار کی تعلیم

فرمایا، اسلام نہ ترک تعلقات کی تعلیم کرتا ہے، نہ دنیا میں انہماک کی اجازت دیتا ہے، بلکہ تعلقات میں اختصار کی تعلیم دیتا ہے۔ (صفحہ ۷۶)

دولت اور زہد و توکل کا جمع ہونا

فرمایا، مال جمع کرنے کے ساتھ بھی زہد و توکل ہوسکتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ مال سے دل نہ لگایا جائے اور ضرورت سے زیادہ دولت کے درپے نہ ہو، پس یہ زھد ہے اور اگر اللہ تعالیٰ طلب وانہماک کے بغیر ضرورت سے زیادہ سامان عطا فرمادیں تو یہ بھی زہد کے خلاف نہیں۔ اور توکل یہ ہے کہ اسباب کو مؤثر نہ سمجھا جائے، نہ ان پر اعتماد کیا جائے، بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رکھی جائے اور ہر چیز کو ان کی عطا سمجھا جائے، اس کے لئے اسباب کو چھوڑنا اور ملازمت کو چھوڑنا ضروری نہیں۔

باطنی دولت سے ناآشنا افراد کی محرومی

فرمایا، اندھے مادر زاد کو کیا خبر کہ نظر کسے کہتے ہیں اور روشنی کیسی ہوتی ہے، عنین کیا جانے کہ نکاح میں کیا مزہ ہے اور منکوحہ کیسی قابل قدر چیز ہے۔ اسی طرح جن کی باطنی آنکھیں اندھی ہیں، وہ باطنی دولت کی حقیقت کیا سمجھیں۔ (صفحہ ۷۹)

وصول الی اللہ کا سب سے قریب طریقہ

فرمایا، حضور کریم ﷺ کی اتباع میں خاص برکت کا راز یہ ہے کہ جو شخص آپ کی ہیئت اختیار کرتا ہے، اس پر خدا تعالیٰ کو محبت اور پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب کے ہم شکل ہے، پس یہ وصول کا سب سے زیادہ قریب طریقہ ہے۔ (صفحہ ۷۹)

شیخ کی پہچان

فرمایا، شیخ کامل کی پہچان یہ ہے کہ وہ شریعت کا پورا متبع ہو، بدعت اور شرک سے محفوظ ہو۔ کوئی جہل کی بات نہ کرتا ہو، اس کی صحبت میں بیٹھنے کا اثر یہ ہو کہ دنیا کی محبت گھٹتی جائے اور حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے اور تم جو مرض باطنی بیان کرو، وہ اسے توجہ سے سن

کر اس کا علاج تجویز کرے اور جو علاج تجویز کرے، اس علاج سے نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جائے۔ (صفحہ ۸۰)

ضروری اور غیر ضروری سامان اور ان کے بارے میں شرعی حکم

فرمایا، سارے اخراجات اور سامان میں اختصار سے کام لیا جائے یعنی ضرورت پر اکتفا کیا جائے۔ پھر ضرورت کے بھی درجے ہیں، ایک یہ کہ جس کے بغیر کام نہ چل سکے، یہ مباح ہی نہیں، بلکہ واجب ہے، دوسرے یہ کہ ایک چیز کے بغیر کام تو چل سکتا ہے، مگر اس کے ہونے سے راحت ملتی ہے، اگر نہ ہو تو تکلیف ہوگی، اگرچہ کام چل جائے گا، مگر مشکل سے چلے گا، ایسے سامان رکھنے کی بھی اجازت ہے، ایک سامان اس طرح کا ہے، جس پر کوئی کام نہیں اٹکتا، نہ اس کے بغیر تکلیف ہوگی، مگر اس کے ہونے سے اپنا دل خوش ہوگا تو اپنا جی خوش کرنے کے واسطے بھی کسی سامان کے رکھنے کا، حیثیت کے مطابق مضائقہ نہیں، یہ بھی جائز ہے۔ ایک یہ کہ دوسروں کو دکھانے اور ان کی نگاہ میں بڑا بننے کے لئے کچھ سامان رکھا جائے، یہ حرام ہے، پس جو عورتیں اپنی راحت کے لئے یا اپنا، یا اپنے خاوند کا دل خوش کرنے کے لئے قیمتی کپڑا زیور پہنتی ہیں، ان کو تو مذکورہ شرط کے مطابق گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کے لئے پہنتی ہیں وہ گنہگار ہیں۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو وہ ذلیل وخوار بھنگیوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کسی تقریب کے لئے نکلیں گی تو نواب کی بچی بن کر جائیں گی۔ یہ تاویل کرنا عورتوں کا کہ ہم تو اپنے خاوند کی عزت کے لئے عمدہ کپڑا پہن کر جاتی ہیں، یہ بھی غلط ہے، کیونکہ پہلی بار ایک جوڑا جو تقریب کے لئے نکالا گیا، وہ خاوند کی عزت کے لئے تھا، پھر ہر دن نیا جوڑا یا کم از کم دوپٹہ کا بدل کر جانا، ان کی ریا کی بین دلیل ہے۔ یہ مذکورہ بالا درجے ہر چیز میں ہیں۔ مکان میں بھی اور برتنوں میں بھی کہ جس کے بغیر تکلیف ہو، وہ ضروری ہے اور جس کے بغیر تکلیف نہ ہو، وہ غیر ضروری ہے، اب اگر اس میں اپنا دل خوش کرنے کی نیت ہے تو مباح ہے اور اگر دوسروں کی نظر میں بڑا بننے کی نیت ہو تو اس صورت میں حرام ہے۔ (صفحہ ۸۱)

توکل کی خامی کی دلیل

فرمایا، ایک دفعہ مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ سے عرض کیا کہ حضرت میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں، حضرت حاجی صاحب

نے فرمایا، مولوی صاحب، ابھی تو پوچھ رہے ہو، پوچھنا دلیل ہے شک کی اور شک دلیل خامی کی ہے اور خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں۔ (صفحہ ۸۱)

''حال'' کیسے پیدا ہو؟

فرمایا، حال پیدا ہوتا ہے عمل پر ہمیشگی اختیار کرنے سے اور کسی قدر ذکر اور کاملین کی صحبت سے۔ (صفحہ ۸۱)

مبتدی، متوسط اور منتہی کے حالات کا بیان

فرمایا، مبتدی، متوسط اور منتہی کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص نے کبھی تو شراب پی ہی نہ ہو، اس لئے وہ ہوش میں ہے، یہ تو مبتدی ہے۔ ایک شخص نے ابھی شراب پینا شروع کی ہے، اس لئے وہ مست ہے، یہ متوسط ہے۔ اور ایک شخص برسوں سے پینے کا عادی ہے۔ اسے کچھ نشہ تو ضرور ہوتا ہے، زیادہ نہیں، یہ منتہی ہے۔ (صفحہ ۸۲)

حال یا علم کے بغیر تصوف کے مسائل کا بیان

فرمایا، جو لوگ حال یا علم کے بغیر باطنی علوم کا اظہار کرتے ہیں اور تصوف کے مسائل اور اہل حال کے اقوال کتابوں میں دیکھ کر نقل کرتے ہیں۔ وہ اپنا اور دوسروں کا ایمان ضائع کرتے ہیں، اس دریاء میں تو وہ شخص آئے، جس کے پاس کشتی ہو۔ (یعنی علم) یا اسے تیرنا آتا ہو (یعنی صاحب حال ہو) (صفحہ ۸۲)

بے لذت ذکر بھی اہمیت کا حامل ہی ہوتا ہے

فرمایا، ذکر بے لذت پر بھی ہمیشگی اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ کی معیت کا انکشاف ہوتا ہے اور قلب کو صحت حاصل ہوتی ہے، جس کے سامنے دنیا کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔ (صفحہ ۸۳)

اللہ تعالیٰ کو ہمارا نقصان گوارا نہیں

فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کسی کو قرض دیا کرو تو لکھ لیا کرو اور اس پر دو آدمیوں کو گواہ کر لیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ نہایت شفقت ومحبت ہے کہ وہ ہمارے پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں کرتے تو انہیں ہماری جان کا نقصان

کیسے گوارا ہوتا۔ پھر وہ جنت سے محروم کر کے دوزخ میں کب ڈالنا چاہیں گے۔ جب کہ تم خود گناہ کر کے جہنم کے حقدار نہ ہو، چنانچہ ارشاد ہے: **مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم**۔

شکر کی ادائیگی کی لطیف حکمت

فرمایا، غذا کے بعد شکر کا جو حکم دیا گیا ہے تو وہ درحقیقت غذا کے ہضم کے لئے چورن کی حیثیت رکھتا ہے، تاکہ پھر غذا کھائی جاسکے، کیونکہ شکر سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس طرح چورن سے دوسرے وقت زیادہ کھانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، جب کہ ناشکری سے صلاحیت سلب ہوتی ہے۔ (صفحہ ۸۳)

عمل کا مقصود

فرمایا، بندہ رسوخ کا مکلّف نہیں، صرف عمل کا ذمہ دار ہے، حتیٰ کہ اگر عمر بھر میں رسوخ حاصل نہ ہو تو مقصود میں کوئی خلل نہیں، اس سے عبادت میں کمال اجر اور قرب میں ذرا کمی نہ ہوگی بشرطیکہ عمل میں کمی نہ کی جائے۔ (صفحہ ۸۵)

تمام اخلاق کا خلاصہ

فرمایا، احادیث پر غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے اخلاق کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں کو اذیت سے بچایا جائے، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص بھائی کی لکڑی نہ اٹھائے، کیونکہ اس سے وہ پریشان ہوگا۔ نہ ہنسی میں اور نہ ارادے سے۔ ایسی ہنسی سے ممانعت کا سبب بھی وہی اذیت ہے۔ (صفحہ ۸۶)

اتفاق کا راز

فرمایا، اتفاق کا راز یہ ہے کہ اپنا بار دوسرے پر نہ ڈالا جائے، حتیٰ کہ بھائی کے نوکروں سے کبھی کام نہ لیا جائے، ممکن ہے، کبھی تنگدلی پیدا ہو، اور کوئی معمولی چیز جلانے کی لکڑی بھی اگر لی جائے تو قیمت دی جائے۔ چنانچہ حکمائے عرب کا قول ہے۔ تعاشروا کالاخوان وتعاملوا کالاجانب، باہم رہو تو بھائیوں کی طرح، لیکن معاملہ اجنبیوں کی طرح کرو۔ (صفحہ ۸۶)

دنیا کے آخرت کے سایہ ہونے کی مثال

فرمایا، ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ دنیا کی مثال آخرت کے ساتھ ایسی ہے، جیسی پرندہ اور سایہ کی۔ آخرت پرندہ ہے اور دنیا سایہ ہے۔ تم پرندہ کو پکڑ لو، سایہ اس کے ساتھ خود بخود چلا آئے گا، اور اگر سایہ کو پکڑو گے تو نہ تو سایہ قبضہ میں آئے گا، نہ دنیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ طالبِ آخرت کے پاس مال بہت آجاتا ہے، نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے چاہنے والوں کو راحت اور چین عطا فرماتے ہیں اور ایسی راحت دیتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ چاہے ان کے پاس مال و دولت کچھ نہ ہو، مگر انہیں اطمینان اور قلب کی کشادگی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ (صفحہ ۸۸)

اللہ تعالیٰ کی، فرد سے محبت کی علامت

فرمایا، حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں تو اسے دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں، جس طرح تم استقا کے بیمار کو پانی سے بچاتے ہو، کیونکہ زیادہ مال و دولت جمع ہونے سے وہ باطنی یکسوئی فوت ہوجاتی ہے، جس پر راحت کا مدار ہے، جس کے سامنے ساری دنیا کی بادشاہی بھی ہیچ ہے۔

رسوائیوں کا سبب اتباع کے مادہ کا نہ ہونا

فرمایا، ہمارے بھائیوں کی تباہی اور بربادی کا سبب یہ ہے کہ ان میں اتباع کا مادہ نہیں۔ اگر دین کامل نہ ہو تو کم از کم یہ مادہ تو ہو کہ کسی کا اتباع کریں۔ (صفحہ ۸۹)

غم و فکر سے نور کا پیدا ہونا

فرمایا، غم سے نفس کو تکلیف ضرور ہوتی ہے، لیکن اس سے روح میں نور پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ مجاہدہ ہے، اگرچہ اضطراری ہی سہی۔ اور اضطراری مجاہدہ بھی موجب اجر ہے۔ حدیث میں اس کی تصریح ہے، چنانچہ مرض، فکر اور بلا پر بشارتیں وارد ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے لئے دعا و تدبیر کا بھی امر ہے، پس دعا و تدبیر بھی کرنا چاہئے اور غم کے فضائل و بشارت پر نظر کر کے صبر و رضا بھی اختیار کرنا چاہئے۔ (صفحہ ۹۰)

اصلاح نفس کے لئے محض دعا کافی نہیں

اصلاح نفس کے لئے صرف دعا کافی نہیں، بلکہ تدابیر کی بھی ضرورت ہے، جیسے بچہ پیدا ہونے کے لئے نری دعا کافی نہیں، بلکہ زوجین کی بھی ضرورت ہے۔ (صفحہ ۹۰)

رضا کے درجہ کا مختلف ہونا

فرمایا، ہر شخص کے لئے رضا کا درجہ جدا جدا ہے، عوام کی رضا کا جو درجہ ہے دنیا کے حصول کے لئے وظائف پڑھنا، یہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ (صفحہ ۹۰)

بخل کی نوعیت

فرمایا، بخل کے دو درجے ہیں، ایک شریعت کے تقاضا کے خلاف، یہ گناہ ہے، دوسرا مروت کے تقاضا کے خلاف، یہ معصیت نہیں۔ فضیلت تو یہ ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔ اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس تقاضا کی مخالفت کی جائے، لیکن اگر ہمت نہ ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ (صفحہ ۹۱)

ہمت کا پیدا ہونا، صحبت کامل سے

فرمایا، ہمت سے اگر انسان کام لے تو کوئی کام بھی مشکل نہیں اور یہ ہمت پیدا ہوتی ہے، کسی کامل کی صحبت میں رہنے سے یا اس سے تعلق پیدا کرنے سے۔ (صفحہ ۹۱)

تصوف کا دشوار اور سہل ہونا

فرمایا، تصوف میں دشواری اس وقت تک ہے، جب تک اس کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد اس سے زیادہ آسان اور کوئی چیز نہیں، تصوف سے عدم واقفیت کی وجہ سے لوگوں نے اسے ہوا بنا رکھا ہے۔ حالانکہ تصوف صرف ایک مسئلہ پر ختم ہے، عمل ایک تو اختیاری ہے دوسرا غیر اختیاری۔ اختیاری عمل کو اختیار کیا جائے، غیر اختیاری کے درپے نہ ہوا جائے۔ (صفحہ ۹۲)

دین، دنیا کی اصلاح کا بھی ذریعہ ہے

فرمایا، اگر مسلمان اپنی اصلاح کرلیں اور دین میں راسخ ہوجائیں تو ان شاء اللہ چند

دن میں دنیوی مصیبتیں بھی ختم ہو جائیں۔ (صفحہ۹۲)

تقریبات میں عورتوں کی شرکت کا مسئلہ

فرمایا، تقریبات میں عورتوں کے جانے کے انسداد کا سہل طریقہ یہ ہے کہ انہیں جانے سے منع تو نہ کیا جائے، مگر انہیں اس پر مجبور کیا جائے کہ زیور وغیرہ پہن کر نہ جائیں۔ جس طرح وہ اپنے گھر میں رہتی ہیں، اسی طرح جائیں، چنانچہ ان کا جانا بند ہو جائے گا۔ (صفحہ۹۲)

خطوط کا جواب دینا

فرمایا، حدیث میں جو اجابتہ الداعی آیا ہے، خطوں کا جواب دینا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ اس لئے حتی المقدور خطوط کا جواب جلد دینا ضروری ہے۔ (صفحہ۹۲)

محقق کی شان

فرمایا، محقق ہمیشہ ضرورت اور مخاطب کی حالت کے لحاظ سے مضمون اختیار کرتا ہے، بیان کے لئے، چاہے مکرر ہو یا پرانا ہو۔ (صفحہ۹۳)

تعلق باللہ کے لئے یکسوئی کا انتظار کرنا

فرمایا، تعلق باللہ کے کام لئے کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے، یکسوئی تو دنیا میں پھنس کر ہو نہیں سکتی، اس کے حصول کا طریقہ صرف یہ ہے کہ موجودہ پریشانی کی حالت میں ہی تعلق مع اللہ کا کام شروع کیا جائے، پھر رفتہ رفتہ اطمینان کلی نصیب ہو جائے گا۔ ورنہ عمر یوں ہی ختم ہو جائے گی اور یکسوئی نصیب نہ ہوگی۔ (صفحہ۹۳)

حیاۃ طیبہ کی حقیقت کا انکشاف

فرمایا، زندگی کے لطف کا مدار مال نہیں، بلکہ طبیعت و روح کے نشاط پر ہے اور روحانی خوشی کا مدار دین و تعلق مع اللہ پر ہے۔ پس دین کے ساتھ دنیا اگرچہ کم ہو، مگر زندگی پُر لطف ہوتی ہے اور دین کے بغیر دنیا بے لطف ہے۔ اگر کسی دنیادار کو لطف کی حالت میں دیکھو تو یا تو اس کی دینداری کا اثر ہے۔ یا پھر دیکھنے والا اس کی ظاہری حالت سے دھوکہ میں مبتلا ہوا ہے، اگر اس کی اندرونی حالت تفتیش کی جائے تو پریشانی ظاہر ہوگی یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

دیکھنے والے نے حقیقی لطف کا مزہ ہی نہ چکھا ہو، لطف کی صورت کو اس نے لطف سمجھ لیا ہے اور اس کا راز وہی ہے کہ لطف و راحت ایک چیز ہے اور سامان لطف و راحت بالکل دوسری چیز ہے۔ لوگ اسباب و دنیا کو سامان راحت سمجھتے ہیں، اگر حقیقی راحت نہ ہو تو وہ حقیقت میں واللہ عذاب ہے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ,,ولا تعجبک اموالھم واولادھم انما یرید اللہ ان یعذبھم بھا فی الدنیا،، الخ پس یہ ضروری نہیں کہ جس کے پاس سامان راحت ہو، اس کو راحت بھی حاصل ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو، اس کو راحت حاصل نہ ہو، خود اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ دین چھوڑنے والے مسلمان کو وہ راحت سے محروم کر دیتے ہیں، پس دین کا نقصان ہے، جس سے دنیا کی راحت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ (صفحہ۹۴)

حرام مال کے استعمال سے شرارت کا مادہ ابھرتا ہے

فرمایا، جس چیز کا خود کھانا حرام ہے، اسے اولاد کو کھلانا بھی حرام ہے، جانوروں کو کھلانا بھی حرام، جانوروں کو خود نہ کھلاؤ، بلکہ ایسی جگہ رکھ دو کہ وہ خود آ کر کھالیں، یاد رکھو، اپنی اولاد کو حرام مال کھلانا ان کے اندر شرارت کا مادہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ (صفحہ۹۷)

قیامت کے دن رونے سے بچنے والی آنکھ

فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہر آنکھ رو رہی ہوگی، بجز اس آنکھ کے، جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کے دیکھنے سے روکی گئی اور وہ آنکھ جس نے اللہ کے راستے میں پہرہ دیا اور وہ آنکھ جس سے خوف الٰہی کی وجہ سے مکھی کے سر کے برابر بھی آنسو نکل آیا۔ (صفحہ۹۹)

شہوانی قوت کی تحفظ سے وصولی الی اللہ کا ملکہ ہونا

مولانا رومی فرماتے ہیں، قوت شہوانی ایک ایسی قوت ہے کہ اسے اگر اپنے اندر جمع رکھا جائے اور اس سے کام لیا جائے تو یہی قوت وصول الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس لئے کہ اس کے رہنے سے طبیعت میں جوش اور ہمت قائم رہتی ہے اور (عبادت اور ذکر و فکر میں) جوش اور ہمت باقی رہتی ہے تو بس قوت شہوانی کا تحفظ کرو تو کام خوب ہوتا ہے اور اگر اس قوت کو ضایع کیا تو اس سے طبیعت میں سستی و کاہلی کا غلبہ ہوگا اور ایسا ہوگا کہ گویا تم نے

اپنا بر اکھاڑ دیا۔ لہذا چاہئے کہ اس میں افراط نہ ہو، بزرگوں نے لکھا ہے کہ افراط شہوت رانی سے باطنی نقصان ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

پر نگہدار وچنیں شہوت مراں
تا پر میلت بروسوئے جناں
خلق پندارند عشرت می کنند
برخیالے پرخود بری کنند

(صفحہ ۹۹)

شک وشبہ کے ازالہ کی صورت

فرمایا، ایسی چیز نہ دیکھنا جس سے شک یا تردد پیدا ہو، اگر بلا ارادہ ایسی چیز فرد کے کان میں پڑ جائے اور شک وشبہ پیدا ہوجائے تو اسے کسی خاص تدبیر سے زائل کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس اہتمام سے پریشانی مزید بڑھے گی اور ہمیشہ کے لئے ایک مستقل شغل ہوجائے گا، بلکہ تدبیر کی بجائے اس سے بے التفاتی اختیار کی جائے اور وسوسہ کتنا ہی تیز ہو، بالکل پرواہ نہ کی جائے، البتہ دعا وتضرع کیا جائے اور اسے کافی سمجھا جائے، ان شاء اللہ بہت جلد طبیعت صاف ہوجائے گی، اور جب یہ عادت ہوجائے گی تو قلب میں ایسی قوت پیدا ہوجائے گی کہ وہ اس طرح کی چیزوں سے متاثر نہ ہوگا۔ (صفحہ ۱۰۱)

قیامت میں ہر عمل کا صورت مشاہدہ ہونا

فرمایا، بعض اکابر کا قول ہے کہ قیامت میں ہر عمل کی صورت مشاہدہ کی ہوگی، مثلاً کسی شخص نے اگر کسی اجنبیہ سے زنا کیا ہوگا تو وہ قیامت میں زنا کرتا ہوا نظر آئے گا۔ (صفحہ ۱۰۲)

ذکر اللہ کی لطافت

فرمایا، ذکر اللہ سے لطافت کے ساتھ قلب میں بشاشت بھی بڑھ جاتی ہے، اس لئے اہل اللہ زندہ دل ہوتے ہیں، مردہ دل نہیں ہوتے۔ (صفحہ ۱۰۳)

عوام اور خواص کے اظہار جوش کا فرق

فرمایا، محبت خدا اور رسول اللہ ﷺ میں عوام تو سب کچھ کر گذرتے ہیں اور خواص

دیکھتے رہ جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کی نظر میں تو صرف ایک چیز ہوتی ہے یعنی محبت، لہذا وہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے لگتے ہیں، اور خواص کی نظر محبت کے ساتھ حکمت پر بھی ہوتی ہے، مثلاً وہ اس طرح کے مواقع پر دیکھتے ہیں کہ اگر مقتضائے محبت پر عمل کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کو نفع کے مقابلہ میں ضرر زیادہ پہنچے گا۔ یہی چیزیں ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے خواص عوام کی طرح جوش کا اظہار نہیں کرتے، کیونکہ تنہا جوش کافی نہیں، بلکہ ہوش سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ (صفحہ ۱۰۵)

مشیت واختیار کے معاملہ میں متوازن موقف

فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ عبدیت اس میں زیادہ ہے کہ اپنی مشیت واختیار کو تسلیم کرکے، اسے مشیت حق کا تابع سمجھا جائے، اس میں عبدیت کچھ زیادہ نہیں کہ اپنے مشیت واختیار کی بالکل نفی کی جائے اور جبر کا قائل ہوا جائے، کمال تو یہ ہے کہ اپنے اختیار کا مشاہدہ ہو، اس کے باوجود اسے ضعیف سمجھا جائے، اس کی مثال یہ ہے کہ بادشاہ کے سامنے رعیت کے ایک معمولی آدمی کو بے اختیار سمجھے، یہ زیادہ کمال محبت کی بات نہیں۔ ہاں اگر کوئی نواب اپنے کو کسی قدر بااختیار سمجھتے ہوئے بھی اپنے اختیار کو بادشاہ کے اختیار کا تابع بنادے تو یہ کمال عبدیت ہے، اسی سے اہل سنت کا مذہب عبدیت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ ان کے عقیدہ میں عبدیت اہل جبر سے زیادہ ہے۔ (صفحہ ۱۰۶)

غرباء اور امراء کے چندہ کی نوعیت میں فرق

فرمایا، چندہ مانگو تو غریبوں سے مانگو، اس میں کچھ ذلت نہیں، وہ جو کچھ بھی دیں گے، نہایت خلوص اور تواضع سے دیں گے اور اس میں برکت بھی ہوگی اور امراء تو مانگنے والے کو ذلیل اور خود کو بڑا سمجھ کر دیتے ہیں، اس لئے اس میں ذلت بھی ہے، دوسرے یہ کہ وہ تو بیچارے قابل رحم ہیں کہ ان کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے وہ پریشان رہتے ہیں۔ (صفحہ ۱۰۷)

شوق رکھ کر کام کرو

فرمایا، ذکر کا جس قدر شوق ہو، اس سے کچھ کم کرنا چاہئے، یعنی شوق کو کچھ باقی چھوڑ دیا جائے۔ دیکھو، جب چکی پر تھوڑا سا تاگا رہ جاتا ہے تو وہ پھر لوٹ آتی ہے اور جب بالکل

نہیں رہتا تو نہیں لوٹتی۔ (صفحہ ۱۰۷)

وسعت نظر کا فائدہ

فرمایا، حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ نظر جس قدر وسیع ہوتی جاتی ہے، اعتراض کم ہوتا جاتا ہے۔ (صفحہ ۱۰۷)

اولیاء اور انبیاء کے کشف میں فرق کی نوعیت

فرمایا، اولیاء کشف میں جو چیز دیکھتے ہیں، وہ بالکل حق ہوتی ہے، مگر چونکہ وہ دور سے دیکھتے ہیں، اس لئے اس کی توقیت یعنی وقت اور جگہ کی تعین میں ان کا تخمینہ ہوتا ہے، جس میں غلطی کا بھی امکان ہے، بخلاف کشف انبیاء کے کہ وہ دیکھتے بھی حق ہیں اور انہیں اس چیز کے سر پر لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور وہ نہایت قریب سے دیکھتے ہیں، اس لئے ان سے تخمین وتعین مکان وزمان میں بھی غلطی نہیں ہوسکتی۔ (صفحہ ۱۰۸)

تصرف کے نقصانات

فرمایا، تصرفات میں نفسانی قوت کا عمل دخل ہوتا ہے، جس طرح جسمانی قوت جیسے (کشتی لڑنا) وغیرہ اسی طرح تصرفات کمالات محمودہ سے نہیں، اسی طرح قوت نفسانیہ بھی ہے، چنانچہ یہ نفسانی قوت اہل باطل میں بھی پائی جاتی ہے، بلکہ بعض محققین کا قول ہے کہ عارف راہمت نہ باشد۔ ہمت سے مراد تصرف ہے یعنی وہ تصرف نہیں چاہتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تصرف عبدیت کی شان کے خلاف ہے اور یہ چیز ایسی ہے، جو جسمانی افعال میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ اس میں مادی اسباب کی طرف احتیاج ظاہر ہے۔ جو عین عبدیت ہے، اور تصرفات نفسانیہ میں اسباب خفی ہیں، اس لئے اس میں احتیاج کی شان خفی ہے، نیز جسمانی افعال کے صدور میں عوام معتقد نہیں ہوتے اور تصرفات میں وہ معتقد ہوجاتے ہیں تو اس میں فتنے اور عجب کا بھی خطرہ ہے۔ (صفحہ ۱۰۹)

محققین اور منتہین کی شان

محققین اور منتہین کی یہ شان ہوتی ہے کہ ان کے لئے ہر چیز آئینہ جمال خداوندی بن جاتی ہے، جہاں زیادہ غصہ کا موقع ہوتا ہے، وہاں وہ زیادہ غصہ کا مظاہرہ کرتے ہیں، جہاں رنج کا موقع ہوتا ہے، وہاں وہ زیادہ رنج کرتے ہیں۔ غرض کہ ان کا عمل موقعہ ومحل کی

مناسبت سے ہوتا ہے، یہی مطلب ہے اس مضمون کا، جو حدیث میں آیا ہے۔ کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به. الخ یعنی میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، الخ اس کے معنی نہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ اس کے آلہ بن جاتے ہیں، بلکہ جیسے آلہ وذی آلہ میں اختلاف نہیں ہوتا، اسی طرح وہ بالکل امر حق کا تابع بن جاتا ہے اور اس کا کوئی قول وفعل امر حق کا مخالف نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۱۰)

گناہ سے معصیت کے مادہ کا قوی ہونا

فرمایا، یہ درحقیقت شیطان کا ایک دھوکہ ہے کہ گناہ کر لینے سے گناہ کا تقاضا کم ہوجائے گا، کیونکہ گناہ سے فی الحال کچھ دیر کے لئے تو تقاضا کم ہوجائے گا، مگر اس کا اثر یہ ہوگا کہ آئندہ کے لئے معصیت کا مادہ قوی ہوجائے گا اور اس کا ازالہ قدرت سے باہر ہوجائے گا۔ (صفحہ ۱۱۲)

گناہ کی کمیت وکیفیت کو دیکھ کر توبہ نہ کرنا فریب ہے

فرمایا، بندہ اگر اس وجہ سے توبہ نہ کرے کہ میرے گناہ اس قدر زیادہ ہیں یا اس وجہ سے کہ توبہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ تو یہ بھی ایک حماقت ہے اور شیطان کا مکر ہے، کیونکہ اگرچہ یہ بظاہر شرمندگی ہے، لیکن حقیقت میں یہ کبر ہے کہ فرد اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ گویا اس نے اللہ تعالیٰ کا کچھ ایسا نقصان کیا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرسکتے۔ یاد رکھو، یہ مساوات کا سا برتاؤ ہے، حالانکہ خدا تعالیٰ اور اس کی صفات کاملہ کے سامنے تمہاری اور تمہارے افعال کی حیثیت ہی کیا ہے۔ سارا عالم بھی نافرمان ہوجائے تو اس کا ذرہ برابر بھی نقصان نہیں ہوسکتا، نہ ان کے عفو وکرم سے مانع ہوسکتا ہے، مشہور ہے کہ ایک مچھر بیل کے سینگ پر جا بیٹھا، جب وہاں سے اڑنے لگا تو بیل سے معذرت چاہی کہ معاف کیجئے گا، میرے بیٹھنے سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی، بیل نے کہا، ارے بھائی، مجھے تو خبر بھی نہیں ہوئی تو کب بیٹھا اور کب اڑا۔ (صفحہ ۱۱۳)

تہجد کے لئے وقت پر جگا کر ہم کلامی کا شرف دینا

فرمایا، اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو تہجد کے عادی ہیں، وقت پر جگا کر اپنے

ساتھ ہمکلام ہونے کا شرف دیتے ہیں، اس لئے بجائے ناز کے نیاز وشکر ادا کرنا چاہئے۔ (صفحہ ۱۱۳)

کون قابل صحبت ہے

فرمایا، جس شخص کے اندر یہ تین باتیں ہوں، اس کی صحبت کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ فقیہ ہو، دوسرے محدث ہو، تیسرے صوفی ہو۔ (صفحہ ۱۱۴)

بندہ کی ہمت ہی اس کی تکمیل کا ذریعہ

فرمایا، بندہ کو چاہیے کہ خود ہمت سے کام لے پھر اس کی تکمیل حق تعالیٰ خود ہی کر دیتے ہیں، جیسے باپ جب دیکھتا ہے کہ بچہ دس قدم چلا اور گر گیا تو خود ہی رحم کھا کر اس کی مدد کرتا ہے اور اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے تو جس طرح باپ چاہتا ہے کہ بچہ اپنی طرف سے کوشش کرے چلنے کی، اسی طرح حق تعالیٰ ہماری طلب کو دیکھنا چاہتے ہیں، مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم تو اپنی جگہ سے سرکتے ہی نہیں۔ (صفحہ ۱۱۵)

جاھدو میں شامل چیزوں کی نشاندہی

فرمایا، والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا. میں جاھدوا سے مراد غور وفکر کرنا دعا والتجا، سعی وکوشش کرنا، حق تعالیٰ کے سامنے الحاح وزاری کرنا، تواضع وخاکساری پیدا کرنا شامل ہے، رونا چلانا شروع کرو، نخوت وتکبر کو دماغ سے نکال دو، اس کے بعد وصول میں دیر نہیں ہوتی، اس حالت کے پیدا کئے بغیر کامیابی مشکل ہے۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(صفحہ ۱۱۸)

قبض معاصی اور قبض غیر معاصی کا فرق

فرمایا، گناہ سے جو قبض ہوتا ہے، اس میں طبعی حزن اور گمراہی کا اندیشہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں جمودِ محض ہوتا ہے، یہی قساوت ہے اور جو قبض گناہوں کے بغیر ہوتا ہے، اس میں یہ خوف اور حزن ہوتا ہے، بجائے جمود کے بے چینی ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۱۹)

بلاضرورت کسی سے فرمائش نہ کرنا تہذیب ہے

فرمایا، تہذیب کی بات یہ ہے کہ جو کام خود کیا جا سکے، اس کی فرمائش دوسرے سے نہ کی جائے، مجبوری کی صورت میں کیا جا سکتا ہے، اس میں اپنی ضرورت اور دوسروں کی سہولت کو پیش نظر رکھا جائے۔ (صفحہ ۱۲۱)

واسطے سے چاہنا بھی محمود ہے

فرمایا، کسی کے تعلق اور واسطہ سے کسی کو چاہنا، حقیقت میں واسطہ کو چاہنا ہے، پس خدا تعالیٰ کی وجہ سے مخلوق کے ساتھ محبت کرنا بھی محمود ہے۔ (صفحہ ۱۲۲)

عارف کا، ہر کام خدا لئے ہونا

فرمایا، عارف کا کوئی کام اپنے واسطے یعنی اپنی حظ نفس کے واسطے نہیں ہوتا، بلکہ خدا کے واسطے ہوتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۲)

کشف القبور کی حقیقت

فرمایا، حضور کریم ﷺ، عذاب قبر کی بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کو انسان اور جنوں کے علاوہ سب سنتے ہیں، یہ ہے کشف قبور۔ اس سے کشف القبور کی حقیقت معلوم ہوگئی کہ گدھوں اور کتوں کو بھی ہو جاتا ہے، پس انسان کے لئے یہ کچھ کمال مطلوب نہیں۔ (صفحہ ۱۲۳)

ایمان وعمل صالح سے محبوبیت کا مقام حاصل ہونا

فرمایا، "ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن ودا" کا مطلب یہ ہے کہ ایمان وعمل سے قبولیت ومحبوبیت عامہ پیدا ہوتی ہے۔ یعنی لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دی جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ سلیم الطبع ہوں۔ یہ بے غرضانہ محبت ہوتی ہے، حتیٰ کہ غیر معاند کفار کے دلوں میں بھی ایسے لوگوں کی عظمت ہوتی ہے۔ انسان کیا معنیٰ جانور تک ان سے محبت کرنے لگتے ہیں، چنانچہ حضور کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام سفینہؓ ایک دفعہ قافلہ سے الگ ہو کر راستہ بھول گئے تھے، رات کو جنگل میں ایک شیر ملا تو آپ نے اس سے کہا، اے شیر، میں سفینہ رضہ غلام ہوں رسول اللہ ﷺ کا۔ یہ سن کر وہ دم ہلا کر خوشامد

کرنے لگا اور پھر آپ کے آگے آگے ہولیا، تھوڑی دیر میں آپ کو قافلہ کے قریب پہنچا کر دم ہلاتا ہوا چلا گیا۔ یہ تو محبت خلق کا ظہور ہوا اور محبت حق کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ اس شخص کو بس آواز تو نہیں آتی، مگر بقسم کہتا ہوں کہ محبت حق کا اثر اس کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ ہر وقت واقعات میں اس کی امداد اور اعانت ہوتی ہے اور قلب پر علوم، واردات وکلام حق کا ایسا القا ہوتا ہے، جیسے حق تعالیٰ اس سے باتیں کرتے ہوں، بس آواز تو نہیں آتی اور سب کچھ ہوتا ہے۔ اور فرد اسے خوب جانتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھے چاہتے ہیں، پھر اس کی لذت کا کیا پوچھنا، باقی اس کا کامل ظہور آخرت میں ہوگا۔ (صفحہ۱۲۳)

دل کی غذا اور اس کے اثرات ونتائج

فرمایا، جس طرح پیٹ کی غذا کھانا پینا اور آنکھ کی غذا دیکھنا ہے۔ اور کان کی غذا سننا ہے، اسی طرح دل کی بھی ایک غذا ہے اور وہ غذا محبت ہے، محبت کے سوا اس کی کوئی غذا نہیں، دل کو اسی میں لذت آتی ہے، پھر جس کا محبوب ناقص ہو، اس کی لذت تو ناقص ہوگی اور جس کا محبوب ایسا کامل ہو کہ اس سے زیادہ کامل محبوب ہی نہ ہو تو اس کی لذت سب سے زیادہ ہوگی۔ ایمان وعمل صالح اختیار کرنے سے دنیا ہی میں غذائے روحانی (یعنی حق تعالیٰ کی محبت کامل) حاصل ہوجاتی ہے، جس سے زیادہ دل کی کوئی غذا نہیں، کیونکہ جسمانی غذا سے روحانی غذا افضل ہے، اس لئے نعمت کے سارے اسباب سے اصل مقصود قلبی راحت ہے، جو جسمانی غذا سے بواسطہ حاصل ہوتی ہے اور روحانی غذا سے بلا واسطہ طور پر۔ پھر کمال یہ ہے کہ اس دسترخوان پر مختلف غذائیں ہیں، کبھی تم محبّ ہو اور حق تعالیٰ محبوب۔ اور کبھی حق تعالیٰ محبّ ہیں اور تم محبوب، اس کی لذت کچھ اور ہے۔ پھر خلق کو تم سے محبت ہوجاتی ہے، اس میں کچھ اور ہی مزہ ہے، ان مختلف اقسام سے لذت بہت بڑھ جاتی ہے۔ پس ہم کو ایمان وعمل صالح کی تکمیل میں کوشش کرنا چاہئے۔ (صفحہ۱۲۴)

مشاہدہ کی نوعیت

فرمایا، مشاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مشاہدہ کامل یہ تو جنت میں ہوگا، یہ مشاہدہ دنیا میں نہیں ہوسکتا، دوسرا مشاہدہ ناقص، یہ دنیا میں بھی ہوتا ہے، یہ مشاہدہ، مشاہدہ کامل کے مقابلہ میں مشاہدہ ناکمل میں داخل ہے۔ چونکہ دنیا میں سالک کو اس سے بہت کچھ تسلی ہوجاتی

ہے، اس لئے یہاں کے اعتبار سے مشاہدہ کامل ہی کو مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ یہ مشاہدہ خواہ تام ہو یا ناقص، اس کا دوام (یعنی ہر وقت مشاہدہ کی حالت کا ہونا) بندہ کی مصلحت کے خلاف ہے، اس لئے نہیں کہ وہاں کچھ کمی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ کو دوام مشاہدہ کا تحمل نہیں۔ کیونکہ دنیا میں دائمی تجلی سے بندہ مغلوب ہوجاتا ہے اور اس پر ہر وقت ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی ہے اور مغلوبیت کی وجہ سے اعمال میں کوتاہی واقع ہوجاتی ہے، جس سے قرب کم ہوجاتا ہے، اس لئے کہ قرب کا مدار اعمال پر ہی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں کیا کہ حضور تام یا رویت کے ہوتے ہوئے حضور یا رویت سے منع کردیا ہو، کیونکہ سالک کے لئے یہ صورت اشد ہے، بلکہ حق تعالیٰ نے یہ کیا کہ سالک کو مخلوق کی طرف متوجہ کردیا اور جنت میں بعض اوقات نفس کی لذت کی طرف متوجہ کردیں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک محبوب نے عاشق کو دیکھا کہ یہ بڑے غور سے مجھے تک رہا ہے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں زیادہ دیکھنے سے یہ مر نہ جائے تو اب ایک صورت تو یہ تھی کہ عاشق کو اپنے سامنے رکھ کر دیدار سے منع کردے کہ ہمیں نہ دیکھو۔ یہ صورت بہت سخت ہے، اس میں عاشق کو سخت بے چینی ہوتی ہے، اس لئے محبوب نے یہ تو نہیں کیا، بلکہ اس نے تھوڑی دیر کے لئے عاشق کو بازار بھیج دیا کہ جاؤ، آم لے آؤ، اس صورت میں اگرچہ محبوب سے کچھ دوری ہوگی، مگر اس سے شوق اعتدال پر آجائے گا۔ اور بازار جانے میں عاشق کی لذت بھی کم نہیں ہوتی، کیونکہ محبوب کے حکم کی تعمیل میں بھی ایک خاص لذت ہے، جو لذت دیدار ہی کے قریب ہے (عشاق اسے خوب سمجھتے ہیں) اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی حضور کامل کی تجلی باقی رکھ کر دیدار مشاہدہ سے منع نہیں کیا، بلکہ تجلی کو مستتر کردیا اور عشاق کو دوسری طرف متوجہ کردیا کہ ہر وقت حضور ومشاہدہ سے عشاق کے دل پھٹ نہ جائیں اور ان کا شوق معتدل رہے۔ (صفحہ۱۲۵)

دعا کی قبولیت کے شرط

فرمایا، دعا کرتے وقت حسن ظن اور امید کی قوت کو سامنے رکھو، پھر ثمرہ دیکھو کہ کامیابی ہی ہوگی۔ (صفحہ۱۲۶)

دیندار اور بے دین کی صحبت کے اثرات

فرمایا، بددین آدمی اگر دین کی بھی باتیں کرتا ہے تو اس میں ظلمت ملی ہوئی ہوتی ہے، اس کی تحریر کے نقوش میں بھی ایک طرح کی ظلمت لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اور دیندار فرد اگر دنیا کی بھی باتیں کرے تو اس میں بھی نور ہوتا ہے، کیونکہ کلام دراصل قلب کی حالت کا اظہار ہوتا ہے تو قلب کی حالت کا اثر اس میں ضرور ہوگا، پس چونکہ متکلم کا اثر اس کے کلام میں اور مصنف کے قلب کا اثر اس کی تصنیف میں ضرور ہوتا ہے، اس لئے بے دینوں کی صحبت اور بے دینوں کی کتابوں کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ مطالعۂ کتب، مصنف کی صحبت کے برابر ہے، جو اثر بے دین کی صحبت کا ہوتا ہے، وہی اثر اس کی کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۸)

مخالفین کی کتابوں کے مطالعہ کے لئے محقق ہونا ضروری ہے

فرمایا، مناظرہ کی نیت سے بھی مخالفین کی کتابیں نہ دیکھنا چاہئے، کیونکہ پہلوان اگر کسی سے کشتی کرنا چاہے تو اس کو پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ مقابل مجھ سے کمزور ہے یا طاقتور۔ اگر کمزور ہو تو مقابلہ کیا جائے، ورنہ اس سے دور بھاگا جائے۔ طاقتور شخص کا مقابلہ وہ شخص کرے، جو اس سے زیادہ طاقتور ہو، پس محقق کے سوا کسی کو اجازت نہیں کہ مخالفین کے رد کے درپے ہو۔ کیونکہ خطرہ ہے کہ غیر محقق خود ہی شک میں مبتلا نہ ہوجائے۔ (صفحہ ۱۲۸)

قلب کے اثرات

فرمایا، قلب کا اثر انسان کے کلام اور لباس تک میں ظاہر ہوتا ہے، اس لئے اہل اللہ کے تبرکات میں اثر ہوتا ہے اور ان کی صحبت میں اس سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۸)

خدا کے واسطے کی محبت

فرمایا، خدا تعالیٰ کے واسطے سے کسی سے محبت کرنا، یہ درحقیقت اللہ ہی کے ساتھ محبت ہے، دیکھو اگر ہماری وجہ سے کوئی ہماری اولاد یا متعلقین کے ساتھ محبت کرتا ہے تو ہم اسے اپنی محبت سمجھتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۹)

تقویٰ کی تعریف

فرمایا، تقویٰ لفظ کا استعمال زیادہ تر اس خوف کے لئے ہوتا ہے، جس میں گناہوں سے اجتناب بھی شامل ہو، محض اعتقادی خوف کے لئے تقویٰ کم استعمال ہوتا ہے، یوں کہیے کہ تقویٰ خوف مقرون بالعمل کو کہتے ہیں اور خشیت خوف اعتقادی کو اور اصلی شرف جس سے انسان خدا تعالیٰ کے یہاں مکرم ومعزز ہوتا ہے، یہی تقویٰ ہے۔ (صفحہ ۱۳۰)

نمازی و بے نمازی کے چہرہ کے اثرات میں فرق

فرمایا، نمازی کے دل میں نور ہے، اس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے، اس کا اثر چہرہ کی بدرونقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اندر میں آگ لگی ہوئی ہے، یہ اسی کا دھواں ہے، جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے، دل کی سیاہی تو یہ ہے کہ نہ رشوت سے نفرت ہے نہ جھوٹ بولنے سے، نہ لڑکوں اور عورتوں کے گھورنے سے، نہ وضع نصرانی اختیار کرنے سے۔ وغیرہ وغیرہ۔ (صفحہ ۱۳۲)

گناہوں کی سوزش کے اثرات

فرمایا، غفلت کی فالج کی وجہ سے جسم سن ہو رہا ہے یا غفلت کے کلوروفارم کی وجہ سے سوزش کا احساس نہیں ہوتا، مگر ایک دن یہ فالج اور یہ بے ہوشی اترے گی، اس وقت گناہوں کی سوزش کا احساس ہوگا۔ (صفحہ ۱۳۲)

گناہوں کی آگ کے اثرات

فرمایا، گناہوں کی آگ خدائی آگ ہے، جس کی خاصیت "نار الله الموقدة التي تطلع على الافئدة" ہے، اس کا اصل مرکز قلب ہے اور دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ گنہگار کا دل بے چین ہوتا ہے، اس کو راحت وچین نصیب نہیں ہوتا۔ گناہ سے دل ضعیف اور کمزور ہوتا ہے، جس کا تجربہ حادثوں کے وقت ہوتا ہے کہ متقی اس وقت مضبوط اور مستقل مزاج رہتا ہے، جب کہ گنہگار اس وقت حواس باختہ ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۱۳۳)

خلوت وجلوت کی تفہیم

فرمایا، خلوت کے معنی یہ ہیں کہ دل خدا کے ساتھ لگا رہے، پس جب تک خلوت میں

دل خدا کے ساتھ لگا رہے، خلوت میں رہا جائے اور جب خلوت میں قلب میں انتشار اور خطرات کا ہجوم ہونے لگے تو مجمع میں بیٹھو، مگر نیک مجمع میں۔ اس سے خطرات دفع ہوں گے، اس وقت یہ جلوت ہی خلوت کے حکم میں ہے، کیونکہ مقصد قلب کا اللہ کے ساتھ رابطہ ہے اور وہ اس وقت خلوت سے حاصل نہیں، بلکہ مجمع میں بیٹھنے سے حاصل ہے۔ (صفحہ ۱۳۳)

علم وعمل پر ناز کیوں؟

فرمایا، علم وعمل اس وقت شرف کا باعث ہے، جبکہ وہ خدا کے یہاں مقبول ہو، یہ ایسی بات ہے، جس کا یقینی علم کسی کو نہیں، بلکہ اپنے علم وعمل کی حالت کو دیکھ کر قبول نہ ہونے کا یقین ہو تو بعید نہیں، ایسی صورت میں فخر کرنے کا کیا موقع اور یہ بھی معلوم ہے کہ علم وعمل کا اعتبار خاتمہ سے ہے اور اس کی بھی خبر نہیں کہ ہمارا خاتمہ کس حال میں ہونے والا ہے، اس لئے ناز کرنا، اترانا کیسا۔ ہاں، علم وعمل کو نعمت الٰہی سمجھ کر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ (صفحہ ۱۳۴)

گناہ سے مسلمان کو پوری لذت کا حاصل نہ ہونا

فرمایا، مسلمان کو گناہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کا خوف ضرور ہوتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے اور آخرت میں عذاب ہوگا۔ یہ خیال ساری لذت کو مکدر کر دیتا ہے۔ اس لئے مسلمان کو گناہ میں پوری لذت نہیں مل سکتی۔ (صفحہ ۱۳۴)

خواب میں حضور کریم ﷺ کی زیارت وعدم زیارت کا مسئلہ

فرمایا، اگر خواب میں کسی کو حضور (ﷺ) کی زیارت حاصل ہو جائے تو یہ کچھ کمال مامور بہ نہیں، اگرچہ یہ نعمت عظمیٰ ہے اور اگر کسی کو عمر بھر زیارت نصیب نہ ہو تو یہ کچھ نقص منہی عنہ نہیں، کیونکہ کمال ونقص کا مدار اختیاری امور ہیں۔ غیر اختیاری امور کے نہ ہونے سے نقص لازم نہیں آتا۔ (صفحہ ۱۳۵)

شیخ کے قلب کا تکدر سالک کے لئے نقصان دہ ہے

فرمایا، شیخ کے قلب کا تکدر فیض کی راہ میں رکاوٹ ہے، اسی لئے حضور کریم ﷺ نے حضرت وحشی کو جنہوں نے حضرت حمزہؓ کو بری طرح سے شہید کیا تھا، اپنے سامنے آنے سے روک دیا تھا کہ روز روز دیکھ کر انقباض ہوگا اور میرے انقباض سے نقصان ہوگا کہ فیوض

وبرکات سے حرمان ہو جائے گا۔ اس میں حضور ﷺ نے صرف اپنی راحت کا ہی سامان نہیں کیا، بلکہ اس میں ان کی راحت کا بھی سامان تھا کہ ان کو بعد میں ہی ترقی ہو سکتی تھی۔ دوسرے اس میں حضرت ﷺ نے امت کو بھی اس قسم کے طبعی امور اور بشری جذبات کی رعایت وموافقت کی اجازت دی اور بتایا کہ مجرم کی خطا معاف کر دینا، الگ چیز ہے اور دل کا کھل جانا، دوسری چیز ہے، یہ ضروری نہیں کہ خطا معاف کر دینے کے ساتھ دل بھی کھل جائے۔ (صفحہ ۱۳۶)

بشری جذبات کے سلسلہ میں معتدل راہ عمل

فرمایا، جس شخص کے سامنے آنے سے اذیت قابل برداشت ہوتی ہو، وہاں عزیمت پر عمل کیا جائے یعنی فرد کو آنے سے نہ روکا جائے، بلکہ دل پر جبر کیا جائے اور جہاں اذیت ناقابل برداشت ہو، وہاں رخصت پر عمل کیا جائے، یعنی آنے سے منع کیا جائے۔ (صفحہ ۱۳۶)

رخصتوں سے استفادہ کی اہمیت

فرمایا، بعض لوگوں کو ہر حالت میں عزیمت پر ہی عمل کرنے کا شوق ہوتا ہے، یہ کوئی کمال نہیں، شرعی رخصت اور نعمت الٰہی سے بلاوجہ اور ضرورت کے باوجود کام نہ لینا یہ ایسا فعل ہے، جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ حدیث میں ہے: ان اللہ یحب ان یوتیٰ رخصة کما یحب ان یوتی عزئمه. یعنی اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کی رخصتوں پر بھی اسی طرح عمل کیا جائے، جس طرح وہ چاہتے ہیں کہ ان کی عزیمتوں پر عمل کیا جائے۔ (صفحہ ۱۳۶)

امر بالمعروف کے لئے طاقت وعدم طاقت کے استعمال کا مسئلہ

فرمایا، ہاتھ سے امر بالمعروف کرنے کا حکم عام نہیں، بلکہ یہ حکم اہل حکومت کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ جہاں طاقت نہ ہو، وہاں نرمی ہی مناسب ہے۔ امام ابو حنیفہ صاحب نے اس راز کو خوب سمجھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے مزامیر (یعنی گانے بجانے کے آلات) توڑ دے تو اس پر جرمانہ لازم آئے گا اور صاحبین فرماتے ہیں کہ جرمانہ تو نہ ہوگا، اس لئے کہ اس نے منکر کا ازالہ کیا ہے اور حدیث میں ہاتھ سے بھی منکر کے روک تھام کا حکم ہے۔ امام صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہاتھ سے منکر کے ازالہ کا

اختیار حکام کو ہے، عوام کو اس کا اختیار نہیں، امام صاحب کے قول کا راز یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں عوام کی دست اندازی سے فساد برپا ہوگا اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" سے شریعت کا مقصود اصلاح ہے، نہ کہ فساد برپا کرنا، لیکن حکومت کے درجے ہیں۔ باپ کو بیٹے پر اور شوہر کو بیوی پر۔ استاد کو شاگرد پر، کسی حد تک حکومت ہوتی ہے، لہذا ان کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہاتھ سے بھی امر بالمعروف کا حکم ہے، لیکن غیروں کے ساتھ ایسا نہ کرنا چاہئے۔ وہاں صرف زبان سے کام لیا جائے اور وہ بھی نرمی سے۔ نیز امر بالمعروف بزرگوں کو بھی کیا جاتا ہے، مگر وہاں نرمی کے ساتھ ادب کی بھی ضرورت ہے۔ (صفحہ ۱۳۷)

قلبی یکسوئی کی فکر کا ہونا

فرمایا، ایک باریک بات کہتا ہوں (اس کی طرف لوگوں کو توجہ کم ہے) وہ یہ کہ اگر قلب کی یکسوئی مطلوب ہے تو ہر وقت اس کی فکر میں رہنا کہ یکسوئی میسر ہو تو یہ بات خود یکسوئی کے منافی ہے، جب یہ فکر غالب رہی تو یکسوئی کہاں رہی۔ اس صورت سے تو قیامت تک جمعیت میسر نہیں ہوسکتی، یکسوئی جبھی ہوسکتی ہے کہ قلب اس کی فکر کے خیال سے ہی خالی ہو۔ (صفحہ ۱۴۱)

باطنی بدعت

فرمایا، جس طرح عقائد واعمال کی حدود کے درجہ سے زیادتی ظاہری بدعت ہے، اسی طرح احوال کی زیادتی بھی بدعت باطنی میں شامل ہے، مثلاً غیر اختیاری امور کے درپے ہونا اور افراط کے ساتھ اس کی تمنا کرنا۔ (صفحہ ۱۴۱)

حسن کا تصور آنا نقصان دہ نہیں

فرمایا، اگر بلا ارادے کسی حسین کا خیال آئے تو اس کا علاج یہ ہے کہ یہ خیال خود نہ آنے دیا جائے، اگر از خود آئے تو آنے دے، اس سے ذرہ برابر بھی ضرر نہیں، مگر ارادے سے اسے باقی نہ رکھا جائے، اس کشمکش میں ہی تو اجر بڑھتا ہے، اگر فرد دفع کرنا ہی چاہے تو کسی ایسے بنئے کا تصور کرے، جو اندھا، چوندھا اور بدشکل ہو، جس کی ناک پچکی ہوئی، ہونٹ بڑے بڑے، توند بڑی سی نکلی ہوئی اور ناک سے ریٹ اور منہ سے رال بہ رہی ہو۔

ان شاء اللہ اس تصور سے وہ خیال جاتا رہے گا، اگر نہ بھی گیا تو کمی تو ضرور ہوجائے گی، کیونکہ یہ عقلی مسئلہ ہے النفس لاتتوجه الی شیئین فی آنٍ واحدٍ لیجئے ہم نے کافر سے بھی دین کا کام لیا۔ اور بالکل اس خیال کا نکل جانا تو مطلوب بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر آدمی اس تصور سے بچنا چاہے اور ہمت اور قوت سے کام لے تو خدا تعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے اور رفتہ رفتہ خیال بالکل نکل جاتا ہے، اگر نہ بھی نکلے تو فرد اذیت برداشت کرے۔ (صفحہ ۱۴۲)

لذت کا مقصود نہ ہونا

فرمایا، انسان ہے تو بندہ، مگر وہ خدا بن کر رہنا چاہتا ہے کہ جو میرا جی چاہے وہ ہو۔ بس حقیقت یہ ہے کہ لذت مقصود ہی نہیں۔ مقصود نسبت ہے، چنانچہ خود حضور کریم ﷺ کو بخار میں شدت ہوئی تاکہ ثواب زیادہ ہو۔

زان   بلاہا   کانبیا   برداشتند
سربر   چرخ   ہفتیں   افراشتند

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل ثم الامثل. (صفحہ ۱۴۳)

نذر کے احکام

فرمایا، (۱) اگر نذر سے یا نذر کے بغیر ذبح کی نیت اللہ کے تقرب کے علاوہ ہو تو ذبیحہ حرام رہے گا، اگرچہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام ہی لیا گیا ہو۔

(۲) صاحب درمختار اپنے زمانہ کے اکثر عوام کی اموات والوں کے لئے نذر کو فساد عقیدہ پر مبنی سمجھتے ہیں اور اکثر لوگوں کو عقیدہ کے اس فساد میں مبتلا پاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں تو یہ فساد بڑھ گیا ہے۔

(۳) اگر نذر اللہ کے لئے ہو اور بزرگ کا ذکر صرف مصرف بیان کے لئے ہو تو وہ جائز ہے۔

(۴) نذر سے یہ خصوصیت مذکور لازم نہیں ہوجاتی، بلکہ دوسرے مقام کے فقراء پر صرف کردینا بھی جائز ہے۔

(۵) جو شے نذر شدہ فقراء پر صرف نہیں کی جاتی، اس کی نذر جائز ہے۔ جیسے چراغ جلانا یا قبر پر غلاف چڑھانا۔

(۶) ان احکام کی تحقیق کے بعد اس کا فیصلہ کرنا کہ آیا یہ نذر اللہ کے قرب کے لئے ہے، اللہ کے سوا غیر کے قرب کے لئے ہے، نہایت آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ مسئلہ نمبر ۴ کو اس کا معیار قرار دیا جائے یعنی نذر کرنے والوں کو یہ مشورہ دیا جائے کہ تم ان بزرگوں کے خادموں کے علاوہ دوسرے مساکین کو جن کو مزار یا صاحب مزار سے کوئی تعلق نہ ہو، دے کر ان بزرگ کو ثواب بخش دیا جائے۔ اور اس سے زیادہ صاف امتحان یہ ہے کہ کہا جائے کہ ان کو ثواب بھی نہ بخشو پھر یا تو اپنی اموات کو بخش دو یا کسی کو بھی نہ بخشو اور خود بھی اس کو مت رکھو، نہ تبرک سمجھو، کیونکہ اس میں برکت ہوجانے کی کوئی دلیل نہیں۔ اگر وہ اس پر خوشی سے راضی ہوجائیں تو جان لو کہ اس سے مقصود بزرگوں سے تقرب نہیں، بلکہ ان کا ذکر محض استعمال کے لئے تھا، اور اگر نذر کرنے والے اس پر راضی نہ ہوں، بلکہ خاص رسوم پر اصرار ہو کہ ذبح ہی ہو (گوشت خرید کر نہ پکایا جائے) اور ان بزرگ کے متعلقین ہی کو دیا جائے اور خود کھانے کو برکت سمجھا جائے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان خاص رسومات کے خلاف کرنے سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ ساری چیزیں عقیدہ کے فساد کی علامات ہیں۔ اس حالت میں فعل بالکل ناجائز ہوگا، جس میں پیشوا اور غیر مقتدا سب برابر ہیں۔ البتہ جواز کی کسی صورت میں ابہام ہو تو اس میں پیشوا کو احتیاط کا مشورہ دیا جائے گا۔ (صفحہ ۱۴۵)

عبدیت کی شان کا غالب ہونا

فرمایا، حضرت حاجی (امداداللہؒ) کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے ہر خادم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ میں آنے والوں کے قدموں کی زیارت کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں، حضرت پر عبدیت کی شان کا غلبہ تھا، غرض یہ تھی کہ اپنی اہلیت کا اعتقاد نہ رکھا جائے، البتہ تمنا کی ممانعت نہیں۔ (صفحہ ۱۵۵)

باطنی اصلاح کے بعد فنائیت کی مثال

فرمایا، ایک رئیس حضرت سید احمد صاحب کے لئے ہر سال کپڑوں کے تین سو ساٹھ جوڑے بنا کر بھیجا کرتے تھے، اس پر ایک روز مجمع میں سید صاحب نے فرمایا کہ لوگوں کو

خیال ہوگا کہ میں روزانہ جوڑا بدل کر خوش ہوتا ہوں۔ واللہ، میری تو حالت یہ ہے کہ مجھے اگر کمبل بندھوا کر اور سر پر گوبر کا ٹوکرا رکھ کر بازار میں نکالا جائے تو یہ ان دونوں حالتوں میں کوئی فرق محسوس نہ ہوگا۔ (صفحہ ۱۴۷)

غصہ کی حالت میں فیصلہ کی ممانعت

فرمایا، حدیث میں ہے لایقضین قاض بین اثنین وھو غضبان یعنی حاکم کو چاہئے کہ غصہ کی حالت میں کبھی فیصلہ نہ کرے بلکہ اس وقت مقدمہ کو ملتوی کردیا جائے۔ تاریخ بڑھادی جائے، یہاں حاکم سے مراد ہر وہ شخص ہے، جس کی دو آدمیوں پر حکومت ہو۔ اس میں معلم، استاد اور گھر کا مالک بھی داخل ہے۔ (صفحہ ۱۴۸)

ناواقف طبیب اور جاہل فیصلہ کرنے والے کا حشر

فرمایا، طبیب ناواقف اور جاہل فیصلہ کرنے والا دونوں جہنمی ہیں، گو ان کی نیت درست ہو، صرف نری خوش نیتی سے کام نہیں چلتا، یہاں تو علم کی ضرورت ہے۔ (صفحہ ۱۴۸)

طبعی شفقت کے ساتھ شرعی غصہ کا اجتماع

فرمایا، لاتاخذکم بھما رافتہ میں تعلیم ہے کہ طبعی شفقت کے ساتھ شرعی غیظ بھی ساتھ رہنا چاہئے، اور یہی کمال ہے کہ دل کڑھ رہا ہے اور پھر بھی حکم پر عمل ہورہا ہے۔ (صفحہ ۱۴۸)

مسلمانوں کا طبع سلیم کا حامل ہونا

فرمایا، کہ یہ "ادفع بالتی ھی احسن فاذاالذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم" سلامت طبع مخاطب کے ساتھ وابستہ ہے اور جن کی طبیعت میں سلامتی نہ ہو، ان کے لئے دوسرا حکم ہے۔ مگر مسلمانوں میں تو زیادہ تر افراد سلیم الطبع ہیں، اس لئے اپنے مخالفوں کو کج طبع نہ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی انہی اپنے کام کا مخالف سمجھنا چاہئے، بلکہ ان کی مخالفت کو غلط فہمی پر قیاس کرنا چاہئے، مثلاً یہ کہ وہ تمہاری نسبت بڑا بننے اور جاہ کا طالب ہونے کا خیال کرتے ہیں، اس لئے شرکت نہیں کرتے، ان کے فعل کو اس پر قیاس کرکے ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور نرمی سے اصلاح کی کوشش کی جائے۔ (صفحہ ۱۴۹)

گناہوں کا مزیدار معلوم ہونا

فرمایا، اس وقت ہماری حس کی مثال ایسی ہے، جیسے سانپ کے کاٹے ہوئے فرد کو نیم کی پتیاں میٹھی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح گناہ جو زہر قاتل ہیں، مزیدار معلوم ہوتے ہیں، سو اس کا علاج کرو او علاج کے لئے کسی تجربہ کار طبیب کو تلاش کرو اور جب تک طبیب نہ ملے، ایک بڑا علاج یہی ہے کہ سوچنا شروع کردو۔ (صفحہ ۱۵۱)

عقیدہ توحید کی پختگی کا طریقہ

فرمایا، قول ثابت سے مراد کلمہ طیبہ ہے، جس کی جڑ عقیدہ توحید ہے اور اس کی شاخیں اعمال صالحہ ہیں، عقیدہ توحید کو پختہ کرنے کا طریقہ کثرت ذکر ہے اور اعمال صالحہ کا طریقہ علم دین کا حاصل کرنا ہے، مسائل کی کتابیں دیکھنا اور وعظ کی کتابیں مطالعہ میں رکھنا۔ (صفحہ ۱۵۲)

کثرت ذکر کا طریقہ

فرمایا، کثرت ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ چلتے پھرتے لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے رہو، کام کے وقت زبان سے کسی قدر آواز سے کرتے رہو، تاکہ یاد رہے اور خالی وقت میں تسبیح ہاتھ میں رکھو، اس سے ذکر یاد رہتا ہے۔ (صفحہ ۱۵۲)

تواضع میں جذب وکشش کی خاصیت کا ہونا

فرمایا، اہل اللہ کے واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ ان حضرات نے اپنے کو جتنا مٹایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا ہی چمکایا، تواضع میں جذب وکشش کی خاصیت ہے، متواضع کی طرف دلوں کو از خود انجذاب ہوتا ہے، بشرطیکہ صحیح تواضع ہو اور تصنع اور بناوٹ نہ ہو، اہل اللہ کے اندر کشف وکرامت سے زیادہ جو چیز دلکش و دلربا ہوتی ہے، وہ ان کے تواضع کے واقعات ہیں۔ بیشک تواضع سے وہ بلندی حاصل ہوتی ہے، جو تصنع سے کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ من تواضع للہ رفعہ اللہ بالکل صادق ہے۔ (۱۵۲)

بشری تقاضوں کا آخر تک باقی رہنا

فرمایا، انسان جب تک، زندہ ہے، بشری تقاضوں سے بچ نہیں سکتا، انسان کتنا ہی

کامل ہوجائے، معصیت کا رجحان کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ یا معصیت کے تصور کی صورت میں آہی جاتا ہے۔ چنانچہ حکیم ترمذی ایک بزرگ ہیں، جوانی میں ان پر ایک عورت عاشق ہوگئی تھی، اور وہ ہر وقت ان کی تلاش میں رہتی تھی، آخر کار ایک دن باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چار دیواری سے بند تھا، وہاں پہنچ کر ان سے اپنے مطلب بر آری کی درخواست کی، یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے۔ اس قصہ کے بعد بڑھاپے میں ایک روز وسوسہ کے طور پر انہیں خیال ہوا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب پورا کر دیتا اور پھر بعد میں توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہوجاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی۔ اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے۔

اس پر انہیں شدید قلق ہوا کہ جوانی میں تو میں اس گناہ سے بچا اور آج بڑھاپے میں یہ حال ہے اور وہ یہ سمجھے کہ میں نے جو اعمال واشغال کئے ہیں، وہ سب غارت واکارت گئے۔ اسی دوران انہیں خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، آپ نے فرمایا، اے حکیم فکر مند کیوں ہو، تمہارا درجہ وہی ہے اور جو عبادت تم نے کی، وہ ضائع نہیں ہوئی اور اس وسوسہ کی وجہ یہ تھی کہ وہ زمانہ میرے زمانہ سے قریب تھا اور قرب عہد نبوی ﷺ میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوی پر عمل کرنے میں کیسی کچھ برکت ہوگی۔ (۱۵۴)

اب کم کھانے کے شرط ضروری نہیں

فرمایا، پہلے لوگوں کے قویٰ اچھے تھے، اس لئے ان کے لئے کثرت سے کھانا مرض ہوجاتا تھا۔ اب چونکہ قویٰ ضعیف ہیں، اس لئے کم کھانے کی غرض از خود حاصل ہے۔ اب زیادہ کھانے اور طعام کی حرص مرض نہیں۔ (صفحہ ۱۵۴)

اپنی تذلیل کی حالت کا غالب ہونا

فرمایا، شریعت نے ذلت سے بچنے کا حکم دیا ہے، اس لئے جب تک (باطنی) حالت غالب نہ ہو، یہی طریق ہے، مگر جب حال غالب ہوجاتا ہے تو (سالک) ذلت کو عزت سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ مگر وہ غیر اختیاری چیز ہے، یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو اس کی تمنا نہ کی جائے، اگر حاصل ہوجائے تو اس کا ازالہ نہ کیا جائے۔ (صفحہ ۱۵۴)

کسی کی اذیت سے چین کا نہ آنا

ایک صاحب نے لکھا کہ اگر کوئی شخص کسی قسم کی تکلیف ونقصان پہنچادے تو اس وقت تک چین نہیں آتا، جب تک کہ اس سے انتقام نہ لے لوں۔ اس کا کیا علاج ہے؟ فرمایا کہ چین کا نہ آنا معصیت نہیں، صرف تکلیف ہے، اس اذیت کو برداشت کرنا مجاہدہ ہے اور ثواب کا باعث۔ اس طرح یہ صورت نافع ہوئی، باقی اذیت کا علاج معلم دین کے ذمہ نہیں، لیکن تبرعاً لکھ دیتا ہوں کہ چند روز تک برداشت کرنے سے عادت پختہ ہوجائے گی، اس کے بعد پھر اس درجہ کی تکلیف نہ ہوگی۔ (صفحہ ۱۵۵)

جنت میں انتظار و بے چینی کا نہ ہونا

فرمایا، یہاں طلب زیادہ ہے اور استعداد کم، اس لئے عطا میں دیر ہوتی ہے، اس لئے بے چینی ہوتی ہے، وہاں آخرت میں استعداد سے زیادہ طلب ہی نہ ہوگی، بلکہ جتنی طلب ہوگی، وہاں اس کی استعداد بھی حاصل ہوگی، اس لئے وہ پہلی بار ہی عطا فرمادی جائے گی اور اس سے آگے جو عطا ہوگی، وہ بلا طلب ہوگی، اس لئے اس کا انتظار ہی نہ ہوگا، غرض جنت میں انتظار و بے چینی نہ ہوگی۔ (صفحہ ۱۵۵)

اختلافی مسائل میں لائحہ عمل

فرمایا، جس مسئلہ پر زیادہ زور دینے سے فتنہ کھڑا ہو، اس مسئلہ پر گفتگو نہ کی جائے، اس لئے دین کے اس خاص مسئلہ کی اہمیت ثابت کرنے سے فتنہ کا دبانا، زیادہ اہم اور ضروری ہے، ہاں قائدین اسلام کو شریعت کی ہر بات صاف صاف کہنا چاہئے، جیسے امام احمد بن حنبلؒ نے خلق قرآن کے مسئلہ پر واضح موقف اختیار کیا، اگر ایسا بڑا قائد نہ ہو تو ایسے بحث کی ضرورت نہیں، جہاں مخاطب سمجھدار اور منصف مزاج ہو، وہاں صحیح مسئلہ بیان کر دیا جائے، جہاں بحث مباحثہ کی صورت ہو، وہاں خاموش رہا جائے۔ (صفحہ ۱۵۵)

مصافحہ، صلح کے لئے کافی نہیں

فرمایا، بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں جھگڑا ہو فوراً دونوں کا ایک دوسرے سے مصافحہ کرادیا جائے۔ خواہ فریقین کے دل ایک دوسرے سے (ناراضگی سے) کتنے ہی بھرے ہوئے ہوں، میں کبھی ایسا نہیں کرتا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ

پہلے معاملہ کی اصلاح کرو، پھر مصافحہ کرو، ورنہ معاملہ کی اصلاح کے بغیر مصافحہ بیکار ہے، اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا تو مصافحہ کے بعد پھر جھگڑا شروع ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۱۵۶)

مسلمانوں کی ترقی کا راز

فرمایا، مسلمانوں کی ترقی کے لئے ہمیشہ یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کی ترقی کیونکر ہوئی اور یہ ہرگز نہ دیکھنا چاہئے کہ کفار کی ترقی کیونکر ہوئی۔ کیونکہ ہر قوم کا مزاج باطنی الگ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ترقی کے لئے جو طریقہ ایک قوم کے لئے مفید ہو، وہ سب کے لئے مفید ہو، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ترقی کی جو صورت ایک قوم کے کسی فرد کے لئے مفید ہو، وہ سارے افراد کے لئے مفید ہو، لطیف المزاج شخص کے لئے وہ چیزیں نافع نہیں ہوتیں، جو ایک گنوار کے لئے نافع ہیں۔ مسلمان، اسلام کی وجہ سے لطیف المزاج ہوگئے ہیں، اس لئے ان کا مزاج شاہانہ ہوگیا ہے، اس لئے ان کی ترقی کی وہ صورت مفید نہ ہوگی، جو کفار کے لئے مفید ہے۔ نیز مسلمان ایسے ہیں، جیسے سر کی ٹوپی کہ جہاں اس میں ذرا سی ناپاکی لگی، فوراً اتار پھینک دی جاتی ہے اور جوتے میں اگر ناپاکی لگ جائے، تو اس کو نہیں پھینکا جاتا، اسی طرح حق تعالیٰ مسلمانوں کو ناپاکی اور گندگی میں ملوث دیکھنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ ملوث ہوگئے تو فوراً سزا دی جائے گی، کفار چاہے کتنا ہی ملوث ہوجائیں، گوارا کیا جائے گا۔ پس اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ انہیں ترقی کیونکر ہوئی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرات صحابہ رضہ کی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات کو محض دین کی اتباع کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ وہ دین میں پختہ تھے۔ ان کے معاملات و معاشرت واخلاق اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق تھے۔ اس لئے دوسری قوموں کے لئے اسلام میں کشش موجود تھی، اور کسی قوم نے اگر ان سے مقابلہ کیا تو چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو راضی کرلیا تھا، اس لئے انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل تھی کہ بے سرو سامانی اور افرادی قوت کی کمی کے باوجود دو بڑی بڑی سلطنتوں کو ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ (۱۵۸)

دینداری، دنیاوی حقوق کی بہتر ادائگی کا ذریعہ ہے

فرمایا، دیندار سے زیادہ تعلقات کے حقوق کوئی بھی ادا نہیں کرسکتا، کیونکہ جس بندہ کا

اللہ سے تعلق مستحکم ہوجاتا ہے تو دنیا کے حقوق کی ادائگی پہلے سے زیادہ مستحکم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ پہلے تو ان حقوق کو نفس کی لذت کے لئے ادا کیا جاتا تھا اور حظ نفس اختیاری چیز ہے۔ فرد جب چاہے، اس اختیاری چیز سے دست بردار ہوسکتا ہے، اس طرح اب رضائے الٰہی کے لئے ان حقوق کو ادا کیا جاتا ہے۔ اور فرد، اللہ کی رضا سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اس لئے حقوق کی ادائگی یقینی ہے، جو لوگ دیندار بن کر متعلقین کے حقوق میں کمی کرتے ہیں، وہ دین سے ناواقف ہیں، حقیقت میں وہ دیندار نہیں، اگرچہ دنیا انہیں دیندار سمجھتی ہے۔ (صفحہ ۱۵۹)

ساری خرابیوں کی جڑ حرص ہی ہے

فرمایا، حرص ساری پریشانیوں کی جڑ ہے، یہ ایسا مرض ہے کہ اسے ام الامراض کہنا چاہئے، کیونکہ اسی وجہ سے جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں مال کی حرص نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے۔ بدکاری اور چوری کا منشا بھی لذت کی حرص ہے۔ اخلاق رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہے، اس لئے عارفین کا قول ہے کہ سارے خراب اخلاق کی جڑ کبر ہے، اور کبر عزت و مال مرتبے کی ہوس کا ہی نام ہے۔ بس کبر کا منشا بھی یہی حرص ہوا۔ (صفحہ ۱۶۲)

سلطنت سے مقصود مذہب کو پھیلانا ہے

فرمایا، افسوس کہ لوگوں کو خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں، بلکہ ملاپن ہی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود ملاپن کا ہی پھیلانا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلواۃ وآتوالزکواۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر. یعنی اگر ان کو ہم دنیا میں سلطنت دیتے تو یہ خوب نماز پڑھتے اور خوب زکواۃ دیتے اور خوب "امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" کرتے۔ (صفحہ ۱۶۲)

حرص کے تقاضا پر عمل، حرص کو بڑھانے کا باعث ہے

فرمایا، حرص کے تقاضا پر عمل کرنے سے دل بھر نہیں سکتا، کیونکہ انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں، جس میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں، تو وہ تیسرے جنگل کا بھی طالب ہوگا، پس یہ خیال ہی غلط ہے کہ ہوس کے

پورے کرنے سے ہوس بجھ جائے گی۔ بلکہ جتنا اس کو پورا کروگے، اتنا ہی بڑھے گی، انسان کی ہوس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

گفت چشم تنگ دنیا دارا
یا قناعت پر کند یا خاک گور

(صفحہ ۱۶۲)

نظر بد سے آنکھوں کی تسکین ممکن نہیں

فرمایا، اصول کی بات ہے کہ کسی قوت سے جتنا زیادہ کام لیا جاتا ہے، وہ قوت اتنی زیادہ زور پکڑتی ہے اور راسخ ہوجاتی ہے، پس نگاہ بد کرنے سے آنکھوں کو سکون حاصل نہ ہوگا، بلکہ نظر کی ہوس میں اضافہ ہوگا، ایک بار گھور لینے سے جو سکون محسوس ہوتا ہے، اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے، کیونکہ یہ عارضی سکون ہے، جیسے تماکو کھانے والے کو ایک بار تمباکو کھالینے سے کچھ دیر کے لئے سکون ہوجاتا ہے، لیکن اس سے اس کی طلب بڑھ جاتی ہے یا یوں سمجھو کہ جب درخت کی جڑ میں پانی دیا جاتا ہے تو تھوڑی دیر میں وہ پانی نظروں سے غائب ہوجاتا ہے، مگر اصل میں وہ غائب نہیں ہوتا، بلکہ وہ اب شاخوں اور پتوں میں رطوبت بڑھانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جڑ کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرنے ذریعہ ہوتا ہے، پس جو لوگ اس طرح کے تقاضوں پر عمل کرتے ہیں، وہ حقیقت تقاضے کو کم نہیں کرتے، بلکہ اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ (صفحہ ۱۶۳)

اصلاح کی کوئی انتہا نہیں

فرمایا، اصلاح کی کوئی انتہا نہیں، اس لئے جب یہ خیال پیدا ہوا کہ اب میری اصلاح ہوچکی ہے اور اس پر اطمینان بھی ہو تو یہ غلط ہے۔ (صفحہ ۱۶۴)

موجودہ دور میں کم کھانا ضروری نہیں

فرمایا، کم کھانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس وقت خوب بھوک ہو، اس وقت کھانا کھا کر بھوک کو فنا نہ کرنا چاہئے، بلکہ اس کو باقی رکھ کر ہاتھ روک لینا چاہئے لیکن تقلیل طعام بذات خود مقصود نہیں، مقصد بہیمی قوت کو کمزور کرنا ہے اور اس سے نفس کو گناہوں سے روکنا ہے، پس اگر نفس کی اصلاح کم کھائے بغیر ہوسکتی ہے تو تقلیل طعام کی ضرورت نہیں۔ بلکہ

اس زمانہ میں کم کھانے سے ضعف ہوجاتا ہے، جس سے جسمانی ونفسانی نقصانات ہوتے ہی، اس لئے بلاضرورت کم کھانا مناسب نہیں۔ (صفحہ ١٦٥)

فتویٰ کفر سے احتراز

فرمایا، ایک مرتبہ حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں اہل باطل کی تکفیر کا ذکر تھا، اس روز جوش میں شان رحیمی کا ظہور ہورہا تھا، یہاں تک فرمایا، کیا کافر لئے پھرتے ہو، قیامت میں دیکھو گے کہ ایسوں کی مغفرت ہوگی، جنہیں تم دنیا میں کافر قطعی کہتے اور واقع میں وہ کافر نہ ہوں گے، مگر نہایت ضعیف الایمان ہوں گے۔ پھر فرمایا، لیکن اگر ڈرانے دھمکانے کے لئے شرعی اہتمام کے لئے کسی وقت کافر کہہ دیا جائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔ (صفحہ ١٦٥)

تواضع کی نشانیاں

فرمایا، خشوع وتواضع کے آثار یہ ہیں، صاحب تواضع جب چلے، گردن جھکا کے چلے۔ بات چیت اور معاملات میں سختی نہ کرے، غصہ اور غضب کے وقت آپے سے باہر نہ ہو، بدلا لینے کی فکر میں نہ رہے وغیرہ وغیرہ۔ (صفحہ ١٦٨)

رسوخ سے مقصود، عمل میں استقامت ہے

فرمایا، رسوخ (یعنی تعلق باللہ میں مضبوطی) سے مقصود عمل ہے، عمل سے رسوخ مقصود نہیں، اگر رسوخ کے بغیر عمل ہوتا رہے تو مقصود حاصل ہے، اس لئے کسی دوسری محمود کیفیت کے راسخ نہ ہونے پر رنج نہ کرنا چاہئے، ہاں عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ (صفحہ ٥٩)

فساد کی تشریح

فرمایا، فساد کے معنیٰ ہیں حالت کا شرعی اعتدال سے نکل جانا اور یہ فساد اختلاف و دشمنی سے ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ کبھی اتفاق سے بھی فساد ہوتا ہے، پس ایسا اتفاق بھی مذموم ہے۔ (صفحہ ٦٣)

غیبت کے نقصانات

فرمایا، غیبت عداوت کا باپ بھی ہے اور بیٹا بھی یعنی کبھی عداوت سے غیبت پیدا ہوتی ہے اور کبھی غیبت سے عداوت جنم لیتی ہے، جس کا نسب ایسا بے ہودہ ہو، اس کی بے ہودگی کے لئے یہی بات کافی ہے پھر جب کوئی شخص کسی کے درپے ہوجاتا ہے تو مشاہدہ ہے کہ اس وقت دین کا خیال بالکل نہیں رہتا، نہ ایذا سے دریغ ہے، نہ جھوٹ اور فریب سے۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ دشمن کو نقصان پہنچ جائے، چاہے اس کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کیوں نہ ہوجائے۔ (صفحہ ٦٣)

دین اور شرافت دونوں کا خاتمہ

فرمایا، اگر فرد میں دین نہ بھی ہو، مگر شرافت موجود ہو تو اس صورت میں بھی فرد بہت سے بے ہودہ کاموں سے بچا رہتا ہے اور جب نہ دین ہو، نہ شرافت تو اب فرد سے بے حیائی کے کسی کام سے رکنے کی امید نہیں رکھی جاسکتی، آجکل اگرچہ نسب کی شرافت باقی ہے، مگر شرافت اخلاق باقی نہیں رہی، اس لئے آجکل فرد دشمنی کی صورت میں ایذا رسانی کی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ (صفحہ ٦٤)

نماز سے رنج وفکر کا دور ہونا

فرمایا، حدیث میں ہے اذا افزع بہ خرج الی الصلوۃ یعنی جب حضور ﷺ کو کوئی بڑی فکر پیش آتی تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہوجاتے، تاکہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کرکے دل بہلائیں اور تسلی وسکون حاصل کریں۔ واقعی تجربہ ومشاہدہ ہے کہ رنج وفکر کی حالت میں نماز میں مشغول ہوجانے سے رنج بہت کم ہوتا ہے۔ (صفحہ ٦٦)

بیعت میں فراخی اور تنگی کا مسئلہ

فرمایا، بعض مشائخ بیعت کرنے میں بڑی فراخی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی سند یہ حدیث ہے، استکثروا من الاخوان فان لکل من شفاعتہ یوم القیامتہ. بہت سے بھائی بناؤ، کیونکہ قیامت کے دن ہر مومن کے لئے ایک شفاعت ہوگی۔ شاید وہ شفاعت تمہارے حق میں ہوجائے اور بعض مشائخ بیعت میں تنگی فرماتے ہیں، دین کی غیرت اور طالبین کے امتحان کے نقطہ نگاہ سے۔ (صفحہ ٦٨)

معاشرت میں سہولت

فرمایا، حدیث میں ہے کہ سب سے بڑا اجر اس عیادت کا ہے، جو ہلکی ہو اور تعزیت ایک بار ہونا چاہئے۔ اس حدیث میں معاشرت کی سہولت کے اعتبار سے کس قدر رعایت ہے۔

افراد کے غلبہ کا سبب اور اس کی شرط

فرمایا، ایسا کوئی کام نہ کیا جائے، جس سے دین کی سبکی ہو، چنانچہ حدیث میں ہے، اعز امر اللہ یعزک اللہ.... یعنی اللہ کے دین کو غالب کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں غالب (ومعزز) بنائیں گے۔ (صفحہ ۶۸)

فرمایا، حدیث میں ہے کہ گناہ کم کر، یعنی نہ کر تجھ پر موت آسان ہو جائے گی اور قرض کم لے، تو آزادی سے زندگی بسر کرے گا یعنی کسی کے سامنے ذلیل ہونے کی صورت سے بچ جائے گا۔ (صفحہ ۶۹)

اسرار کے اظہار میں کاوش کا ہونا

فرمایا، اسرار کے اظہار میں کاوش نہ کی جائے اور بے ساختہ طور پر قلب میں جو بات آجائے، جو شرعی قواعد کے خلاف نہ ہو تو اسے بیان کیا جائے۔ (صفحہ ۷۰)

اکابرین کے علوم سے اپنے علوم کی مناسبت کا ہونا

فرمایا، اکابرین کے علوم سے اپنے علوم کی موافقت بڑی دولت ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ فرد کا مذاق اور فہم دونوں صحیح ہیں، جو شکر و مسرت کا موجب ہے۔ (صفحہ ۷۰)

محقق کی ایک علامت

فرمایا محقق ہونے کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی بات سے اطمینان اور قلب کو قرار ہو جائے۔ (صفحہ ۷۰)

آخرت کے مسافر کی نشانیاں

فرمایا، کن فی الدنیا کانک غریب (یعنی دنیا میں اس طرح رہ کہ گویا تو مسافر ہے) جس شخص پر یہ حال طاری ہوگا، اس کی علامات یہ ہیں کہ وہ غیر ضروری سامان میں

مصروف نہ ہوگا۔ نیز وہ کسی سے لڑے گا بھڑے گا نہیں۔ کیونکہ مسافر کو اگر کوئی برا بھلا کہہ دے تو اس کی وجہ سے وہ اپنی منزل کھوٹی نہیں کرتا۔ چنانچہ اسٹیشن اور سرائے میں کسی کو اگر کسی شخص سے تکلیف پہنچے تو وہ رپورٹ نہیں لکھواتا۔ یہاں غریب سے مراد وہی مسافر ہے، جو بے کس و بے مددگار ہو پردیس میں۔ (صفحہ ۸۲)

غلامی کا راز

فرمایا، غلامی کا راز یہ ہے کہ انسان نے عبداللہ بننے سے انکار کیا تھا، اس لئے سزا کے طور پر اسے عبد بنایا گیا، جو عقل کے بالکل موافق ہے، چنانچہ سلاطین میں بھی جب کوئی بادشاہ سے بغاوت کرتا ہے تو اسے قید کر کے ایک معمولی جیلر کی سپردگی میں دے دیا جاتا ہے۔ (صفحہ ۸۴)

فرمایا، سچے احوال عمل ہی کی برکت سے حاصل ہوتے ہیں، اس کے بغیر محض تکلف و تصنع ہے، چنانچہ رافضیوں کا رونا محض تکلف ہی سے ہوتا ہے، ورنہ جس کو واقعی رنج کی وجہ سے رونا آتا ہو، کیا وہ کہیں رونے کے بعد مٹھائی تقسیم کرتا ہے۔ (۸۴)

دل کے بھڑاس کا اندر رہنا

فرمایا، اہل عرس جو ہمیں خشک کہتے ہیں، حالانکہ وہ قوالی سن کر دل کا بھاپ نکال لیتے ہیں اور یہاں حالت یہ ہے کہ اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں۔ دل کی بھڑاس کبھی نہیں نکلتی۔ جتنی بھاپ پیدا ہوتی ہے، سب اندر ہی اندر رہتی ہے، پھر ہم خشک کیسے ہوگئے۔ (صفحہ ۸۴)

دوسروں کی بدخوئی کی شکایت کرنے والے

فرمایا، اگر کوئی شخص کسی کی خراب عادت کی شکایت کرے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شاکی صاحب خود بھی بدخو ہیں، اس لئے اگر وہ خوش خُو ہوتے تو یہ دوسروں کی بدخوئی کو برداشت کرتے، ان کی شکایت نہ کرتے پھرتے۔ (صفحہ ۸۵)

ارواح سے استفادہ کا طریقہ

فرمایا، فیض کی دو قسمیں ہیں ایک تعلیم دوسرا نسبت کی تقویت کا فیض پھر ایک تو فیض ہے، جب کہ دوسرا فیض کا ادراک اور شعور ہے۔ پھر ادراک ایک فوری نوعیت کا ہوتا ہے اور دوسرا آہستہ آہستہ، پس تعلیم کا فیض تو اہل کشف کے ساتھ خاص ہے، مگر یہ ایسا فیض ہے جو

تربیت کے لئے کافی نہیں۔ اور تقویت نسبت کا فیض اہل کشف کے ساتھ خاص نہیں، یہ اہل کشف کے علاوہ دوسروں کو بھی ہوتا ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اہل کشف کو اس کا فوری ادراک ہوتا ہے اور غیر اہل کشف کو بتدریج، لیکن بقا اس فیض کو بھی نہیں ہوتی، جب تک اعمال سے اس کی بقا کا اہتمام نہ کیا جائے۔ پھر اس تدریج میں بھی تفاوت ہے، بعض افراد کو فطرتاً اشغال کے چھوٹ جانے سے طبعی بے سکونی ہو جاتی ہے، جو جلدی ادراک کے لئے معاون ہوتا ہے، اور بعض پر انتشار غالب ہوتا ہے، جو جلدی ادراک کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے استفاضہ جدا جدا کا طریقہ سب کے لئے یہ ہے کہ قبر کے قریب بیٹھ کر اپنی اور میت کی روح کا تصور کیا جائے اور دونوں میں اتصال کیا جائے اور یہ تصور کیا جائے کہ اس اتصال سے فلاں کیفیت مثلاً محبت یا خشیت وغیرہ میت کی روح سے میری روح پر وارد ہو رہی ہے، اگر شروع میں دل نہ لگے تو تنگ نہ ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۸۸)

سالکین کا مراتب میں، مجذوبوں سے افضل ہونا

فرمایا مجذوبین میں اگرچہ عقل نہیں ہوتی، لیکن جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے، اس میں عقل کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ وہ اسے بخوبی انجام دیتے ہیں، کیونکہ ان کاموں کی انجام دہی کے لئے حواس کی سلامتی کافی ہے، یہ مجذوبین بچوں کی حالت کے مشابہ ہیں، جن میں حواس تو سلیم ہوتے ہیں، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے سالکین مراتب میں مجذوبین سے افضل ہیں۔ (صفحہ ۹۰)

نفس کو مغلوب کرنا، جہاد اکبر ہے

فرمایا، شیطان کو گمراہ کرنے کے لئے کوئی دوسرا شیطان نہیں آیا تھا، بلکہ یہی نفس تھا، جس نے اسے ابلیس بنادیا، ورنہ تو عزازیل تھا، پس نفس کو مغلوب کرنا کفار کے مغلوب کرنے سے زیادہ اہم ہے، اسی واسطے مجاہدہ نفس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔ (صفحہ ۹۴)

فساد کے اندیشہ کی وجہ سے امر بالمعروف سے سبکدوشی

فرمایا، اگر کسی پر سختی کرنے یا قطع تعلق کرنے میں فساد اور خرابی کا اندیشہ ہو اور اس کی طرف سے نقصان کا خوف ہو اور اپنے اندر تحمل کی طاقت بھی نہ ہو تو اس صورت میں امر بالمعروف نہ کرنے کی اجازت ہے، باقی جسے ہمت ہو، اسے اس معاملہ میں خاموشی کی

اجازت نہیں۔ (صفحہ ۹۵)

گناہگار کی گناہ کے اثرات

فرمایا، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں رسول اللہ ﷺ کو سہو ہو گیا، نماز کے بعد آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی کیا حالت ہے کہ اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے، جس سے امام کو نماز میں سہو ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گنہگار کے گناہ کا اثر بے گناہوں تک پہنچتا ہے۔ (صفحہ ۹۶)

روزگار کے لئے فرد کی محنت کی حیثیت

فرمایا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جب انسان روزی کے لئے محنت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی محنت میں اثر دیتے ہیں، ورنہ فرد کی محنت کو بالذات نتیجہ خیز ہونے میں کوئی دخل نہیں۔ (صفحہ ۹۶)

دل اور روح کی آنکھوں کا کھلنا

فرمایا، یاد رکھو کہ خدا کی نافرمانی کے ساتھ مشاہدہ جمال حق کبھی نہیں ہو سکتا، دل اور روح کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہے، جب نفس کی شہوات ولذات کو حرام جگہ سے روکا جائے۔ (صفحہ ۹۹)

شیخ کی زیادہ شفقت مرید کے لئے نقصاندہ ہے

فرمایا، شیخ کو بلاارادہ اذیت پہنچانا نقصان سے خالی نہیں ہوتی، شیخ کی، مرید کے ساتھ زیادہ شفقت بھی مضر ہے، اس لئے کہ شیخ کو مرید سے جتنی شفقت ہوگی، اس کی بدتمیزیوں سے اتنی ہی اذیت ہوگی۔ (صفحہ ۱۰۲)

واردات کی مخالفت کے اثرات

فرمایا، واردات کی مخالفت گناہ تو نہیں، مگر اس سے دنیاوی نقصان ضرور ہو جاتا ہے اور یہ ضرر (اضطراراً تو نہیں مگر اختیار) کبھی سبب ہو جاتا ہے، دینی نقصان کا اور وہ دینی نقصان اس طرح ہوتا ہے کہ کسی گناہ کا وسوسہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے (کہ ہمت سے اس کی مخالفت ہو سکتی تھے، مگر) طبعی کمزوری غالب ہوگئی، اس لئے اعمال میں کمی ہوگئی، اب

اس میں دو صورتیں ہیں کہ وہ عمل اگر واجب تھا تو سخت نقصان اور اگر واجب نہ تھا تو محرومی ہوئی، یہ بڑا نازک راستہ ہے، بہت زیادہ سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے۔ (صفحہ ۱۰۳)

کامیابی کی گاڑی کے دو پہیے

فرمایا، گناہ سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اول فرد خود ہمت کرے اور اس کے ساتھ خدا تعالیٰ سے ہمت طلب کرے اور خاصان خدا سے بھی دعا کرائے۔ ان شاء اللہ گناہوں سے بچنے کی ضرور توفیق ہوگی۔ کامیابی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، ایک اپنی ہمت دوسرے بزرگوں کی دعا، ان دونوں پہیوں سے گاڑی کو چلاؤ، ایک پہیا کافی نہیں۔ (صفحہ ۱۰۴)

وحدۃ الوجود کا مراقبہ

فرمایا، وحدۃ الوجود کا شغل اس شخص کے لئے نافع ہے، جس میں دو شرطیں جمع ہوں، ایک تو اللہ تعالیٰ کی فاعلیت اور کمال کا مشاہدہ، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسباب سے نظر اٹھ جاتی ہے دوسری محبت۔ اگر مشاہدہ حاصل ہے اور محبت نہیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں فرد کفر میں مبتلا نہ ہوجائے۔ مثلاً کسی شخص کا باپ مرگیا، اب چونکہ اسے اس بات کا مشاہدہ حاصل ہے، اس لئے وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے گا، مگر چونکہ اسے ابھی اللہ سے پوری طرح محبت حاصل نہیں، اس لئے خطرہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف ناگواری پیدا ہوجائے گی، جو کفر ہے۔ (صفحہ ۱۱۱)

گناہوں سے توبہ کے سلسلے میں اہم نکات

فرمایا، اگر بندوں کو رحمت حق کا مشاہدہ ہونے لگے تو گناہوں کو بڑا سمجھنے پر شرمندگی ہوگی۔ ناامیدی تو بھلا کیا ہوتی۔ مگر اس شرمندگی تقاضا پر عمل نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ گناہ اگرچہ رحمت حق کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں، مگر تمہارے لئے تو بڑے ہی ہیں، تولہ بھر سنکھیا اگرچہ من بھر تریاق کے سامنے چھوٹا ہے، مگر معدہ کے مقابلہ میں تو بڑا ہے۔ (صفحہ ۱۱۴)

فرمایا، مومن اپنے گناہوں سے ڈرتا ہے، اگرچہ ادنیٰ ہی گناہ ہو، اس کے برخلاف فاجر گناہ کو مثل مکھی کے سمجھتا ہے کہ آئی اور اڑادیا۔ تو معلوم ہوا کہ گناہ کو سخت سمجھ کر توبہ کرنا، ایمان کی علامت ہے اور اس کو ہلکا سمجھنا بے ایمانی کی علامت ہے۔ اوپر جو آیا ہے کہ گناہ کو بڑا سمجھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا نہ سمجھنا کہ توبہ کی راہ میں رکاوٹ ہوجائے

اور یہاں بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا نہ سمجھے کہ توبہ کی ضرورت نہ سمجھے، غرض اصل چیز توبہ ہے، جو چیز توبہ کے اعتقاد میں رکاوٹ ہو، وہ مذموم ہے، خواہ بڑے ہونے کا اعتقاد ہو یا چھوٹا ہونے کا۔ (صفحہ ۱۱۴)

مرید کے لئے شیخ کے سامنے گفتگو کے آداب

فرمایا، میں تربیت کے لئے آنے والوں کے لئے پابندی لگادیتا ہوں کہ وہ بولا نہ کریں۔ اس لئے کہ ذوق کے بغیر بولنے سے مناظرہ کی صورت پیدا ہوتی ہے، جو اس طریق میں سخت نقصان دہ ہے۔ (صفحہ ۱۱۷)

رسوخ کی عطاء، اللہ کے قانون اور طریق سے وابستہ ہے

فرمایا، عطا کی شرط عادی یہ ہے کہ (سالک رسوخ کے لئے) جلدی نہ مچائے۔ مانگے جائے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق تو ساری عمر کا ہے۔ چاہے حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو، تم اپنا انکسار و نیاز مت چھوڑو۔ تاخیر میں بھی مصلحتیں ہوتی ہیں، رہا یہ سوال کہ پھر وہ مصلحتیں کیا ہیں تو آپ کوئی پارلیمینٹ کے ممبر نہیں کہ آپ کو وہ مصلحتیں بتائی جائیں۔ کچھ دنوں تک دعا مانگ کر بیٹھ جانے میں اس بات کا زیادہ اندیشہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جانب سے کوتاہی کا خیال ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حالت بہت تشویشناک ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ پر الزام ہے، جو عبودیت کے قطعاً خلاف ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ برابر دعا مانگتے رہو، کیونکہ بندہ کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عجز و انکسار کا اظہار کرتا رہے۔ (صفحہ ۱۲۶)

علم مطلوب کی تعریف

فرمایا، علم نام ہے پختہ یقین کا اور تجربہ ہے کہ جس درجہ کا پختہ یقین شروع میں مقصود ہے، وہ عمل کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، پس علم مطلوب وہی ہے، جو عمل کا ذریعہ بن جائے۔ (صفحہ ۱۱۷)

نماز راحت کا ذریعہ ہے

فرمایا، فلاح کی حقیقت راحت ہے اور نماز سے قلب کو وہ راحت ملتی ہے، جو ہزار کھانوں سے بھی نہیں مل سکتی، مگر اس راحت کا احساس ایک خاص میعاد کے بعد ہوتا ہے، جو ہر شخص کے لئے اس کے مناسب ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۳۲)

حسن سے سیر ہونے کی دو صورتیں

فرمایا، حسن سے سیر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ حسن منتہی ہو دوسرے یہ کہ طلب نہ ہو، حسن کی پہلی صورت تو حق تعالیٰ کے ساتھ ہو نہیں سکتی' اس لئے کہ ان کے حسن کی انتہا نہیں، ہاں البتہ یہ صورت ہے کہ ہماری طرف سے طلب نہ ہو۔ (صفحہ ۱۳۸)

مباح چیزوں کا استعمال

فرمایا، جن چیزوں کی اجازت ورخصت ہے، ان میں تنگی نہ کرنا چاہیے اور اس میں راز یہ ہے کہ مباح چیزوں کے استعمال میں انکسار کی شان ہے، جو مطلوب ہے۔ ان کے عدم استعمال اور چھوڑنے میں استغنی کا شائبہ پایا جاتا ہے جو پسندیدہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ مباحات کے ترک سے دل میں قساوت بھی پیدا ہو جاتی ہے، بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص چالیس دن مسلسل گوشت کھائے تو اس کے دل میں بھی قساوت پیدا ہو جاتی ہے اور جو نہ کھائے، اس کے دل میں بھی، اس لئے کہ جو ترک کرتا ہے، اس کے دل میں عجب و ناز پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بھی خشوع کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۱۴۰)

کمال کے حصول کا گر

فرمایا، ایمان کامل کے لئے لازمی ہے کہ طبیعت کی سلامتی مسلمانوں کی سی ہو۔ رغبت اسی چیز سے ہو، جو حدیث وقرآن سے ثابت ہے، کمال کے لئے حقیقی نفع قرآن وحدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ مستحبات پر ویسا ہی عمل ہو، جیسے واجبات پر ہے۔ اس لئے کہ ہر کام میں کمال کے لئے انہماک ضروری ہے۔ مستحب اور واجب کی تنقیح سے نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۴۰)

اصل مقصود ہیبت وخشیت ہے

فرمایا، اصل مقصود تو ہیبت اور خشیت کا القا کرنا ہے اور مزہ اس واسطے دیتے ہیں کہ ہیبت اور خشیت کی قوت پیدا ہو سکے، اسی کو فرماتے ہیں۔

گر تو ہستی طالب حق مرد راہ
درد خواہ و درد خواہ و درد خواہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

(صفحہ ۱۴۲)

عمامہ کے بارے میں موقف

کسی نے اپنا حال لکھا کہ عمامہ باندھا خاص طور پر جمعہ عیدین کی نماز میں حیا وخجلت کی وجہ سے ترک کیا جائے یا نہیں۔ ترک سنت کی وجہ سے حیاء کو ترجیح دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جواب میں فرمایا نہ یہ سنت مقصود نہیں۔ پھر دوسری طرف تواضع بھی مسنون ہے، جس کے بعض افراد واجب بھی ہیں تو مقصودات کی شان تواضع میں زیادہ ہے، بہ نسبت عمامہ کے۔ (صفحہ ۱۴۴)

اللہ سے قربت کے مسائل میں ایثار

فرمایا، زاہد خشک کا فتویٰ ہے کہ اللہ سے قربت کے مسائل میں ایثار جائز نہیں، مگر محققین نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ بھی قربت کی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ ادب کی رعایت کی جائے۔ مزید فرمایا کہ اہل مکہ میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ وہ حج کے زمانہ میں مسافروں کی رعایت سے خود طواف کرنا چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی واجب شرعی نہیں ہے، مگر جائز ہے۔ اس سے مسافروں کو بہت سہولت ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۴۶)

اطاعت کے نتیجہ میں سارے کام درست ہو جاتے ہیں

فرمایا، قلب کا دنیا پر مطمئن ہو جانا اور آخرت کے لئے قلب کا بے چین نہ ہونا ساری بیماریوں کی جڑ یہی ہے، اس اطمینان کو دل سے نکالو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو لازم کرلو، اگرچہ تکلف کے ساتھ ہو اسی کی اطاعت میں خاص اثر ہے، اس سے فکر پیدا ہوگی اور فکر کے پیدا ہونے سے سارے کام درست ہو جائیں گے۔ ایک اور بات جو اپنے اوپر لازم کرو، وہ یہ ہے کہ جو دل میں آئے، فوراً مت کیا کرو، بلکہ علماء سے تحقیق کرکے کیا کرو، اگر وہ ناجائز بتائیں تو اس کام کو ہرگز نہ کرو، اپنے آپ کو علماء کا محتاج سمجھو۔ (صفحہ ۱۵۱)

آخرت سے بے بی خوفی کی وجہ

فرمایا، دور کے خطرہ کا عادتاً تاثر کم ہوا ہے، اس لئے قیامت وآخرت کا خوف نہیں۔ (صفحہ ۱۵۱)

اپنے بھائی کی عزت نفس کے لئے اپنی عزت سے دستبردار ہونا

فرمایا، شرعی حکم یہ ہے کہ اگر تقویٰ کے کسی خاص درجہ پر عمل کرنے سے دوسرے بھائی کی دل شکنی ہو تو فتویٰ پر عمل کرنا چاہیے۔ ایسے موقع پر تقویٰ کی حفاظت جائز نہیں۔ چنانچہ کسی چیز کے نہ لینے میں اگر اپنی عزت ہو اور اپنے بھائی کی ذلت ہو، اور لینے میں اپنی تو ذلت ہو، لیکن بھائی کی عزت ہو تو اس کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح دینا چاہیے۔ یعنی اپنی آبرو وعزت کو لات مار دینا چاہئے اور اپنے بھائی کی بات کو اونچا رکھنا چاہئے، یہ ایثار نفس ہے۔ (صفحہ ۱۷۰)

مدارات اور مداہنت میں فرق

فرمایا، مدارت کا حاصل اہل شر کے ساتھ نرمی کرنا ہے، تاکہ ان کے شر سے حفاظت کی صورت ہو رہے اور یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں۔ پہلا امر تو خود دین میں مقصود ہے اور دوسرا مقصود میں معاون ہے۔ کیونکہ کسی شریر شخص کی ایذاء میں مبتلا ہوجانے سے کبھی اطاعت میں اور اکثر تبلیغ میں خلل پڑ جاتا ہے، اور مداہنت بددینوں کے ساتھ نرمی کرنا ہے، تاکہ ان سے مال و جاہ کا نفع حاصل کرے۔ اور مدارت حضرات صوفیہ کے خاص اخلاق میں سے ہے۔ (صفحہ ۱۸۵)

وہ لوگ جن کی مدد اللہ کے ذمہ ہے

فرمایا، حدیث میں ہے تین شخص ہیں، جن کی مدد کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔
(۱) مجاہد فی سبیل اللہ (۲) قرضہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ (۳) اور وہ نکاح کرنے والا، جو عفت کی زندگی چاہتا ہو۔ (صفحہ ۱۸۸)

نفس کی طرف سے کسی وقت بھی مطمئن نہ ہونا

فرمایا، کہ الحزم سوء الظن اس کی تفسیر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ

دانائی واحتیاط یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس سے خراب ظن ہی رکھے۔ اس کی طرف سے کسی وقت مطمئن نہ ہو، ہمیشہ کھٹکتا رہے۔ اگرچہ حکماء نے اس جملے کے دوسرے معنی بھی لئے ہیں، وہ کہ انسان کو کسی شخص پر اعتماد کرنا نہ چاہئے اور ہر شخص سے بدگمان رہنا چاہئے، چاہے دوسرا شخص مخلص دوست ہو۔ مگر اس سے بھی محتاط رہے، معالہ کے اعتبار سے یہ بھی صحیح ہے، مگر عارفین کا کہنا ہے کہ فرد دوسروں سے تو حسن ظن رکھے، البتہ اپنے نفس سے سوئے ظن رکھے۔ (صفحہ ۲۰۲)

احتیاط اور ادب کے اثرات

فرمایا، حدیث میں ہے عفوا عن نساء المسلمین تحف نسائکم وبروا آبائکم تبر کم ابنائکم. یعنی تم مسلمانوں کی عورتوں سے بچتے رہو تو تمہاری عورتیں باعصمت رہیں گی۔ تم اپنے باپ کا ادب ملحوظ رکھو تو تمہاری اولاد تمہارا ادب کرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دوسروں کی عورتوں پر نظر رکھتا ہے او ان کی عصمت برباد کرتا ہے تو اس کی عورتوں کی بھی عصمت برباد ہوجاتی ہے۔ (صفحہ ۲۰۸)

بندہ کے ساتھ تقدیر کے تعلق کی نوعیت

فرمایا، اگرچہ بندوں کے افعال کے ساتھ اللہ کی تقدیر ومشیت کا تعلق ہے اور اس تعلق کا اثر یہ ہے کہ اس مقدر کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا، لیکن تقدیر کے ساتھ اس تعلق کے باوجود فرد کے اختیار وقدرت کی نفی نہیں ہوسکتی، کیونکہ تقدیر کا بندہ کے ساتھ وہ تعلق اس طرح ہے کہ فلاں شخص فلاں کام فلاں وقت پر اپنے اختیار وقدرت سے کرے گا، تقدیر جس طرح اس فعل کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، اسی طرح وہ اس فاعل کی قدرت واختیار کے ساتھ بھی وابستہ ہوتی ہے، سو اگر تقدیر کے ساتھ سے یہ فعل لازم ہوگیا تو اسی تعلق سے اختیار کا وجود بھی لازم ہوگیا تو مسئلہ تقدیر سے بجائے قدرت اور بندہ کی قدرت کی نفی کے، اس کا وجود مزید تاکیدی ہوگیا۔ اختیاری معاملات میں عبادت (یعنی پابندیٔ احکام شریعت) اور غیر اختیاری میں عبودیت یعنی سپردگی یہی زندگی کے دستور العمل کا خلاصہ ہے۔ (صفحہ ۲۱۵)

شرعی احکام کی حکمتیں معلوم کرنے کی خواہش کا ہونا

فرمایا، شرعی احکام میں مصلحت یا حکمت دریافت کرنے میں عوام کے لئے ایک نقصان بھی ہے، وہ یہ کہ سبب یا حکمت معلوم ہوجانے کے بعد قلب پر اطاعت کی عظمت کا وہ اثر نہیں ہوتا، جو اس کے بغیر عمل کرنے سے ہوتا ہے، پس احکام کی حکمت معلوم کرکے اس عظمت کا تقدس پامال نہیں کرنا چاہئے۔ علم اسرار کا ایسا ہی شوق ہے تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ پہلے حکمت معلوم کئے بغیر عمل شروع کردو، کام کرتے کرتے برکات واسرار خود محسوس ہونے لگتے ہیں، وہی شخص سچا عاشق ہے، جو اسباب اور حکمتوں کے درپے نہ ہو، باقی مجتہدین اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ عمل شروع کرنے کی حکمت تلاش نہیں کرتے، نہ سبب پر عمل کو منحصر رکھتے ہیں، بلکہ مسائل واحکام کی تحقیق کے لئے وہ عمل دریافت کرتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱۷)

مٹ جانے والے افراد انتقام نہیں لیتے

فرمایا، اہل اللہ میں خودداری کہاں۔ گالیاں بھی پڑنے لگیں تو انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی، اگرچہ طبعی طور پر اس کا رنج ہو، ان کی یہ حالت نہیں ہوتی کہ کسی کو برا بھلا کہنے پر وہ اس کے پیچھے پڑجائیں اور مشورہ کرتے رہیں کہ کیا کرنا چاہے۔ پھر فرمایا کہ ایک طالب علم نے مولوی صاحب کا مقابلہ کیا، مگر مولوی صاحب اس کے درپے نہ ہوئے، حالانکہ ان کو اس پر پورا قابو تھا، کیونکہ وہ مولوی صاحب جن صاحب کے یہاں ہیں، وہ مجسٹریٹ ہیں۔ مجسٹریٹ صاحب نے انہیں کہا بھی کہ میں اس کو چھ ماہ جیل کی سزا دوں گا۔ مگر مولوی صاحب نے کہا کہ میں اپنے نفس کے لئے ایسا نہ کروں گا۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک نمونہ اس وقت بتایا، مگر جو شخص فنا کے مقام پر نہیں پہنچا تو وہ بزرگ نہیں، بلکہ فنا یہ ہے کہ بزرگ ہوکر بھی مٹ جائے، جس کی علامت یہ ہے کہ بزرگ ہوکر بھی اپنے آپ کو بزرگ نہ سمجھے۔ اور صاحب فنا کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کی گستاخی پر اس کے دل میں اثر نہ ہو، ہاں، اس کے خلاف انتقامی کارروائی سرزد نہ ہوگی، ویسے تو طبعی امور فرد کو ستاتے رہتے ہیں، یہ ساری چیزیں خدائے تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔ استحقاق کسی کو بھی نہیں۔ مگر ہاں دھن میں لگا رہنا چاہیے۔ (صفحہ ۲۲۱)

دینی تعلیم کے لئے اجرت لینے کا مسئلہ

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ دینی تعلیم پر اجرت لینے سے اجر ملتا ہے یا نہیں۔ اور جس طرح دینی تعلیم پر اجرت کو جائز کہا جاتا ہے، اسی طرح قرآن سنانے پر اجرت لینے کے جواز میں آخر کیا قباحت ہے، فرمایا کہ تعلیم پر اجرت لینے سے اجر نہیں ملتا۔ مگر تعلیم پر جو ملتا ہے، اسے اجرت کیوں قرار دیا جائے، بلکہ وہ تو دین کی خدمت پر اس کی ضروریات کا انتظام ہے، جو مسلمانوں پر واجب ہے یعنی چونکہ یہ شخص مسلمانوں کی دینی خدمت سرانجام دے رہا ہے، ان کے ذمہ ہے کہ وہ اس کی ضروریات کا انتظام کریں، جو ان کے ذمہ واجب ہے۔ جب یہ معاملہ کی نوعیت یہ ہے تو اجرت تو نہ ہوئی۔ البتہ متعین مقدار میں رقم سے شبہ ہوتا ہے، اس لئے کہ ضروریات کے مطابق اخراجات میں رقم متعین نہیں ہوتی، بلکہ جس قدر اس کے اخراجات کے لئے کافی ہو، وہ دینا چاہئے تو بات یہ ہے کہ رقم کا یہ تعین رقم کو سلجھانے کے لئے ہے، صورت میں لینے میں معلم کو تعلیم پر اجر بھی ملے گا، جب کہ اس کی نیت اللہ کے لئے فیض پہنچانا ہو اور فقط ضرورتاً لینا مقصود ہو۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اگر معلم کا گذارہ اس طریقہ سے ہوتا ہے، کسی اور جگہ سے زیادہ رقم کی ملازمت مل جائے تو وہ وہاں چلا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ معلم صاحب، زر کا طالب ہے۔ اور اگر وہاں نہ جائے تو معلوم ہوگا کہ دین کا خادم ہے، ہاں اگر تنگی سے گذر ہوتا ہو اور چلا جائے تو پھر مذموم نہیں۔ باقی مُردوں پر جو قرآن پڑھا جاتا ہے، اس قرآن کا قیاس تعلیم پر کرنا صحیح نہیں، کیونکہ وہ تعلیم دین کی ضرورت ہے، اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو دین کو نقصان ہوگا کہ ایک مدت کے بعد قرآن ضائع ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے اس سلسلہ میں ضرورت کی خاطر صورۃ امام صاحب (ابوحنیفہ) کے مسلک کو ترک کیا گیا ہے بخلاف ایصال ثواب کے کہ اس کی کمی سے دین کے لئے کوئی نقصان نہیں۔ (صفحہ ۲۴۵)

بیعت کا صحیح طریقہ کار

فرمایا، بیعت کوئی معمولی چیز نہیں، بہتر طریقہ یہ ہے کہ فرد جس سے بیعت ہونا چاہے۔ کافی وقت تک اسے جانچے، جس کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ کافی وقت تک اس کی صحبت میں رہا جائے، یہ زیادہ بہتر ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خط وکتابت کے ذریعہ طریق پوچھ کر اس پر عمل کیا جائے، پھر اپنے احوال کی اسے اطلاع دی جاتی رہے، وہ جو

چیز تجویز کرے، کیا جائے، اسی طرح مدت دراز تک کرتے رہنا چاہئے، اس کے بعد اگر دل چاہے تو بیعت کی درخواست کی جائے، پھر وہ اس کا جو کچھ جواب دے، اس پر راضی رہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

درود شریف کی خاصیت، زیارت

فرمایا، درود شریف جس قدر پڑھا جائے موجب برکت ہے، باقی کسی درود میں یہ خاصیت نہیں ہے کہ اس سے حضور اقدس ﷺ کی زیارت ضرور حاصل ہو، زیارت کے لازم ہونے کا اعتقاد نہ رکھا جائے، ہاں، زیارت کی تمنا رکھئے کہ اگر کوئی شخص عمر بھر بھی خواب میں حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف نہ ہو، مگر وہ متبع سنت ہو تو وہ شخص رسول اللہ ﷺ کا محبوب ہے اور جو شخص روزانہ ساری رات زیارت سے مشرف رہتا ہو، مگر اتباع سنت سے محروم ہے تو ایسا شخص حضور ﷺ کے نزدیک مبغوض ہے۔ (صفحہ ۲۶۳)

راہ خدا کا سب سے بڑا رہزن بڑا پن ہے

فرمایا، کبر (بڑا پن) خدا کے راستہ کا بڑا رہزن ہے، اول اس بڑی بیماری کا علاج کرنا چاہئے۔ نسبت دوسری چیز ہے، وہ اللہ کا نام لینے سے حاصل ہوتی ہے، لیکن جب تک اللہ سے پوری طرح تعلق قائم نہ ہو، کیا فائدہ، ذرا اللہ کا دھیان رہنے لگا، بس سمجھنے لگے، ہم اللہ والے ہوگئے۔ نسبت کا اصلی معیار سنت کی متابعت ہے کہ اقوال وافعال، اخلاق وغیرہ سب سنت کے مطابق ہونے لگیں، اگر یہ حالت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ (صفحہ ۲۷۳)

فنائیت کے بعد عشاق کی حالت

فرمایا، عشاق اور حق میں فنا والوں کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ آخر میں وداعی میں حرکت بھی نہیں رہتی اور وسوسے بھی نہیں رہتے۔ (صفحہ ۲۸۷)

ایک تدبیر سے تکبر کے مادہ کا جاتے رہنا

فرمایا، ایک صاحب کیرانہ میں میرے پاس بیعت کے لئے آئے تو اس وقت مٹھائی ایک دوسرے شخص کو دے کر لائے تو میں نے سمجھ لیا کہ ہاں، آپ میں کبر کا مادہ موجود

ہے۔ اتفاق سے مجھے کئی جگہ جانا تھا، میں نے ان سے کہا کہ یہاں مجھے فرصت نہیں ملی، مجھے فلاں صاحب کے ہاں جانا ہے، وہاں شاید بیعت کرسکوں، وہاں چلئے، چنانچہ مٹھائی کا طباق ہاتھ میں لئے ہوئے حضرت میرے ساتھ ہولئے، وہاں پہنچ کر بھی میں نے یہی کہا کہ کیا کہوں یہاں بھی مجھے فرصت نہ ملی، وہاں چلئے، غرض اس طرح دو گھنٹے تک ان کو گھر گھر مٹھائی کے ساتھ لئے پھرا اور قصداً بازار میں گذر کر جاتا تھا، وہ صاحب ہاتھ میں مٹھائی کا طباق لئے ساتھ پھرتے رہے، جب میں نے خوب پریشان کرلیا اور سمجھ لیا کہ ہاں، اب ان کے قلب سے یہ خبیث مادہ نکل گیا، تب انہیں بیعت کیا اور اپنی اس حرکت کی وجہ بھی ظاہر کردی، چنانچہ تکبر کا اتنا بڑا مرض جو برسوں کے مجاہدوں اور ریاضوں سے بھی نہ جاتا، بفضلہ اس تدبیر سے دو گھنٹہ میں جاتا رہا۔ (صفحہ ۳۰۹)

تشویشناک حد تک وسوسوں کے مریض کا علاج

ایک صاحب (تعلیمات اسلام کے بارے میں) شدید وسوسوں کا شکار تھے، اس کی تشخیص کے بعد فرمایا کہ یہ وسوسے ہیں پھر فرمایا تمہیں یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ جو لوگ علم، فہم اور تقویٰ میں مجھ سے زیادہ ہیں، انہوں نے جب اچھی طرح تحقیقات کرلی ہیں تو اس صورت میں ہمیں تحقیقات کی کیا حاجت ہے، بس ایسے لوگوں کی تقلید کرنی کافی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے ہماری تحقیق ان کی تحقیق کے برابر نہیں ہوسکتی۔ پھر کچھ دیر تامل فرما کر دریافت فرمایا کہ آخر آپ کو یہ مرض کب سے ہوا ہے۔ عرض کیا، بچپن ہی سے یہ مرض ہے۔ جبکہ میں ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ فرمایا، آپ نے کسی سے اس کا اظہار کیا، عرض کیا نہیں، فرمایا، آپ نے غضب کیا اور سخت غلطی کی جو اس مرض کو چھپایا، میرے نزدیک طب کا پڑھنا آپ کے بالکل حرام تھا اور اب بھی میں آپ کے لئے طب کے مشغلہ کو ناجائز سمجھتا ہوں، کیونکہ اس میں اہل باطل کی صحبت کا زیادہ موقع ہے اور وہ آپ کے لئے سخت مضر ہے۔

اب آپ کو چاہئے کہ اس مشغلہ کو بالکل ترک کرکے کسی کی جوتیوں کی نیچے خاک ہوجائیں یعنی پیش مرد کا ملے پامال شو۔ اور اہل اللہ کی جماعت میں رہ کر مزدوری کرکے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پال، کر گذارہ کیجئے، ورنہ ان سے علیحدہ رہ کر طب میں مشغول رہنا یہ ایسا ہے، جیسے سمندر میں کودنا ہے، ان کی صحبت سے ان کے نورانی قلب کا پرتو آپ کے قلب پر پڑے گا، جس سے آپ کی قلب میں نورانیت پیدا ہوگی، جس کے غلبے سے یہ

وسوسے غائب ہوجائیں گے اور قلب کو سکون محض حاصل ہوجائے گا، اگر طب کو نہ چھوڑ سکو تو اس کا علاج صحبت بد سے احتراز ہے کیونکہ جس طرح یہ صحیح ہے کہ نیک صحبت سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ اہل ظلمت کی صحبت سے قلب پر ان کی ظلمت کا عکس پڑتا ہے، پس زانی، فساق اور فجار کے علاج سے قطعاً دست برداری اختیار کیجئے اور ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھئے، اکثر اوقات خلوت میں رہئے اور روزانہ کچھ وقت خواہ تھوڑا ہی ہو مثلاً آدھ گھنٹہ روزانہ ذکر اللہ کیجئے اور بزرگوں کے ملفوظات وکلمات کے مطالعہ کا شغل رکھئے۔ (صفحہ ۳۱۳)

مجذوبوں کے بارے میں کچھ اہم باتیں

فرمایا، مجنوں کی طرح مجذوب بھی عقل نہ ہونے کی وجہ سے احکام شرع کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اس زمانہ کے صلحاء ومشائخ اس طرح کے فرد کے ساتھ جو احترام اور جو برتاؤ کریں، وہی عوام کو کرنا چاہئے۔ پھر فرمایا، اس جماعت سے نفع کی کوئی امید نہیں رکھنا چاہئے۔ ان سے حتی الامکان الگ رہنا ہی مناسب ہے، کیونکہ ان کو عقل تو ہوتی نہیں، اس لئے ان سے نقصان کا اندیشہ غالب ہوتا ہے، پھر ایک صاحب نے دریافت کیا کہ یہ مجذوب کیسے ہوجاتے ہیں، فرمایا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی وارد ایسا قوی ہوتا ہے، جس سے عقل سلب ہوتی ہے اور یہ سب مجاہدہ ہی کی برکت ہے کہ انہیں یہ درجہ نصیب ہوتا ہے، جس سے عقل سلب ہوجاتی ہے اور یہی مجذوب ہیں ،جن کے سپرد کارخانہ تکوینیہ ہے اور یہ اس کے انتظام کے ذمہ دار ہیں۔ باقی جو اہل ارشاد ہیں، وہ نائب رسول اللہ ﷺ ہیں۔ وارثان پیغمبر ہیں، ان کی شان کہیں ارفع اعلیٰ ہے۔ (صفحہ ۴۳۰)

سماع کے لئے حضرت نظام الدین اولیاء کی شرائط

سلطان نظام الدین قدس سرہ سماع کے لئے چار شرائط بتاتے ہیں۔ (۱) سامع از اہل دل باشد از اہل ہوا و شہوت نباشد (سننے والا اہل دل ہو وہ ہو، اور ہوس کا بندہ نہ ہو) (۲) مستمع مرد تمام باشد زن وکودک نباشد (سننے والے سارے مرد ہوں، عورتیں اور نوعمر لڑکے نہ ہوں) (۳) مسموع مضمون ہزل نباشد (سماع کا مضمون یاوہ گوئی پر مشتمل نہ ہو) (۴) آلہ سماع چنگ ورباب درمیان نباشد (سماع میں مزامیر کا استعمال نہ ہو) فرمایا کہ

میں ایک بار اپنے ایک صاحب سماع بزرگ کو تلاش کرنے کے سلسلے میں سلطان جی کے عرس میں عرس کے وقت سے پہلے حاضر ہوا، میں ان دنوں، کانپور میں تھا، ان بزرگ سے ملاقات کے لئے دہلی آیا تھا، مجھے خیال تھا کہ وہ عرس میں ملیں گے، مگر وہ اس وقت تک عرس میں نہ آئے تھے۔ میں نماز ظہر کے قریب لوٹا کہ پھر شہر میں مل لوں گا، وہاں سب چشتی جمع تھے۔ انہوں نے مجھے گھیرا کہ چشتی ہوکر عرس شروع ہونے کے وقت کہاں چلے گئے۔ میں نے کہا کہ اگر میں عرس میں شریک ہوجاؤں گا تو حضرت سلطان جی خفا ہوجائیں گے اور میں نے سلطان جی کا اوپر کا ملفوظ پڑھ کر سنایا اور کہا کہ سلطان جی کے بیان کردہ شرائط مجھ میں نہیں۔ سب نے کہا کہ تم تو اس کے اہل ہو، مگر ہم اہل نہیں۔ ہمیں سماع کے سلسلہ میں ایسی تبلیغ آج کسی نے نہیں کی تھی۔ (صفحہ ۴۴۲)

علم سے مسئولیت میں اضافہ ہونا

فرمایا، صوفیہ علم کے اہتمام سے زیادہ عمل کا اہتمام کرتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے امت، مجھے تمہارے متعلق ان چیزوں سے زیادہ اندیشہ نہیں، جس کا تم کو علم نہیں۔ کیونکہ علم کی کمی سے عمل میں جو کوتاہی ہوجاتی ہے، وہ بے باکی کی دلیل نہیں، اس لئے یہ ہلکا گناہ ہے، لیکن یہ دیکھو کہ جن چیزوں کا تمہیں علم ہے، ان پر تم عمل کیسا کرتے ہو۔ اس حدیث کی تشریح میں حضرت قشیری نے لکھا ہے کہ عالم کی جتنی دقیق اور وسیع نظر ہوگی، اس کا مواخذہ بھی اتنا شدید ہوگا۔ لہٰذا کسی عالم کے لئے خوشی وناز مناسب نہیں، بلکہ اسے خشیت کی صورت اختیار کرنی چاہئے۔ اسی وقت وہ خوش ونیاز کا مستحق ہوگا۔ (صفحہ ۱۶۹)

کبر کی حقیقت اور اس کا علاج

فرمایا، تکبر کا حاصل یہ ہے کہ فرد کسی دنیوی یا دینی کمال میں اپنے کو بااختیار اور خود کو دوسروں سے اس طرح بڑا سمجھے کہ ان کو حقیر سمجھنے لگے، اس میں دو جزو شامل ہیں۔ اپنے کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، یہ تکبر کی حقیقت ہے، جو حرام اور معصیت ہے، ایک اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں سارے اجزا شامل ہیں۔ سوائے ایک جزو یعنی اختیار کے، یعنی اختیار کے بغیر ان اجزا کا خیال آگیا، یہاں تک تو معصیت نہیں، لیکن اگر اس کے بعد اس خیال کو اپنی مرضی سے اچھا سمجھا، یا باوجود اچھا نہ سمجھنے کے، اپنی مرضی سے اس کو باقی رکھا تو یہ حقیقت کبر کی ہوجائے گی، جو معصیت ہے، دوسروں کو حقیر سمجھنے کا جز اگر نہیں تو یہ تکبر نہیں۔

جیسے ایک بیس برس کی عمر والا شخص دو برس کے بچے کو عمر میں اپنے آپ سے چھوٹا سمجھے۔ یا ایک ہدایہ پڑھنے والا طالب علم نحو پڑھنے والے طالب علم کو تعلیم میں اپنے آپ سے پیچھے سمجھے۔ یا کوئی مالدار فرد کسی مسکین کو مال میں اپنے آپ سے کم سمجھے، ان ساری صورتوں میں چونکہ حقارت شامل نہیں، اس لئے یہ کبر نہیں، کبر کا علاج ایک خاص مراقبہ ہے۔ وہ مراقبہ یہ ہے:

(الف) اگرچہ مجھے یہ کمال حاصل ہے، مگر یہ میرا اپنا کمال نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا ہے:

(ب) عطا بھی کسی استحقاق سے حاصل نہیں، بلکہ محض عطا اور رحمت ہے۔

(ج) پھر عطا کے بعد اس کا بقاء میرے اختیار میں نہیں، بلکہ حق تعالیٰ جب چاہیں، یہ نعمت سلب کر سکتے ہیں۔

(د) اگرچہ دوسرے شخص میں فی الحال یہ کمال نہیں ہے، مگر عملاً ممکن ہے کہ میرے کمال سے زیادہ اس کو یہ کمال اس طرح حاصل ہو جائے کہ میں اس کمال میں اس کا محتاج ہو جاؤں۔

(ہ) اگر عملاً اسے کمال نہ بھی حاصل ہو، جس طرح بعض اوقات ظاہری اسباب سے اس کا گمان غالب ہوتا ہے تو ممکن ہے، اس شخص میں کوئی کمال ایسا موجود ہو، جو مجھ سے مخفی ہو اور دوسروں پر ظاہر ہو یا سب سے ہی مخفی ہو اور حق تعالیٰ کو معلوم ہو، جس کی وجہ سے اس کے اوصاف کا مجموعہ میرے اوصاف کے مجموعہ سے اکمل ہو۔

(س) اگر دوسرے کا کمال ذہن میں نہ آسکے تو اس احتمال کو ذہن میں حاضر کیا جائے کہ شاید یہ شخص علم الٰہی میں مقبول ہو اور میں غیر مقبول ہوں یا اگر میں بھی مقبول ہوں تو یہ مجھ سے زیادہ مقبول ہو، ایسی صورت میں مجھے کیا حق حاصل ہے کہ اس کو حقیر سمجھوں۔

(د) اور اگر بالفرض ان سارے امور میں یہ شخص مجھ سے کم ہے تو کامل پر ناقص کا حق ہوتا ہے، جس طرح مریض کا صحتمند پر۔ ضعیف کا قوی اور فقیر کا غنی پر ہوتا ہے۔ تو مجھے چاہیے کہ اس پر شفقت کروں اور اس کی تکمیل کی کوشش کروں، اور اگر کسی طرح قدرت نہ ہو یا ہمت نہ ہو یا فرصت نہ ہو تو تکمیل کی دعا ہی کی جائے۔ اس خیال کے بعد تکمیل میں سعی شروع کر دے تو اس تدبیر سے اس کے ساتھ تعلق میں شفقت پیدا ہو جائے گی۔ اور طبعی خاصہ ہے کہ فرد جس شخص کی تکمیل اور تربیت میں سعی کرتا ہے، اس سے محبت ہو جاتی ہے اور

محبت کے بعد تحقیر باقی نہیں رہتی۔

(ز) اگر یہ بھی نہ ہو تو اس کے ساتھ کبھی کبھار لطف و اخلاق کے ساتھ بات چیت کی جائے، اس کا مزاج معلوم کیا جائے، اس سے بھی طرفین کے درمیان تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح کے تعلق کے بعد تحقیر ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر وہ شخص ایسا ہے کہ شرعاً اس سے بغض رکھنا ضروری ہے تو مذکورہ تدابیر میں سے بعض تدابیر اختیار نہ کی جائیں۔

یہ گفتگو تو تکبر کے بارے میں تھی اور عجب میں صرف ایک جز کم ہے، باقی سارے اجزاء وہی ہیں یعنی اس میں دوسروں کو حقیر سمجھنا نہیں، صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھنا شامل ہے، اس میں بھی حقیقت اور صورت کے درجے وہی ہیں اور وہی احکام ہیں اور مذکورہ علاج میں سے جن میں سے دوسرے کا تعلق نہیں، وہ سب اس میں بھی ہیں۔

حب جاہ کا حاصل یہ ہے کہ فرد جس طرح دل میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، اس کی یہ بھی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اسے بڑا سمجھیں اور میرے ساتھ تعظیم و اطاعت و خدمت کا معاملہ کریں، چونکہ اس کا منشاء بھی تکبر یا عجب ہی ہے، اس لئے اس کے اقسام و احکام اور علاج بھی وہی ہے، جو کبر کا ہے۔

ریا کا حاصل یہ ہے کہ کوئی دنیوی یا دینی عمل لوگوں کی نظر میں بڑائی کا ذریعہ بن جائے، کبر و عجب میں یہ چیز شامل نہ تھی، چونکہ یہ بھی کبر و عجب ہی سے پیدا ہوتا ہے اس کے درجات و اقسام و احکام و معالجات بھی وہی ہیں اور یہ سارے احکام ہیں، کبھی کبھار خاص حالات اور نئی صورتیں یا نئے معالجات بھی ہوتے ہیں، جو مربی کی رائے سے متعین کئے جاتے ہیں۔ (صفحہ ۱۷۰-۱۷۲ تلخیص)

عمر کی زیادتی سے بیوی کی محبت میں کمی کا نہ ہونا

فرمایا، عمر کی زیادتی سے بیوی کی محبت میں کمی نہیں ہوتی۔ جس چیز میں سن کی زیادتی سے کمی ہو جاتی ہے، وہ ہیجان نفسانی ہے اور محبت کی خاصیت تو شراب جیسی ہے۔ (صفحہ ۱۷۶)

حرص، حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کے فقدان کا نتیجہ ہے، اس کا علاج

فرمایا، حرص کی حقیقت دنیا کی طرف میلان اور توجہ ہے۔ اگر اس توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دیا جائے تو یہ میلان باقی نہ رہے گا۔ اگر وہ چیز طبعاً بھی محبوب ہو تو یہ نیا میلان شدید تر ہو گا اور اس سے دنیا کی محبت کا ازالہ بھی قوی ہو گا اور اگر نیا میلان طبعاً محبوب نہ ہو تو

اس صورت میں توجہ کمزور ہوگی۔ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو حق تعالیٰ کے ساتھ فطری محبت اور طبعی میلان ہے۔ مسلمان ہی نہیں کافر کو بھی۔ کیونکہ محبت کے اسباب حسن وجمال یا فضل و کمال وغیرہ ہیں۔ اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے، اس سے محبت بھی قوی ہوگی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ اوصاف بالذات حق تعالیٰ میں ہی ہیں۔ دوسری چیزوں میں اس کا ظل ہے۔ پس فرد میں موجودہ حقیقی محبت اور میلان حق تعالیٰ ہی کا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان اس وجہ سے ہے کہ ان میں صفات حق کا ظل ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن ان چیزوں کی محبت اس لئے ہے کہ لوگوں کو یہ علم نہیں کہ یہ اوصاف حقیقت میں حق تعالیٰ کے ہیں۔ جس وقت انہیں یہ معلوم ہوگا کہ حضرت حق ہی محسن ومنعم ہیں اور وہی حسین وجمیل ہیں اور وہی صاحب فضل وکمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظل ہے، اس وقت ہر شخص حق تعالیٰ کو محبوب بنالے گا۔ پس حرص کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا جائے اور چونکہ فرد کو حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے، اس لئے یہ توجہ اشد واکمل ہوگی تو جتنی توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہوگی، اتنی ہی توجہ دنیا سے ہٹے گی۔ (صفحہ ۱۷۸)

عورتوں کے عیوب کی نشاندہی

فرمایا عورتوں کے اکثر عیب یہ ہیں۔

(۱) بعض عورتیں ان نمازوں کی قضا ادا نہیں کرتیں، جو ہر مہینے میں ان سے غسل کی تاخیر کے سبب فوت ہوتی ہیں۔

(۲) روزہ کے حقوق ادا نہیں کرتیں، فضول اور گناہ کی باتوں میں روزہ کو برباد کرتی ہیں۔

(۳) پردہ میں احتیاط کم کرتی ہیں، جن عزیزوں سے شرعاً پردہ ہے، ان کے سامنے آتی ہیں، نیز کافر عورتوں جیسے بھنگن، چماری وغیرہ سے بدن چھپانے کا اہتمام نہیں کرتیں، چنانچہ سر اور سر کے بال اور بازو اور کلائی اور پنڈلی وغیرہ ان کے سامنے کھولے رہتی ہیں۔

(۴) عورتوں میں ذکر اللہ کا رواج بہت کم ہے۔ نماز روزہ کے ساتھ کچھ ذکر اللہ بھی کرنا چاہیے۔ ذکر سے دل کو خدا تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے اور نماز میں دل لگتا ہے۔ حالانکہ ان کی طبیعتوں کو ذکر اللہ سے بہت مناسبت ہے۔ کیونکہ ذکر اللہ کا اثر ان پر زیادہ ہوتا ہے، جس سے قلوب میں سکون ویکسوئی کی حالت ہو اور عورتوں کو پردہ کی برکت سے یہ

بات خاص درجہ میں حاصل ہے۔ (صفحہ ۱۷۹)

عورتوں کے لئے جدید تعلیم مضر ہے

فرمایا، عورتوں کو علوم جدیدہ کی تعلیم دینا ان کو برباد کرنا ہے، بس ان کو تو قرآن شریف اور ضرورت کے مطابق دینی مسائل کی تعلیم دینا چاہیے۔ (صفحہ ۱۷۹)

حرص کی وجہ سے اللہ اللہ کرنے سے محرومی

فرمایا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذرا بیٹے کی شادی یا بیٹی کے نکاح سے فارغ ہو جائیں تو پھر دنیا کے دھندوں سے الگ ہو کر اللہ اللہ کریں گے۔ حضور کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس طرح حرص کبھی کم نہیں ہوسکتی، بلکہ اور بڑھے گی۔ وہی حالت ہوگی جیسے خارش والا کہا کرتا ہے کہ ذرا کھجلالوں پھر نہ کھلاؤں گا۔ مگر وہ جتنا کھجلاتا ہے، اتنی ہی خارش بڑھتی ہے، اسی طرح آج تو ایک بیٹی کی شادی کا بہانہ بنایا جاتا ہے، کل نہ معلوم کتنی بیٹیاں ہو جائیں گی، تمہاری نہ ہوں، تمہاری اولاد کی ہو جائیں گی تو یہ سلسلہ تو کہیں ختم نہ ہوگا۔ (صفحہ ۱۸۰)

مسلمان سے قطع کلام کرنے کی سزا

فرمایا، حدیث میں ہے کہ اگر مسلمان سے ایک سال تک نہ بولا جائے تو قتل کا گناہ ہوتا ہے۔ (صفحہ ۱۸۰!)

خدا کے کام کبھی رکتے نہیں

فرمایا، چندہ دباؤ ڈال کر ہرگز نہ لیا جائے۔ خدا کے دین کے کام کبھی رکے نہیں رہتے، دین کے کام میں دینا، خدا کو دینا ہے اور خدا کو کسی کے مال کی ضرورت نہیں، اس لئے خدا کے حکم کی خلاف ورزی نہ کی جائے، باقی دینے کی ترغیب اس لئے دی گئی ہے کہ اس میں ہمارا اپنا نفع ہے کہ اس سے صدقات بڑھائے جائیں گے اور ہمارے لئے آخرت میں خزانہ جمع ہو جائے گا۔ ورنہ جس کا جی چاہے، امتحان کرلے کہ خدا کا کام کسی کے دینے نہ دینے پر منحصر نہیں رہتا، وہ ہو کر رہتا ہے، البتہ نہ دینے سے تم خیر سے محروم رہ جاؤ گے۔ (صفحہ ۱۸۲)

اپنے لئے سارا انتظام دوسروں سے بے پرواہی

فرمایا، شریعت نے دوسروں کے دکھ اور تکلیف میں مدد کرنے کا نہایت اہتمام کے ساتھ حکم کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمیں آج کل اس کی بالکل پرواہ نہیں کہ دوسرے کو نفع پہنچائیں، ہم ایسے بخیل اور خود غرض ہوگئے ہیں کہ اپنے لئے تو سارا سامان کر لیتے ہیں۔ جوتے کا بھی۔ اناج کا بھی، کپڑے کا بھی، لیکن دوسروں کی بالکل فکر نہیں کرتے کہ مر رہے ہیں یا غمگین ہیں۔ (صفحہ ۱۸۲)

اتفاق کا راز

فرمایا، اتفاق ہوتا ہے، دوسروں کو آرام پہنچانے سے۔ اگر مسلمان اس بات کا خیال رکھیں کہ دوسروں کو نفع پہنچایا کریں تو اس سے اتفاق کی فضا پیدا ہوگی' مگر اب تو اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے۔ (صفحہ ۱۸۳)

جبر کے ساتھ اور راہ خدا میں دینا زیادہ اجر کا باعث ہے

فرمایا، بعض افراد کہتے ہیں، کہ جب دل میں اللہ کے لئے دینے کا شوق نہ ہو تو ثواب کیا خاک ہوگا۔ مگر صاحبو، اگر نیت اللہ کے واسطے ہو تو ناگواری کے ساتھ دینے میں بھی ثواب ہوتا ہے، بلکہ اس صورت میں زیادہ ثواب ہوگا کہ دل نہیں چاہتا، مگر دل پر جبر کر کے اللہ کے لئے دے رہا ہے۔ (صفحہ ۱۸۳)

منتہی کی صفات

فرمایا، منتہی اور کامل کی تعریف یہ ہے کہ اسے (نسبت مع اللہ کا) ایسا ملکہ عطا ہوجائے، جس کی وجہ سے وہ نفس کو مغلوب رکھنے پر قادر ہوجائے اور شیطان اسے مطیع نہ کرسکے۔ اور نہ وہ خود بینی میں مبتلا ہو۔ (صفحہ ۱۸۵)

زینت کے سامان کے سلسلہ میں اہم نکتہ

فرمایا، حدیث میں ہے، 'البذاذۃ من الایمان۔ یعنی زینت کو ترک کرنا، یہ ایمان کے شعبوں میں سے ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مومن کی ساری توجہ آخرت کی طرف ہوتی ہے۔ تو اس صورت میں اسے سامان زینت کی فکر کیسے ہوگی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا، کہ

مقصد اس زینت کو چھوڑنا ہے، جس میں توجہ اور وقت صرف ہوجائے۔ اگر خاص اہتمام کے بغیر زینت کا سامان عطا ہوجائے تو وہ زینت بری نہیں، بلکہ اس سے اعراض کرنا، یہ زہد کا اظہار ہے، جو ایک قسم کی ریا ہے۔ بالخصوص جبکہ ترک زینت کے لئے خاص اہتمام کرنا پڑے، جو توجہ آخرت میں رکاوٹ ہوجائے تو جس بنا پر زینت مذموم ہوئی تھی، وہ سبب چونکہ ترک زینت میں بھی ثابت ہوگیا، اس لئے اس طرح کی ترک زینت مذموم ہوجائے گی، جس کی طرف عارف شیرازی اشارہ فرماتے ہیں۔

نقد صوفی نہ ہمہ صفا و بے غش باشد
اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

مگر چونکہ اکثر عادۃً زینت محتاج اہتمام ہوتی ہے۔ ترک زینت کے لئے اہتمام نہیں ہوتا، اس لئے ترک زینت کی مدح فرمائی گئی۔ (صفحہ ۱۸۶)

نئے آنے والوں کا خیر مقدم

فرمایا، حدیث میں ہے 'بالداخل وحشتہ فتلوہ بمرحباً' یعنی نئے آنے والے کو (اجنبیت کے سبب) ایک قسم کی حیرت زدگی یعنی بدحواسی ہوتی ہے (اس لئے اس کے ذہن میں بعض ضروری باتیں نہیں آتیں، اپنے ہر قول اور فعل میں وہ چکرا جاتا ہے) اس لئے اس کی آؤ بھگت کیا کرو (تاکہ اس کی طبیعت مانوس ہوکر کھل جائے اور حواس بجا ہوجائیں اور ہر قول و فعل کا موقعہ سمجھ سکے، پھر نہ وہ خود پریشان ہو، نہ دوسرے کو پریشان کرسکے)۔ (صفحہ ۱۸۶)

بزرگوں کا مصائب و تکلیف میں مبتلا ہونا

فرمایا، حدیث میں ہے یعنی جیسا سیلاب اپنی انتہا کی طرف دوڑتا ہے، اسی طرح تکلیف اہل اللہ کی طرف اس سے بھی زیادہ تیز دوڑتی ہے،' مشہور ہے کہ بزرگوں کو کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہوتی ہے، یہ حدیث اس کا ماخذ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا اجر بڑھانا چاہتا ہے، اگر تکلیف نہ ہو تو وہ اعمال کا اجر تو حاصل کرسکتے ہیں، مگر بلا اور مصیبت پر جو اجر ملتا ہے، اس کو کیسے حاصل کرسکتے۔ اور بلا سے مراد اگر ظاہری مصیبت ہو، جیسا کہ متبادر یہی ہے تب تو یہ اکثری ہے، کلی نہیں، کیونکہ طبعی طور پر کمزور بزرگوں کے لئے مصیبت کو برداشت کرنا دشوار ہوتا ہے، اس لئے ان کے لئے وہ مضر ہوتی ہے، اللہ

انہیں محفوظ رکھتے ہیں اور اگر اس میں باطنی تکلیف بھی شامل ہو تو یہ حکم کلی ہے۔ باطنی احوال سب سالکوں کو ایسے پیش آتے ہیں کہ دوسرے برداشت ہی نہیں کر سکتے، جیسے خشیت، فکر آخرت، ملاحظہ عظمت وغیرہ، اس لئے کسی نے کہا ہے۔

اے ترا خارے، بپا شکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

اس لئے حضور کریم ﷺ اقدس نے فرمایا ہے، ان اللہ یبغض الحبر السمین. یعنی اللہ تعالیٰ موٹے عالم کو پسند نہیں فرماتے، اس سے مراد وہ فربہی بھی ہے، جو بے فکری سے پیدا ہو، کیونکہ جو شخص عالم ہو کر آخرت سے بے فکر ہو، وہ ضرور عتاب کا شکار ہوگا۔ (صفحہ ۱۸۷)

اختیاری اور غیر اختیاری معاملات اور غم کے اقسام

فرمایا حدیث میں ہے، تجد المومن مجتهدا فيما يطيق متلهفا على ما لا يطيق. یعنی تو مومن کو اس حال میں پائے گا کہ جو عمل اس کی اپنی طاقت میں ہو، اس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے اور جو عمل اس کی طاقت میں نہ ہو، اس پر وہ افسوس کرتا ہے، اس سے دو امر ثابت ہوئے، ایک تو یہ کہ اختیاری امور میں طاقت ہمت اد کوشش سے کام لینا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ غیر اختیاری معاملات میں اپنے کو تکلیف میں نہ ڈالنا چاہیے۔ اس کے فوت ہونے پر غم کافی ہے، مگر اس حزن کے درجات ہیں، ایک حزن معتدل ہے، جو اس عمل کے محبوب ہونے اور اپنے عاجز ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے، یہ تو محمود ہے کہ اچھے عمل کی محبت ایمان سے ہے۔ اور اپنے عجز کا مشاہدہ عبدیت کا شعبہ ہے۔ دوسرا درجہ حزن مضرط ہے جس سے قلب میں پریشانی پیدا ہو کر یا اس کا غلبہ ہو اور ہمت میں ضعف ہو جائے، یہ مذموم ہے، اس لئے کہ یہ عمل میں رکاوٹ ہے، جو کہ مقصود تھا۔ (صفحہ ۱۸۷)

حق تعالیٰ اور انبیاء کرام و عزیزوں کے سامنے اعمال کا پیش ہونا

فرمایا، حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کے روبرو تو پیر اور جمعرات کے روز بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام اور باپوں اور ماؤں کے روبرو جمعہ کے روز پیش کئے جاتے ہیں (یعنی ملائک پیش کرتے ہیں۔ اور ہر نبی پر ان کی امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور باپوں اور ماؤں سے مراد اصول ہیں، پس دادا پردادا اور اسی

طرح دادی پردادی۔ نانی پر نانی سب اس میں داخل ہو گئے) پس وہ (یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام اور آباؤ امہات) ان کی نیکیوں سے خوش ہوتے ہیں۔ اور خوشی سے ان کے چہروں کی چمک دمک بڑھ جاتی ہے، پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور گناہ کے کام مت کرو اور اپنے مُردوں کو ایذا مت دو (یعنی جس طرح وہ حسنات سے خوش ہوتے ہیں، اسی طرح گناہوں سے رنجیدہ ہوتے ہیں تو اپنی بد اعمالیوں سے انہیں آزار نہ پہنچاؤ) (صفحہ ۱۸۸)

خدا کی راہ میں ناکامی پر دوہرے اجر کا ملنا

فرمایا، حدیث میں ہے کہ جو فوج اور لشکر خدا کے راستہ میں جہاد کر کے سلامت آجائے اور مال غنیمت حاصل کر لے تو اس نے اپنے جہاد کا دو حصہ اجر حاصل کر لیا اور صرف ایک حصہ آخرت میں پائے گا۔ اور جو لشکر ناکام رہا، خائف کیا گیا اور مصیبت زدہ کیا گیا تو اس کا آخرت کا اجر باقی رہا یعنی، سے آخرت میں پورا اجر ملے گا۔ اس حدیث سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ اگر کوئی شخص سعی و کوشش کے باوجود طریق سلوک میں ناکام رہا تو اسے آخرت میں اجر ضرور ملے گا، بلکہ دوہرا اجر ملے گا۔ ایک تو سعی و کوشش کا، دوسرا ناکامی کا۔ (صفحہ ۱۹۹)

گناہوں اور صالح اعمال کی خاصیت

فرمایا، گناہوں میں مایوسی پیدا کرنے کی خاصیت ہے، جیسا کہ اعمال صالحہ میں رجاء پیدا کرنے کی خاصیت ہے۔ (صفحہ ۱۸۹)

نور فہم کی تحصیل کا طریق

فرمایا، نور فہم کسی باقی باللہ فانی فی اللہ کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اس کے بغیر علم ایسا ہے، جیسے بعض لوگ طوطے کو قرآن کی سورتیں یا فارسی جملے یاد کرا دیتے ہیں۔ (صفحہ ۱۹۱)

جہاد، توسیع اسلام کے لئے نہیں، بلکہ تحفظ اسلام کے لئے فرض ہوا

فرمایا، اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے، بالخصوص عرب قوم، جو جنگ جوئی میں مشہور ہے، وہ کسی بھی طرح تلوار کے خوف سے اسلام قبول نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے لئے

لڑنا مرنا معمولی بات تھی، مگر دب کر دین بدلنا سخت عیب تھا۔ وہ تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لاسکتے تھے۔ اس پر شاید یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر جہاد کس لئے شروع ہوا تو خوب سمجھنا چاہئے کہ جہاد حفاظت اسلام کے لئے فرض ہوا، نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے، ان دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جہاد کی مثال آپریشن کی سی ہے، کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک متعدی، دوسرا غیر متعدی۔ جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے، اس کو تو علاج کے ذریعہ سے دبایا جاتا ہے۔ کوئی مرہم لگا دیا۔ مالش کردی، جس سے وہ دب گیا اور پھیل جانے والے مادہ کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کو چیر کر نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طرح دشمنانِ اسلام دو طرح کے ہیں، بعض تو وہ، جن سے صلح کر لینی مناسب ہوتی ہے، وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں، ان سے صلح اور مصالحت کر لی جاتی ہے۔ بعض ایسے مفسد اور موذی ہوتے ہیں کہ وہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، یہ مادہ متعدیہ ہے، ان کے واسطے پر آپریشن کی ضرورت ہے، اسی کا نام جہاد ہے۔ پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں، بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہیں۔ (صفحہ۱۹۳)

ہر چیز میں اعتدال کی تعلیم

فرمایا، ہر چیز میں افراط و تفریط مناسب نہیں، بلکہ اعتدال ہی مناسب ہے۔ اور اعتدال کا اثر ہر چیز کا وہی ہے، جو اس حکم شریعت کا ہے۔ مثلاً ہمدردی اچھی چیز ہے، اگر وہ اس قدر زیادہ نہ ہو کہ اس سے اللہ پر اعتراض پیدا ہونے لگے، مثلاً جیسے کوئی بچہ بیمار ہے سخت روتا چلاتا ہے، اس پر رحم کھا کر دعا کی جائے اور ایسا نہ ہو کہ تاخیر صحت سے اللہ پر اعتراض پیدا ہونے لگے کہ حق تعالیٰ بچہ کے حق میں دعا کو کیوں قبول نہیں کرتے یا قبولیت میں دیر کیوں کرتے ہیں، بات یہ ہے کہ اس میں بھی حکمت ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ والدین تدبیر کو استعمال میں نہیں لاتے اور حق تعالیٰ کو غیظ آتا ہے کہ یہ میرے قانون میں خلل ڈالنا چاہتا ہے (کیونکہ حق تعالیٰ کی سنت جاریہ یہی ہے کہ اختیار اسباب پر مسبب کو مرتب فرماتے ہیں) اور ایسے وقت میں حکم شریعت کا حکم یہی ہے کہ تدبیر اختیار کی جائے اور تدبیر کو مؤثر بنانے کے لئے دعا بھی کی جائے۔ (صفحہ۱۹۴)

شریعت میں ساری مصالح شامل ہیں، اس لئے اس کا اتباع ضروری ہے

فرمایا، خدا کا کام سب سے زیادہ کامل ہے، کیونکہ حالات کا سب سے زیادہ علم اسی کو ہے، پھر وہ با اختیار مالک ہستی ہے اور ساری اشیاء میں وہ مؤثر ہے، اس پر کوئی کیفیت غالب نہیں، اس لئے اس کی طرف سے صادر ہونے والا ہر حکم نہایت کامل ہے، نہ اس کے احکام بہت سخت ہو سکتے ہیں، کیونکہ اس پر غضب کی کیفیت غالب نہیں، نہ بہت نرم ہو سکتے ہیں، کیونکہ اس پر رحمت کی کیفیت غالب نہیں، بلکہ وہ با اختیار ہے خود قہار ہے اور با اختیار خود رحیم و کریم ہے۔ وہ کسی صفت میں مجبور یا مغلوب نہیں، پس کلام خداوندی کے سارے احکام افراط تفریط سے پاک ہیں۔ چنانچہ شریعت کا پابند ہونا، ہر بشر پر لازم ہے، کیونکہ ان احکام میں سب کی مصالح جامع ہیں۔ نیز ہماری یہ حالت مشاہدے میں ہے کہ ہر شدید کیفیت ہمیں مغلوب کر دیتی ہے، اس لئے ہمارے لئے شریعت الٰہی کی پابندی ضروری ہے، تاکہ ہم اعتدال پر قائم رہ سکیں، واقعی شریعت کی تعلیم میں نہایت اعتدال ہے۔ (صفحہ۱۹۵)

مصیبت کے وقت لائحہ عمل

(۱) فرمایا، مصیبت کے وقت جب تکلیف ہو، صبر کیا جائے کہ مومن کی یہی شان ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ **عجبا للمومن** (الیٰ ان قال) **ان اصابتہ سراء شکر فکان خیر الہ و ان اصابتہ ضراء صبر فکان خیر الہ.** یعنی مومن کی عجیب حالت ہے کہ اگر اسے خوشی پہنچتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور اگر مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے تو وہ دونوں حالتوں میں نفع میں رہا۔

(۲) فرمایا، خدا کی رحمت سے مصیبت کے وقت مایوس نہ ہوں، بلکہ فضل و کرم الٰہی کا امیدوار ہوجائے، کیونکہ اسباب سے اوپر بھی تو کوئی چیز ہے تو مایوسی کی بات وہ کہے، جس کا تقدیر پر ایمان نہ ہو، اہل دین کا طریقہ تو قضا پر راضی رہنا ہے۔

(۳) مصیبت کی وجہ سے دوسرے شرعی احکام میں کوتاہی نہ کی جائے۔

(۴) خدا سے اس مشکل کے آسان کردینے کی دعا کرنی چاہئے اور تدابیر میں مشغول رہا جائے۔ مگر تدبیر کو کارگر نہ سمجھا جائے اور دعا کا حکم اس لئے ہے کہ تدبیر میں بغیر دعا کے برکت نہیں ہوتی۔

(۵) استغفار کرتے رہو یعنی اپنے گناہوں سے معافی چاہو۔

(۶) اگر مصیبت ہمارے کسی مسلمان بھائی پر نازل ہو تو اس کو اپنے اوپر نازل سمجھا جائے، اس کے لئے ویسی ہی تدبیر اختیار کی جائیں، جیسی اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبت کے وقت اختیار کی جاتی ہیں۔ (صفحہ ۱۹۶)

مصیبت کی حقیقت

فرمایا، اصل مصیبت وہ ہے، جس سے دل میں پریشانی اور بے چینی پیدا ہو۔ پس جو شخص بیمار ہو اور دل کو پریشان پائے، اس کے حق میں یہ مرض مصیبت ہے اور اگر دل پریشان نہیں، بلکہ صابر و شاکر ہے تو یہ ہرگز مصیبت نہیں، بلکہ درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے۔ (صفحہ ۱۹۷)

لوگوں میں بڑا بن کر رہنا، فریب نفس ہے

فرمایا، نفس کا ایک پوشیدہ فریب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ (لوگوں میں) ممتاز ہو کر رہے اور اس میں اسے لذت حاصل ہوتی ہے، اس لئے بعض افراد یہ چاہتے ہیں کہ وہ اخیر شب میں ہی جاگیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہو۔ سو یہ عجب اور ناز ہے اور عجب ایسی بری چیز ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہوتا ہے، اس وقت وہ خدا کی نظر میں ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۲۰۴)

کبائر ہستیوں کا علاج نفس

فرمایا، سلف نے تو معاشرت تک میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ وہ اپنی نظر میں پسندیدہ نہ ہوں، چنانچہ حضرت علیؓ کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بار کرتہ پہنا۔ انہیں اس کی آستینیں خوبصورت معلوم ہوئیں تو آپ نے ان کو تراش ڈالا کہ یہ بدشکل ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کو کسی نے مسلمانوں کے گھروں میں پانی بھرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ آپ یہ کیا رہے ہیں، فرمایا کہ میں اس وقت اپنے نفس کا علاج کر رہا ہوں، اس وقت ہرقل کی طرف سے دو شخص میرے پاس آئے تھے، جنہوں نے میرے عدل کی تعریف کی، جس سے میرا نفس خوش ہوا، میں نے اس کا علاج کیا۔ (صفحہ ۲۰۴)

ہم میں اور صحابہ میں فرق

فرمایا، ایک بزرگ نے کسی سے پوچھا کہ ہم میں اور صحابہ کرام میں کیا فرق ہے،

انہوں نے فرمایا کہ اگر صحابہ آجکل کے لوگوں کو دیکھتے تو وہ ان کو کافر کہتے اور یہ ان کو پاگل سڑی خیال کرتے۔ واقعی دونوں حکایات اوپر کی اس پر شاہد ہیں۔

ہیئت میں ممتاز بننے کی کوشش کا ہونا

فرمایا، جب مشکل عمل میں ناز کا احتمال ہو تو ایسے موقعہ پر مشکل کا انتظار نہ کیا جائے، اس کا بالکل اہتمام نہ کیا جائے کہ ہیئت ممتاز ہو، جو بھی نیکی میسر ہو، اسے حقیر نہ سمجھا جائے، مثلاً یہ انتظار نہ کیا جائے کہ رات کے آخری حصہ میں اٹھنے کی فضیلت ہے (اس لئے ہر صورت میں اسی وقت اٹھایا جائے) اگر اس وقت جاگنا مشکل ہو تو عشاء ہی وقت تہجد پڑھنے پر قناعت کی جائے۔ (صفحہ ۲۰۴)

مومن کے ہر کام میں اللہ کی طرف سے اعانت کا ہونا

ایک شخص نے لکھا کہ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ بیوی سے چند روز کی جدائی میں تو دل پر بن جاتی ہے۔ دائمی جدائی کے وقت کیا گذرے گی، فرمایا، اول تو مومن کے لئے اللہ کی طرف سے اعانت ہوتی ہے۔ وقوع کے وقت اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق ایسا غالب کر دیا جاتا ہے کہ دوسرے تعلقات مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ طبعی غم کسی درجہ میں رہے، جیسے زندگی میں موت کی کراہت کسی درجہ میں ہوتی ہے۔ مگر عین موت کے وقت یہ کراہت اکثر شوق میں بدل جاتی ہے اور اقل درجہ میں بدل کر گوارائی ہو جاتی ہے۔ کما ورد فی الحدیث ویشاھد کثیرا (صفحہ ۲۰۷)

جنت میں بیویوں کا حوروں سے افضل ہونا

فرمایا، جنت میں بیبیاں حوروں سے افضل و اجمل ہوں گی، اور اجمل کی طلب نہ خلاف عقل ہے، نہ خلاف نقل، اس لئے اپنی بیویوں کے ملنے کے لئے دعا کرنا، نہ خلاف عقل ہے، نہ خلاف نقل۔ (صفحہ ۲۰۷)

پاس انفاس کا ذکر

فرمایا، اللہ اللہ کہنا اگر خلوص سے نہ بھی ہو، تب بھی بے کار نہیں، کہنے سے استعداد تو پیدا ہو جائے گی اور پہلی بار کہنا یہ آئندہ کے لئے کہنے میں معین ہو جائے گا۔ لہٰذا دنیٰ ذکر کو بھی بے کار نہ سمجھا جائے اور کوئی ساعت کسی نہ کسی عمل سے خالی نہ رہنے دی جائے، اس

لئے مشائخ نے پاس انفاس کا ذکر تجویز کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ سلسلہ رہے۔

یک چشم زن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(صفحہ ۲۰۹)

اپنے آپ کو مٹانے کے لئے سلطنتوں کا ترک کرنا

فرمایا، اپنے آپ کو مٹانا جسے تواضع کہتے ہیں، یہ بڑے کام اور نفع کی چیز ہے، یہ مٹانا، وہ چیز ہے، جس کے حاصل کرنے کے واسطے بندگان خدا نے سلطنتیں چھوڑ دیں اور دنیا بھر کی پرواہ نہ کی۔ کوئی بات تو تھی، جس کی بدولت وہ اسے دنیا بھر سے ترجیح دیتے تھے۔ (صفحہ ۲۱۰)

حق تعالیٰ کے سامنے ہمارے تقویٰ کی حیثیت

فرمایا، حق تعالیٰ کے سامنے کسی کے زہد و اطاعت اور تقویٰ کی کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہمارا عمل ان کی شان کے موافق ہے۔ اگر بخشش ہوسکتی ہے تو صرف عنایت نظر سے ہوسکتی ہے، جس کے لئے ادنیٰ سبب بھی کافی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایک ذاکر کی بخشش محض اس بنا پر ہوئی کہ انہوں نے بے نمک کھچڑی خوشی سے کھالی تھی۔ (صفحہ ۲۱۰)

بی بی کا ایک حق جیب خرچ بھی ہے

فرمایا، بی بی کا یہ بھی حق ہے کہ اسے کچھ رقم ایسی دی جائے، جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرسکے، جس کو جیب خرچ کہتے ہیں، یہ رقم اپنی اور بیوی کی حیثیت کے موافق ہوسکتی ہے۔ (صفحہ ۲۱۱)

عورتوں سے نرمی کا برتاؤ

فرمایا، حدیث میں ہے، استوصوا بالنساء خیراً فانما ھن عوان عندکم. یعنی عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو، کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی کی طرح ہیں۔ اور جو شخص کسی کے ہاتھ میں قید ہو اور ہر طرح سے اس کے اختیار میں ہو، اس پر سختی کرنا، یہ جوان مردی کے خلاف ہے۔ لفظ عوان سے پردہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقید ہو کر رہنے ہی کا نام تو پردہ ہے۔

نیز پردہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پردہ کا منشا حیا اور حیا عورت کے لئے امر طبعی ہے اور امر طبعی کے خلاف کسی کو مجبور کرنا، اذیت کا باعث ہے اور اذیت پہنچانا دلجوئی کے خلاف ہے۔ پس عورتوں کو پردہ میں رکھنا ان پر ظلم نہیں، بلکہ حقیقت میں ان کی دلجوئی ہے۔ (صفحہ ۲۱۱)

عورتوں کا پردہ خلاف طبع نہیں

فرمایا، قید حبس خلاف طبع کو کہتے ہیں اور جو حبس خلاف طبع نہ ہو، اسے قید نہیں کہیں گے، ورنہ بیت الخلاء میں فرد پردہ کرکے جو بیٹھتا ہے، اسے بھی قید کہنا چاہیے، مگر اس کو کوئی قید نہیں کہتا، کیونکہ یہ حبس خلاف طبع نہیں، بلکہ طبیعت کے موافق ہے۔ اسی طرح عورتوں کا پردہ میں رہنا قید طبیعت کے موافق ہے، اس لئے اس کو عرفی قید نہیں کہہ سکتے۔ (صفحہ ۲۱۱)

عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سفارش

فرمایا، مردوں کو غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کس عمدہ پیرایہ میں عورتوں کی سفارش کی ہے۔ فرماتے ہیں: "وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیرا۔" یعنی عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اگر کسی وجہ سے وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت سی بھلائیاں رکھ دیں ہوں مثلاً عورت کی بدخلقی پر صبر کرنے سے اجر کثیر کا وعدہ ہے یا مثلاً اس سے کوئی اولاد ہوجائے جو قیامت میں اس کی دستگیری کرے۔ (صفحہ ۲۱۲)

شیخ کے اتباع کا دائرہ کار

فرمایا، شیخ کا مکمل اتباع واطاعت مطلقہ نہ عقائد میں ہے۔ نہ کشفیات میں اور نہ جمیع مسائل میں، نہ ہی معاشی و معاشرتی معاملات میں (مثلاً طالب سے کہے کہ تم اپنی لڑکی کا رشتہ میرے لڑکے سے یا کسی اور سے کردو) اس کا اتباع تربیت امراض کی تشخیص و تجویز، تدابیر اور ان مسائل میں ہے، جن کا تعلق اصلاح و تربیت باطنی سے ہے، وہ بھی اس وقت تک، جب تک کہ اس کا جواز مرید و شیخ کے درمیاں متفق علیہ ہو اور اگر اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا تو خلاف طریق ہے اور امتثال امر خلاف شریعت ہے، ایسی صورت میں علماء سے پوچھ کر یا اپنی تحقیق سے حکم متعین کرکے شیخ کو اطلاع دی جائے کہ میں فلاں عمل کو جائز

نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اگر اس پر شیخ کی طرف سے پھر بھی وہی حکم ملے تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے اور اگر وہ چھوڑنے کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ اتباع کامل کے معنی یہی ہیں یعنی جو نفسانی مرض اس نے تجویز کیا ہے یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہے یا جو شرعی عمل جس کا شرعی ہونا شیخ و مرید کے درمیان متفق علیہ ہے، تجویز کیا ہے، ان چیزوں میں اتباع کامل کیا جائے، اس معاملہ میں اپنی رائے کو ذرا بھی دخل نہ دے اور باقی معاملات میں اتباع مراد نہیں۔ (۲۱۶)

بیبیوں کی قدر کرنا چاہیے، شکستہ دلوں کا تھوڑا سا عمل قبول ہونا

فرمایا، مردوں کو ہر صورت میں اپنی بیبیوں کی قدر کرنا چاہیے، ایک تو بی بی ہونے کی حیثیت سے کہ وہ ان کے ہاتھ میں قید ہیں اور یہ بات جوان مردی کے خلاف ہے کہ جو ہر طرح اپنے بس میں ہو، اسے تکلیف پہنچائی جائے۔ دوسرے دین کی وجہ سے، کیونکہ تم مسلمان ہو، وہ بھی مسلمان، جیسے تم دین کام کام کرتے ہو، اسی طرح وہ بھی کرتی ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ دینی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون زیادہ مقبول ہے۔ یہ بات ضروری نہیں کہ عورت مرد سے ہمیشہ کم درجہ کی حامل ہو، ممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرد کے برابر ہو، بلکہ اس سے زیادہ ہو، پس عورتوں کو حقیر و ذلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بے کس، مجبور اور شکستہ دل کا تھوڑا سا عمل بھی قبول فرما لیتے ہیں اور اس کے درجے بڑھا دیتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱۶)

نیند کو جبراً روکنا بعض اوقات جنون کا سبب بنتا ہے

فرمایا، اگر ذکر و فکر اور عبادت کے وقت نیند آنے لگے تو تکیہ پر سر رکھ کر سو رہو۔ جب طبیعت ہلکی ہو جائے پھر عبادت کرنے لگو، اور نیند کو جبراً دفع بھی کیا جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے، اس میں اشتعال بڑھ جاتا ہے۔ سودا میں ترقی ہو جاتی ہے، خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات فرد ان خیالات کو الہام سمجھ کر خود کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے، آخر میں یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے، اسی لئے جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی نیند کی بہت رعایت کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔ **لا تفریط فی النوم**. (صفحہ ۶۱۷)

مجاہدہ میں زیادہ کاوش سے عُجب کا پیدا ہونا

فرمایا، عمل میں سختی کے متعلق ایک مفید بات یہ ہے کہ جو شخص عمل میں زیادہ کاوش کرتا ہے، وہ خاص مراعات کا منتظر رہتا ہے، اگر اس کے عمل کے نتیجہ میں دیر ہوتی ہے تو وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مجاہدات کے باوجود مجھے اب تک ثمرات کیوں نہ ملے۔ اس طرح اپنی عبادت پر ناز ہو جاتا ہے اور فرد سمجھنے لگتا ہے کہ میں بھی کوئی چیز ہوں اور اپنے آپ کو ثمرات کا مستحق سمجھنے لگتا ہے کہ میری عبادت پر ثمرات کا دینا گویا خدا کے ذمہ ہو گیا۔ اور یہ چیز عین کبر ہے۔ اور جو شخص اعتدال سے کام کرتا ہے تو وہ خیال ہی نہیں رکھتا، بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کرتا ہی کیا ہوں، جس پر ثمرات مرتب ہوں، وہ تو ثمرات کا خیال کرتے ہوئے بھی شرماتا ہے، ایسا شخص صرف فضل کا امیدوار ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۱۸)

صوفیاء کے اشغال کی مثال حضور کریم ﷺ کے خندق کی کھدوائی کی سی ہے

ایک مولوی صاحب نے مثنوی شریف کے اس مصرع کا مطلب دریافت کیا۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند

اس پر فرمایا کہ اس سے مولانا کی مراد (تصوف کے) اشغال نہیں ہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی نامرضیات سے پرہیز کرنا ہے۔ تصوف میں موجودہ اشغال تو صوفیہ نے بہت آخر زمانہ میں جوگیوں سے لئے تھے۔ اور اس میں کچھ حرج بھی نہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اہل فارس کی حکایت سن کر اس کی افادیت کی بنا پر خندق کھدوائی اور اشغال تو بہت ادنیٰ درجہ کی چیز ہیں اور آجکل تو بزرگوں نے اکثر انہیں چھوڑ دیا ہے، کیونکہ لوگوں پر ضعف غالب ہے اور اشغال سے دماغ، معدہ وغیرہ سب خراب ہو جاتے ہیں، بعض لوگ اس میں ہلاک ہو گئے اور مولانا روم کے زمانہ میں تو اشغال تھے بھی نہیں۔ یہ تو بہت آخر زمانہ کی ایجاد ہے۔ (صفحہ ۲۱۸)

اپنی حالت کے پیش نظر استحقاق کا دعویٰ کیسے؟

فرمایا، بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں ذکر و شغل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تھوڑا وقت گذرنے کے بعد وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں اتنے دن ہو گئے، کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ کیا خدا تعالیٰ کے ذمہ تمہارا قرض ہے اور کیا ان پر تمہارا استحقاق ہے، اس صورت میں

ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے وعدہ ہے، اس لئے اس کے مطابق ہمیں ملنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کون سا وعدہ پورا کر رہے ہیں، تمہاری طرف سے ایفا نہ کرنے کی صورت میں خدائے تعالیٰ کا کوئی وعدہ ہی نہیں، چنانچہ ارشاد ہے: "اوفو بعهدی اوف بعهدکم" تم میرے عہد کو پورا کرو تو میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ کچھ ملنے کی تمنا یہ حقیقت میں کبر ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ جب کہ ہمیں اپنی حقیقت کی خبر نہیں، اگر ہمیں اپنی حقیقت کا علم ہوجائے تو پانچ وقت کی نماز کی توفیق ہونے پر بھی ہمیں تعجب ہو۔ اور معلوم ہو کہ ہم تو اس قابل بھی نہ تھے، یہ محض ان کا فضل ہے کہ انہوں نے ہمیں اس کی بھی توفیق دی ہوئی ہے، اگر کوئی شخص کسی امیر کے یہاں سڑا ہوا خربوزہ لے جائے اور انعام کے استحقاق کا دعویٰ کرنے لگے تو اس کی کیا گت بنے گی، ظاہر ہے وہ ذلت کے ساتھ نکال دیا جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہ ہمیں سڑے ہوئے پر بھی انعام دیتے ہیں اور اپنے دربار سے نہیں نکالتے، ہمیں اس چیز کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ درجات کیسے؟ اس کا تو ہمیں وہم بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خطرہ ہونا چاہیے کہ جوتیاں نہ لگیں، جس کے ہم مستحق ہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص فوجداری کا مجرم ہو اور وہ جیل خانہ کا مستحق ہو اور حاکم اس پر رحم کھا کر اسے بری کردے اور وہ صاحب کہنے لگے کہ مجھے گاؤں تو ملے ہی نہیں تو اسے کہا جائے گا کہ تیرا گاؤں ملنا تو یہی ہے کہ تو جیل خانہ سے بچ گیا۔ (صفحہ ۲۱۹)

اصلاح کے عمل کا، تقلید محض سے ہونا

فرمایا، ذوق پیدا ہوتا ہے، اہل اللہ کی صحبت اور ان کی جوتیاں سیدھی کرنے سے، جو عقیدت کے ساتھ ہو، کیونکہ یہاں محض تقلید سے کام چلتا ہے، چون و چرا کرنے سے کام نہیں چلتا۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

جیسے کوئی بچہ استاد کے سامنے الف، ب لیکر بیٹھے اور استاد پڑھائے الف اور ب کہو اور بچہ کہنے لگے کہ الف کی صورت ایسی کیوں ہوئی اور ب کے ایسی کس واسطے ہوئی تو استاد اس سے کہے گا کہ تو اپنے گھر کا راستہ لے۔ بات یہ ہے کہ ہر معاملہ میں ابتدا تقلید محض

سے ہوتی ہے۔ (صفحہ ۲۲۰)

طالب کی نیت کیا ہونی چاہیے

فرمایا، طالب کی نیت تو رہبر بننے کی بھی نہ ہونی چاہیے، بلکہ یہ نیت ہونی چاہیے کہ ہمیں راستہ نظر آئے۔ اور رہبر بننے کی نیت طریقت میں شرک ہے، بلکہ بزرگ بننے کی بھی نیت نہ ہونی چاہیے، اگر یہ نیت ہے تو وہ شخص غیر حق کا طالب ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرے۔ (صفحہ ۲۲۰)

آداب طریقت کی خلاف ورزی کے نتائج

فرمایا، ایک بات سمجھ لینے کے قابل ہے کہ احکام شریعت کی خلاف ورزی سے تو آخرت میں عذاب ہوگا۔ اور آداب طریقت کی خلاف ورزی سے معصیت نہیں ہوتی۔ مگر دنیوی نقصان ہوجاتا ہے۔ آخرت کا ضرر نہ ہوگا، اگرچہ کبھی بواسطہ آخرت میں بھی محرومی ہوجائے گی۔ کیونکہ اس مخالفت کا پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اللہ کا نام لینے کی حلاوت جاتی رہتی ہے۔ پھر تعطل ہوجاتا ہے، اس کے بعد مستحب چھوٹ جاتا ہے پھر ترک سنت واجبات۔ یہاں تک کہ سلب ایمان کی نوبت آجاتی ہے، اگر اس حالت میں بھی ہمت سے شریعت پر عمل کی کوشش ہوتی رہے تو آخرت کا نقصان نہیں، مگر انشراح و راحت واطمینان نصیب نہ ہوگا۔ یہ غلط ہے کہ پیر کے ناراض ہوجانے سے اللہ میاں ناراض ہوں گے۔ اور آداب طریقت سے کوئی ادب غامض نہیں، پیر کو مکدر نہ کیا جائے، اس پر اعتراض نہ ہو۔ پیر سے غلطی ہوجانے پر نصیحت کی جائے، مگر ادب سے کی جائے۔ (صفحہ ۲۲۳)

غیر ضروری باتوں سے احتراز

فرمایا، جس چیز میں کوئی فائدہ نہ ہو، اس کو ترک کردینا چاہیے، جو ایسا کرے گا، اسے حلاوت کی زندگی حاصل ہوگی دنیا و آخرت اسے دونوں کا خیر حاصل ہوگا لایعنی باتوں میں بڑا وقت برباد ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۲۳)

مذمت جاہ

فرمایا، بڑے بننے میں لوگوں کو لذت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ چھوٹے ہونے میں حظ ہے، کیونکہ بڑے بننے میں سارے بار اس شخص پر آجاتے ہیں۔ ہاں اگر منجانب اللہ کوئی

خدمت اس کے سپرد ہو جائے تو اس کی اعانت ہوتی ہے اور خود بڑا بننے میں اللہ کی طرف سے اعانت نہیں ہوتی۔ مولانا روم بڑے بننے کی مذمت فرماتے ہیں۔

خویش رنجور سازو زار زار
تاترا بیرون کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم است
بند این از بند آہن کے کم است

اور جبکہ وہ بڑائی جو کہ بلا ارادہ خود بخود حاصل ہو، وہ بھی موجب خطرہ ہے تو خود بڑا بننے کا تو کہنا ہی نہیں اور ایسے لوگ کم ہیں کہ انہیں بڑے بننے کے مواقع اور سامان حاصل ہو، اس کے باوجود وہ کبر کے اثرات سے محفوظ ہوں۔ (صفحہ ۲۲۴)

خطبوں کے درمیان دعا کی ترکیب

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ خطبوں کے درمیان جب امام جلسہ کرتا ہے تو اس وقت دعا مانگنا درست ہے یا نہیں۔ فرمایا، زبان کی حرکت کے بغیر دعا کرنا جائز ہے۔ سکوت واجب ہے اور دعا و سکوت اس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ (صفحہ ۲۲۴)

فنائے نفس کے بغیر وسوسوں کا دور نہ ہونا

ایک عورت نے ایک رشتہ دار کے توسط سے یہ شکایت کی کہ ان کے دل میں وسوسے بہت آتے ہیں، اس لئے کوئی وظیفہ بتلایئے۔ فرمایا، طبعی حالات نہیں بدلتے، جب تک فنائے نفس حاصل نہ ہو۔ کمال یہ ہے کہ وسوسے بھی ہوں اور پھر کام کیا جائے۔ طالب کو یہ دھوکہ نہ دینا چاہیے کہ فلاں وظیفہ سے ان کے وسوسے دور ہو جائیں گے۔ طبعی تقاضے کیسے دور ہو سکتے ہیں، اس کہنے سے کہ فلاں وظیفہ سے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اگر دور نہ ہوئے تو وہ اللہ کا نام لینا چھوڑ دے گا کہ اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ان کو چاہیے کہ کلمہ پڑھیں۔ استغفار کریں، جتنی تسبیح آسان ہو، اس قدر پڑھیں پھر مجھ کو اطلاع دیں۔ (صفحہ ۲۲۵)

فاتحہ کے بارے میں عوامی عقائد کی خرابیاں

فرمایا، بدعات میں اکثر لوگوں کے عقائد خراب ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے

عقیدہ میں یہ بات شامل ہے کہ بزرگ اللہ میاں کے کام میں سہارا دیتے ہیں۔ ایک تعزیہ میں اولاد کے بارے میں عرضی لٹکی ہوئی تھی کہ اے امام حسین، مجھے لڑکا دے دیجئے۔ اور اس کے ساتھ ایک پتلا بھی بنا کر اس میں رکھا ہوا تھا، گویا نمونہ بتلایا تھا کہ لڑکا ایسا ہو، یہ تو ایک جاہل عورت کا فعل تھا، مگر تعجب ہے کہ ایک مقام پر ایک تحصیلدار صاحب نے عرضی لٹکائی تھی کہ اے امام حسین لڑکا دیجئے۔ ایک ظریف اس کے نیچے لکھ آئے۔

زمین شورہ سنبل برنیارد
درو تخم عمل ضائع مگردان

یعنی تمہاری یہ بی بی بانجھ ہے، اس سے ہرگز اولاد نہ ہوگی، جب تک دوسرا نکاح نہ کرو گے اور نیچے لکھ دیا، راقم امام حسین۔

(۲) ایک جگہ دو طالب علموں میں بحث ہو رہی تھی، ایک تو یہ کہتے تھے کہ لوگ بڑے پیر کی نیاز دلاتے ہیں، یہ اختلاف محض لفظوں میں ہے، باقی اس میں ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ نیاز تو اللہ کی ہے اور اس کا ثواب فلاں بزرگ کو پہنچ جائے۔ دوسرے کہتے تھے کہ نہیں عقیدہ میں بزرگوں کے نام کی نیاز ہوتی ہے، یہی گفتگو ہو رہی تھی، اتفاق سے ایک بڑھیا آگئی اور کہا کہ بڑے پیر کی نیاز دے دو۔ جو شخص کہہ رہے تھے کہ عقیدہ میں بھی بزرگوں کی نیاز دی جاتی ہے۔ انہوں نے اس بڑھیا سے کہا کہ نیاز تو دوں، اللہ کی اور ثواب پہنچاؤں، بڑے پیر صاحب کو، وہ بڑھیا کہتی ہے نہیں۔ اللہ میاں کی نیاز تو میں الگ دلواؤں گی، یہ تو بڑے پیر کی نیاز ہے۔ جب انہوں نے اپنے مقابل سے کہا کہ دیکھئے، آپ کی بڑھیا کس تصریح سے آپ کی تاویل کو جھٹلا رہی ہے۔ جس میں خلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ (صفحہ ۲۲۳)

(۳) ایک طالب علم دوسرے طالب علم سے نقل کرتے تھے کہ ایک عورت ان کو فاتحہ کے لئے بلا کر لے گئی۔ کھانا تو تھا ہی، اس کے ساتھ افیون، چانڈو، حقہ وغیرہ بھی تھا، جب فاتحہ خوانی شروع کی تو اس عورت نے کہا کہ میاں نیچے کو مت دیکھنا، مگر طالب علم تھا شوخ، نیچے جو دیکھا تو وہ عورت ننگی تھی، وہ خفا ہوئی کہ ہم نے تو منع کر دیا تھا، آخر وجہ پوچھی تو کہا جیسے مُردہ کو اور چیزوں سے رغبت تھی، اس سے بھی رغبت تھی، کیا حد ہے اس زیادتی کی۔

(۴) ایک سب انسپکٹر بیان کرتے تھے کہ میرے یہاں تھانہ میں رپورٹ داخل ہوئی کہ میری فاتحہ کوئی شخص چرا لے گیا، چنانچہ میں تحقیقات کو گیا، معلوم ہوا کہ ایک نلکی میں پیر

جی نے فاتحہ بند کر کے دیدی تھی اور روئی کی ڈاٹ لگادی تھی کہ جب فاتحہ دینا ہو تو اس نلکی کو کھول کر کھانے پر جھاڑ دیا کرو۔ سال کے بعد وہ بدل جاتی تھی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص فاتحہ وغیرہ احتیاط سے کرے، جواب میں فرمایا، رسوم کے بغیر کریں اور ایک بات اور قابل غور ہے کہ کھانا سامنے رکھ کر جو فاتحہ دیتے ہیں، یہ عقل کے خلاف ہے، کیونکہ کسی چیز کے ثواب ملنے کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے عمل کریں کہ اس کا ثواب اپنے کو ملے، اس کے بعد دعا کریں کہ یا اللہ، جو ثواب مجھ کو ملا ہے، وہ فلاں کو پہنچ جائے، اس بنا پر صورت یہ ہونی چاہیے کہ پہلے کھانا مستحقین کو دے دیں کہ ثواب اس کا اپنا ہو جائے، پھر دعا کریں کہ اے اللہ، دوسرے کی طرف اس کو منتقل فرمادیں، اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ کھانے پر فاتحہ دینے کے کچھ معنیٰ ہیں، بلکل لغو حرکت ہے، دوسرے یہ کہ فاتحہ میں کُل کھانا سامنے نہیں رکھتے، تھوڑا سا رکھتے ہیں اور اس پر فاتحہ دیتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اتنے ہی کھانے کا ثواب پہنچانا مقصود ہے یا کل کا، صرف اسی مقدار کا مقصود ہونا تو ان کے نزدیک بھی نہیں اور جب سارے کا ثواب پہنچانا مقصود ہے تو سوال یہ ہے کہ جب وہ سامنے نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ سامنے رکھنا شرط نہیں پھر یہ تھوڑا کیوں سامنے رکھا گیا، کیا اللہ میاں کو نمونہ دکھاتے ہیں، یہ بھی لغو حرکت ہے۔

وقار اور تکبر کے درمیان فرق

ایک شخص نے دریافت کیا کہ وقار و تکبر میں کیا فرق ہے۔ فرمایا، کہاں تکبر، کہاں وقار، تکبر کہتے ہیں، اپنے کو بڑا سمجھنا اور دسروں کو حقیر سمجھنا، وقار کے معنیٰ ہیں ایسی حرکتیں نہ کرنا جو واقع میں خفیف ہوں اور وقار میں یہ بات شامل نہیں کہ دوسروں کو حقیر سمجھا جائے، بلکہ وقار تو تواضع کا ایک شعبہ ہے۔ جس قدر انکسار بڑھتا جائے گا۔ سکون و سکوت کی شان بڑھتی جائے گی۔ تواضع کے لئے وقار لازم ہے اور تواضع تکبر کی ضد ہے۔ (صفحہ ۲۳۶)

اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور اہل باطل کو حقیر سمجھنا

فرمایا، حق پر گامزن شخص کی دو حالتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اسے نعمت سمجھ کر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، دوسری حالت یہ ہے کہ حق کی وجہ سے فرد ناز کرنے لگے، یہ جہل ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً ایک چیز ہے، جس پر دو شخص قابض ہیں، مگر ایک شخص تو اس کا مالک ہے، دوسرا محض تحویلدار ہے، سو مالک تو ناز کرسکتا ہے، مگر تحویلدار نہیں کرسکتا،

بلکہ اسے تو یہ اندیشہ لگا رہے گا کہ ناز کرنے سے کہیں مالک مجھ سے چھین نہ لے۔ اسی طرح اگر کسی نعمت پر بندہ میں کسی خوف کی کیفیت طاری ہے کہ کہیں مالک حقیقی اس نعمت کو سلب نہ کرے تو یہ شکر ہے کہ فرد سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے دوسری صورت میں یہ کبر ہے۔ پس اہل حق کو چاہیے کہ وہ ترساں و لرزاں رہیں، اہل باطل کو حقیر اور اپنے کو بڑا نہ سمجھیں۔ (صفحہ ۲۳۷)

اپنے عیبوں کا مراقبہ

فرمایا، فرد کو چاہیے کہ اپنی حقیقت پر غور کیا کرے اور سوچا کرے کہ لوگ جو برائیاں میری طرف منسوب کرتے ہیں، میں تو اس سے بھی زیادہ بُرا ہوں۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے میرے اصل عیوب کو چھپا لیا ہے، میرے عیوب تو اس سے بھی زیادہ ہیں، پھر برا کیوں مانے۔ جس طرح کوئی اندھے کو کانا کہہ دے تو اسے شکر گذار ہونا چاہیے، اگر خوش بھی نہ ہو تو اسے اس بات میں تو نہ پڑنا چاہیے کہ مجھے کیوں برا کہا گیا ہے۔ اور اس میں کون کون افراد شامل ہیں۔ اور کیا معنیٰ ہوا، برا کہنے کا اور اس کا دفعیہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ (صفحہ ۲۳۸)

یا شیخ عبدالقادر اور مولود کے بارے میں تحقیق

ایک شخص یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ پڑھتے تھے، فرمایا، میں نے ان سے کہا، جب شیخ نہ تھے تو لوگ کیا پڑھتے ہوں گے اور خود حضرت شیخ کیا پڑھتے تھے۔ وہ چیز تو یقیناً بڑھ کر ہوگی، اس سے جس کی بدولت حضرت غوث اعظم اس مرتبہ کو پہنچے تو وہی چیز کیوں نہ پڑھی جائے، درۃ المعارف میں لکھا ہے کہ میں ایک بار پڑھ رہا تھا یا شیخ عبدالقادر شیئاً اللہ، آواز آئی کہ کہو یا ارحم الراحمین شیئاً اللہ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمہ کسی نے غلبہ حال میں کہا ہوگا۔ اصل تو اس کی یہ ہے، لیکن اب وہ رائج ہو گیا ہے۔ بعض باتیں رسم ہو گئیں، اگرچہ ابتدا میں غلبہ حال میں صادر ہوئی تھیں، جیسے قیام مولود اس کی اصل بھی یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی مجلس میں اتفاقاً ذکر شریف میں کسی کو وجد ہوا، اور وہ اسی حالت میں کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے، جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو وجد ہو اور وہ کھڑا ہو جائے تو سب کو کھڑا ہونا چاہیے، تاکہ اس کو انقباض نہ ہو۔ لیکن اب وہ رسم

ہوگئی ہے۔ (صفحہ ۲۴۲)

نسبت وہابی کی تکذیب

فرمایا، میں نے ایک صاحب سے کہا تھا کہ تم جو ہمیں وہابی کہتے ہو، ہمیں ابن عبدالوہاب سے کیا نسبت ہے۔ حالانکہ نسبت تین قسم کی ہے، پہلی نسبت شاگردی کی ہے، وہ تو ہمارے سلسلہ اساتذہ میں شامل نہیں۔

دوسری نسبت بیعت کی ہے، یہ بھی نہیں، تیسری نسبت نسب کی ہے، سو وہ ہمارے بڑوں میں بھی نہیں، تو ایسی صورت میں ہمیں ان کی طرف نسبت کرنے میں کیا تم سے مواخذہ نہ ہوگا۔ اب تو نسبت کرنے والے یہ معنیٰ لیتے ہیں کہ ہم افعال میں اس کے متبع ہیں، مگر یہ بھی تہمت ہے، کیونکہ ہمیں تو عبدالوہاب کی تاریخ بھی معلوم نہیں، ہماری مجلس میں کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں آتا، نہ بطور مدح کے، نہ بطور قدح کے۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہابی کے معنیٰ آج کل یہ ہیں کہ جو شخص مروجہ رسوم کے خلاف کرے، وہ وہابی ہے اور عوام کے نزدیک وہابی بے ادب کو سمجھا جاتا ہے۔ (صفحہ ۲۴۳)

گیارہویں کی مٹھائی کے بارے میں موقف

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر گیارھویں کی مٹھائی آئے تو اس کو کیا کرے، فرمایا لیکر کہیں دفن کردے اور رد کرنے میں عوام کے اندر اشتعال کا اندیشہ ہے، جہلا عوام الناس کو مشتعل کرنا ٹھیک نہیں۔ اس کی تائید میں کہ عوام میں اشتعال مناسب نہیں۔ ایک حکایت بیان کی کہ ایک زمانہ میں مسئلہ مولد کے متعلق کانپور میں میری تردید کے لئے علماء کو باہر سے بلاکر ان سے بیان کرایا جاتا تھا، مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی بھی تشریف لائے، ان سے بھی میرے رد کی درخواست کی گئی، انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ میرا پیر بھائی ہے، میں ایسا نہ کروں گا۔ اسی زمانہ میں ایک صاحب نے خواب دیکھا کہ حضور ﷺ کی خدمت میں بڑا مجمع ہے۔ اور اس زمانہ میں کانپور کے لوگوں میں یہی شور ہو رہا تھا، صاحب رویا نے حضور ﷺ سے دریافت کیا، ان مسائل میں حق کیا ہے تو فرمایا کہ اشرف علی جو کہتا ہے، وہ حق ہے، پھر حضور ﷺ نے آہستہ سے یہ بھی فرمایا کہ اس سے کہہ دینا، یہ وقت اس کا نہیں ہے، مطلب یہ تھا کہ عوام الناس میں چونکہ شورش پھیلتی ہے، اس لئے خاموشی کی رخصت ہے۔ (صفحہ ۲۴۴)

اخلاص کی علامت

فرمایا، کسی کام میں اخلاص کی علامت یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص وہی کام کرنے کے لئے تیار ہوجائے تو متعلقہ شخص کو وہ کام چھوڑ دینا چاہیے، بشرطیکہ وہ شخص اہل بھی ہو۔ لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مدرسہ پہلے سے موجود ہو، اگر دوسرا مدرسہ شروع ہوجائے اور یہ معلوم ہو کہ وہ اچھا کام کرے گا تو اس کے اکھاڑنے کی فکر کی جاتی ہے، کیونکہ دنیا کی منفعت پیش نظر ہے۔ (کہ اس سے چندہ کم ہوجائے گا) (صفحہ ۲۴۴)

خشوع خضوع کی تحقیق

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ خشوع وخضوع میں عطف آیا تفسیری ہے۔ فرمایا خشوع کا تعلق قلب سے ہے اور خضوع کا تعلق جوارح سے ہے، خشوع کے معنیٰ سکون کے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں ہے "تری الارض خاشعة" عمل میں خشوع یہ ہے کہ قلب میں سکون ہو یعنی غیر مقصد چیزوں میں فکری حرکت نہ ہو اور جو چیز موصل الی اللہ نہ ہو، وہ غیر مقصود ہے۔ اگرچہ مقصود بالذات نہ ہی، اگرچہ ظاہر میں وہ غیر معلوم ہو، چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نماز میں فوج کی ترتیب وتشکیل کرتا ہوں تو وہ تجہیز منافی جیش نہ تھی جیسا کہ ظاہر معلوم ہوتا ہے، اسی بناء پر ایک مولوی صاحب نے کہا، پھر تو خشوع کی ضرورت نہیں، کیونکہ حضرت عمرؓ نماز میں تجہیز جیش فرماتے تھے، اس پر حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ یہ خشوع کے منافی نہیں، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے وزیر دربار میں جاتا ہے اور امور سلطنت کو پیش کرتا ہے تو امور حضوری بادشاہی کے خلاف نہیں سمجھے جاتے، کیونکہ اس کی حضوری یہی ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضہ کو خیال کیجئے، کیونکہ ان کے سپرد یہی کام تھا۔ (صفحہ ۲۴۶)

تعویذ کے بارے میں نقطہ نظر

فرمایا، تعویذ کے بارے میں عوام الناس کا اعتقاد حد سے بڑھ گیا ہے۔ اس لئے طبیعت تعویذ دینے کو نہیں چاہتی۔ جیسے اہل سائنس کا اعتقاد ہے کہ ہر چیز میں ایک تاثیر رکھ دی گئی ہے، اس کے مخالف نہیں ہوسکتا اور تاثیر رکھ دینے کے بعد نعوذ باللہ، اللہ میاں کو بھی قدرت نہیں رہی کہ اس کے خلاف ہوسکے۔ مثلاً آگ کے اندر جلانے کی تاثیر رکھ دی ہے،

اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آگ نہ جلائے، اسی طرح تعویذ کے بارے میں عوام الناس کا اعتقاد ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ جب تعویذ باندھا ہے تو بس غرض سے باندھا ہے، اس کے خلاف ہی نہ ہوگا اور اگر خلاف ہوجائے تو یہ احتمال ہی نہیں ہوتا کہ تعویذ کا اثر غیر لازم ہے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ شرط میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ میں تو تعویذ دینے میں اللہ کی طرف دعا کے ساتھ توجہ کرتا ہوں۔ حضرات انبیاء کا بھی یہی طریقہ تھا کہ وہ رجوع الی اللہ کرتے تھے کہ لوگوں کی اصلاح ہوجائے، نہ یہ کہ ان کے قلوب پر تصرف کرتے تھے اور زور ڈالتے تھے کہ قلوب کو اپنی طرف پھیرلیں۔ بخلاف عامل کے کہ وہ تو توجہ اس طرح کرتے ہیں کہ میں خود مریض کے مرض کو نکال رہا ہوں۔ (صفحہ ۲۴۶)

جنت و دوزخ کا موجود ہونا

فرمایا، ان الاخرۃ لھی الحیوان. ان سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیواۃ ہے کیونکہ زیادہ مستعمل حیوان بمعنیٰ مصدر ہے، یہ ایسا ہے جیسے زید، عدل، اور اگر صفت بھی ہو بمعنیٰ ذی حیات ہوگی۔ پس وہاں کی درو دیوار میں بھی زندگی ہوگی۔ دیواریں گائیں گی۔ ان سے نغمات پیدا ہوں گے۔ جنت گائیں گے۔ باقی جنت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہے۔ اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے، یہی صوفیہ کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک دوزخ بھی ذی حیات ہے۔ دلیل یہ ہے کہ وہ "ھل من مزید" پکارے گی، نیز اس میں اور بھی حیات کے آثار پائے جاتے ہیں، نیز بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی شکل اژدہے کی سی ہے۔ اس کے پیٹ میں سانپ بچھو کنکھجورے وغیرہ ہیں۔ اس سے ایک حدیث کے معنیٰ بلاتاویل کے سمجھ میں آجائیں گے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جائے گی، جس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوئے ہوئیں گے، مگر وہ پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور 'ھل من مزید' پکارتی ہوگی۔ (صفحہ ۲۵۰)

نیند کا علاج

فرمایا، نیند کا اصل علاج یہ ہے کہ پانی کم پیئو، ستر اہل مجاہدہ کا قول ہے کہ نیند کا مادہ پانی سے ہے۔ اس کو امام غزالی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر نیند آئے تو سیاہ مرچ چبالو اور دن کو سویا کرو۔ (صفحہ ۲۵۰)

سامان دنیا کی مذمت نہیں، بلکہ خاص درجہ میں ان کی محبت قابل مذمت ہے

فرمایا، اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ دنیا کمانا الگ چیز ہے، جب کہ دنیا کی محبت دوسری چیز ہے، جو مذموم ہے، ضرورت کے مطابق دنیا کمانا جائز ہے جس اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث" اس آیت میں مرغوب چیزوں کی فہرست تو بیان فرمائی، مگر فی ذاتہا ان کی مذمت نہیں فرمائی، بلکہ اس کے بعد دنیا کی ان چیزوں سے زیادہ اچھی چیز کا پتہ بتادیا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہیں تو یہ ساری چیزیں اچھی، مثلاً عورتیں اور اولاد وغیرہ سب بہتر چیزیں ہیں، مگر دوسری چیز ان سے زیادہ بہتر ہیں، اس لئے تم ان ہی چیزوں پر بس مت کرو، کیونکہ ذالک متاع الحیواۃ الدنیا، یعنی یہ تو صرف دنیا کا سامان ہے، بلکہ ان سے زیادہ بہتر چیز کو طلب کرو، چنانچہ آگے فرماتے ہیں، "قل اؤنبئکم بخیر من ذالکم للذین اتقوا عند ربھم جنت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا وازواج مطھرۃ ورضوان من اللہ واللہ بصیر بالعباد۔" یعنی کہئے اے محمد ﷺ، کیا میں تم کو ان سے بہتر چیز کی خبر نہ دوں جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لئے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک کی ہوئی بیبیاں ہیں اور اللہ کی رضامندی ہے۔ سبحان اللہ، کیا بلاغت ہے، حکماء کی تعلیم اس درجہ کی کہاں ہوسکتی ہے، وجہ یہ ہے کہ یہاں تو حکمت کے ساتھ شفقت بھی ہے، شفیق کی تعلیم سے نفع ہی دوسرا ہوتا ہے، نری حکمت کی تعلیم میں وہ نفع کہاں، غرض حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان چیزوں کی مذمت نہیں فرمائی، البتہ ان کی خاص درجہ کی محبت کی مذمت فرمائی کہ ان میں اس قدر انہماک ہوجائے کہ ان سے جو اچھی چیز ہے، اس سے بالکل غفلت ہوجائے یعنی آخرت سے بے فکری ہوجائے اور دنیاوی چیزوں پر اطمینان ہوجائے۔ (صفحہ ۲۵۲)

دنیا کے ظاہری نقش و نگار کی مثال

فرمایا، دنیائے مذموم وملعون کی مثال ایسی ہے، جیسے کوڑے پر سبزہ جما ہوا ہو، جسے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ ایک چمن ہے اور اس کے ظاہری رنگ و روپ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوجائے اور جب وہاں پہنچے تو پاخانہ بھرا ہوا نظر آئے۔ یہی حال دنیا کا ہے کہ اس کا ظاہر تو

بہت بھلا ہوتا ہے، مگر اس کے اندر نجاست بھری ہوئی ہے یا دنیا کی مثال خوبصورت سانپ کی سی ہے، جس کا ظاہر تو اچھا ہے، نقش ونگار سے آراستہ ہے، مگر اندر زہر بھرا پڑا ہے۔

زہر ایں مار منقش قاتل است
باشد ازوے دور ہر کو عاقل است

اگر بچے کے سامنے سانپ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے، اسے یہ خبر نہیں کہ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے، مگر اس کا انجام کیا ہوگا۔ ہماری حالت بھی اس بچے کی سی ہے کہ ہم دنیا کے ظاہری آب وتاب اور نقش ونگار اور رنگ وروپ پر فریفتہ ہیں اور اندر کی خبر نہیں۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جتنا زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، اسی قدر زہریلا ہوتا ہے، اس لئے حقیقت شناس افراد دنیا کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ (صفحہ۲۵۳)

حرص کا علاج

فرمایا، حق تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ اپنی شہوت کو فنا کردو اور حرص کو بالکل زائل کردو، بلکہ فرمایا ہے کہ شہوت اور حرص کو باقی رکھ کر انہیں دنیا سے عمدہ چیز یعنی آخرت کی نعمت کی تحصیل کی طرف مائل کردو۔ پس حرص کا علاج یہی ہے۔ (صفحہ۲۵۳)

غم کا علاج

فرمایا، حد سے زیادہ رنجیدہ ہونا گناہ ہے اور گناہ بھی بے لذت اور اس کا علاج واجب ہے۔ چنانچہ اس آیت "ماعندکم ینفد وما عنداللہ باق" میں اس طرح کے غم کے علاج کا بیان ہے اور یہ بیان ایک مقدمہ پر موقوف ہے، وہ یہ کہ اگر مرغوب کے جاتے رہنے سے غم لاحق ہو، مگر ہمیں کسی ایسی چیز کا پتہ مل جائے اور اس کے ملنے کا یقین ہوجائے، جو اس مرغوب شے سے ہزار درجہ بڑھ کر ہو تو جانے والی چیز کا غم نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً کسی کے ہاتھ میں ایک پیسہ ہو اور دوسرا شخص اس سے وہ پیسہ چھین لے اور اس کے بدلے میں اسے ایک روپیہ دے دے تو ظاہر ہے کہ اسے پیسہ کا غم بالکل نہ ہوگا، بلکہ اگر وہ شخص بدلنا چاہے تو یہ بدلنے پر بھی راضی نہ ہوگا۔ یہی بات ہمیں اس آیت میں بتلائی گئی ہے کہ جو چیزیں ہمارے پاس ہیں، وہ اگرچہ ہمیں انتہا درجہ مرغوب ہیں، مگر وہ سب فنا ہونے والی ہیں، اس لئے ہمیں حکم ہے کہ تم ان مرغوب چیزوں پر قناعت نہ کرو، بلکہ جو چیزیں ان سے

زیادہ اچھی ہیں اور باقی رہنے والی ہیں، ان کی رغبت کرو، اس طرح فانی چیز کا غم مغلوب ہوجائے گا۔

اصل علاج یہ ہوا کہ آخرت کی پسندیدہ چیزوں پر نظر کرکے دنیا کی مرغوبات کی طرف زیادہ توجہ نہ کرو تو غم غلط ہوجائے گا۔ (صفحہ۲۵۴)

موت محبوب سے ملاقات کی پل ہے

فرمایا، لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسان مرجاتا ہے اور اسے قبر میں دفنایا جاتا ہے، وہاں وہ وحشت کدہ میں تنہا پڑا رہتا ہے اور اس طرح کی زندگی عدم حیات کی سی ہے۔ صاحبو، ایسا نہیں ہے، بلکہ مسلمان کے لئے وہاں بڑی راحت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ارواح نئے آنے والی روح کا استقبال کرتی ہیں یعنی اس کے عزیز اقرباء جو اس سے پہلے چلے گئے ہیں، وہ اس سے ملتے ہیں اور اس سے دوسرے متعلقین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ فلاں شخص تو مرگیا ہے، تو کہتے ہیں، افسوس وہ دوزخ میں چلا گیا ہے، ورنہ ہم سے ضرور ملاقات ہوتی اور اس سے ان کو غم ہوتا ہے۔ غرض موت کے بعد مردے اس طرح باہم خوش ہوکر ملتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ بس مرنے کے بعد الو کی طرح پڑے رہیں گے لاحول ولا قوۃ الا باللہ، یہ بات نہیں۔ قبر اس گڑھے کا نام نہیں ہے، یہ تو قبر کی صورت ہے، جب کہ حقیقت میں قبر عالم برزخ کا نام ہے، وہاں سب جمع ہوتے ہیں اور وہ پاکیزہ لوگوں کا مجمع ہے۔ دنیا میں تو آپس میں جدائی بھی ہوسکتی ہے، جیسے کوئی فرد ملازمت سے رخصت لیکر آئے اور اپنے عزیزوں کے پاس رہے۔ جب رخصت ختم ہوگی تو جدائی ہوجائے گی، تو دنیا کا اجتماع تو ایسا ہے۔ لیکن وہاں کی یکجائی ختم نہیں ہوتی، وہاں تو عیش ہی عیش ہے۔ بات یہ ہے کہ حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کو موت سے وحشت ہوگئی ہے ورنہ موت تو محبوب سے ملاقات کے لئے پل ہے۔ (صفحہ۲۵۶)

موت کے بعد کی وسیع زندگی کا کچھ تذکرہ

دنیا کی مثال آخرت کے سامنے ماں کے رحم کی سی ہے، جب تک بچہ ماں کے رحم میں رہتا ہے سب کچھ اسی کو سمجھتا ہے، اس وقت اگر اسے کہا جائے کہ اس سے زیادہ فراخ جگہ بھی موجود ہے تو وہ یقین نہ کرے گا اور باور کرے گا کہ سب کچھ یہی ہے۔ مگر جب وہ باہر آتا ہے تو ایک بڑا عالم دیکھتا ہے کہ رحم کو تو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ اور اب اگر اس

سے کہا جائے کہ وہ رحم میں واپس جائے تو وہ اسے کبھی منظور نہ کرے گا اور دنیا سے ہرگز واپس جانا نہ چاہے گا۔ جب خدا کے پاس پہنچنے کا وقت قریب آتا ہے اور اس عالم کی چیزوں کا انکشاف ہوتا ہے تو اس وقت اگر مومن کو کوئی حیات افزا چیز دے کر کہا جائے کہ لو، اسے کھالو، تاکہ تم مدت دراز تک زندہ رہو تو اسے وہ لات مار دے گا کہ فوراً مرجاؤں۔ چنانچہ یہاں ایک پردیسی طالب علم طاعون میں مبتلا ہوئے، لوگ ان کو تسلی دیتے تھے کہ تم اچھے ہوجاؤ گے، مگر وہ یہی کہتے تھے کہ یوں نہ کہو، اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے اور اس وقت اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے۔ "تتنزل علیهم الملائکة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون" اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے لئے بادشاہ کی طرف سے وزارت کے عہدہ کا پیام آئے اور وہ شخص اپنے گھر سے پائے تخت شاہی کی طرف چلے تو اگرچہ اس کے گھر والے اس کی جدائی سے غمگین ہوں گے مگر وہ شخص یقیناً شاداں وفرحاں ہوگا، اگر اس حالت میں بادشاہ کی طرف سے یوں ارشاد ہو کہ اگر تم چاہو تو تمہیں اتنے روز کی مہلت بھی مل سکتی ہے تو وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہوگا۔ اسی طرح جب آخرت کی راحت کا علم ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ ہوجاتا ہے تو اس وقت اگر اسے دنیا میں رہنے کو کہا جائے تو ہرگز راضی نہ ہوگا۔ پس ماعندالله سے رغبت کرو اور اسی رغبت کی بدولت اہل الله ہر وقت شگفتہ رہتے ہیں اور ان کو وہاں کے متعلق قسم قسم کی تمنائیں اور امیدیں ہوتی ہیں، ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

کوئے نامیدی مرو کامید ہاست
ہاسوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

انہیں غم نہیں ہوتا' منصور کی یہ حالت ہوئی کہ جب ان کو دار پر لے جانے لگے تو وہ خوش ہوکر کہتے تھے:

اقتلونی یا ثقاتی
ان فی موتی حیاتی

غرض موت اہل الله کا کھیل ہے، ان کا مشغلہ ہے۔ پس ہمیں یہ حالت پیدا کرنی چاہیے کہ موت سے بجائے غم کے شوق پیدا ہو جس کا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ ان مضامین پر غور کرو جو میں نے اس وقت بیان کئے ہیں۔ انشاء الله اس سے غم کا بھی علاج ہوجائے گا

اور آخرت کا بھی شوق پیدا ہوگا۔ حق سبحانہ ن تعالیٰ نے ماعندکم ینفد وما عندالله باق۔ میں اسی کا علاج بتلایا ہے۔ سبحان الله، کیسا عجیب علاج ہے۔ اس کا مراقبہ کرو کہ آخرت میں جو راحت ہے، وہ دنیا سے بدرجہ بڑھ کر ہے اور مرنے والا ہمارے پاس سے خدا کے ہاں پہنچ گیا ہے اور یقیناً خدا کے پاس رہنا ہمارے پاس رہنے سے بہتر ہے، کیونکہ وہ الله ہم سے کہیں زیادہ اس سے محبت رکھتے ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں جتنی محبت تمام جانوروں اور انسانوں کو ماؤں کو اپنے بچہ سے ہے، ان سب سے بڑھ کر محبت حق تعالیٰ کو اپنے بندہ سے ہے۔ اور اگرچہ امکان کے درجے میں مرنے والے کے لئے وہاں کی سزا کا بھی احتمال ہے، مگر اپنے مسلمان عزیز کے ساتھ یہ بدگمانی کیوں کی جائے کہ خدانخواستہ مجرموں کی طرح تکلیف میں ہوگا، بلکہ ان کے بارے میں نیک گمان رکھا جائے۔ (بمقتضائے سبقت رحمتی علی غضبی) اور اس احتمال کے تدارک کے لئے دعا اور ایصال ثواب کرتے رہو یہ اس کے لئے غم کرنے سے زیادہ نافع ہے۔ (۲۵۸)

غیبت کی نوعیت اور اس کی تفصیل

فرمایا، غیبت اصل میں جہاں شرعی مصلحت نہ ہو، جائز نہیں اور جہاں شرعی مصلحت ہو، جائز ہے، مثلاً کسی فرد نے ظلم کیا تو حاکم سے اس کی شکایت کرنا جائز ہے۔ یا مثلاً ایک شخص کسی کو نوکر رکھنا چاہتا ہے حالانکہ وہ شخص چور ہے اور آقا کو اس کا علم نہیں تو اس کے بارے میں صحیح اطلاع دینا جائز ہے۔ البتہ غیبت کے ذریعہ اپنے غصہ کا فرو کرنا، یہ برا ہے اور بعض اوقات فرد کے سامنے مقصود تو اپنے صدمہ کا اظہار ہوتا ہے، مگر تاویل سے اس کا جواز نکالنے کی کاوش ہوتی ہے، فقہا اور علماء میں اس طرح کی غیبت بہت ہے، یہ بری چیز ہے۔ اس سے تو فاسق لوگوں کی غیبت اچھی ہے، کیونکہ وہ انہیں غیبت ہی نہیں سمجھتے اور فساق برا سمجھ کر کرتے ہیں۔ امام غزالی رضہ نے غیبت کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ اور کافر کی برائی جو کفر کے متعلق ہے وہ تو جائز ہے، اس کے علاوہ دوسری جائز نہیں۔ (صفحہ ۲۶۲)

اسم ذات کا ذکر

فرمایا، ابتداء میں اسم ذات کی کثرت دوسرے اشغال و اذکار سے زیادہ مناسب ہے۔ (صفحہ ۲۶۴)

معمولات، کا جاری رہنا کرامت سے زیادہ بہتر ہے

فرمایا، معمولات کا جاری رہنا یہ خود ایسا بلند حال ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی امر جدید کا نہ ہونا نقصاندہ نہیں کیونکہ اس جاری رہنے کو استقامت کہا جاتا ہے جو اکابر کی تصریح کے مطابق کرامت سے بہتر چیز ہے۔ فوق الکرامۃ ہے۔ (صفحہ ۲۶۶)

بے کار شخص کو شیطان گھیر لیتا ہے

فرمایا، مسلمانوں کو فرصت جتنی کم ہو، اتنا ہی اچھا ہے اس پر یہ قصہ بھی فرمایا کہ ایک بزرگ کہیں تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں ایک شخص کو بیٹھا ہوا دیکھا، اسے سلام نہیں کیا، جب بزرگ واپس ہوئے تو وہ شخص اب تک وہیں بیٹھا ہوا تھا اور تنکے سے زمین کرید رہا تھا۔ اس وقت بزرگ نے انہیں سلام کیا۔ خدام نے بزرگ سے عرض کیا کہ پہلے سلام نہ کرنے کا سبب کیا تھا اور واپسی میں سلام کرنے کا سبب کیا ہوا۔ فرمایا پہلے وہ شخص بالکل خالی بیٹھا ہوا تھا، اس لئے میں نے اسے سلام نہ کیا، کیونکہ بے کار شخص کو شیطان گھیر لیتا ہے اور واپسی میں وہ شخص اگرچہ ایک فضول کام کر رہا تھا، مگر خیر اس طرح وہ شیطان کی مشغولی سے تو بچا ہوا تھا، اس لئے میں نے اسے سلام کیا۔ (صفحہ ۲۶۷)

عورتوں کی اصلاح کا طریقہ

فرمایا، عورتوں کی اصلاح کے لئے بس یہ کافی ہے کہ وہ دینی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہیں، باقی آجکل ایسا نمونہ جسے وہ خود مشاہدہ کرکے اپنے اخلاق درست کریں، عورتوں میں ملنا مشکل ہے، عورتیں خاوند کی معتقد ہوتیں نہیں۔ اس لئے بس وہ کتابیں پڑھا کریں، سنا کریں۔ خاوندوں کو ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ آگے چاہے اصلاح ہو یا نہ ہو، اس طرح مواخذہ سے بری ہوجاؤ گے۔ (صفحہ ۲۶۷)

ملزم کا کسی ترکیب سے سزا سے بچنا

فرمایا، اگر کوئی ملزم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچائے تو شرعاً یہ کچھ گناہ نہیں، جائز ہے، مثلاً سزائے رجم میں اگر فرد زنا کا اقرار نہ کرے تو رجم سے بچ جائے گا۔ علیحدہ چپکے سے اللہ میاں سے توبہ کرے، اسی طرح چوری میں کسی شخص کی چیز چرالی ہے، اسے واپس کردے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور عدالت میں اقرار نہ کرے تو کچھ گناہ

نہیں (شرعاً لوگوں کو وسعت دینا، حسن اخلاق اور رحمت عامہ کا حصہ ہے) (صفحہ ۲۶۹)

خیالات کو برا ماننے کا مرض

فرمایا، باطن کے بعض امور ایسے ہیں، جو مرض نہیں، مگر لوگ انہیں خواہ مخواہ مرض سمجھتے ہیں، مثلاً خیالات اور وسوسوں کو لوگ برا سمجھتے ہیں، اگر انہیں سمجھایا جائے کہ اس میں کچھ حرج نہیں تو مانتے نہیں، بلکہ خیال کرتے ہیں کہ ویسے ٹال دیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب سے کہے کہ حکیم جی، دھوپ میں چلتا ہوں تو میرا بدن گرم ہوجاتا ہے، مجھے یہ مرض لاحق ہے، حکیم جی شفقت سے یہ جواب دیں کہ بھائی یہ مرض نہیں ہے مگر وہ اصرار کرے کہ نہیں حکیم جی، یہ تو مرض ہے۔ (صفحہ ۲۷۰)

زینت کا لباس

ایک مولوی صاحب جو بہت زینت کا لباس پہنے ہوئے تھے، انہوں نے حضرت والا کو پرچہ دیا، جس میں اپنے وظائف کا حال لکھا تھا۔ فرمایا گنگاپار کی طرف زینت بہت ہے۔ وہاں کے بعض مقتدا اور مشائخ اہل نسبت بھی زینت میں مبتلا ہیں۔ جب آپ کا قلب زینت کی چیزوں میں مشغول ہے تو پھر اللہ کی یاد کی گنجائش کہاں ہے۔ ان وظائف سے کچھ نفع نہ ہوگا، ایسی حالت میں آخر طالبان دنیا اور طالبان حق کے درمیان کیا فرق ہوا۔ زینت عورت کے لئے مناسب ہے، مردوں کو ہرگز ایسی زینت مناسب نہیں، آپ میرے پھندے میں کیوں پھنستے ہیں، میں تو آزاد آدمی ہوں، رسوم کو جڑ سے اکھاڑتا ہوں۔ چاہے وہ علماء کی رسوم ہوں یا مشائخ کی ہوں۔ میں طالب کی دلجوئی نہیں کرتا، کیونکہ اس کی تو دلشوئی کی ضرورت ہے نہ کہ دلجوئی کی۔ ہاں طالب کی بھی خاطر ہوتی ہے جبکہ وہ اصلاح قبول کرلیتا ہے پھر اس سے بڑھ کر کسی کی خاطر نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۲۷۲)

مشورہ میں احتیاط

فرمایا، جب مجھ سے کوئی مشورہ لیتا ہے تو میں مشورہ دینے کے بجائے یہ لکھ دیتا ہوں کہ اگر مجھے یہ واقعہ پیش آتا تو میں اس طرح کرتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم بھی ایسا کرو۔ آج کل اکثر مواقع پر مشورہ دینا بے قوفی ہے، الزام ضرور آتا ہے۔ (صفحہ ۲۷۴)

بزرگوں کی توجہ کے بارے میں قابل غور نکات

فرمایا، توجہ کے دو درجے ہیں، ایک درجہ تو غیر اختیاری ہے، وہ یہ ہے کہ دل چاہتا ہے کہ فلاں شخص میں ذوق وشوق محبت حق اور خوف وغیرہ پیدا ہو۔ اس کے لئے دعا کی جائے، اس میں کچھ حرج نہیں، دوسری توجہ جو تصوف کی اصطلاح میں متعارف ہے، قلب کو سارے خطرات سے خالی کر کے خاص توجہ کرنا ہے اس میں ارادۂ تصرف ہوتا ہے، یہ اگرچہ جائز ہے، مگر مجھے قطعاً پسند نہیں۔ اور اس میں فاعل قوت برقیہ ہوتی ہے۔ جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے، جس طرح زمین میں یہ قوت موجود ہے، سنا ہے کہ بے تار کے جو خبر پہنچتی ہے، وہ اسی کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے۔ نظر لگنے میں بھی اسی کا تاثر ہوتا ہے۔ مسمریزم اور توجہ متعارف کا منشاء ماخذ ایک ہی ہے۔ ایک بری جگہ صرف ہوتا ہے اور دوسری اچھی جگہ صرف کی جاتی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے، اور یہ مشق پر موقوف ہے، اس کے لئے مشق کی جاتی ہے کہ دوسروں پر نسبت کا القاء کیا جائے۔ بعض مشائخ کے یہاں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ مگر اس کا نفع باقی نہیں رہتا، طالب نفع سمجھ کر اس کو کافی سمجھتا ہے، اس لئے وہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں چند خلجان ہیں، اول تو اس طرح کی توجہ سنت میں منقول نہیں۔ دوم اس سے اکثر افراد سستی کرنے لگتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ مرید پر از خود بزرگ کی توجہ ہو، اس میں مضائقہ نہیں۔ باقی خود توجہ کرنے میں تو اس وقت قلب میں خدا کی طرف توجہ مطلق نہیں رہتی، اگر یہ کہا جائے کہ یوں تو معمولی بات چیت میں بھی توجہ الی اللہ نہیں ہوتی۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ اس سے زیادہ اشد چیز ہے، کیونکہ اس میں قلب قصداً خالی کیا جاتا ہے اور خدا کی طرف سے توجہ ہٹانا غیرت کے خلاف کی بات معلوم ہوتی ہے، حلقہ متعارف میں یہی ہوتا ہے، بس مسنون طریقہ اصلاح کا وعظ نصیحت ہے۔ دعا ہے اور توجہ تام حق تعالیٰ کا حق ہے۔ (صفحہ ۲۷۵)

ایک صاحب مجاز مولوی صاحب کو سزا

ایک مولوی صاحب نے (جو حضرت والا کے مجاز ہیں) اپنے ملفوظات خود جمع کئے تھے اور ملفوظات کا آغاز اس لفظ سے تھا کہ ''فرمایا''۔ اس کی اطلاع حضرت کو ہوئی، حضرت والا نے مولوی صاحب سے فرمایا، ہمارے ہاں سے اٹھ جاؤ اور ہمیں صورت مت دکھاؤ اور نہ کسی کو بیعت کرو۔ پھر ان مولوی صاحب نے حضرت والا کی خدمت مبارک میں معافی کی

درخواست کی، مگر چونکہ بے ڈھنگے طور سے معافی چاہی گئی تھی، اس لئے اس پر حضرت والا نے یہ سزا تجویز فرمائی کہ بعد نماز مغرب روزانہ اس مضمون کا اعلان کیا کیجئے کہ صاحبو، چونکہ میں فلاں قوم کا فرد ہوں، اس لئے کم حوصلگی کے سبب اپنے مربی کی عنایتوں پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا، جس کی وجہ سے میں سزا میں گرفتار ہوں، لہذا آپ لوگوں کو چاہیے کہ تکبر سے سخت پرہیز کریں، مولوی صاحب دو دن تک یہ اعلان کرتے رہے، اس کے بعد، بعد نماز ظہر حضرت والا نے ان مولوی صاحب سے سب کو گفتگو کرنے کی اجازت دیدی اور فرمایا، عنقریب دوسرے معاملات بھی طے ہوجائیں گے۔ (ملفوظ کی تلخیص صفحہ ۲۷۶)

تواضع حقیقی اور تواضع مصنوعی میں فرق

فرمایا، کبھی تکبر کی صورت میں تواضع بھی ہوتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ تواضع تکبر کے ارادے سے ہوتی ہے، اس کے بعد فخر ہوتا ہے اور اس تواضع کے بعد اگر کوئی تعظیم نہ کرے تو فرداً اسے برا مانتا ہے اور جو تواضع، تواضع کے ارادے سے ہو، اس میں خوف ہوتا ہے اور کسی کی طرف سے تعظیم نہ کرنے سے فرد کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس عدم تعظیم کا ہی مستحق سمجھتا ہے۔ (صفحہ ۲۸۶)

اصلاح نفس کے لئے ایک بزرگ کا طریقہ

فرمایا، ایک بزرگ کی خدمت میں ایک شخص بیعت کے لئے حاضر ہوئے، بزرگ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ مال بھی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں، سو روپے ہیں، ان بزرگ نے فرمایا کہ مال کو نکال دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت خیرات کردوں گا، فرمایا کہ اس سے نفس کو خوشی حاصل ہوگی کہ ہم نے اتنے روپے خیرات کئے، ان پیسوں کو سمندر میں پھینک دو اس نے منظور کیا۔ پھر فرمایا کہ ایک دم پھینکنے کے بجائے ایک ایک روپیہ کر کے پھینکنا تاکہ ذرا نفس پر آرا تو چلے اور ایک دم سے پھینکنے میں تو بس ایک بار ہی مجاہدہ ہوگا۔ (صفحہ ۲۸۷)

نسبت کا روح اور جسم پر اثر

فرمایا، بڑھاپے میں نسبت قوی ہوجاتی ہے، کیونکہ مدت کی نسبت ہوتی ہے۔ نیز اہل نسبت کے پاس بیٹھنے سے روحانی قوت بڑھتی ہے۔ بعض اوقات اس کا اثر بدن پر محسوس

ہوتا ہے، چنانچہ بہت سے بزرگوں کے بدن پر مرنے کے بعد بھی حرارت محسوس ہوئی ہے، اصل میں تو اثر روح پر ہوتا ہے مگر تبعاً کبھی تبرعاً جسم پر بھی ظاہر ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۲۸۸)

وصول الی اللہ کی علامتیں

فرمایا، حق تعالیٰ تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے کہ اخلاق فاسدہ جاتے رہیں، اخلاق حمیدہ پیدا ہوجائیں گناہ چھوٹ جائیں۔ اطاعت کی توفیق حاصل ہوجائے، غفلت من اللہ جاتی رہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہوجائے۔ (۲۹۰)

مالدار ہونے کے فوائد

فرمایا، آج کل مالدار ہونے میں بھی مصلحت ہے۔ مالداری سے یہ فائدے ہیں ایک لوگوں کو نذرانوں کے حوالے سے تکلیف نہ ہوگی۔ دوم عزت ہوگی، سوم فرد دوسروں کا دست نگر نہ ہوگا۔ (صفحہ ۲۹۰)

صحبت اہل اللہ کی اہمیت

فرمایا، اصلاح کے لئے اصلی چیز صحبت ہے، چاہے علم ہو یا نہ ہو، بلکہ علم بھی صحبت کے بغیر بے کار ہے، صاحب صحبت شخص جو صاحب علم نہ ہو، اس کی اصلاح اس فرد سے زیادہ ہوتی ہے، جو عالم ہے، لیکن صحبت یافتہ نہیں، اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ انگریزی خواں بچوں کو صلحا و علماء کے پاس بھیجا کرو اور بڑے بھی اس کا خیال رکھیں تو بڑا فائدہ ہو۔ اور ہم اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نہ ان کے پائنچوں پر اعتراض کریں گے، نہ ہمیں ان کی داڑھی سے بحث ہوگی، نہ ہم ان کو مار مار کر نماز پڑھائیں گے، وہ ہمارے پاس بیٹھیں گے تو ان کو ہم سے اور ہم کو ان سے محبت پیدا ہوگی اور دین سے مناسبت پیدا ہوگی، یہ مناسبت ہی بنیاد ہے اور علم و عمل اس کی شاخ ہے۔ صحابہ کرام سب کے سب عالم نہ تھے، صرف صحبت یافتہ تھے، انہوں نے جو کچھ پایا، وہ صحبت ہی سے پایا تھا اور ہمیشہ اہل اللہ نے صحبت کا انتظام رکھا ہے۔ انہوں نے علم کے لئے اتنی توجہ صرف نہیں کی، جتنی صحبت کی طرف کی۔ (صفحہ ۲۹۱)

طلب ذکر کے مقتضیات

طلب ذکر تو یہ ہے کہ سارے کاموں سے قطع نظر کرکے سالک بس ذکر کا ہوجائے

اور یہ ارادہ کرے کہ ذکر ہی کروں گا۔ اگرچہ ساری عمر اس میں صرف ہوجائے، اگر یہ بھی نہ ہو تو کچھ مدت تو ہو۔ حضرت گنگوہیؒ ہی اس کے لئے دو برس فرمایا کرتے تھے۔ (صفحہ ۲۹۲)

تین باتوں سے وصول الی اللہ کا ملکہ پیدا ہونا

فرمایا، میں نے بہت دفعہ طلباء سے اور عام طور سے لوگوں سے کہا ہے کہ دو باتوں پر پختہ ہوجاؤ، میں ذمہ لیتا ہوں، وصول الی اللہ کا۔ ایک گناہوں سے بچنے کا دوسرا کم بولنا اور تھوڑی دیر ذکر و فکر کے لئے خلوت اختیار کرنا۔ (صفحہ ۲۹۲)

مشائخ کی برکت سے نااہل کا اہلیت سے بہرہ ور ہونا

فرمایا، امام کو نااہل ہونے کے باوجود لوگ اہل سمجھ کر امام بناتے ہیں تو ممکن ہے حق تعالیٰ لوگوں کے گمان کے مطابق اسے اہل ہی کردیں۔ اکثر واقع ہوا ہے کہ مشائخ نے کسی ایسے شخص کو اجازت دیدی، جس میں اہلیت موجود نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے ان کی فعل کی برکت سے اسے اہل کردیا۔ (صفحہ ۲۹۳)

کثرت شہوت کا علاج

ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھ کو عورتوں اور لڑکوں کی طرف اس درجہ میلان ہے کہ جنون کی سی حالت ہے، کھانے کا بھی اس کے سامنے ہوش نہیں۔ اور نماز پڑھتا ہوں، مگر بعض وقت یہ بھی ہوش نہیں رہتا کہ کیا پڑھا۔ اور میں اس سے نہایت خائف ہوں اور اس کا علاج چاہتا ہوں، فرمایا، میلان کے دو درجے ہیں۔ ایک کسی شے کی طرف توجہ اور ایک محبت۔ یعنی توجہ تقاضا کے درجے میں۔ اول درجہ تو طبعی امر ہے۔ حق تعالیٰ نے مرد کی طبیعت میں میلان رکھا ہے۔ یہ تقاضا نہ تو کسی تدبیر سے جاسکتا ہے اور نہ انسان اس کے کھونے کا ذمہ دار ہے، اور دوسرا درجہ اختیاری ہے یعنی اختیار کو وجود عدم میں داخل ہے۔ انسان کسی چیز میں اتنا انہماک کرسکتا ہے کہ وہ بس اسی کا ہوکر رہے اور کسی چیز سے اتنا بچ سکتا ہے کہ اس کا محبت کا درجہ باقی نہ رہے۔ جب یہ اختیاری چیز ہے تو انسان اس کا ذمہ دار بھی ہے۔ اس کا علاج ہمت ہے، حق تعالیٰ نے اختیاری معاملات کو بندے کی ہمت پر رکھا ہے اور ہمت کرنے کے بعد مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور دوران علاج طبیعت کو اس طرف سے پھیرنا ہے، جس وقت ہیجان پیدا ہو۔ یہ قاعدہ ہے کہ نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف

متوجہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جس وقت ہیجان پیدا ہو، نفس کو دوسرے کام میں لگا دینا چاہیے، خواہ دین کے کام میں مثلاً کسی کے پاس بیٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ ایک علاج یہ بھی ہے کہ اس ہیجان کی طرف بالکل توجہ نہ کی جائے اور سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ خیال آتا ہے آیا کرے۔ یہ نہایت مجرب علاج ہے، عرض کیا، کیسے توجہ نہ کروں۔ نماز اور ذکر و شغل میرا سب غارت ہوگیا۔ کسی وقت یہ خیال دور نہیں ہوتا، فرمایا یہ خیال درجہ اولیٰ ہے، اس پر گناہ نہیں، تم اپنے فعل کے ذمہ دار ہو، ان خیالات کو عملی شکل دینا، یہ تمہارا فعل ہے۔ جب تک یہ نہیں بالکل گناہ مواخذہ نہیں، اگر ساری عمر بھی طبیعت ایسی رہے، اپنا کام کرتے رہو، تو آپ کا کوئی نقصان نہیں۔ عرض کیا، کوئی وظیفہ ایسا بتا دیجئے، جس سے یہ بلا دور ہوجائے۔ فرمایا وظیفوں سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ علاج وہی ہے جو میں نے بتایا' بجائے وظیفہ کے دعا کیجئے، ہمت سے کام لیجئے اور کسی دوسرے کام میں لگ جایا کیجئے اور حق تعالیٰ سے بالحاح وزاری دعا مانگا کیجئے، کہ مجھے ان آفات سے محفوظ رکھیے۔ دعا سے یقیناً اثر ہوتا ہے، ہر مشکل میں آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔

اللہ کی محبت اور رسول کی محبت مختلف افراد پر محبت کے جدا جدا رنگ کا غالب ہونا

ایک صاحب نے عرض کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ جناب حاجی صاحب دوسرے سارے مشائخ سے افضل ہیں اور مرید کے لئے تصور شیخ بھی ایک چیز ہے، اس سے نفع بھی ہوتا ہے اور وہ لذیذ بھی ہے اور ہمارے حضور ﷺ سارے شیخوں کے شیخ ہیں تو حضور ﷺ سارے مشائخ سے افضل ہوئے بلکہ حضور ﷺ تو انبیاء علیہم السلام کے بھی امام ہیں آپ تو دنیا و مافیہا سے افضل و برتر ہوئے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جب سارے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے تو حضور ﷺ کا تصور تو بڑی چیز ہوا۔ لیکن جب میں حضور ﷺ کے تصور کا ارادہ کرتا ہوں تو دل اندر سے اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتا اور اس میں لذت حاصل نہیں ہوتی، گویا مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، اللہ کے تصور ذات میں دل لگتا ہے اور اس میں لذت بھی آتی ہے، یہ کیا بات ہے اور اس میں خطا و ثواب کی نوعیت کیا ہے۔ فرمایا کہ مذاق مختلف ہوتے ہیں، بعض سالکوں پر اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہوتی ہے اور بعضوں پر رسول اللہ ﷺ کی محبت، آپ پر توحید کا غلبہ ہے اور فی نفسہ دونوں مذاق

صحیح ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت بھی دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی محبت ہے، کیونکہ آپ سے محبت، اللہ کے رسول ہونے کی رو سے ہے اور نائب کی محبت اس کے نیابت کی حیثیت سے، درحقیقت اللہ کی محبت ہے اور اللہ کو ہم نے حضور ﷺ کے ذریعہ سے ہی پہچانا، آپ کے واسطہ کے بغیر اللہ کی محبت حاصل نہیں ہوسکتی اور میرا مذاق بھی آپ ہی کا سا ہے، مجھے کسی چیز میں ایسی لذت نہیں آتی، جیسی ذکر اللہ میں آتی ہے، اور یہ بات یاد رکھئے کہ دونوں محمود ہیں۔ (صفحہ ۳۰۱)

علماء کی تعظیم کے فوائد و نقصانات

فرمایا، علماء کی تعظیم کرنے سے تو لوگوں کا نفع ہے کہ ان کی تعظیم درحقیقت دین کی تعظیم ہے، مگر یہ تعظیم خود علماء اور علم کے لئے سخت مضر ہے، اس لئے کہ اس سے ان میں نخوت اور تکبر پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے مضر ہوئی۔ جب لوگ علماء میں خراب صفات دیکھتے ہیں تو نہ تو ان کی بات میں اثر رہتا ہے اور نہ ہی لوگوں کے دلوں میں ان کے علم کی تعظیم باقی رہتی ہے، چنانچہ ان کے ساتھ علم بھی بدنام ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۳۰۲)

قلب کی سختی وغیرہ کا علاج

کسی طالب نے کہا کہ بندہ کا حال بہت ہی خراب ہے، جس سے سخت پریشانی ہے، قلب سخت ہے، ادنیٰ بات پر بھی غصہ آتا ہے، قلب میں گناہوں کا میلان ہے، بلکہ بعض اوقات گناہوں سے محبت کی حالت یہ ہے کہ طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ فرمایا، سختی اور میلان اور وساوس یہ تینوں امور غیر اختیاری ہیں، جن کی کوئی خاص تدبیر نہیں، ذکر اللہ، اطاعت اور طویل عرصہ تک صحبت اہل اللہ سے ان کا خود ازالہ ہوجاتا ہے۔ اس وقت آپ کے ذمہ صرف اتنا ہے کہ ان امور کے تقاضوں پر عمل نہ کریں، پھر آپ پر کوئی مواخذہ نہیں۔ (صفحہ ۳۰۳)

صحبت کے بغیر ذکر کا ناکافی ہونا

فرمایا، صحبت شیخ کے بغیر اگر کوئی لاکھ تسبیحیں پڑھتا رہتا ہے، کچھ نفع نہیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت خود ذکر اللہ میں یہ صفت ہونی چاہیے تھی کہ وہ خود کافی ہوجایا کرتا، صحبت شیخ کی کیوں قید ہے؟ فرمایا، کام تو ذکر اللہ سے ہی ہوگا، لیکن اللہ کا فائدہ

یوں جاری ہے کہ شیخ کی صحبت کے بغیر کام بنانے کے لئے خالی ذکر کافی نہیں، اس کے لئے صحبت شیخ شرط ہے، جس طرح کاٹنے کا کام جب ہوگا، تلوار سے ہی ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کسی کے قبضہ میں ہو، ورنہ اکیلی تلوار کچھ نہیں کر سکتی۔ (صفحہ ۳۰۵)

شیخ کی صحبت کے فوائد

فرمایا، شیخ کے پاس رہ کر مشغول رہنے میں اور دور رہ کر مشغول رہنے میں ایسا فرق ہے، جیسا مریض ایک تو طبیب کے پاس رہ کر علاج کرائے اور دوسرے یہ کہ دور سے محض خط و کتابت کے ذریعہ علاج ہو، ظاہر ہے ان دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ پھر فرمایا، کہ صحبت شیخ میں طالب ذوقیہ طور پر اپنے اندر شیخ کے اخلاق کو لے لیتا ہے، صحبت شیخ کے بغیر محض خط و کتابت پر اکتفا کرنے کی مثال یہ ہے، جیسے شوہر اور بیوی محض خط و کتابت کرتے رہیں اور اظہار محبت بھی کرتے رہیں، لیکن ملتے جلتے نہ رہیں تو اولاد ہو چکی۔ اسی طرح شیخ کے ساتھ محض خط و کتابت رکھنے سے زیادہ فائدہ نہیں، خاص ثمرات کے لئے صحبت شیخ ضروری ہے۔ (صفحہ ۳۰۶)

تکمیل کے بعد سالک کا شیخ سے مستغنی ہونا

فرمایا، تکمیل کے بعد پھر شیخ کا تربیت میں دخل نہیں رہتا، نہ اس کی حاجت رہتی ہے، اللہ کی طرف سے بلا واسطہ فرد کی تربیت ہوتی رہتی ہے اور طالب شیخ سے مستغنی ہو جاتا ہے، جیسا مشاطہ بناؤ سنوار کر، دلہن کو دولہا تک پہنچا دیتی ہے، اس کے بعد پھر وہاں اس کا گذر نہیں ہوتا۔ البتہ شیخ کا جس کی بدولت اس کو یہ وصول الی اللہ حاصل ہوا ہے، ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے، ورنہ ناشکری موجب زوال ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۳۰۶)

نماز میں پابندی کا طریقہ کار

ایک صاحب نے عرض کیا کہ نماز کی پابندی نہیں ہوتی، فرمایا، اس کے دو علاج ہیں، ایک سہل دوسرا مشکل۔ مشکل علاج یہ ہے کہ اپنے اوپر کوئی جرمانہ مقرر کیا جائے، جو نہ اس قدر زیادہ ہو کہ پابندی کے ساتھ اس کا ادا ہونا ہی مشکل ہو۔ اور نہ اس قدر کم ہو کہ نفس پر مشکل ہی نہ ہو۔ یہ علاج تو مشکل ہے، کیونکہ خود اپنے اوپر سزا جاری کرنا مشکل کام ہے، دوسرا علاج سہل یہ ہے کہ جس شخصیت سے عقیدت ہو، کچھ دن کے لئے اس کی صحبت اختیار

کی جائے، ان شاء اللہ خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔ (صفحہ ۳۰۷)

تسخیر اور قبولیت عنداللہ کے درمیاں فرق

فرمایا، تسخیر اور قبولیت عنداللہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ عملیات وغیرہ سے ہونے والی تسخیر کا اثر فوری ہوتا ہے اور وہ دیرپا نہیں ہوتا اور مقبولیت عنداللہ کا اثر روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے اور وہ کبھی زائل نہیں ہوتا۔ جس طرح ملمع ہوتا ہے کہ شروع میں اس میں جو آب تاب ہوتا ہے، وہ اصلی کندن سے بھی زیادہ ہوتا ہے، لیکن جب اس کا جھول اتر جاتا ہے تو پھر وہی تانبہ کا تانبہ ہوتا ہے، اس کے برخلاف جو تانبہ کیمیا کے ذریعہ سے سونا بن جاتا ہے، اس کے جگر تک اثر پہنچ جاتا ہے اور اس کی سونا ہونے کی خاصیت کبھی زائل نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۳۰۷)

متقی کی طرف نفسانی میلان کا نہ ہونا

عشق مجازی کے تذکرہ میں فرمایا، ایک بات بتاتا ہوں جو شروع میں شاید سمجھ میں نہ آئے، لیکن سچی بات ہے، تجربہ کر کے دیکھیں، فی الحال تقلیداً مان لیں۔ وہ بات یہ ہے کہ اگر عاشق کی طبیعت بالکل خبیث نہ ہو تو متقی شخص کی طرف نفسانی میلان نہیں ہو سکتا، کیونکہ تقویٰ نفسانی میلان کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔ خواہ تقویٰ کا دوسرے کو علم ہو یا نہ ہو۔ عشق مجازی کے تذکرہ میں فرمایا کہ یہ سخت آزمائش کی چیز ہے، اس سے بہت بچنا چاہیے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس معاملہ میں مجھے خود اپنا اعتبار نہیں اور چونکہ میں خود کوئی چیز نہیں، اس لئے میری طرف سے یہ بے اعتباری کوئی ایسی اہم چیز نہیں، لیکن جو شخص مجھے بڑا سمجھتا ہے اور مجھ سے عقیدت رکھتا ہے، اس کے لئے یہ بڑی عبرت کی بات ہے کہ جسے ہم بڑا سمجھتے ہیں، جب اس کی یہ حالت ہے تو اس معاملہ میں تو بہت احتیاط کرنا چاہیے۔ (صفحہ ۳۰۸)

بزرگوں سے دنیا کے حوالے سے تعلق کا نہ ہونا

فرمایا، بزرگوں سے تعلق کے نتیجہ میں دین تو درست ہوتا ہی ہے، دنیا میں بھی برکت ہوتی ہے، لیکن بزرگوں سے تعلق دنیا کے ارادہ سے پیدا نہ کرنا چاہیے، جس طرح حج کو جاتے وقت اس بات کا قصد تو نہ ہونا چاہیے کہ بمبئی (یا کراچی) دیکھیں گے اور جہاز کی سیر کریں گے، لیکن چونکہ حج کے راستہ میں بمبئی اور کراچی بھی پڑے گی، اس لئے اس کی

سر بھی ہوگی۔ (صفحہ ۳۰۹)

ذکر سے آہستہ آہستہ ملکہ اور نسبت کا پیدا ہونا

فرمایا، ذکر میں چاہے دل لگے یا نہ لگے، لیکن برابر کرتے رہنا چاہیے رفتہ رفتہ اس کی ایسی عادت ہوجاتی ہے کہ اس کے بغیر چین ہی نہیں آتا، جیسے شروع شروع میں حقہ پینے سے، کراہت بھی ہوتی ہے، متلی بھی ہوتی ہے، قے بھی ہوتی ہے، لیکن پیتے پیتے پھر یہ حالت ہوجاتی ہے کہ چاہے کھانا نہ ملے، مگر حقہ کے دو کش ضرور مل جائیں۔ ایک بار فرمایا ذکر کا نفع تو شروع ہی سے ہونے لگتا ہے، لیکن وہ محسوس نہیں ہوتا، جیسے بچہ روز کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ آج اتنا بڑھا، کل اتنا بڑھا۔ البتہ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد جب اس کی پچھلی حالت کا موازنہ کیا جاتا ہے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے، یہی حال ذکر کا ہے کہ شروع میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ بھی نفع نہیں ہو رہا ہے، حالانکہ دراصل نفع برابر ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک بار فرمایا کہ پتھر پر شروع میں پہلا قطرہ گرتا ہے، پھر دوسرا پھر تیسرا، یہاں تک کہ ان قطروں سے اس میں گڑھا ہوجاتا ہے، گڑھا کرنے میں پہلے قطرہ کو بھی اتنا ہی دخل حاصل ہے، جتنا آخری قطرہ کو، اول قطرہ کو بے اثر ہرگز نہ سمجھنا چاہیے، اسی طرح اول روز کا ذکر جس کو بے ثمرہ سمجھا جاتا ہے، ہرگز بے ثمرہ نہیں، اخیر میں جو خاص حالت پیدا ہوگی، اس میں اول روز کے ذکر کو بھی اتنا ہی دخل ہوگا جتنا آخری روز کے ذکر کو۔ (صفحہ ۳۱۰)

نماز اور ذکر میں سرسری توجہ کا ہونا

فرمایا، ذکر نماز وغیرہ میں سرسری توجہ استحضار کافی ہے۔ توجہ کے لئے زیادہ کاوش نہ کی جائے ورنہ قلب و دماغ ماؤف ہوجائیں گے۔ زیادہ کاوش سے تکلف اور پریشانی ہوتی ہے، جس سے نفع بند ہوجاتا ہے، سرسری توجہ ہی سے آہستہ آہستہ کامل ملکہ حاصل ہوتا ہے، اسی طرح کسی خاص کیفیت یا حالت کی بقا کے لئے بھی زیادہ کاوش نہ کی جائے، نہ اس کے پیچھے پڑے، گھیر گھار مضر ہے، اپنا کام کرتے رہنا چاہیے، استعداد جس طرح بڑھتی جائے گی، اس کے مناسب احوال و واردات ہوتے رہیں گے۔ قلب کو تشویش میں مبتلا نہ کیا جائے۔ نہ ثمرات و حالات کے درپے ہوا جائے، بڑی چیز کام میں مشغول ہونا چاہیے۔ (صفحہ ۳۱۰)

ایک دو اذکار سے مناسبت پیدا کرنا

فرمایا، مختلف اذکار سے اس قدر نفع نہیں ہوتا، جس قدر ایک یا دو قسم کے ذکر سے ہوتا ہے، کیونکہ مختلف اذکار میں طبیعت منتشر رہتی ہے، کوئی ذکر بھی راسخ نہیں ہوتا۔ ایک دو اذکار پر مداومت کی جائے تو وہ بہت جلد راسخ ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۳۱۱)

بیعت کی صورت اور حقیقت

ایک صاحب نے بیعت کی درخواست کی، فرمایا یہ کوئی ایسی ضروری چیز نہیں، اصل چیز تو اتباع اور محبت ہے، باقی ہاتھ میں ہاتھ دینا، یہ محض طالب کی تسلی کے لئے ہوتا ہے کہ اسے اطمینان ہوجائے کہ ہاں، میرا فلاں شخص کے ساتھ خصوصی تعلق قائم ہوگیا ہے، ورنہ نفع میں بیعت کا کچھ دخل نہیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نفع میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہوگی، بلکہ بیعت کرنے سے مجھ پر ایک بوجھ ہوجاتا ہے، میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ مجھ سے بیعت نہ ہوں، لیکن مجھ سے دین کی خدمت لیں، پھر ان صاحب نے عرض کیا کہ بیعت تو سنت ہے، فرمایا سنت تو ہے، مگر مستحب کے درجے میں اور سنت بھی بیعت کی حقیقت ہے نہ کہ صورت، یعنی ہاتھ پر ہاتھ رکھنا بیعت کی صورت ہے نہ کہ حقیقت، حقیقت ہے محبت اور اتباع، جس شخص کو محبت ہو اور وہ اتباع کرے تو اسے بیعت کی حقیقت حاصل ہوجاتی ہے، اگرچہ بیعت کی صورت حاصل نہ ہو۔ (صفحہ ۳۱۱)

عوام وخواص کے لئے بیعت کا نافع ہونا

فرمایا، بیعت کی حقیقت ہے تعلیم کرنے والے پر اعتقاد اور یقین کہ یہ میرا خیر خواہ ہے اور جو مشورہ دے گا، وہ میرے لئے نہایت نافع ہوگا، غرض اس پر پورا اطمینان ہو اور اپنی رائے کو شیخ کی تجویز و تشخیص کے مقابلہ میں بالکل دخل نہ دے۔ باقی بیعت کی صورت یعنی ہاتھ پر ہاتھ رکھنا یہ اول خواص کے لئے پہلی ہی بار نافع نہیں، البتہ عوام کے لئے پہلی بار ہی بیعت کی صورت بھی نافع ہوجاتی ہے، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے قول کو باوقعت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں، خواص کے لئے یہ بیعت کچھ مدت کے بعد نافع ہوتی ہے، کیونکہ بیعت کا خاصہ ہے کہ جانبین میں ایک تعلق خاص پیدا ہوجائے، شیخ کو محسوس ہو کہ یہ ہمارا ہے اور مرید کو یہ احساس ہو کہ یہ ہمارے ہیں۔

(صفحہ ۳۱۴)

قبر پر فاتحہ پڑھنے کے فوائد

ایک صاحب نے عرض کیا کہ قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنے میں کیا مصلحت ہے، جہاں چاہے ثواب پہنچا سکتا ہے، فرمایا، اس میں تین مصلحتیں ہیں، ایک تو یہ کہ قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنے سے ایصال ثواب کے علاوہ خود پڑھنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہاں موت کا استحضار زیادہ ہوتا ہے، دوسری باطنی مصلحت یہ ہے کہ مردہ کو ذکر سے انس ہوتا ہے، خواہ آہستہ آہستہ پڑھا جائے یا زور سے، حق تعالیٰ مُردہ کو آواز پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بات اولیاء کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ عام مسلمین بھی سنتے ہیں، کیونکہ مرنے کے بعد روح میں حیات کی بہ نسبت کسی قدر ایک اطلاق کی شان پیدا ہوجاتی ہے، اوراس کا ادراک بڑھ جاتا ہے، مگر نہ اتنا کہ کوئی ان کو حاضر وناظر سمجھنے لگے۔ تیسرے یہ بھی ہے کہ ذکر کے انوار جو پھیلتے ہیں، اس سے بھی مردہ کو راحت پہنچتی ہے۔ (صفحہ ۳۱۵)

ایصال ثواب کے بارے میں تصریح

فرمایا، مالی عبادت کا ثواب بہ نسبت بدنی عبادت کے مردہ کے حق میں زیادہ افضل ہے، کیوں کہ یہ مسئلہ خود اہل سنت والجماعۃ میں مختلف فیہ ہے کہ بدنی عبادات کا ثواب بھی مردہ کو پہنچتا ہے یا نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک صرف مالی عبادت کا ثواب پہنچتا ہے، بدنی عبادت کا نہیں پہنچتا، دوسرے اماموں کے نزدیک بھی یہی بات ہے۔ البتہ ہمارے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں قسم کی عبادتوں کا ثواب پہنچتا ہے، بہرحال مالی عبادت کے ثواب کی افضلیت مردہ کے حق میں اس وجہ سے ثابت ہے۔ (صفحہ ۳۱۶)

فخر کے لئے لباس کا استعمال حرام ہے

فرمایا، اچھے کپڑے وغیرہ پہننا، اگر عزت کی خاطر ہے تو یہ ناجائز ہے اور اسراف میں داخل ہے اور اگر دفع مذلت کے لئے ہو تو پچاس روپیہ گز کا کپڑا پہننا بھی جائز ہے یعنی جس کے لئے گنجائش ہو، اگر نیت ریا وتفاخر کی نہ ہو، جب کہ دوسرے شخص کے لئے پانچ آنہ گز کا بھی ناجائز ہے یعنی جس کو گنجائش نہ ہو یا ریا وتفاخر کی نیت ہو۔ (صفحہ ۳۱۶)

غنی کی تعریف

فرمایا، اگر کسی کی تنخواہ بڑی ہو، لیکن مہینہ میں سب ختم ہوجاتی ہو تو وہ غنی نہیں، مسکین ہے، کیونکہ غنی وہ ہے جس کے پاس کچھ ذخیرہ ہو۔ (صفحہ ۳۱۷)

تقلید کے بغیر محقق کے درجہ کا حصول مشکل ہے

فرمایا، الحمدللہ، میں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ کبھی ظاہراً یا باطناً اختلاف نہیں کیا اور ہر طرح سے ادب کو ملحوظ رکھا، حالانکہ مجھے سینکڑوں احتمالات سوجھتے تھے، لیکن میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ ہم کیا جانیں اور اگر کبھی کوئی بات سمجھ میں نہ بھی آئی، تب بھی یہ کہہ کر دل کو مطمئن کرلیا کہ یہ کیا ضروری ہے، کہ ہر بات کا فہم حاصل ہو، سو واقعی طالب تحقیق کے لئے ابتدا میں تقلید ضروری ہے، اس کے بعد تقلید کی برکت سے تحقیق کا درجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے، (محقق بننے کی) ترتیب یہی ہے، دیکھئے اگر کوئی بچہ اپنے استاد کی تقلید نہ کرے اور پڑھاتے وقت کہے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے، ب نہیں، تو ظاہر ہے وہ پڑھ نہیں سکتا۔ (صفحہ ۳۱۹)

دیندار اور غیر دیندار کے فہم کا فرق

فرمایا، جو شخص دین کا پابند نہیں، دنیاوی معاملات کے سلسلہ میں بھی اس کے فہم میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے اور دیندار شخص کو اگرچہ دنیا کا تجربہ نہ ہو، لیکن دنوی امور میں بھی اس کی سمجھ سلیم ہوجاتی ہے، حلال روزی میں بھی یہی اثر ہے، برخلاف اس کے حرام روزی سے فہم مسخ ہوجاتی ہے۔ (صفحہ ۳۱۹)

استعداد کا مرشد کے ذریعہ سے ظاہر ہونا

فرمایا، حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی شخص ذکر شغل کا نفع ظاہر کرتا تو فرماتے کہ بھائی استعداد تو خود تمہارے اندر موجود تھی، میرے ذریعہ سے وہ صرف ظاہر ہوئی ہے، لیکن تم ایسا مت سمجھنا، تم یہی سمجھنا کہ مجھ سے تم کو یہ نفع پہنچا ہے، ورنہ تمہارے لئے نقصان ہوگا۔ یہ شان ہوتی ہے، اہل مقام کی کہ وہ ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں، ورنہ اہل حال ایک بات کے پیچھے ہی پڑجاتے ہیں، دوسرے پہلو پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ (صفحہ ۳۲۰)

مرید کے لئے طریقہ کار

فرمایا، ذکر وشغل کے لئے آنے والے فرد کو کسی بات سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے، بس اسے اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے، نہ کسی کا پیام پہنچائے، نہ شیخ کو کسی کا سلام پہنچائے، خود بھی کسی اور جانب متوجہ نہ ہو اور نہ شیخ کو متوجہ کرے، بلکہ جہاں تک ہو سکے، شیخ کو اپنی طرف متوجہ رکھے۔ اگر کسی کا سلام پہنچایا تو گویا اس نے خود اپنے شیخ کو دوسرے کی طرف متوجہ کیا، جو اس کی مصلحت کے منافی ہے اور غیرت عشق کے بھی خلاف ہے۔ (صفحہ ۳۲۱)

بعض معاملات میں رخصت پر عمل کی اہمیت وافادیت

فرمایا، میں تو بعض احوال میں عزیمت پر عمل کرنے کے بجائے رخصت پر عمل افضل سمجھتا ہوں، کیونکہ جو شخص عزیمت پر عمل کرتا ہے، اسے ہمیشہ اپنے عمل پر نظر ہوتی ہے اور اسے جو کچھ عطا ہوتا ہے، وہ اسے اپنے عمل کے مقابلہ میں کم سمجھتا ہے، نیز اس کے دل میں یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ دیکھو میں اتنے دن سے زہد وتقویٰ کے لئے اتنی مشقت اٹھا رہا ہوں اور ذکر وفکر کرتے ہوئے اتنا عرصہ گذر گیا ہے اور اب تک کچھ نصیب نہیں ہوا، یہ کتنا لغو تصور ہے، اس کے برخلاف جو شخص کچھ معاملات میں رخصتوں پر عمل رکھتا ہے، اسے عمل پر نظر نہیں ہو سکتی، اسے جو کچھ بھی عطا ہوتا ہے، وہ اسے اپنے عمل کے مقابلہ میں زیادہ سمجھتا ہے اور اسے عدم واردات اور عدم کیفیات وغیرہ کے بارے میں بھی شکایات پیدا نہیں ہوتیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا عمل ہی کیا ہے کہ ثمرات کا مستحق ہوں۔ بہرحال رخصت پر عمل کرنے والے کی نظر میں ہمیشہ حق تعالیٰ کی عطاؤں کا پلہ اعمال کے مقابلے میں بھاری رہتا ہے۔ (۳۲۲)

کھانے کے بارے میں عمدہ بحث

فرمایا، زہد لذتوں کو چھوڑنے کا نام نہیں، بلکہ محض زہد کے لئے لذتوں کو کم کرنا کافی ہے یعنی لذتوں میں انہماک نہ ہو کہ دن رات یہی فکر ہو کہ یہ چیز پکنی چاہیے، وہ چیز منگانا چاہیے، غرض یہ کہ نفیس نفیس کھانوں اور کپڑوں کی فکر میں رہنا یہ زہد کے منافی ہے۔ تکلف واہتمام کے بغیر خاص لذت کی چیزیں میسر ہوں تو حق تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ بہت کم کھانا بھی زہد نہیں ہے اور نہ یہ مقصود ہے، فرد کے کم کھانے سے اللہ

تعالیٰ کے خزانہ میں کوئی کمی واقع نہ ہو جائے گی اور نہ یہ ہوگا کہ صاحب' سرکار کے بڑے خیر خواہ ہیں کہ پوری تنخواہ بھی نہیں لیتے، وہاں ان باتوں کی کیا پرواہ ہے، لیکن اتنا بھی نہ کھایا جائے کہ پیٹ میں درد ہونے لگے، حضرت حاجی صاحب کا مذاق یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھا جائے، لیکن اس سے کام لیا جائے۔ (صفحہ ۳۲۳)

خدا کی نظر میں بڑا بننا

فرمایا، حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ خلق کی نظر میں عزت تو سب کے نزدیک مذموم ہے، لیکن عارفین کے نزدیک خالق کی نظر میں بھی جاہ کا ارادہ ناپسندیدہ ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ فرد حق تعالیٰ کے نزدیک بڑا بننا چاہتا ہے تو گویا اپنی نظر میں اس کی شان یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی نظروں میں باوقعت ہو۔ (صفحہ ۳۲۴)

لوگوں کو اپنے شر سے بچانے کے لئے خلوت اختیار کرنا

فرمایا، آج کل سلامتی خلوت اور یکسوئی میں ہے، کسی کتاب میں ایک بزرگ کا قول دیکھا ہے کہ خلوت میں بھی یہ نیت نہ ہونی چاہیے کہ میں لوگوں کے شر سے محفوظ ہوں، بلکہ یہ نیت ہونی چاہیے کہ میں مثل سانپ اور بچھو کے ہوں، میرے لئے الگ رہنا ہی مناسب ہے، تاکہ لوگ میرے شر سے محفوظ رہیں۔ اللہ اکبر، سلف نے عُجب وغیرہ سے کہاں تک احتیاط کی ہے، لیکن آج کل ہمارے زمانہ میں ایسے نفوس کہاں ہیں، جو یہ نیت کر سکیں کہ ہم دوسروں کو اپنے شر سے بچائیں، اس لئے میں نے اس میں کچھ ترمیم کی ہے کہ یہ نیت کرنی چاہیے کہ بعض لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھوں اور بعض کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھوں۔ (صفحہ ۳۲۵)

کاملین بھی "حال" سے خالی نہیں

فرمایا، کاملین پر حال غالب نہیں ہوتا، اس کے یہ معنی ہیں کہ ایسا غلبہ نہیں ہوتا کہ وہ استقامت یعنی شرعی اعتدال سے نکل جائیں۔ باقی غلبہ تو ہوتا ہے، نفی اس غلبہ کی ہوتی ہے، جس میں حضرت منصور سے اناالحق نکل گیا تھا، دیکھیے حضور ﷺ پر وحی کے وقت غشی اور پسینہ کی کثرت ہوتی تھی، البتہ ایسا غلبہ نہیں تھا، جس سے شرعی امر میں خلل واقع ہو۔ وحی میں نوم کی طرح مغلوبیت ہوتی تھی، لیکن اس میں کسی شرعی حالت سے خروج نہیں ہوتا تھا۔

باقی حالت محمودہ (مثلاً رونا وغیرہ) کا مطلق غلبہ کیسے منفی ہوسکتا ہے، جبکہ نوم کا بھی غلبہ انبیاء و اولیاء پر ہوتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۷)

ذاکر کو شہرت کی آرزو نہ ہونا چاہیے

فرمایا، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وسوسے قلب کے اندر سے ہی پیدا ہوتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا، بلکہ وسوسے باہر ہوتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندر ہیں اور جب قلب میں صحیح عقائد مستحکم ہیں تو قلب میں ان کے خلاف وسوسے کیسے آئیں گے، یہ شیطان ہی کے پیدا کردہ وسوسے ہوتے ہیں، جس طرح کسی شیشہ پر مکھی بیٹھی ہو تو ہوتی وہ شیشہ کے اوپر ہے، لیکن عکس کی وجہ سے دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ (صفحہ ۳۳۰)

مشقت کے بجائے آسانی کا راستہ اختیار کرنا

فرمایا، جو کام آسانی سے ہوسکے، اس کو مشکل طریقہ سے نہیں کرنا چاہیے، حدیث میں ہے: ماخیر ﷺ بین الامرین الااختار ایسرھما. یہ سلامت طبع کی دلیل ہے کہ ہمیشہ آسانی کا راستہ اختیار ہو، جب دونوں شقیں برابر ہوں یعنی ثواب اور مصلحت دونوں میں، پھر فرمایا کہ آسانی کا راستہ اختیار کرنا جو مسنون ہے، طریق میں ہے، مقصود میں نہیں۔ جس مشقت پر شریعت نے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، وہ تو مقصود ہونے کی وجہ سے مستثنیٰ ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے بعض صحابہ کو مسجد کے قریب مکان لینے سے منع فرمایا تھا، کیونکہ دور سے آنے میں زیادہ ثواب ہے۔ اور جس پر کوئی ثواب نہیں اور محض مشقت ہی مشقت ہے پھر دشوار شق کو اختیار کرنا فضول ہے۔ (صفحہ ۳۳۱)

گناہوں کو ترک کرنے کا طریق

فرمایا، شیوخ، مباح چیزیں تو آہستہ آہستہ چھڑواتے ہیں، گناہ آہستہ آہستہ نہیں چھڑواتے، لیکن میں تو وعظ میں کہہ دیتا ہوں (اللہ تعالیٰ معاف کرے نیت بری نہیں) کہ ایک گناہ تو وہ ہیں کہ جنہیں اگر چھوڑ دیا جائے تو فرد کو کوئی تکلیف نہ ہوگی، مثلاً داڑھی منڈوانا، ٹخنہ ڈھکنا وغیرہ۔ اگر انہیں چھوڑ دیا جائے تو اس سے کوئی کام نہیں اٹکتا، اس طرح کی چیزوں کو تو فوراً چھوڑ دینا چاہیے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں چھوڑنے کے بعد کچھ

تکلیف اور تنگی ہوگی، مثلاً رشوت لینا کہ صاحب، بال بچے ہیں، اتنی تنخواہ میں گذر ہو نہیں سکتا، تو اس طرح کے گناہوں کے بارے میں کہہ دیتا ہوں کہ رفتہ رفتہ چھوڑو۔ نیت یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح تو چھوڑ دیں، جن سے ایک دم نجات کی امید نہیں، بلکہ اگر ان پر اس سلسلہ میں زور ڈالا جائے تو ان کے لئے ساری عمر بھی چھوڑنا مشکل ہوجائے۔ میں گناہوں کے چھوڑنے کا ایک طریقہ یہ بتاتا ہوں کہ سوتے وقت روزانہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ یا اللہ، میں بڑا کمبخت، نالائق اور سیاہ کار ہوں، غرض اپنے بارے میں سخت سے سخت الفاظ استعمال کرکے کہو کہ یا اللہ ان گناہوں کو چھوڑنے کے سلسلہ میں میری ہمت کافی نہیں، آپ ہی مدد فرمائیں، یہ ترکیب کرکے دیکھو، ان شاء اللہ ایک دو ہفتہ میں ہی سارے گناہ ختم۔ (صفحہ ۳۳۴)

کامل میں استغنیٰ کی شان کا غالب ہونا

فرمایا، جو شخص اپنے کمالات کے اظہار کی کاوش کرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی حالت کمزور ہے، کیونکہ کامل کو اس قدر کوشش کی کیا ضرورت ہے، اس میں تو استغنا کی شان موجود ہوتی ہے۔ (صفحہ ۳۳۵)

زندگی اور صحت کی قدر کرنی چاہیے

فرمایا، جس آرام کی اجازت ہے، وہ ضرور کرنا چاہیے، صرف یہ خیال رکھنا چاہیے کہ انہماک نہ ہونے پائے، اس سلسلہ میں اپنے اوپر سختی نہ کرنا چاہیے، مثلاً اگر نیند کا غلبہ ہے تو سونا چاہیے، کم سونے سے بعض لوگ مرض میں مبتلا ہوگئے ہیں، کچھ لوگ مجنوں ہوگئے، کچھ مرگئے، صحت و حیات کی بڑی حفاظت کرنی چاہیے، یہ وہ چیز ہے جو پھر کہاں میسر ہوگی۔ (صفحہ ۳۳۶)

زندگی معرفت کے لئے ہے، اس لئے صحت کی حفاظت ضروری ہے

فرمایا، کسی شخص نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آیا آپ کو یہ زیادہ پسند ہے کہ آپ بچپن میں انتقال کر جاتے اور جنت یقینی طور پر ملتی یا یہ پسند ہے کہ بالغ ہوکر خطرہ میں پڑتے، فرمایا کہ بالغ ہوکر خطرہ میں پڑنا مجھے پسند ہے، اگر بچپن میں انتقال ہو جاتا تو اس وقت تو حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہوتی، اب اگر چہ خطرہ کی حالت میں ہوں، لیکن

معرفت حق تعالیٰ کی نصیب ہوئی، آگے جو محبوب کی مرضی ہو، پھر فرمایا کہ واقعی زندگی بڑی قابل قدر چیز ہے۔

عمر عزیز لائق سوز و گداز نیست
ایں رشتہ راسوز کہ چندیں دراز نیست

اس لئے میرے نزدیک صحت کی حفاظت نہایت ضروری ہے، چاہے نفلی اعمال کی توفیق نہ بھی ہو، لیکن جب فرد راحت اور آرام میں رہے گا تو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت تو پیدا ہوگی اور انسان احسان کا بندہ ہے، جب وہ مشاہدہ کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چین یا آرام دیا ہے تو ضرور اس کے طرف کشش پیدا ہوگی۔ (صفحہ ۳۳۶)

فرد کے لئے دوسرے مسلمان بھائی کی دعا کا قبول ہونا

فرمایا، حدیث شریف میں ہے کہ فرد کے حق میں اپنی دعا سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی کی دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے دوسروں سے ضرور دعا کرانی چاہیے۔ (صفحہ ۳۳۶)

سالک کو گناہ کی سزا مل کر رہتی ہے

فرمایا، عوارف المعارف میں لکھا ہے کہ اگر باطنی بے ادبی ہوتی ہے تو اس کی سزا ملتی ہے، خواہ سزا دیر سے ملے، چنانچہ ایک بزرگ کے خادم نے کسی غلام لڑکے کو نظر بد سے دیکھ لیا تھا، ان کے شیخ نے فرمایا کہ تمہیں اس کی سزا ملے گی، چنانچہ ایک مدت کے بعد اس کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ وہ کلام مجید بھول گئے۔ (صفحہ ۳۳۷)

درویشی کی حقیقت

فرمایا، درویشی کی حقیقت اطاعت اور ذکر کے دوام میں سہولت ہے، بیخودی ومحویت، اور کشف وکرامت وغیرہ ان میں سے کوئی چیز مقصود نہیں۔ (صفحہ ۳۳۰)

سالک کو روحانی صحت کے بارے میں فکرمند نہ ہونا چاہیے

فرمایا، نفع میں بیعت کو ذرا دل نہیں، باقی کامیابی یہ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جس طرح طبیب صرف نسخہ تجویز کرسکتا ہے، اس کا استعمال مریض کے اختیار میں ہے اور صحت دینا یہ حق تعالیٰ کا کام ہے، طبیب، صحت کا وقت متعین نہیں کرسکتا، البتہ طریقت میں اتنی امید ضرور دلائی جاسکتی ہے کہ ظاہری مرض میں تو کبھی مایوسی تک نوبت پہنچ جاتی ہے،

لیکن یہاں مایوسی ہرگز نہیں۔ (روحانی) صحت یقینی ہے، خواہ مرتے وقت ہی نصیب ہوجائے۔ ویسے حق تعالیٰ کا فضل ہے، جلدی ہوجائے، باقی اپنی طرف سے (سالک کو) اس بات پر آمادہ رہنا چاہیے کہ اگر مرتے وقت تک بھی کامیابی نصیب ہوجائے تو بھی راضی ہیں۔ (صفحہ ۳۳۸)

بیعت میں جلدی نہیں کرنا چاہیے

فرمایا، جب تک فرد کی بزرگ سے مناسبت نہ ہوجائے، اس وقت تک بیعت نہ کرنا چاہیے، جب فرد پوری طرح راہ پر پڑجائے، تب بیعت ہونا چاہیے، مرید ہونے کے بعد (ہوتا یہ ہے کہ افراد عام طور پر) بے فکر ہوجاتے ہیں اور مرید ہونے کے لالچ میں تو کسی قدر اپنی اصلاح کی فکر میں مشغول بھی رہتے ہیں، تاکہ جلدی مقصود حاصل ہوجائے۔ (صفحہ ۳۳۸)

امراء اور غرباء کی فضیلتوں میں فرق

فرمایا، امراء کو زیادہ شکر گزار ہونا چاہیے، اس لئے حق تعالیٰ کی، ان پر بہت نعمتیں ہیں اور حق تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت غرباء پر یہ ہے کہ غربت کی وجہ سے انہیں بہت سے گناہوں سے بچا رکھا ہے، امراء اگر غرباء سے محبت رکھیں تو ان شاء اللہ انہیں غرباء کے ہی درجات نصیب ہوجائیں گے، چنانچہ ارشاد ہے: المرء مع من احب. (صفحہ ۳۳۹)

دوسروں سے ناگواری کا سبب اکثر اپنی کمزوری کا ہونا

فرمایا، کسی دوسرے شخص سے عداوت کرنا، یہ درصل اپنے ساتھ عداوت کرنا ہے، پھر فرمایا کہ دوسرے شخص کا جو فعل ناگوار ہوتا ہے تو دراصل اکثر اپنی کوئی خرابی ہوتی ہے، مثلاً تکبر، جس کی وجہ سے وہ فعل ناگوار ہوتا ہے، ناگواری کا سبب دراصل اپنے اندر موجود ہوتا ہے، ظہور اس کا دوسرے شخص میں ہوتا ہے۔ (صفحہ ۳۳۹)

افضل سورتیں، جو پڑھنی چاہیے

استفسار پر فرمایا، قبر پر فاتحہ پڑھنے میں چند سورتیں جن کی خاص فضیلتیں آئیں ہیں ان کو پڑھتا ہوں۔ مثلاً الحمد شریف۔ قل ھو اللہ (اکثر بارہ مرتبہ کیونکہ ایک روایت میں بارہ مرتبہ پڑھنے کی خاص فضیلت آئی ہے) الھکم التکاثر۔ اذا زلزلت۔ قل یاایھا الکافرون۔

قل اعوذ برب الفلق ۔ قل اعوذ برب الناس ۔ سورۃ یاسین ۔ سورۃ ملک ۔ پھر فرمایا کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے فاتحہ پڑھنا چاہیے، تا کہ مردہ کا مواجہ ہو۔ (صفحہ ۳۳۹)

عورتوں کی دو قابل تعریف صفات

فرمایا، عورتیں قابل تعریف اور لائق رحم ہیں، ان میں دو صفات تو ایسی ہیں کہ مردوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ایک خدمتگاری کی صفت اور دوسرے عفت۔ ان میں عفت تو اس درجہ ہے کہ مرد چاہے افعال سے پاک ہوں، لیکن وسوسوں سے شاید ہی کوئی خالی ہو۔ جب کہ شریف عورتوں میں سے اگر سَو کو لیا جائے تو شاید سو کی سو ایسی نکلیں گی کہ زندگی بھر وسوسہ تک بھی نہ آیا ہو، اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ المحصنات الغافلات۔ (صفحہ ۳۴۰)

بیمار کی نماز، اشکالات کا جواب

ایک بیمار صاحب نے نماز کے سلسلہ میں بار بار اپنی سخت مجبوری ظاہر کی، کہا کہ کپڑے ناپاک رہتے ہیں، فرمایا، اس میں کچھ حرج نہیں، ناپاک کپڑوں ہی سے نماز ہو جاتی ہے، بشرطیکہ مریض کو پاک کرنے میں زیادہ زحمت ہوتی ہو۔ کہا کہ حرکت بھی نہیں کی جاتی، فرمایا، اشارہ سے لیٹے لیٹے نماز پڑھو، کہا کہ زبان سے الفاظ نہیں نکلتے، فرمایا، اس میں کچھ حرج نہیں، دل ہی دل میں کہہ لیا کرو۔ نماز کسی صورت میں معاف نہیں (جب تک ہوش رہے) نماز کی بڑی سخت تاکید ہے، یہاں تک کہ اگر فرد سمندر میں ڈوب رہا ہو اور نماز کا وقت آ گیا ہو تو نیت باندھ کر ڈوب جائے، لیکن جہاں اس قدر تاکید ہے، وہاں سہولت بھی انتہا رکھی گئی ہے۔ ان باتوں سے بھی ان مریض صاحب کی تسلی نہ ہوئی اور وہ یہی کہتے رہے کہ ایسی حالت میں نماز کیسے ہو سکتی ہے، فرمایا کہ رائے کی خرابی ہے، لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس طرح نماز ناقص ہوگی، حالانکہ حق تعالیٰ کے حقوق اس قدر ہیں کہ ان کے سامنے ہماری نماز کبھی کامل ہو ہی نہیں سکتی۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر کپڑے پاک صاف ہوں۔ وضو وغیرہ سب باقاعدہ ہوں، خشوع وخضوع ہو تو نماز بڑی کامل ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ عظمت حق کے اعتبار سے وہ بھی ناقص ہی ہوگی۔ پھر جب ہر حال میں ناقص ہی ہوئی تو اس طرح پڑھنے سے کیوں دلی آمادگی نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۳۴۰)

عجز کا مشاہدہ ہی بہتر حالت ہے

ایک صاحب نے عرض کیا (کیفیات کے اعتبار سے) پہلے حالت اچھی تھی، اب بہت خراب ہوگئی ہے، فرمایا، میری رائے میں تو جو حالت اچھی سمجھی جاتی تھی، وہ بری تھی کیونکہ اسے اچھا سمجھنا ہی برا تھا۔ اور یہ حالت جس کو آپ خراب سمجھتے ہیں، اس پہلی حالت سے اچھی ہے، کیونکہ اس کے ساتھ یہ کتنی بڑی دولت ہے کہ اپنے عجز کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ (صفحہ ۳۴۱)

کھانے کے وقت ہاتھ وغیرہ دھونے کا مسئلہ

فرمایا، کھانے کی نیت سے ہاتھ دھونا سنت ہے اور دونوں ہاتھ دھونا سنت ہے اور رومال وغیرہ سے پونچھنا نہیں چاہیے۔ البتہ کھانے کے بعد جب ہاتھ دھوئے تو ان کو پونچھنا چاہیے، کھانے سے پہلے صرف ہاتھ دھونے چاہیے، کلی نہ کرنی چاہیے، یہی سنت ہے۔ البتہ کھانا کھانے کے بعد ہاتھوں کو دھونے کے بعد کلی کر کے منہ کو صاف کرنا چاہیے۔ (صفحہ ۳۴۱)

تسلی سے سلوک کا جلد طے ہونا

فرمایا، تسلی سے سلوک جس قدر طے ہوتا ہے، کسی اور طریقہ سے نہیں ہوتا۔ اور اس سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ الحمدللہ، مجھے محبت حق پیدا کرنے کا بہت اہتمام رہتا ہے۔ (صفحہ ۳۴۲)

عقل اور فراست کے درمیان فرق

فرمایا، فراست جس سے طالب کے باطنی امراض معلوم ہو جاتے ہیں، وہ کشف نہیں ہے، کشف تو یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص راستہ میں آرہا ہے، اس کو وہیں بیٹھے دیکھ لیا اور پھر بعد میں وہ بھی آ گیا۔ فراست، دل کی گواہی دینے کو کہتے ہیں، اسے الہام کہنا زیادہ مناسب ہے۔ فراست اور عقل باہم مشابہ ہیں، عقلاء کو بھی عقل کے ذریعہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، لیکن عقل اور فراست میں فرق یہ ہے کہ عقل تو ظاہری اسباب سے استدلال کرتی ہے، جب کہ فراست محض وجداناً محسوس کرتی ہے۔ (صفحہ ۳۴۲)

کام کرنے والے شخص کے لئے دل سے دعا کا نکلنا

فرمایا، چونکہ میں دعا کو تدبیر میں معین سمجھتا ہوں، اس لئے جس شخص کو کام میں مشغول دیکھتا ہوں، اس کے لئے از خود دل سے دعا نکلتی ہے، ورنہ دو تین مرتبہ دعا کر کے بس فرض سا اتار دیا۔ (صفحہ ۲۴۳)

جائداد کی خریداری کا مسئلہ

فرمایا، جائداد فساد کی جڑ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر جائداد بیچو تو اس روپیہ سے فوراً دوسری خریدو، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اے عائشہ، جائداد مت خریدو، دنیادار ہو جاؤ گی۔ ان دونوں حدیثوں کے مجموعہ سے جو مفہوم ظاہر ہوا، وہ یہ ہے کہ اگر جائداد موجود ہو تو اس کو بیچا نہ جائے اور نئی جائداد نہیں خریدنی چاہیے۔ (صفحہ ۲۴۳)

دوسروں پر ہنسنے کی خرابی

فرمایا، دوسروں پر ہنسنا نہیں چاہیے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ دوسروں پر ہنسنے کے نتیجہ میں اس عیب یا مصیبت میں فرد خود مبتلا ہو گیا ہے۔ (صفحہ ۲۴۸)

میل جول کے نقصانات

فرمایا، میرے یہاں بے تعلقی کو محاسن میں سے سمجھا جاتا ہے اور اختلاط (میل جول) جرائم میں شامل ہے، کیونکہ ملنے جلنے میں ہزارہا نقصانات ہیں، بس اپنے اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ (صفحہ ۲۴۱)

جس سے عقیدت ہو، اس کی رائے میں اپنی رائے کو فنا کرنا چاہیے

فرمایا، جس سے عقیدت ہو، اس سے سوال و جواب کی نوبت نہ آنے دینا چاہیے، بلکہ اپنی رائے و مشورہ کو اس کی رائے و مشورہ میں فنا کر دینا چاہیے، بزرگوں کے سامنے ردوکد کرنا بالکل خلاف ادب ہے۔ (صفحہ ۲۵۰)

مجلس کے آداب کو ملحوظ رکھنا

فرمایا، جب کوئی شخص گفتگو کر رہا ہو یا کسی کام میں مشغول ہو تو آنے والے کو چپکے بیٹھ جانا چاہیے، یہ نہیں کہ بیچ میں سلام کر کے لٹھ سی آ کر مار دے اور مصافحہ کرنے لگے، یہ

بدتہذیبی کی بات ہے اور ایذا کا سبب ہے۔ (صفحہ ۲۵۱)

کندھے پر رومال ڈال کر نماز پڑھنے کا مسئلہ

فرمایا، کندھے پر رومال ڈال کر نماز نہ پڑھنا چاہیے کہ یہ نماز سے خارج کی ہیئت ہے۔ (صفحہ ۲۵۱)

اخلاص خود سبب شہرت ہے

فرمایا، جو کام خالص اللہ کے لئے کیا جاتا ہے، شہرت وغیرہ کی نیت کے بغیر تو اللہ تعالیٰ شہرت فرما ہی دیتے ہیں۔ (صفحہ ۲۵۲)

کشش و میلان طبعی کی مخالفت کے اثرات

فرمایا، (نفس کی) کشش و میلان کا بالکل زائل ہو جانا تو خلاف عادت ہے، البتہ تدبیر سے اس میں ایسا ضعف و اضمحلال ہو جاتا ہے کہ اس کی مخالفت میں تکلیف باقی نہیں رہتی اور وہ تدبیر یہ ہے کہ عملاً (نفس کی) اس کشش کے خلاف عمل کیا جائے۔ اگرچہ اس میں تکلیف ہو، اس تکلیف کو برداشت کیا جائے، یہی وہ طریقہ ہے، جس سے طبیعتوں کے اختلاف سے کسی کو جلدی کسی کو دیر سے (نفسی قوتوں) پر بڑی حد تک فتح یابی حاصل جاتی ہے اور نفس کی مخالفت کے لئے ہمیشہ قصد و ہمت کی ضرورت رہتی ہے، مگر اس ملکہ کی وجہ سے اس عزم میں بھی سہولت سے کامیابی ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۲۵۲)

نیکی سے مسرت کا حاصل ہونا، گناہ سے اذیت کا ہونا

فرمایا، طبعی امور دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو کسی عمل کا ذریعہ نہ ہوں۔ وہ تو نہ محمود ہیں نہ مذموم۔ دوسرے قسم کے طبعی امور یہ ہیں کہ وہ فطری نہ ہوں، بلکہ کسی عمل سے پیدا ہوئے ہوں تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ کسی اچھے عمل سے پیدا ہوئے ہوں، تب تو اچھے ہوں گے اور اگر کسی خراب عمل سے پیدا ہوں تو وہ مذموم شمار ہوں گے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: اذا سرتک حسنتک وسائتک سیئتک فانت مومن ۔ یعنی اگر نیک کام کر کے تجھے مسرت حاصل ہو اور گناہ کر کے تمہارا دل مکدر ہو (دل میں اذیت محسوس ہو) تو تو مومن ہے تو یہاں جو مسرت ہے، وہ ایک طبعی چیز ہے، مگر چونکہ یہ ایک عمل صالحہ سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے اسے ایمان کی علامت فرمایا گیا اور جو چیز محمود نہ ہو، وہ ایمان کی

علامت نہیں بن سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ محمود ہے، اگرچہ یہ مسرت فی نفسہ طبعی نہیں، مگر حال غالب ہو جانے کی وجہ سے وہ طبعی امر کی طرح ہوجاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے اس مسرت کو بھی طبعی امر بنادیا، اسی طرح اگر کسی کو قبض ہو تو اگر وہ کسی گناہ کی وجہ سے ہو تو وہ مذموم ہے اور اس کے علاج کی ضرورت ہے اور اگر اس کا سبب کوئی گناہ نہ ہو تو اس کی کچھ فکر نہ کی جائے، کیونکہ وہ مذموم نہیں۔ (صفحہ ۳۵۳)

استخارہ کی حقیقت

فرمایا، استخارہ ایسے معاملہ میں ہوتا ہے، جس میں نفع وضرر دونوں کا احتمال ہو اور جو معاملات، عادۃً یا شرعاً دونوں صورتوں میں مضر ہوں، ان معاملات میں استخارہ نہیں۔ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھنے کے لئے استخارہ کرنے لگے یا دونوں وقت کھانا کھانے کے لئے استخارہ کرنے لگے یا چوری کرنے کے لئے یا اپاہج عورت سے نکاح کرنے کے لئے استخارہ کرنے لگے۔ استخارہ ایک دعا ہے کہ اے اللہ، اگر اس معاملہ میں میرے لئے خیر ہو تو میرے قلب کو یکسو کردے، ورنہ میری توجہ کو ہٹادے اور میرے لئے معاملے کی، جس نوعیت میں خیر ہو، اس کو تجویز کردے، سو اس کے بعد قلب یکسو ہو جائے تو اس معاملہ کو اختیار کیا جائے اور ظناً خیر سمجھنا چاہیے، خواہ کامیابی کی صورت میں یا ناکامیابی کی صورت میں۔ اور ناکامیابی کا خیر ہونا، خیر کے آثار کے اعتبار سے ہے، خواہ دنیا میں اس کا نعم البدل ملے یا آخرت میں، اس سے صبر کا اجر ملے۔ اور استخارہ نہ کرنے میں مجموعی طور پر اس خیر کا وعدہ نہیں، خواہ کلی طور پر یا جزوی طور پر۔ بس استخارہ کا فائدہ یہی ہے کہ ہمیں اس سے ضرور خیر عطا ہوگا اور استخارہ اور عدم استخارہ کے ان آثار میں فرق کا سبب یہ ہے کہ استخارہ کے بعد اگر وہ چیز مؤثر ثابت ہوئی تو قلب ایسی چیز میں یکسو نہ ہوگا، جس میں بے احتیاطی ہو اور استخارہ کے بغیر اس طرح کی چیز کے آنے کا بھی اہتمام ہے کہ ذرا غور سے اس کا مضر ہونا معلوم ہوسکتا تھا، مگر اس پر غور نہیں کیا گیا اور بے احتیاطی سے اس کو اختیار کرلیا تو اپنے ہاتھوں جب مضرت کو اختیار کیا جائے تو اس میں خیر کا وعدہ نہیں، پس سمجھنا چاہیے کہ استخارہ میں کامیابی کا وعدہ نہیں، بلکہ حصول خیر کا وعدہ ہے، وہ خیر ظاہری ہو یا خیر باطنی۔ (صفحہ ۳۵۴)

وجد و حال کو روکنا نہیں چاہیے

فرمایا، میں کسی صاحب حال شخص کو اس کے حال کے تقاضا پر عمل کرنے سے نہیں روکتا، حال ناقص ہی کیوں نہ ہو، البتہ اگر صاحب حال خود چاہے تو اس کی اصلاح یا تعدیل کردیتا ہوں، ورنہ اسے اس کے حال پر چھوڑتا ہوں اور اس حال کی قدر کرتا ہوں اور قدر کرنی چاہیے، اگر چیخنے کو دل چاہے تو خوب چیخے، اگر ہنسنے کو دل چاہے خوب ہنسے۔ جو حال وارد ہو، اسے اس وقت روکنا نہیں چاہیے۔ (صفحہ ۳۵۴)

شیخ کے ساتھ محبت کا غلبہ ہونا

فرمایا، شیخ سے اس قدر عقیدت مطلوب نہیں اور نہ اس قدر عظمت مطلوب ہے، اصل چیز جس کی ضرورت ہے، وہ محبت ہے۔ (صفحہ ۳۵۶)

چھوٹے، بڑوں کے لئے ذریعہ نجات ہیں

فرمایا، کبھی چھوٹوں کو وہ بات نصیب ہوجاتی ہے کہ بڑوں کو کبھی وہ بات خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بڑے بڑے ہی نہ رہتے، کیونکہ نفس تعریف سن سن کر فرعون ہوجاتا۔ اور اب یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح چھوٹوں کو ہماری ضرورت ہے، اسی طرح ہمیں بھی ان کی ضرورت ہے، چنانچہ ہمارے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں آنے والوں کی زیارت کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں۔ (صفحہ ۳۵۶)

اللہ کے ہاں قبولیت کے لئے محض علم وعمل کافی نہیں

فرمایا، ایک فرد عالم ہے، محدث ہے، مفسر ہے، فقیہ ہے، حافظ ہے، نیک ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ میں اللہ کے ہاں مقبول ہوں، لیکن ممکن ہے کہ وہ وہاں مردود ہو، اس کی مثال اس عورت کی سی ہے، جو خوبصورت بھی ہے، فاخرانہ لباس بھی پہنے ہوئی ہے، زیور سے آراستہ بھی ہے، سنگار کئے ہوئی ہے، اس آرائش وزیبائش کی بناء پر وہ سمجھتی ہے کہ میرے خاوند کو مجھ سے محبت ہے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ برائی میں بھی مبتلا ہے، اس لئے اس کا خاوند اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔ ایک دوسری عورت ہے، جو سانولی، سادہ کپڑے پہنے ہوئی ہے میلے کچیلے، زیور بھی اس کے پاس نہیں، مگر خاوند کو اس کی کوئی ادا پسند ہے، اس لئے وہ اسے محبوب رکھتا ہے اور دل سے اسے چاہتا ہے تو جس طرح گندہ ذہن عورت اپنے

خاوند کی نظر میں مقبول ہونے کے غلط گمان میں مبتلا ہے۔ یہی حالت کمالات کی بناء پر ہونے والے گمان کی ہے، حاصل یہ ہے کہ ظاہری کمالات مقبولیت کی دلیل نہیں، ممکن ہے ہمارے اندر کوئی ایسی باطنی خرابی موجود ہو، جو اللہ میاں کو پسند نہ ہو۔ (صفحہ ۳۵۷)

شیخ کو بھی اصلاح کی فکر میں رہنا چاہیے

فرمایا، جس طرح میں دوسروں کی اصلاح کے طریقے سوچتا رہتا ہوں، اسی طرح اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنی اصلاح کے طریقے بھی سوچتا رہتا ہوں۔ مسلمان کو تو مرتے دم تک اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہنا چاہیے، اس پر بھی اگر نجات حاصل ہو جائے تو سب کچھ ہے، اس سے آگے ہم کیا حوصلہ اور ہمت کر سکتے ہیں، باقی فضائل اور درجات تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں، ہم کو تو جنتیوں کی جوتیوں میں ہی جگہ مل جائے تو یہی بڑی دولت ہے۔ (صفحہ ۳۵۷)

متوسط کا، تنہائی کے لئے مضطرب ہونا

فرمایا، میں نے حضرت مولانا گنگوہی سے پوچھا تھا کہ میرا دل تنہائی چاہتا ہے، لیکن اس میں لوگوں کی دل شکنی کا خیال ہوتا ہے، حضرت مولانا نے فرمایا کہ اپنی مصلحت دیکھ لو، دوسروں کی مصلحت کا خیال نہ کرو، سب کو جھاڑو مارو۔ یہ بات انہوں نے اس طرح فرمائی تھی، گویا ان پر خود بھی گذری ہے۔ (صفحہ ۳۵۸)

کسی کی بھلائی اور برائی کا خیال نہ کرنا

فرمایا، فرد سب کو تو خوش رکھ نہیں سکتا، جب ہر حال میں اس پر برائی آنی ہے تو پھر اپنی مصلحت کو کیوں فوت کیا جائے، جس کام میں اپنی مصلحت اور راحت دیکھی جائے، بشرط شرعی طور اجازت بھی ہو تو وہی کیا جائے، کسی کی بھلائی برائی کا خیال نہ کیا جائے۔ (صفحہ ۳۵۹)

سال بھر کی روزی کا انتظام، توکل کے خلاف نہیں

فرمایا، ایک بزرگ تھے، انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ جتنی روزی میری قسمت میں ہو، وہ سب مجھے ایک ہی بار دیجئے، تھوڑی تھوڑی کر کے نہ دیجئے، ارشاد ہوا کہ کیا تمہیں ہمارے وعدہ پر یقین نہیں، عرض کیا، یقین تو ہے مگر وعدہ مبہم ہے، ملے گا تو لیکن یہ متعین

نہیں، اس لئے شیطان مجھے بہکاتا ہے، اگر آپ مجھے ایک ہی بار دیدیں گے تو میں کوٹھری میں بھر کر رکھ لوں گا، جب شیطان مجھ سے پوچھے گا کہ کہاں سے کھائے گا تو میں کہہ دوں گا کہ اس کوٹھری سے، تو بزرگوں نے اپنے ضعف کے پیش نظر اس طرح کی تدابیر اختیار کی ہیں۔ پس یاد رکھنے کی بات ہے کہ کمزوری، طبعی امور کا حصہ ہے، ولایت میں ان کو دخل نہیں۔

ولایت کہتے ہیں اطاعت اور عبدیت کو۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کو سال بھر کا خرچ ایک ساتھ دے کر ظاہر فرمایا کہ سال بھر تک خرچ ذخیرہ رکھنا اعلیٰ سے اعلیٰ توکل کے بھی خلاف نہیں۔ (صفحہ ۳۵۹)

مال کی قدر کرنا چاہئے

فرمایا، حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کو زہد میں بہت مبالغہ تھا، یہاں تک کہ ہارون رشید بادشاہ کی طرف سے آنے والے رقعہ کو ہاتھ سے نہیں چھوا تھا، بلکہ دور سے لکڑی سے اولٹ کر کھولا تھا۔ وہ ہم لوگوں کے لئے فرما گئے ہیں کہ جس کے پاس درہم ہوں، اسے چاہئے کہ وہ ان کی قدر کرے، کیونکہ اب وہ زمانہ ہے کہ جب آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو اس کی پہلی مشق دین پر ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہمارے پاس مال نہ ہوتا تو امراء ہم کو ختم کر دیتے۔ (صفحہ ۳۵۹)

اسباب کے ذریعہ مسبب الاسباب پر نگاہ رکھنا

فرمایا، اسباب میں بالاجماع حکمتیں ہیں، چنانچہ مثنوی شریف میں ایک حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ اسباب کے ذریعہ سے مسبب اسباب کی ہستی پر نظر کرو، پس اس طرح یہ اسباب اللہ سے قربت کا ذریعہ ہو جائیں گے، کیونکہ مصنوع اپنے صانع کی دلیل ہوتا ہے پھر فرمایا کہ حضرت عطاء سکندری نے اپنی کتاب تنویر میں بالکل اسباب کو مٹا دیا ہے، لیکن پھر بھی اسباب کی تکوین میں مصلحت ثابت کی ہے، لکھا ہے کہ اسباب کو حق تعالیٰ نے اس لئے پیدا فرمایا ہے، تا کہ بندہ، اسباب کو اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ ان کو توڑے اور کچھ نہیں تو اسباب میں یہی ایک نفع سہی۔ (صفحہ ۳۶۰)

غرباء کے پیسے کی اہمیت

فرمایا، میں امراء کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اگر تم کسی نیک کام میں روپیہ لگاؤ تو اگر برکت چاہتے ہو تو اس میں غرباء کے دو چار پیسے ضرور شامل کر لیا کرو۔ اگر ویسے نہ ہو تو ان سے مانگ کر ہی شامل کر لیا کرو۔ امراء کے پیسہ میں جو برکت ہے تو وہ غرباء کے پیسے شامل ہونے کی وجہ سے ہے، امراء کو غرباء کا احسان مند ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۳۶۲)

ذکر وفکر سے اللہ سے مناسبت کا پیدا ہو جانا

فرمایا، ذکر و شغل کے دو ثمرات ہیں، ایک تو اللہ کی رضا ہے، جو کہ اصل ثمرہ ہے، اس کا ظہور تو آخرت میں ہوگا دوسرا ثمرہ دنیا میں حاصل ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قلب کو اللہ تعالیٰ سے ایک خاص لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، جس طرح عاشق کے قلب کو معشوق کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے، پھر فرمایا، بڑی چیز احکام کی پابندی ہے، اس کے لئے میری کتابوں کا مطالعہ بالخصوص اصلاح الرسوم، تعلیم الدین۔ قصد السبیل اور میرے کُل وعظ۔ بس یہ کافی ہے، انشاء اللہ۔ (صفحہ ۳۶۳)

دوسروں کی بھلائی کے لئے اپنے آپ کو اذیت میں ڈالنا

ایک مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر باوجود واقعات جاننے کے، فرد شہادت نہ دے، محض اس خیال سے کہ کچہری میں وکلاء وغیرہ تنگ کرتے ہیں، جائز ہے یا نہیں، فرمایا، اپنے آپ کو ضرر سے بچانا جائز ہے۔ عرض کیا گیا کہ چاہے دوسرے کا بھلا ہوتا ہو، فرمایا، ہمارا جو اپنا برا ہوتا ہے، دوسرے کے نفع کے لئے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالنا، آدمی اس کا ذمہ دار نہیں۔ (صفحہ ۳۲۳)

طبیعت اور عقلیت کے غلبہ کا معاملہ

خواجہ صاحب نے کہا کہ حضور کی محبت میں پہلے جو جوش وخروش تھا، وہ اب نہیں رہا، فرمایا پہلے طبیعت غالب تھی، اب عقلیت غالب ہے، موجودہ حالت اکمل ہے۔ (صفحہ ۳۶۵)

شیخ، فیوض کا محض واسطہ ہوتا ہے

فرمایا، تعلیم کرنے والا تو محض بہانہ ہے، اصل میں فیض دینے والی ذات سے ہی

فیوض وبرکات نازل ہوتے ہیں، شیخ برائے نام واسطہ ہوتا ہے، لیکن طالب کو چاہئے کہ واسطہ کی قدر کرے، کیونکہ خدا کی عادت ہے کہ واسطہ۔ کے بغیر وہ فیوض وبرکات نازل نہیں فرماتے۔ (صفحہ ۳۶۵)

بزرگی کی اصل شناخت

فرمایا، بزرگوں میں اصل بات جو دیکھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ انہیں حضور ﷺ کی متابعت میں سے کتنا حصہ ملا ہے۔ اصل چیز یہی ہے کہ حضور ﷺ سے کس درجے کی مناسبت ہے اور مناسبت بھی بے ساختگی اور پختگی کے ساتھ، یوں دو چار دن کے لئے اطاعت تو سب کر سکتے ہیں۔ (صفحہ ۳۶۶)

شہوت کا زیادہ استعمال نقصاندہ ہے

فرمایا، ناجائز شہوت سے تو نقصان ہوتا ہی ہے، لیکن جائز شہوت میں زیادتی سے بھی نقصان ہوتا ہے، اس لئے کہ شہوت کے زیادہ استعمال سے طبیعت کی چستی جاتی رہتی ہے، اس لئے بزرگوں نے اس سے منع کیا ہے، غلو نہیں ہونا چاہئے۔ بالخصوص سالک کے لئے ایسا کرنا سخت مضر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ طبیعت کی نشاط کی بہت قدر کرنی چاہیے۔ (صفحہ ۳۲۶)

نگاہ بد کے معاملہ میں فرد کے اختیار کا مسئلہ

ایک صاحب کو اس بات میں کلام تھا کہ نگاہ بد، فرد کے اختیار میں نہیں، فرمایا، چونکہ نفس سے تکلیف گوارا نہیں ہوتی، نگاہ ہٹانے میں دشواری ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں لوگ تکلیف گوارا نہیں کرتے، وہ نفس کے ساتھ ہو لیتے ہیں، اس لئے انہیں یہ غیر اختیاری معاملہ نظر آتا ہے، اس سے تو شریعت پر اعتراض لازم آتا ہے کہ اس نے فرد کو ایسی چیز کا ذمہ دار بنایا ہے، جو اس کے اختیار میں نہیں اور یہ بھی فرمایا کہ اگر فرد عورت کی چھاتی پر سوار ہو اور زنا کا مرتکب ہونے والا ہو، اس وقت بھی ہٹنا اس کے اختیار میں ہے، چاہے اس کے لئے کتنی ہی مشقت ہو، کیونکہ اس وقت بھی شریعت کا حکم یہی ہے کہ اس سے باز آؤ۔ (صفحہ ۳۶۶)

اہل حق کو کسی کا ساتھ دینے اور نہ دینے کی پرواہ نہیں ہوتی

فرمایا، وہ کیا اہل حق ہے، جس کی نظر غیر پر ہو۔ لاحول پڑھئے، خاک ڈالنی چاہئے،

ایسے خیال پر کہ اپنا مجمع بڑھانے اور قوت پیدا کرنے کے لئے کسی کو مرید کرلیا جائے۔ حق میں تو وہ قوت ہے کہ اگر دنیا میں صرف ایک شخص اہل حق ہو اور باقی سب اہل باطل، تو وہ سمجھتا ہے کہ اہل باطل کی حقیقت ہی کیا ہے، نیز میں ان سب پر غالب آسکتا ہوں، اگر اتنی قوت نہیں تو وہ حق ہی نہیں، چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب منکرین زکواۃ سے قتال کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام نے ان سے اختلاف کیا کہ ایسا کرنا مصلحت کے خلاف ہے اور فتنہ برپا ہوجائے گا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ بھی اس اختلاف میں شریک تھے، حضرت صدیقؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جبار فی الجاہلیہ خوار فی الاسلام یعنی تم حالت کفر میں تو ایسے سخت تھے، اسلام میں ایسے کمزور ہوگئے ہو، مجھے کسی کا انتظار نہیں، میں کسی کو ساتھ دینے کی درخواست نہیں کرتا، مجھے کسی کے تعاون کی حاجت نہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ان اللہ معنا۔ حضورﷺ کے ساتھ میں ہی تھا، لہٰذا نص قطعی سے ثابت ہے کہ اللہ میرے ساتھ ہے، جب خدا میرے ساتھ ہے تو مجھے کسی کے ساتھ کی پروا نہیں۔ اکیلا کندھے پر تلوار رکھ کر نکلوں گا اور سارے عالم کے مقابلہ کے لئے میں تنہا کافی ہوں، خدا میرا ساتھ دے گا، یہ سن کر سب دم بخود ہوگئے اور موافقت کرلی۔ (صفحہ ۳۶۷)

نسبت کا مفہوم

فرمایا، نسبت میں جو یکسوئی ہوتی ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خطرہ ہی نہ آئے، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ غیر حق پر نظر نہ ہو۔ صحابہ اہل نسبت تھے، لیکن وسوسے آتے تھے۔ (صفحہ ۳۶۷)

دوران مجلس سلام سے احتراز کرنا

فرمایا، جب مجلس جمی ہوئی ہو اور کوئی گفتگو ہو رہی ہو تو سلام نہیں کرنا چاہئے، نہ مصافحہ کرنا چاہیے، بعض لوگ بیچ میں السلام علیکم کہہ کر لٹھ سی مار دیتے ہیں اور پھر ایک طرف سے مصافحہ کرنا شروع کردیتے ہیں، جس سے گفتگو کا سارا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اور تمام مجمع پریشان ہوجاتا ہے، یہ آداب مجلس کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۳۲۸)

طبائع کے اختلاف کی وجہ سے بزرگوں کی مختلف شانوں کا ہونا

فرمایا، ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست۔ بزرگوں کی شانیں مختلف ہیں، کیونکہ طبیعتیں

پیدائشی طور پر مختلف ہوتی ہیں۔ جب وہ بزرگ ہوجاتے ہیں تو وہ طبعی امور جو پیدائشی ہیں، جیسے تیزی، نزاکت، تحمل، عدم تحمل، صفائی انتظام، بے انتظامی وغیرہ وہ باقی رہتے ہیں، جس سے ان بزرگوں کی شانیں مختلف ہوجاتی ہیں، چنانچہ مختلف شان کے بزرگوں کی حسب ذیل حکایتیں بیان فرمائیں۔

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب حج کے لئے چلے تو بمبئی میں مولانا محمد قاسم صاحب تو لوگوں سے ملتے جلتے رہے اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ انتظام میں مشغول رہتے۔ جب مولانا محمد قاسم صاحب واپس آتے تو مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے، کچھ فکر بھی ہے کہ کیا انتظام کرنا چاہئے، بس ملتے جلتے رہتے ہیں۔ مولانا فرماتے کہ جب آپ بڑے سر پر موجود ہیں تو مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے۔ (۲) مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس کوئی شخص بیٹھا ہوا ہوتا تو وہ اشراق اور چاشت بھی قضا کردیتے تھے۔ جب کہ مولانا رشید احمد صاحب کی دوسری شان تھی۔ کوئی شخص بیٹھا ہو، جب اشراق یا چاشت کا وقت آیا، وضو کرکے وہیں نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے، یہ بھی نہ کہتے تھے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں، جہاں کھانے کا وقت آیا، لکڑی لی اور چلدئے، چاہے کوئی نواب کا بچہ بیٹھا ہو، مولانا کی شان بادشاہوں کی سی شان تھی، ایک تو مولانا بات ہی کم کرتے اور اگر کچھ مختصر سی بات کہی تو جلدی سے ختم کرکے تسبیح لے کر ذکر میں مشغول ہوجاتے، کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دیدیا اور اگر نہ پوچھی تو کوئی شخص بیٹھا رہے، انہیں اس سے کچھ مطلب نہیں، جب کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے پاس جب تک کوئی شخص بیٹھا رہتا، وہ بولتے رہتے۔ (صفحہ ۳۷۰)

صحبت کب تک ضروری ہے

فرمایا، جب تک طریق کی حقیقت معلوم نہ ہوجائے، اس وقت تک تو صحبت شیخ ضروری ہے، جب اس کی حقیقت معلوم ہوگئی اور طریق سے مناسبت پیدا ہوگئی پھر صحبت ضروری نہیں۔ (صفحہ ۳۷۱)

ذکر کے وقت، ذات حق کا تصور رکھنا

فرمایا، ذکر کے وقت مختلف تصورات سے یکسوئی فوت ہوجاتی ہے، بلکہ اس وقت محض تصور ذات حق رکھنا چاہئے، اس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ (صفحہ ۳۷۱)

سلسلہ کے وراثتی اثرات

فرمایا، بیعت ضروری نہیں۔ بڑی چیز تعلیم ہے اور مربی کے ساتھ اعتقاد، کیونکہ اگر اعتقاد موجود ہے تو چاہے شیخ خود کسی قابل نہ ہو، لیکن اس کا (یعنی تعلیم حاصل کرنے والے کا) کام بن جاتا ہے، بشرطیکہ سلسلہ صحیح ہو۔ اگر سلسلہ صحیح نہ ہو تو نرے اعتقاد سے کچھ نہیں ہوتا۔ صحیح سلسلہ ہونے کی صورت میں چونکہ سلسلہ دور تک اثرات کا حامل ہوتا ہے، اس کے واسطے سے بزرگوں کا فیض پہونچ جاتا ہے۔ ایک بار فرمایا، صحیح سلسلہ کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے، جیسے نسب کے صحیح سلسلہ ہونے کا۔ (صفحہ ۳۷۲)

معدہ اور دماغ کی صحت کی فکر کرنا

ایک ذاکر شاغل سے بعد دریافت حال فرمایا کہ تم کمزور ہو۔ ضرب اور جہر چھوڑ دو۔ وظیفہ کے طور پر پڑھا کرو اور دو چیزوں کا ہمیشہ خیال رکھو۔ معدہ اور دماغ کی تندرستی کا۔ کام کا دارومدار ان دونوں کی حفاظت پر ہے۔ (صفحہ ۳۷۲)

سارے کاموں کو، خدا کے سپرد کرنا

فرمایا، جس بندہ پر حق تعالیٰ کی حکمت آشکار ہوگئی ہے اور اس کے حکیم ہونے کا یقین کامل ہوگیا ہے، اس نے سارے کاموں کو خدا پر چھوڑ دیا ہے، اسی حال کا مبالغہ ہے کہ بعضے بزرگوں نے دعا بھی چھوڑ دی۔ لیکن سنت یہ ہے کہ حال تو وہی ہو، اور پھر دعا کرے، دونوں کو جمع کرنا اگرچہ بڑا مشکل کام ہے، لیکن کمال یہی ہے۔ (صفحہ ۳۷۳)

سلوک کے لازمی تقاضے اور حالتوں کا تغیر

فرمایا، ابتداء میں بلکہ درمیان تک (سالک کی) حالت میں تغیر رہتا ہے، استقلال تو مدتوں کے بعد ہوتا ہے۔ رسوخ نسبت میں کمال کے بعد البتہ (سالک کی) حالت میں ثبات ہوتا ہے، اس حالت کا انتظار نہ کرنا چاہئے، نہ ہی بدلتی ہوئی اس باطنی حالت سے دلگیر ہونا چاہئے۔ اپنے کام میں لگے رہنا چاہئے (سالک کو چاہئے کہ) قدم اٹھا کر چلنا شروع کردے۔ پھر چاہے روزانہ ایک بالشت ہی چلے۔ بُعد روز بروز کم ہوتا جائے گا۔ بلکہ راستہ میں رہ جانا بھی پہنچ جانا ہی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص علم کی طلب میں مرجاتا ہے، اس کا حشر علماء وشہداء میں ہی ہوتا ہے یعنی وہ ان ہی میں شمار ہوتا ہے تو طلب

بمنزلہ وصول کے ہے، کیونکہ بندہ کا کام اتنا ہی تھا۔ (صفحہ ۳۷۴)

قبض کا بسط سے زیادہ بہتر ہونا

ایک ذاکر صاحب نے عرض کیا کہ بعض اوقات قلب بالکل خالی معلوم ہوتا ہے، بہت کوشش کرتا ہوں لیکن کچھ نہیں ہوتا۔ فرمایا، کوشش میں مبالغہ کرنا غلطی ہے، سرسری توجہ کافی ہے۔ ورنہ کاوش کا انجام اچھا نہیں۔ طبیعت پر بوجھ ڈالنے سے پریشانی بڑھتی اور کبھی مایوسی تک نوبت پہنچتی ہے، کیونکہ ایسے امور (یعنی کیفیات وغیرہ) اختیار میں نہیں اور جو امور اختیار میں نہ ہوں، ان کے پیچھے پڑنے کا انجام اخیر میں تعطل ہوتا ہے، اگر بالفرض کامیابی نہ ہوئی تو شیطان راہ مارتا ہے، اغوا کرتا ہے کہ اتنا سر مارتے ہو، پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، کیا فائدہ، بے کار محنت کرنے سے۔ اور یہ قلب کا خالی رہ جانا قبض کہلاتا ہے اور قبض، بسط سے بھی ارفع ہے، اس لئے کہ اپنی حقیقت قبض میں ہی معلوم ہوتی ہے۔ اگر بسط دائم رہے تو بہت سے اخلاق رذیلہ پیدا ہوجائیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے رزق ظاہری کی بابت فرمایا ہے کہ **ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض** یعنی اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے رزق کو کشادہ فرمادیتے تو وہ شرارت کرنے لگتے۔ یہی حال رزق باطنی کا ہے کہ اگر احوال وکیفیات دائم رہیں تو بہت سی باطنی خرابیاں پیدا ہوجائیں، مثلاً کبر وعجب اور سرکشی وغیرہ، پس قبض میں بھی صدہا مصلحتیں ہیں اور یہ جو قلب خالی معلوم ہوتا ہے تو واقع میں وہ خالی نہیں ہوتا، بلکہ بھرا ہوا ہوتا ہے، لیکن جو چیز اس میں بھری ہوئی ہے، وہ ایسی ہے کہ بظاہر محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن بعض اوقات وہی چیز ضروری ہوتی ہے، چنانچہ مشک میں کبھی پانی بھرتے ہیں، کبھی پھونک مار کر ہوا بھرتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے تیرتے ہیں، اس وقت ہوا کا بھرنا ہی ضروری ہوتا ہے۔ اس وقت اگر اس میں کوئی شخص سوئی چبھودے تو اس کے ڈوبنے کا ذریعہ ہے اور یہ جاننا مربی حقیقی کا کام ہے کہ کس وقت ہوا بھرنا چاہئے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم خالی ہیں۔ کام میں لگا رہنا چاہئے اور حالات کی اطلاع دیتے رہنا چاہئے، ان شاء اللہ کامیابی یقینی ہے، اس راہ میں محرومی ہرگز نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۳۷۵)

لڑکوں سے عشق کا تعلق مردودیت کی علامت ہے

فرمایا، عشق صورۃ بھی عذاب ہے اور خاص طور پر لڑکوں کا عشق تو عذاب ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب کسی کو مردود کرنا منظور ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو لڑکوں کے عشق میں

مبتلا کرتے ہیں۔ پس یہ عشق صورۃ گویا مردودیت کی علامت ہے۔ تصوف کا مسئلہ ہے کہ لڑکوں سے میلاپ نہ کیا جائے اور عورتوں سے نرم باتیں نہ کی جائیں۔ حق تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے لاتخضعن بالقول اس سے تائید ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ عشق مجازی ظاہر میں ایک نہایت مصیبت اور تکلیف کی چیز ہے، برخلاف عشق حقیقی کے، کہ اس میں سراسر راحت اور اطمینان ہے اور اس میں بظاہر جو تکلیف معلوم ہوتی ہے، اس میں بھی ایک نور ہوتا ہے، پریشانی بالکل نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۳۷۶)

شرافت کا خاتمہ

فرمایا، آج کل شرافت اور ریاست کا وہ خلاصہ رہ گیا ہے، جو میرے سب سے چھوٹے ماموں صاحب نے اس شعر میں دکھلایا ہے۔

ہے شرافت تو کہاں بس شر و آفت ہے فقط
ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

(صفحہ ۳۷۷)

نسبت اویسہ کا ناکافی ہونا

فرمایا، بزرگوں نے کہا ہے کہ گربۂ زندہ بہ از شیر مردہ۔ یعنی زندہ شیخ سے جو فیوض و برکات حاصل ہوسکتے ہیں، وہ مردہ شیوخ سے نہیں ہوسکتے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس طریق میں تعلیم کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور عادۃً تعلیم مردوں سے نہیں ہوسکتی، اگرچہ بزرگ برزخ میں زندوں سے بڑھ کر حیاۃ کی صفت سے بہرہ ور ہوں، ہاں، ان سے نسبت میں تقویت ہوسکتی ہے۔ لیکن خالی تقویت نسبت سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی شخص پہلوانی کا ہزار زور رکھتا ہو، لیکن اگر وہ داؤ نہ جانتا ہو تو وہ کچھ بھی نہیں۔ اور داؤ جاننے والا ایک بچہ بھی اس کو چت کردے گا۔ خالی تقویت سے کیا ہوتا ہے، صنعت بھی تو چاہیئے۔ روایت کا سلسلہ آخر عبث تھوڑا ہی ہے۔ مرغی بے مرغ کے بھی انڈے دیتی ہے۔ لیکن خالی انڈے سے بچے نہیں نکلتے۔ اسی طرح اگرچہ وہ خود کچھ ہو بھی جائے، لیکن ایسے شخص سے دوسرے کو نفع نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ ایسے شخص کو جو مدعی ہے نسبت اویسیہ کا۔ اگر کوئی دشواری پیش آئے تو وہ کسی سے پوچھے گا بھی نہیں، کیونکہ اس سے لوگوں کے نزدیک اس کی نسبت اویسیہ قطع ہوجائے گی۔ اور اسے شرمندہ اور سبکی ہونے کا احساس ہوگا پھر فرمایا نسبت اویسیہ ہوتی ہے، لیکن

میرے نزدیک وہ کافی نہیں، ایسے شخص سے غلطیاں واقع ہوسکتی ہیں، کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ (بزرگ) ہر چیز کی تحقیق حضور ﷺ سے کرسکے اور اگر ہو بھی تو کشف کے غلط ہونے کا احتمال ہے، محض روحانی طور پر فیض ہونے سے نسبت میں تو قوت ہوجاتی ہے، لیکن طریقت کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی۔ (صفحہ ۳۷۷)

محبت، خود آداب سکھاتی ہے

ایک صاحب نے استفسار کیا (اہل اللہ سے) محبت کے کیا آداب ہیں۔ فرمایا، جب محبت پیدا ہوگی تو آداب خود بخود معلوم ہوجائیں گے۔ جس طرح لڑکا جب بالغ ہوتا ہے تو اسے خود بخود شہوت ہونے لگتی ہے۔ نابالغ بچہ کو کس طرح سمجھایا جائے کہ جماع اس طرح ہوتا ہے۔ محبت پیدا کی جائے، پھر خود بخود قلب میں آداب آنے لگیں گے۔ محبت کے آداب کی کوئی فہرست تھوڑا ہی تیار ہوسکتی ہے۔ اور تکلف کے ساتھ محبت نہ کی جائے، اگر کھینچ تان کر اور آداب کی فہرست معلوم کرکے محبت بھی کی جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے، جتنی محبت ہو، اتنا ہی اس کا اظہار کیا جائے۔ (صفحہ ۳۷۸)

سرمایۂ تسلی کا ہونا

ایک ذاکر صاحب کچھ وقت قیام کرکے واپس جارہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ پہلے دیکھا ہے کہ حضور کے (وجدانی طور پر) فراق میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور گریہ طاری رہا کرتا ہے۔ فرمایا، اب ان شاء اللہ ایسا نہ ہوگا، کیونکہ اب ذکر سے بفضلہٖ تعالیٰ مناسبت پیدا ہوگئی ہے، اب تسلی کا سرمایہ پاس ہے۔ (صفحہ ۳۷۹)

ذاکر کی سب سے بڑی مصروفیت

فرمایا، حضرت خضر علیہ السلام، حضرت ابراہیم بن ادہم سے ملنے آئے، سلام و مصافحہ کے بعد حضرت ابراہیم ابن ادہم پھر ذکر اللہ میں مشغول ہوگئے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ تو بڑے بے فکرے ہیں۔ فرمایا، بھائی، تم بڑے بے فکر ہو، لوگ تو برسوں میرے ملنے کی تمنا کرتے رہتے ہیں، لیکن ملنا نصیب نہیں ہوتا، تم سے میں خود ملنے آیا ہوں، لیکن تم نے میری طرف توجہ بھی نہ کی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم نے فرمایا کہ جسے خدا سے ملنے سے فرصت ہو، وہ آپ سے ملنے کی تمنا کرے۔ (صفحہ ۳۸۰)

اکابر کو اپنے عیوب کی صفائی کا فکر نہ ہونا

فرمایا، اکابر کو اپنے اوپر طعن کو ہٹانے کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم باخلق عالم کار نیست

بات یہ ہے کہ وہ اپنی نظر میں سب سے زیادہ ذلیل ہوتے ہیں، یہ بالکل وجدانی امر ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو کسی بھی مدح کا مستحق نہیں سمجھتے۔ بلکہ بخدا انہیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ لوگ ہمارے معتقد کیوں ہیں، باوجود اتنے عیوب کے اور بعض بزرگ تو اس قدر مغلوب ہوتے ہیں کہ وہ اپنے عیوب کھولنے لگتے ہیں، تاکہ لوگ معتقد نہ رہیں، لیکن قائد کو ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اس میں عوام کا ضرر ہے۔ (صفحہ ۳۸۲)

اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی بڑی ترکیب

تنگی کی شکایت پر فرمایا کہ یہ انبیاء کی سنت ہے۔ رزق جتنا مقدر میں ہوتا ہے، اتنا ہی ملتا ہے۔ اس کا کوئی خاص وظیفہ نہیں، ہاں دعا کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سکون دیدیں گے۔ جب فرد کا اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھ جاتا ہے تو پھر پریشانی نہیں ہوتی اور تعلق پیدا کرنے کی سب سے بڑی ترکیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوب مانگا جائے۔ (صفحہ ۳۸۳)

دین میں حق تعالیٰ کی برکت کا ہونا

فرمایا، دین میں محنت تو کم ہے اور ثمرہ زیادہ۔ برخلاف اس کے دنیا میں محنت تو زیادہ ہے اور ثمرہ کم۔ اس کی میں یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ کبوتر کے شکار میں بہت کم مشقت ہے، اگر ہوائی بندوق بھی لے کر کوئی چلا جائے تو دو چار کبوتر تو لے ہی آئے گا، کم از کم شام کے لئے سالن تو ہو ہی گیا۔ برخلاف اس کے اگر سور کا شکار کیا تو کارتوس کے کارتوس خراب کئے اور ملا کیا سور۔ نہ کھانے کا، نہ پکانے کا، دین میں کسی حال میں نقصان نہیں۔ یہ سب حق تعالیٰ کی برکت ہے۔ (صفحہ ۳۸۴)

اللہ تعالیٰ کا، حسن ظن کے مطابق معاملہ فرمانا

ایک انگریز نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات میں نے یہ دیکھی کہ ایک مردہ کو دیکھا، جو اجمیر میں پڑا ہوا سارے ہندوستان پر سلطنت کر رہا ہے۔

واقعی، خواجہ صاحب کے ساتھ لوگوں کو بالخصوص ریاست کے امراء کو بہت ہی عقیدت ہے۔ ان حضرات نے اللہ کی اطاعت کی تھی، پھر دیکھئے، کیا رنگ ظاہر ہو رہا ہے۔ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب نے عرض کیا کہ جب فائدہ ہوتا ہوگا، تب ہی تو اس قدر عقیدت ہے۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسا ظن ہو، ویسا ہی وہ معاملہ فرماتے ہیں۔ اس طرح تو بت پرستوں کو بت پرستی میں بھی فائدہ ہوتا ہے، یہ کوئی دلیل تھوڑا ہی ہے۔ دلیل ہے شریعت۔ (صفحہ ۳۸۴)

بدگمانی اور بدزبانی کا منشا کبر ہے

فرمایا، بڑی چیز تو یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر فعل کو شریعت پر پرکھے، میرا کون سا عمل شریعت کے موافق ہے اور کون سا خلاف۔ اور کسی کے ساتھ اعتقاد رکھنا ضروری نہیں۔ ہاں، کسی کے لئے بلاضرورت بدگمانی اور بدزبانی جائز نہیں، اگر بدگمانی نہ کی تو کیا نقصان ہوا، پھر فرمایا کہ بدگمانی کا سبب کئی چیزیں ہیں اور ان سب کا منشا کبر ہے۔ اگر فرد اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے گا تو جس وقت بدگمانی ہونے لگے گی، فوراً اپنا عیب سامنے آئے گا اور سوچے گا کہ ہم تو اس سے بھی زیادہ نالائق ہیں، اس کے بعد کبھی اس کی نوبت نہ آئے گی۔ لہٰذا کبر کا علاج کسی کامل شخص کے پاس رہ کر کرانا ضروری ہے۔ (صفحہ ۳۸۵)

مجاہدہ کے ثمرات ونتائج

فرمایا، مجاہدہ کا ثمرہ اونچا رہتا ہے اور ناز ونعم کا ثمرہ نیچا رہتا ہے، اس کی توضیح میں یہ حکایت بیان فرمائی کہ ایک بزرگ درویش تھے یعنی عالم پورے نہ تھے، اگرچہ بےعلم بھی نہ تھے۔ وعظ میں سیدھی سیدھی باتیں فرما رہے تھے۔ ان کی باتوں سے لوگ تڑپ رہے تھے، اس مجلس میں ایک علامہ بھی حاضر تھے، ان کے دل میں خیال گذرا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہم اتنے بڑے عالم ہیں، لیکن ہمارے وعظ میں اثر نہیں، جب کہ یہ کم علم مضامین بھی عالی اور دقیق نہیں لیکن ان کے وعظ میں لوگوں کی یہ حالت ہے۔ ان بزرگ کو ان کا یہ خیال مکشوف ہوگیا۔ فرمایا کہ ایک گلاس میں تیل، پانی اور بتی تھی۔ پانی نے تیل سے شکایت کی اور پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں نیچے رہتا ہوں اور تو اوپر۔ حالانکہ میں پانی ہوں اور پانی کی یہ صفت ہے کہ وہ صاف شفاف خود طاہر مطہر۔ روشن، خوبصورت، خوب سیرت ہے۔ غرض ساری صفتیں موجود ہیں اور تو (یعنی تیل خود بھی میلا اور جس پر گرے اسے بھی میلا

کردے۔ کوئی چیز تجھ سے دھوئی نہیں جاسکتی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تو نیچے ہوتا اور میں اوپر، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تیل نے جواب دیا کہ چونکہ تم نے کوئی مجاہدہ نہیں کیا، ہمیشہ ناز ونعم میں ہی رہے، بچپن سے اب تک۔ بچپن میں تمہیں فرشتے آسمان سے اتار کر بڑے اکرام سے لائے۔ پھر جس نے دیکھا، عزت کے ساتھ برتنوں میں لیا۔ بڑی رغبت سے نوش کیا، تمہاری دھوپ سے حفاظت کی جاتی ہے۔ میل کچیل گرد وغبار سے بچایا جاتا ہے، اگرچہ اپنے مطلب کے لئے ہی سہی۔ غرض تم نے ہمیشہ عزت ہی عزت اور ناز ہی ناز دیکھا اور ہم نے جب سے ہماری ابتداء ہوئی ہے، ہمیشہ مصیبتیں جھیلی ہیں۔ سب سے اول سرسوں یا تل کا تخم تھا، پہلی مصیبت تو یہ ہوئی کہ سینکڑوں من مٹی ہمارے اوپر ڈالی گئی۔ سینہ پر پتھر رکھا۔ پھر جگر شق ہوا، یہ دوسری مصیبت پڑی۔ تیسری مصیبت یہ پڑی کہ زمین کو توڑ کر باہر نکلے، چوتھی یہ کہ جب باہر نکلے تو آفتاب کی شدت نے جگر بھون دیا۔ پانچویں مصیبت یہ جھیلنی پڑی کہ جب کچھ بڑے ہوگئے تو درانتی سے کاٹا گیا۔ چھٹی مصیبت یہ کہ زیر وزبر کیا گیا اور بیلوں کے کھروں میں روندا گیا۔ آخر میں ساتویں مصیبت تو غضب کی تھی کہ کولھو میں ڈال کر جو کچلا تو جگر پاش پاش کردیا۔ اسی طرح ہماری ہستی فنا ہوئی، عمر بھر مجاہدوں میں گذری۔ سو مجاہدہ کا ثمرہ اونچا رہتا ہے اور ناز ونعم کا ثمرہ نیچا رہتا ہے۔ (صفحہ ۳۸۵)

بیعت کو ضروری سمجھنا، بدعت ہے

فرمایا، بیعت کے بغیر جو نفع ہوتا ہے، وہی نفع بغیر بیعت کے بھی حاصل ہوسکتا ہے، نفع کا دارومدار بیعت پر نہیں۔ عرض کیا گیا کہ پھر بیعت بدعت ہے، اگر بدعت ہے تو اس کو قطعاً ترک کردینا چاہئے۔ فرمایا، بیعت بدعت نہیں، بیعت کو ضروری سمجھنا بدعت ہے۔ بلکہ بیعت ایک سنت مستحبہ غیر ضروری ہے۔ (صفحہ ۳۸۶)

ذکر وفکر کے لئے اسلامیت کی شرط کا ہونا

فرمایا، خدا کے نام کے لئے اسلام کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں۔ کوئی ہندو مجھ سے اللہ کا نام پوچھے تو میں ہرگز نہ بتاؤں گا، جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائے، باقی چاہے جبری ہو، قدری ہو، چاہے فلاں خانی ہو، چاہے سماع سنتا ہو۔ چاہے غیر مقلد ہو، چاہے رافضی ہو، کوئی ہو، لیکن ہو مسلمان، ہم سے ذکر وشغل پوچھے تو ہم بتائیں گے، چاہے نفع نہ ہو، لیکن ہم اپنی طرف سے بتانے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے یہاں اہل سنت والجماعت ہونے کی شرط

نہیں۔ لیکن ہم بتائیں گے کہ عقاید کی اصلاح کے بغیر کچھ نفع نہیں ہوگا۔ اس لئے میں اللہ کا نام سب کو بتادیتا ہوں کہ اس کی برکت سے نفع ہوجاتا ہے۔ یعنی عقاید درست ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۳۸۷)

زنا کے بارے میں کچھ اہم نکات

فرمایا، زنا کی سزا بہت سخت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ فعل اللہ کے نزدیک بہت سخت ہے، سارے بدن سے مزے لوٹے تھے، اس لئے سارے بدن پر پتھر مار مار کر جان نکالی جاتی ہے، پھر فرمایا کہ زنا کی شہادت بھی بہت سخت ہے۔ غالباً آج تک زنا کا ثبوت شہادت سے کبھی نہیں ہوا، جب ہوا ہے، اقرار سے ہوا ہے، زنا کے اقرار میں بھی یہ قانون ہے کہ جب چاہے اپنے اقرار سے رجوع کرلے، پھر اس پر حد قائم نہیں کی جاسکتی، مگر قتل کے اقرار میں یہ بات نہیں، پھر استفسار پر فرمایا کہ زنا کا اقرار نہ کرنا اور جھوٹ بول دینا، اقرار کرنے سے افضل ہے۔ لیکن جن صحابہ نے اقرار کیا، ان پر حال طاری ہوگیا تھا، انہوں نے اپنے وجود سے عالم کو پاک کرنا چاہا، اس قدر ندامت دامنگیر ہوئی۔ واقعی اپنے اختیار سے اپنے اوپر ایسی سخت سزا جاری کرالینا، نہایت عجیب ہے۔ جبھی تو حضور ﷺ نے، حضرت ماعز کی نسبت فرمایا تھا کہ اگر اس کی توبہ تمام اہل مدینہ پر تقسیم کردی جائے تو سب کی مغفرت کے لئے کافی ہے۔ (صفحہ ۳۸۷)

عمر رسیدہ بزرگوں میں شہوانی قوت کا غالب ہونا

فرمایا، اس معاملہ میں میری خوب اطمینان کی تحقیق ہے کہ جیسی عفت جوانی میں ہوتی ہے، بڑھاپے میں ویسی نہیں ہوتی۔ عفیف جوان بہ نسبت عفیف بوڑھوں کے زیادہ عفیف ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں ضبط کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عورتوں کو بوڑھے آدمی سے زیادہ احتیاط کرنی چاہئے۔ لیکن لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے، بوڑھوں سے بالکل احتیاط نہیں کرائی جاتی۔ میں نے کئی بوڑھوں سے پوچھا، سب نے اقرار کیا کہ شہوت تو ہوتی ہے، بوڑھوں میں بھی، یعنی قلبی میلان، لیکن چونکہ وہ کسی کام کے نہیں رہتے، اس لئے بزرگ رہتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ لوگ اسی طرح عورتوں کو بزرگوں سے بھی نہیں بچاتے، حالانکہ بزرگوں میں زیادہ قوت ہوتی ہے، کیونکہ وہ سب باتوں سے رکے رہتے ہیں۔ فاسق فاجر میں تو کچھ نہیں رہتا۔ کیونکہ کچھ فسق وفجور میں نکل جاتا ہے۔ کچھ

آنکھوں کی راہ سے نکل جاتا ہے۔ کچھ خیالات کی راہ سے نکل جاتا ہے اور جو متقی ہوتے ہیں، ان کا سب ذخیرہ کوٹھری ہی میں رہتا ہے۔ نکلنے کی سب راہیں بند رہتی ہیں، اس لئے بزرگوں سے تو ضرور بچانا چاہئے، اب یہ ہوتا ہے کہ میری لڑکی پر ہاتھ پھیر دیجئے۔ میری بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے، یہ واہیات حرکتیں ہیں۔ بہت ہی احتیاط چاہئے۔ (صفحہ ۳۸۹)

بیوی میں حسن وجمال کی تلاش کا مسئلہ

فرمایا، آج کل لوگ منکوحہ عورتوں میں حسن وجمال تلاش کرتے ہیں، حالانکہ آج کل فتنوں سے حفاظت اور راحت اس میں ہے کہ بیوی زیادہ حسین وجمیل نہ ہو، حسن وجمال کی کمی قدرتی چیز ہے، عرض کرنے پر فرمایا کہ حسن وجمال خدائے تعالیٰ کی نعمت ہے، لیکن اس میں فتنہ کا احتمال غالب ہے۔ (صفحہ ۳۹۰)

اہل اللہ کے دل میں خاص برکت کا ہونا

فرمایا کہ اکثر رئیسوں کو حق تعالیٰ حوصلہ عطا فرما دیتے ہیں۔

خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ اسی طرح بزرگان کاملین دولت باطنی دینے میں سخی ہوتے ہوں گے۔ مگر ان کو اس میں کیا اختیار ہے، وہ تو حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ فرمایا کہ ان کے اختیار کی ضرورت نہیں۔ ان کے قلوب میں یہ برکت ہوتی ہے کہ جو شخص انہیں راضی رکھتا ہے اور جس کی طرف ان کے قلوب متوجہ رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر فضل فرما ہی دیتا ہے۔ تجربہ یہی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل اور ایک اور شخص نہر میں وضو کررہے تھے۔ امام صاحب نیچے کی طرف تھے اور وہ شخص اوپر کی طرف۔ اس شخص نے خیال کیا کہ امام صاحب، اللہ کی مقبول بندے ہیں۔ میرا مستعمل پانی ان کے پاس جاتا ہے، یہ بے ادبی ہے۔ اس لئے وہ اٹھ کر دوسری طرف ان کے نیچے جا بیٹھا، انتقال کے بعد اس کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا، پوچھا کہ مغفرت ہوئی یا نہیں۔ کہا کہ میرے پاس کوئی عمل نہیں تھا۔ اس بات پر مغفرت ہوئی کہ تو نے ہمارے مقبول بندہ احمد بن حنبل کا ادب کیا تھا، جو ہمیں پسند آیا۔ اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ اے عائشہؓ کسی بھی نیک عمل کو حقیر نہ

سمجھنا، ہر نیک عمل میں مغفرت کی خاصیت ہے۔ اسی طرح ہر گناہ میں عذاب کی خاصیت ہے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ (صفحہ ۳۹۲)

بزرگوں کی نظر میں باطنی اخلاق کی اہمیت

فرمایا، بزرگوں کی ظاہری اعمال پر زیادہ نظر نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی اصلاح تو جلدی ہوسکتی ہے۔ یہ تو محض ارادہ کا بدلنا ہے۔ بے نمازی ایک منٹ میں نمازی ہوسکتا ہے۔ بے داڑھی والا ایک منٹ میں ڈاڑھی چھوڑ سکتا ہے۔ شرابی ایک منٹ میں شراب سے تائب ہوسکتا ہے۔ فاسق فاجر ایک منٹ میں متقی ہوسکتا ہے، لیکن بڑی چیز، جس پر بزرگوں کی نظر ہوتی ہے، اخلاق باطنہ ہیں۔ مثلاً تکبر وغیرہ، ان کی اصلاح نہایت دشوار ہوتی ہے۔

اصلاح، نفس کی تذلیل سے ہی ہوتی ہے

فرمایا، کتابوں سے بھی ثابت ہے اور تجربہ سے بھی کہ نفس کو جب تک ذلت نہ دی جائے، یہ سیدھا نہیں ہوتا اور یہ بات ظاہر ہے کہ ذلت اپنے ہاتھ سے نہیں ہوتی۔ بازار میں کھڑے ہوکر خود اپنے ہاتھ سے اپنے سر پر جوتیاں بھی مار لی جائیں، تب بھی ذلت نہ ہوگی، ذلت تو دوسرے کے ہاتھ سے ہی ہوتی ہے۔ (صفحہ ۳۹۳)

ولایت کی سلبی سے متعلق تفصیلات

ایک صاحب نے عرض کیا کہ ایک بزرگ ایسے تھے کہ وہ جس بزرگ سے مصافحہ کرتے تھے، ان کی ولایت سلب کرلیتے تھے، اخیر میں انہیں ایک ایسے بزرگ ملے، جنہوں نے ان بزرگ کی اپنی ولایت بھی اور جتنے بزرگوں کی وہ ولایت سلب کرچکے تھے، وہ سب ولایتیں بھی ایک دم سے سلب کرلیں۔ اس پر تحقیق بیان فرمائی کہ دو حالتیں ہیں، ایک تو اللہ کے ساتھ نسبت کی حالت ہے یا اس سے متعلق چیزیں ہیں، مثلاً اطاعت وعبادت وغیرہ، یہ قرب الی اللہ کا سبب ہے، یہ تو حق تعالیٰ کی عطا ہے، جو قربت کا ذریعہ ہے یا ہر قرب پر مرتب ہوتی ہے وہ سلب نہیں ہوسکتی۔ دوسری نفسانی حالت ہوتی ہے، جس میں طبیعت کی خصوصیت اور طبعی اسباب کو بھی دخل ہے، مثلاً ذوق وشوق کی کیفیت۔ کہ یہ کیفیت طبعی اسباب سے وابستہ ہے، مثلاً مزاج میں قوت کا ہونا۔ صحت کا اچھا ہونا۔ ہر طرح کا اطمینان ہونا یعنی معاش کی طرف سے بھی اطمینان ہو اور دشمنوں کی طرف سے بھی کوئی اندیشہ نہیں۔

ان سب اسباب کی وجہ سے طبیعتوں میں شوق وخوشی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ سو خوشی کی یہ کیفیات خیالی قوت کے ذریعہ سے مغلوب ہوسکتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں ایک قسم کی رنجیدگی اور افسردگی پیدا ہوجاتی ہے، بعض طبیعتیں ایسی کمزور وکم ہمت ہوتی ہیں کہ اس افسردگی کی وجہ سے ان پر سستی غالب ہوجاتی ہے، اس کی بنا پر یہ عبادت چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں دینی نقصان ہونے لگتا ہے، اس کا سبب ان کی کم ہمتی ہوتی ہے، لیکن لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ولایت سلب کرلی، ایک شخص کسی کو لٹھ مارے اور وہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے پانچ وقت کی نماز چھوڑ دے تو اس کو کوئی کہے کہ لٹھ مار کر ولایت سلب کرلی۔ (صفحہ ۳۹۶)

القائے نسبت کا مفہوم

ایک صاحب نے پوچھا کہ شیخ جو نسبت القا کرتا ہے، اس کے معنی کیا ہے، فرمایا، شیخ کی توجہ اور شفقت میں یہ برکت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نسبت القا فرمادیتے ہیں، جیسے استاد، اگر توجہ اور شفقت سے پڑھائے تو اللہ تعالیٰ شاگرد کے قلب میں مضامین القا فرمادیتے ہیں، پس القا استاد یا شیخ کا فعل نہیں۔ چنانچہ اس قسم کے اجارہ کو فقہا نے ناجائز کہا ہے، مثلا میرے لڑکے کو حساب کا ماہر کردو، البتہ یہ جائز ہے کہ تم بتلادو، ماہر کردینا، یہ کسی کے اختیار میں نہیں، البتہ بتادینا اختیار میں ہے۔ پھر ان صاحب نے عرض کیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ مشائخ، بیعت کے وقت القائے نسبت کرتے ہیں، اس کا یہی مطلب ہے، فرمایا کہ بیعت کے وقت اجمالا نسبت القا ہوجاتی ہے یعنی حق تعالیٰ کے ساتھ ایک طرح کی نسبت پیدا ہوجاتی ہے، اہل اللہ کے ساتھ تعلق ہوگیا تو گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوگیا۔ بیعت سے گویا اللہ کے ساتھ ایک خصوصیت ہوگئی۔ (صفحہ ۳۹۶)

ہر معاملہ میں عزیمت پر عمل کرنا دشوار ہے

ایک صاحب نے اس حدیث پر کچھ اشکال ظاہر کیا۔ لن یشاد الدین احدھما الا غلبہ، فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر امر میں فضیلت اور عزیمت پر عمل کرنا ممکن نہیں، جب کوئی شخص اس کی کوشش کرے گا تو وہ ہمیشہ مغلوب رہے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے زیادہ کاوش اور مبالغہ سے منع فرمایا ہے۔ اس طرح گویا (حضور ﷺ نے) پریشانی سے بچایا ہے، کیونکہ لوگ احاطہ کی کوشش کرتے ہیں اور احاطہ ممکن نہیں، اس سے یہ پریشانی ہوتی ہے

کہ ہم فضیلت سے رہ گئے تو حضور ﷺ نے فرمادیا کہ رہ گئے بلا سے رہ گئے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ یہ فضیلت نہیں ہے یعنی جس چیز کا حصول ممکن نہ ہو، اس میں فضیلت اور شرف کہاں ہوا۔ پھر فرمایا کہ قرآن وحدیث تو تصوف کے بعد پڑھنا چاہئے، تب لطف ہے، بلکہ بوستان بھی بعد تصوف کے پڑھنا چاہئے۔ (صفحہ ۳۹۸)

صحت کی حفاظت کا، نوافل سے افضل ہونا

فرمایا، صحت کی حفاظت کی مصلحت کسی مستحب کی تحصیل سے مقدم ہے، مثلا صبح کو ہوا خوری کے لئے جنگل کی طرف جانا، مسجد میں اشراق کی نماز کے لئے طلوع آفتاب تک بیٹھے رہنے سے افضل ہے۔ (صفحہ ۴۰۰)

طالب حق کی، خلق کی ناراضگی سے بے نیازی

فرمایا، طالب حق کو کسی کی ناراضگی کی کیا پروا، اپنی طرف سے کسی کو دشمن نہ بنانا چاہئے۔ اسکے باوجود اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ حق تعالیٰ مددگار ہے، اس پر نظر رکھنا چاہئے اور اس کو راضی رکھنا چاہئے، بلکہ بعض اوقات تو خلق کی ناراضی سبب ہوجاتا ہے، بہت سی آفات سے بچنے کا۔ (صفحہ ۴۰۰)

کشف کی وجہ سے کسی مسلمان کی دل شکنی کرنا

ایک صاحب نے لکھا، پولیس میں ایک جگہ خالی ہے، اگر مل جائے تو ساری پریشانیاں دفع ہوکر تنگدستی بھی دور ہوجائے، مگر ایک شاہ صاحب نے اس جگہ کے خالی ہونے کے بارے میں جواب دیدیا تھا کہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے، اس لئے مجبوری ہے۔ حضور کی خدمت میں دعا کا ملتجی ہوں، اس پر تحریر فرمایا، دل وجان سے کامیابی کی دعا کرتا ہوں، قسمت کی یقینی خبر نبی کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتی اور کشف وغیرہ خود مشکوک چیز ہے۔ اس کی بناء پر کسی مسلمان کی دل شکنی کرنا، دیانت سے بہت بعید ہے۔ آپ کوشش کریں، اللہ تعالیٰ پر نظر رکھیں اور بعد عشاء یا لطیف گیارہ سو بار پڑھیں، پھر اول آخر درود شریف گیارہ بار پڑھ کر دعا کریں، جو بہتر ہوگا وہ ہورہے گا۔ (صفحہ ۴۰۱)

مخالف اور دوستوں کی تکلیف کی نوعیت کا مختلف ہونا

فرمایا، تکالیف کا گناہوں کی وجہ سے ہونا، یہ ساری تکالیف کے لئے نہیں، بلکہ یہ

حقیقی مصائب کے لئے ہے۔ کیونکہ ایک تو مصیبت کی صورت ہوتی ہے، جیسا کہ کسی معشوق کا، کسی عاشق کو زور سے آغوش میں دبا لینا۔ جس سے اس کو ازحد تکلیف ہونے لگے، یہ مصیبت کی صورت ہے۔ جس کا اثر محض جسم اور روح حیوانی پر ہوتا ہے۔ جب کہ اس سے روح انسانی محفوظ اور لذت گیر ہوتی ہے، دوسری مصیبت حقیقی ہوتی ہے، جیسے ایک دشمن سے اس کے دوسرے دشمن کو تکلیف پہنچتی ہے۔ پس قرآن مجید کی آیت وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم میں حقیقی مصیبت مراد ہے۔ باقی اہل اللہ مثل انبیاء اولیائے کاملین اس کے مخاطب نہیں کہ ان کی مصیبت محض صوری ہے۔ حقیقی نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ دل سے پریشان نہیں ہوتے، اگرچہ جسم تکلیف میں ہو۔ اور ثمرہ اس کا درجات کی بلندی ہوتا ہے اور یہی حال بچوں کی تکلیف کا ہے۔

سالک کے غصہ کی نوعیت

ایک مرید نے لکھا، لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کو جی چاہتا ہے، بات بات پر غصہ آجاتا ہے، مگر ضبط کر لیتا ہوں۔ یہ کبر کا شائبہ تو نہیں، تحریر فرمایا، یہ کبر نہیں ہے۔ اللہ کے لئے وحشت ہے، جو اللہ کے ساتھ محبت کا نتیجہ ہے۔ اور کبھی سبب بھی ہوجاتا ہے، انس مع الحق کا، بے فکر رہیں، ہاں، برتاؤ میں اعتدال سے تجاوز نہ کریں۔ زیادہ فکر میں نہ پڑیں۔ (صفحہ ۴۰۷)

شیخ کی ایذا رسانی کا سخت نقصاندہ ہونا

فرمایا، شیخ کے قلب کو ہرگز مکدر نہ کرنا چاہئے، اگر انہیں چھوڑنا ہی ہو تو بلا اطلاع کے چھوڑ دے۔ ورنہ فرد کی دنیاوی زندگی تلخ ہوجائے گی۔ موت تک فرد کو چین نصیب نہ ہوگا، جس کو یقین نہ ہو، وہ آزما کر دیکھ لے۔ (شیخ کو اذیت دینے سے) ایک طرح سے دین کا بھی نقصان ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ ذوق شوق جاتا رہتا ہے۔ اگر فرد ہمت کرے اور طبیعت پر جبر کرے تو دینی اعمال میں کچھ فرق نہیں آتا، لیکن وہ جو ایک قسم کی توفیق وتائید تھی، وہ جاتی رہتی ہے۔ اگر ہمت سے کام لے تو فرد اب بھی اعمال پر قادر ہوسکتا ہے، لیکن اگر فرد ہمت کا مظاہرہ نہ کرے تو دینی اعمال کی توفیق بھی نہ رہے گی۔ اس اعتبار سے شیخ کو اذیت پہنچانے میں بواسطہ دینی نقصان بھی ہوسکتا ہے، اگرچہ بلاواسطہ دینی نقصان نہیں ہوتا۔ (۴۰۹)

حق تعالیٰ کی طرف سے عیوب کی اطلاع

ایک صاحب نے لکھا، اس خادم کے عیوب سے مطلع فرمایا جائے، تحریر فرمایا، کوئی بات معلوم ہوگی تو کہہ دوں گا۔ باقی ایسے شخص کو حق تعالیٰ خود اس کے عیوب پر مطلع فرما دیتے ہیں۔ (۴۱۰)

ہمت کے ساتھ راستہ پر گامزن ہونا

ایک صاحب نے اپنے بہت بہتر (قلبی وروحانی) حالات لکھ کر یہ لکھا کہ ان سارے امور کے ساتھ اس بات کا بھی بڑا خوف ہے کہ کہیں خدانخواستہ اس حالت میں فرق واقع نہ ہوجائے۔ اس پر تحریر فرمایا کہ یہ خوف بھی تقاضائے ایمان ہے۔ مگر اس کے ساتھ توکل کا استحضار بھی ضروری ہے، عزم کے ساتھ یہ نیت رکھی جائے کہ اللہ کی مدد سے ہم اس راہ پر مستقیم رہیں گے، اگر کمی ہوجائے گی تو پھر ہمت کریں گے اور کمی سے استغفار کریں گے۔

عورت کی نماز کا مسئلہ

ایک شخص نے پوچھا کہ ایک عورت اپنے خاوند یا باپ کے ساتھ بلا شرکت دوسرے مرد کے نماز پڑھ سکتی ہے یا نہیں فرمایا، ہاں، لیکن بالکل ٹھیک پیچھے کھڑی ہو، برابر کھڑی نہ ہو۔ (صفحہ ۴۱۱)

گھر میں رحمت کے فرشتوں کا نہ آنا

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حدیث میں تو ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ اگر کوئی شخص مجبورا اپنی جان ومال کی حفاظت کی غرض سے کتا پالے تو آیا اس کا گھر رحمت کے فرشتوں کے نزول سے محروم رہے گا۔ فرمایا، اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ گھر میں رحمت کا فرشتہ پھر بھی نہیں آئے گا، لیکن اس مجبوری کی صورت میں فرد گناہ سے محفوظ رہے گا۔ واللہ اعلم۔ (۴۰۹)

سعادت توفیق کے بغیر، عقل کا غیر مفید ہونا

فرمایا، دنیوی عقل کی کمی نقص نہیں، چنانچہ حدیث میں قلیل التوفیق خیر من کثیر

العقل والعقل فی امر الدنیا مضرة والعقل فی امر الدین مسرة یعنی تھوڑی توفیق کا حاصل ہونا، زیادہ عقل سے بہتر ہے، کیونکہ اگر عقل ہو اور توفیق حاصل نہ ہو تو اس صورت میں فرد اس عقل سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مثلاً خیر و شر کی عقل ہے، لیکن توفیق کے بغیر فرد نہ تو خیر حاصل کر سکتا ہے، نہ ہی شر سے بچ سکتا ہے، اس کے برعکس اگر توفیق حاصل ہو، اگرچہ عقل کامل نہ ہو، مگر ضروری درجہ میں ہو تو اس سے فرد خیر حاصل کرے گا اور شر سے بچے گا اور صرف دنیوی معاملات میں عقل نقصان کا ذریعہ ہے۔ (صفحہ ۴۱۲)

سالک کی طرف سے سہولت کا انتظار

فرمایا، ویسے تو ہر معاملہ کے دو درجے ہیں، ایک درجہ عمل کا ہے، دوسرا سہولت عمل کا۔ ہر شخص (سالک) کا اپنا دل تو یہ چاہتا ہے کہ سہولت کی تدبیر بتائی جائے (تاکہ ذکر سے دل کی مناسبت پیدا ہو جائے) مگر شیخ کی طرف سے انتظار ہوتا ہے کہ سالک، اپنی کوشش ختم کر کے دکھلا دے، جب وہ عاجز ہو جائے گا، تب اہل تصرف تو اپنے تصرف سے اور اہل تدبیر اپنی تدبیر سے انشاء اللہ اس کا ازالہ کریں گے۔ (صفحہ ۴۱۴)

بنیاد پر ہی محل کھڑے ہوتے ہیں، لیکن بنیاد خوبصورت نہیں ہوتی

ایک مرید نے لکھا کہ نہ نماز میں دل لگتا ہے نہ ذکر میں۔ نہ کلام مجید پڑھا جاتا ہے اور دنیا کا کوئی کام بھی نہیں ہوتا کہ فرصت نہ ہو۔ جواب تحریر فرمایا کہ کام تو جس طرح بھی ہو کرنا ضروری ہے، وہ خواہ ناقص ہی ہو۔ تکمیل کا طریقہ یہی ہے۔ اگر بدنویس اس لئے مشق کرنا چھوڑ دے کہ اس سے اچھا نہیں لکھا جاتا تو اسے کبھی اچھا لکھنا نہیں آئے گا۔ اس سلسلہ میں مزید فرمایا، ناقص عمل کو بھی چھوڑنا نہ چاہئے، جس طرح مکان کی بنیاد مضبوط کرنے کا اہتمام تو ہوتا ہے، لیکن اس کے خوشنما ہونے کے پیچھے نہیں پڑتے، اس میں روڑے وغیرہ بھر دیتے ہیں اور بعد میں اس بنیاد پر بڑے بڑے محل اور کوٹھیاں تیار ہوتی ہیں۔ اسی طرح ناقص بنیاد ہے عمل کامل کی۔ بنیاد کے کمال اور ناقص ہونے پر نظر نہ کی جائے، جو کچھ ہو اور جس طرح ہو سکے، عمل کرنا چاہئے، عمل اصول کے موافق ہو، چاہے وہ ناقص ہی ہو، جیسے نماز اگرچہ ناقص ہو، مگر ہو حدود میں تو وہ ہو جاتی ہے۔ بلکہ ایسی عبادت پر، جس پر دل نہ لگے، اجر زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ مجاہدہ ہے۔ یہ طریق بہت نازک ہے۔ محض کتابیں پڑھ لینے سے کام نہیں چلتا، فہم کامل اور ذوق تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ ذوق اس شخص کو عطا ہوتا ہے،

جس پر حق تعالیٰ اپنا فضل فرما دیں۔ (صفحہ ۴۱۵)

اپنی فنائیت کے بغیر کام نہیں چلتا

فرمایا، یہ طریق بہت ہی نازک ہے۔ اس میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی شان اپنے کمالات سب کو فنا کر دینا چاہئے اور مصلح کی ہر بات اور ہر تعلیم پر عمل کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا جائے، اس راہ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ایسا بن جائے۔ فرماتے ہیں۔

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں
شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

حتیٰ کہ فرد جوتیاں کھانے تک تیار ہو جائے اور جو شخص جوتیاں کھانے کے لئے تیار ہو گیا، اس نے گویا جوتیاں کھا لیں اور اس کی اصلاح ہو گئی۔ آمادہ ہونا ہی تو مشکل ہے۔ اس لئے کہ آمادگی وہی معتبر ہے، جو خلوص دل سے ہو۔ اور خلوص دل سے وہی شخص آمادہ ہوتا ہے، جو اپنی شان نہیں رکھتا، کام کی اصل چیز یہی ہے کہ اپنے کو مٹا دیا جائے اور فنا کر دیا جائے، جوتیاں کھانے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ (صفحہ ۴۱۷)

وصول الی اللہ کے لئے خاص مدت تک بزرگ کی صحبت و معیت کا ضروری ہونا

فرمایا، مرید کا شیخ کی خدمت میں ایک مدت خاص تک رہنا ضروری ہے، اس سے مقصود میں خاص سہولت ہو جاتی ہے۔ رہا یہ کہ کتنی مدت میں کام ہو جاتا ہے، اس کا تعین مشکل ہے۔ اس کا مدار مناسبت پر ہے، اگر فرد صاحب استعداد ہوتا ہے تو بہت جلد کام ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا اس وقت کا یہ فرمانا کہ ہم دے چکے، جو کچھ دینا تھا، سمجھ میں نہ آیا کہ کیا دیا، مگر پندرہ برس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ دیا تھا، اس پر مولانا گنگوہی نے مزاحاً فرمایا کہ اگر ہم جانتے کہ یہ چیز ہے تو اتنی محنت کیوں کرتے؟ اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ مل جانے پر فرماتے تھے، ورنہ پندرہ برس تو معلوم ہونے میں لگ گئے۔ (صفحہ ۴۱۷)

شیخ کی صفات

فرمایا، ایک رسالہ میں ایک ایسا جامع مضمون لکھا دیکھا تھا کہ اگر وہ ذہن میں آ جائے تو پھر سارے رسالے کی ضرورت نہ رہے۔ کہتے ہیں کہ شیخ میں دین ہونا چاہئے

انبیاء کا سا۔ اور سیاست یعنی احتساب سلاطین کا سا، علاج اطبا کا سا، کہ وہ ہر شخص کا جدا علاج تجویز کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ شیخ میں انبیاء کا سا دین کیسے ہوسکتا ہے۔ فرمایا، مراد یہ نہیں کہ ان جیسا دین ہو، اس کا مطلب اخلاص میں تشبیہ ہے یعنی اعمال میں دنیا کی محبت اور خواہشات نفس کی آمیزش نہ ہو۔ جس میں یہ باتیں ہوں، وہ شیخ ہوسکتا ہے۔ (صفحہ ۴۱۹)

اولیاء کے بارے میں عوام کے عقائد کی خرابی

فرمایا، ایک صاحب نے لکھا ہے کہ بعض لوگ مجھے، مشورہ دیتے ہیں کہ بانوں کی دکان کرلو، کوئی کہتا ہے دواؤں کی دوکان کرلو تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ مجھے ان چیزوں میں تجربہ نہیں۔ کسی تجربہ کار شخص سے معلوم کرکے عمل کرو، میرے دو کام ہیں ایک دعا کرالو، چاہے وہ دنیا کے لئے ہی ہو، وہ بھی عبادت ہے۔ دوسرے اللہ کا نام پوچھ لو، پھر فرمایا، اتنا تو یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ انہیں تجربہ نہیں، مگر پھر ایسی بات پوچھنے کی کیا وجہ ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ والوں سے اس لئے پوچھ کر کام کرنا چاہئے کہ ان کے دل میں وہی بات آئے گی، جو ہونے والی ہے، حالانکہ یہ غلو ہے، اور یہ عقائد کی خرابی ہے۔ میں لوگوں کو اس جہل سے بھی بچانا چاہتا ہوں کہ وہ دھوکے میں نہ رہیں۔ اور بعض حضرات جن کا مجھ سے بے تکلفی کا تعلق ہے، ان سے معلوم ہوا ہے کہ عوام کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ جو کہتے ہیں، وہی ہوجاتا ہے۔ ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت، ہمارا بھی تو یہی عقیدہ ہے کہ وہی ہوجاتا ہے، فرمایا، اعتقاد میں بھی درجات ہیں اور وہ جدا جدا ہیں۔ عوام کے اعتقاد کی نوعیت بہت ہی خراب ہے۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ان اولیاء کے خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا، بخلاف اہل علم کے کہ ان کا اعتقاد اس درجہ کا نہیں ہوسکتا۔ (صفحہ ۴۲۰)

بزرگ کی صحبت میں محض رہنا، کافی نہیں

فرمایا، کسی کے پاس محض رہنے سے کیا ہوتا ہے، جب تک انسان کو اپنی اصلاح اور تربیت کی فکر نہ ہو۔ (صفحہ ۴۲۰)

فقہی کتاب بھی تصوف ہی ہے

فرمایا، فقہی کتاب میں تصوف ہی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے حلال وحرام کی تمیز

پیدا ہوگی۔ حرام سے بچیں گے تو اس سے نور پیدا ہوگا۔ علم وعمل کی توفیق حاصل ہوگی اور اس سے بھی قرب الٰہی نصیب ہوگا۔ یہی تصوف ہے۔ (صفحہ ۴۲۲)

نور بخش ذکر کی توفیق کا، اصلاح کے بغیر حاصل نہ ہونا

فرمایا، ممکن ہے کہ ایک دن بیٹھ کر کچھ دیر تک ذکر کرلیا جائے، مگر دوام ذکر نور بخش بغیر اصلاح کے نہیں ہوتا اور یکسوئی اور ہر وقت کی توجہ جو کہ نورانیت کی شرط ہے، بغیر اصلاح کے نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس طرح کے ذکر کی توفیق خدا تعالیٰ کی توجہ سے ہوتی ہے یعنی وہب سے، جو خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے، ورنہ توفیق بھی نہیں ہوتی۔ اہل دل اس کی حقیقت خوب سمجھتے ہیں۔ عوارف المعارف جو شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب ہے۔ اس میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ایک دن وہ ذکر کرنا چاہتے تھے، مگر زبان نہیں اٹھتی تھی۔ ارادہ بھی تھا، شعور بھی تھا، مگر زبان نہیں چلتی۔ بڑے پریشان ہوئے، گریہ وزاری کے ساتھ التجا کی کہ یا اللہ، اگر قصور ہوا تو مطلع فرمایئے، تاکہ توبہ واستغفار سے تدارک کروں، الہام ہوا کہ فلاں وقت گستاخی سے ایک برا کلمہ کہا تھا، آج اس کا خمیازہ بھگت رہے ہو۔ بہت روئے، پیٹے گریہ وزاری کی، تب زبان چلی۔ (صفحہ ۴۲۳)

ذکر کو اصل کام سمجھنے کے اثرات ونتائج

فرمایا، اگر ذکر اللہ کو اپنا اصل کام سمجھ لیا جائے تو جو کام اس میں رکاوٹ ہوگا، اس سے دل پریشان ہوگا، گناہ سب اس کام میں رکاوٹ ہیں، اس لئے ان سب سے نفرت ہوجائے گی، پھر رفتہ رفتہ مباحات سے بھی نفرت ہونے لگے گی۔ (صفحہ ۴۲۳)

تسبیح کے ذریعہ ذکر میں مداومت

فرمایا، تجربہ ہے کہ تسبیح ہاتھ میں رکھنے سے خدا یاد آتا ہے، اسی لئے صوفیہ نے اس کا نام مذکرہ رکھا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ تسبیح ہاتھ میں رکھنے سے لوگ ہنسیں گے تو جواب یہ ہے کہ لوگ چاہے ہنسیں، لیکن (اس عمل سے یہ ہوگا کہ) تم رونے سے بچ جاؤ گے، اب لوگ تم پر ہنسیں گے اور کل قیامت میں تم ان پر ہنسو گے، پس ان کو اب ہنسنے دو، اگر تمہیں کہیں سے ہزار روپے ملتے ہوں، اگر ان کے لینے سے لوگ ہنستے ہوں تو انصاف سے بتاؤ کہ کیا روپے لوگے یا ہنسی کے خیال سے چھوڑ دو گے، یقیناً لوگے اور لوگوں کی ہنسی کی پروا نہیں

کرو گے، آخر کیا وجہ ہے کہ وہاں تو ہنسی کی پرواہ ہے اور یہاں نہیں۔ بات یہ ہے کہ پیسوں کو نفع کی چیز سمجھا جاتا ہے اور نفع کی چیز میں ہنسی کی پروانہیں کی جاتی۔ کیا خدا کا ذکر نافع نہیں۔ اگر نافع ہے تو آخر ایسا کیوں ہے کہ پیسے لینے میں تو ہنسی مانع نہیں ہے اور ذکر خدا میں رکاوٹ ہے اور لوگوں کی یہ ہنسی بھی اس وقت تک ہے کہ جب کام شروع ہو، پھر چند روز کے بعد کوئی نہیں ہنستا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ہنسی غفلت پر ہوتی ہے یعنی پہلے جو تمہیں غفلت تھی، وہی اس وقت ہنسنے کا سبب ہے، چنانچہ جو شخص پہلے سے غفلت میں نہ ہو، بلکہ ہمیشہ سے ذاکر ہو، اس پر کوئی نہیں ہنستا تو خدا کے بندے، جس غفلت پر ہنسی ہوئی تھی، کیا تم اب اسی حالت میں رہنا چاہتے ہو۔ تسبیح ہاتھ میں لو، چند روز کے بعد کوئی نہیں ہنسے گا، بلکہ جب یہ معلوم ہوجائے گا کہ اب فرد کی غفلت جاتی رہی تو اب ہنستا کہاں، اب تو اس کے پاؤں چومیں گے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں کفار اسلام پر ہنستے تھے اور قرآن پر ہنستے تھے اتخذوھا ھزوا ولعبا. اس کو کھیل کود بنا رکھا تھا تو کیا ان کے ہنسنے سے صحابہ نے اسلام چھوڑ دیا تھا۔ (صفحہ ۴۲۴)

ذکر فکر اور نیک کاموں کے لئے دل چاہے یا نہ چاہے، کرتے رہنا چاہئے

فرمایا، نیک کام کرتے رہو، جیسے بھی ہو (چاہے دل جمعی کے ساتھ نہ ہو) کئے جاؤ۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شروع میں کام انتظام سے نہیں ہوتا، دل نہیں لگتا، تو اس کی پرواہ مت کرو، جیسے ہو کرو، جس دن توفیق ہو کرو، یہ خیال نہ کرو کہ کل تو (ذکر وفکر) کیا نہیں، آج کرنے سے کیا فائدہ ہوگا، جیسے بھی بنے، کئے جاؤ، مولانا رومی فرماتے ہیں۔

دوست دارد دوست ایں آشفتگی
کوشش بیہودہ بہ از خفتگی
اندریں رہ می تراش وی خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

یعنی دھن ہونا چاہئے، اگرچہ عمل میں کوتاہی ہوجائے۔ ناغہ ہوجائے تو ہونے دو، ممکن نہیں کہ راہ پر نہ آؤ۔ (صفحہ ۴۲۴)

فرمایا، خدا اگر کسی کو بے فکری سے کھانے کو دے تو یہ نعمت ہے، لیکن اس میں ایک مضرت بھی ہے کہ اس سے کبر، ناز و عجب، غرور، غفلت، غریبوں کی تحقیر اور کمزوروں پر ظلم بھی

پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا علاج اور تدارک یہ ہے کہ تدبر اور تفکر سے کام لیا جائے اور یہ سوچا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا فضل فرمایا ہے، ورنہ میں بالکل نااہل تھا، مجھ میں تو کوئی کمال نہ تھا۔ بلکہ اپنے گناہوں پر نظر کر کے سوچا جائے کہ میں تو سزا کا مستحق تھا اور اگر بالفرض مجھ میں کوئی کمال بھی تھا تو مجھ سے بہت زیادہ کمال رکھنے والے افراد پریشان حال پھرتے ہیں، پھر اس کا فضل ہی تو ہے کہ اس نے مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا، میں ناز کس بات پر کروں۔

اگر روزی بدانش برفزودے
ز ناداں تنگ روزی ترنبودے

یعنی رزق کا مدار عقل پر نہیں۔ لیاقت سے رزق کا ملنا قارون کا عقیدہ ہے۔ (صفحہ ۴۲۵)

تکبر کا نظری اور عملی علاج

فرمایا، بعض سمجھ دار امیر ایسے ہوتے ہیں، جو امارت اور دولت کے باوجود نہایت متواضع ہیں۔ (لیکن امیروں کی) غالب حالت متکبروں کی ہے، ان متکبروں کو سمجھنا چاہئے کہ ہم ایسی چیز پر تکبر کرتے ہیں، جس کا حصول ہمارے اختیار میں نہیں اور حصول تو بڑی بات ہے، اسے باقی رکھنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں، اسی طرح کی چیز پر آخر تکبر کرنے سے کیا فائدہ، یہ تو اس کا نظری علاج ہے، تکبر کا عملی علاج یہ ہے کہ غرباء کی تعظیم و تواضع کی جائے۔ خوشی سے نہ ہو سکے تو تکلف کے ساتھ ہی ہو، ان سے خوش خلقی، نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آیا جائے، وہ جب ملنے آئیں تو کھڑے ہوجایا کریں اور ان کی دلجوئی کریں۔ (صفحہ ۴۲۶)

قلوب کا آپریشن ہونا

فرمایا، جس طرح والدین بچے کے دنبل کا آپریشن کراتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ قلوب کا آپریشن کرتے ہیں، جب دلوں میں غفلت بڑھ جاتی ہے اور گناہوں کی کثرت سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں تو مصیبت اور بلا کے نشتروں سے دلوں کا خراب مادہ نکالا جاتا ہے اور ان کی اصلاح کی جاتی ہے، پس یہاں بھی عملاً تکلیف ہے اور وہاں بھی، مگر دونوں کا انجام راحت ہے، البتہ فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت قریب ہے کہ دنبل میں نشتر

دینے کے پندرہ بیس دن کے بعد صحت ہوجاتی ہے اور یہاں بعید ہے کہ قیامت میں اس کا ظہور ہوگا، جبکہ مصائب کا ثواب ملے گا۔ (صفحہ ۴۲۶)

اطاعت سے خوشی کا ہونا اور گناہ سے اذیت کا ہونا

فرمایا، میں بقسم کہتا ہوں کہ اطاعت کا کوئی کام ایسا نہیں، جس کی جزا فوری نہ ملتی ہو، گناہ کا کوئی کام ایسا نہیں، جس کی سزا فورا نہ ملتی ہو۔ مگر اس کے لئے صحیح ذوق کی ضرورت ہے، اہل ذوق کو اطاعت سے اس قدر انبساط اور خوشی محسوس ہوتی ہے، جیسی قریب قریب جنت میں ہوگی اور اس وقت ان کی نظر میں دنیا کی سلطنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، چنانچہ ایک عارف کہتے ہیں۔

بفراغ دل زمانے نظرے بما ہروئے
بہ زانکہ چتر شاہی ہمہ روزہاء وہوئے
پس از سی سال ازیں معنیٰ محقق شد بخا قانی
کہ یکدم با خدا بودن بہ از تخت سلیمانی

مگر ہمیں یہ انبساط وفرح کیسے ہو، ہمیں تو دنیا کے سانپ نے ڈس لیا ہے، جس سے مذاق (ذوق) ہی بگڑ گیا ہے، اگر ہم بھی صحیح ذوق پیدا کرلیں تو اس کی لذت محسوس ہو۔ اسی طرح گناہ سے قلب میں اس قدر تنگی اور پریشانی ہوتی ہے کہ سر پر ہزاروں تلواریں پڑیں، تب بھی اسطرح اذیت نہ ہو۔ (صفحہ ۴۲۹)

فضول گفتگو سے قلب پر اذیت کے اثرات

فرمایا، ایک بزرگ کسی کے ہاں تشریف لے گئے، دروازہ پر پہنچ کر آواز دی، اندر سے جواب آیا کہ نہیں ہیں، پوچھا، کہاں ہیں، جواب ملا، خبر نہیں تو یہ بزرگ صرف اتنی بات پر تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے ایسا فضول سوال کیوں کیا کہ کہاں ہیں، اس طرح میرے نامہ اعمال میں ایک فضول بات درج ہوگئی، حالانکہ مومن کی شان یہ ہے کہ والذین ھم عن اللغو معرضون. اب اندازہ کیجئے کہ جس کو ایک لغو بات سے اس قدر تکلیف ہوگی، اس کو گناہ کی اذیت کا کس قدر احساس ہوگا۔ (صفحہ ۴۲۸)

نماز میں سرور کیسے پیدا ہو؟

ایک صاحب نے لکھا کہ نماز میں پورا پورا نشاط حاصل نہیں ہوتا، جب کہ ذکر میں سرور ونشاط کی کیفیت ہوتی ہے، فرمایا، ذکر میں بہ نسبت نماز کے بساطت کی شان ہے اور نماز میں ذکر کی بہ نسبت ترکیب کی شان ہے۔ چنانچہ ذکر میں مختلف اجزاء کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اس لئے اس میں یکسوئی ہوجاتی ہے، نماز میں توجہ منقسم ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ نماز میں توجہ ایک طرف رکھی جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ قیام کے وقت یہ خیال نہ کیا جائے کہ اس کے بعد قومہ کرنا ہے، وعلیٰ ھذا، بلکہ ہر رکن میں صرف اسی رکن کو مقصود سمجھا جائے اور اسی طرف متوجہ ہو، اسی طرح پھر دوسرے رکن میں الیٰ آخر الصلوٰۃ، اگر ایسا ہوجائے تو نماز میں اس قدر یکسوئی ہوگی کہ ایسی یکسوئی ذکر میں بھی نہ ہوگی، کیونکہ ذکر میں اگرچہ یکسوئی ہے، مگر ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی شخص آکر اس یکسوئی کو ختم نہ کردے یا فرد خود ہی حرکت کر کے دوسرے کام میں لگ سکتا ہے۔ اور نماز میں اطمینان ہے کہ سلام پھیرنے تک کوئی شخص اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتا، نہ خود کوئی دوسرا کام کیا جا سکتا ہے۔ وھذا الذی کتبت ورد علیٰ قلبی فی فرض الظھر وجربتہ فیہ وفی سنت البعدیتہ وللہ الحمد (صفحہ ۴۲۹)

احوال کے تغیر میں مصلحتوں کا ہونا

فرمایا، دوام تو اعمال پر ہوتا ہے، نہ کہ احوال پر، بلکہ احوال کے بدلنے میں جن کا مشاہدہ اہل طریق کو خود ہوجاتا ہے، مثلا غیبت کے بعد حضوری میں زیادہ لذت کا ہونا اور مثلا غیبت میں انکسار وندامت کا غالب آنا اور مثلا اپنے عجز کا مشاہدہ ہونا وغیرہ (صفحہ ۴۲۹)

بدگمانی کا علاج

ایک صاحب نے بدگمانی کا علاج دریافت کیا تو فرمایا، جب کبھی کسی کی طرف سے دل میں بدگمانی پیدا ہو تو اول علیحدہ بیٹھ کر یہ تصور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بدگمانی سے منع فرمایا ہے، اس لئے یہ تو گناہ ہوا اور گناہ پر عذاب کا سبب ہے۔ تو اے نفس، تو حق تعالیٰ کے عذاب کو کیسے برداشت کرے گا، یہ سوچ کر توبہ کی جائے اور دعا بھی کی جائے کہ اے اللہ،

میرے دل کو صاف کر دے اور جس کے ساتھ بدگمانی ہو، اس کے لئے بھی دعا کی جائے کہ اے اللہ، اس کو دونوں جہاں کی نعمتیں عطا فرما، دن رات میں تین مرتبہ ایسا کیا جائے، اگر پھر بھی اثر رہے تو اس کے بعد اس شخص سے مل کر اس سے کہا جائے کہ مجھے تم سے بلاوجہ بدگمانی ہوگئی ہے، تم معاف کرو اور میرے لئے دعا کردو کہ یہ بدگمانی دور ہو جائے۔ (صفحہ ۴۲۹)

جہنم میں کفار اور گناہ گار مسلمانوں کے عذاب کی نوعیت میں فرق

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ دوزخ میں کفار بھی جائیں گے اور اعمالِ بد کی وجہ سے مسلمان بھی تو ان کے عذاب میں فرق کیا ہوگا، فرمایا، کہنے کی تو بات نہیں، مگر آپ نے سوال کیا ہے، اس لئے کہنی پڑی۔

مومنین کے بارے میں مسلم کی حدیث ہے اماتھم اللہ اماتتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہنم میں مسلمانوں کو عذاب کا احساس نہ ہوگا، لیکن ہاں کفار کے برابر احساس نہ ہوگا، اس کی بالکل ایسی مثال ہے، جیسے کلوروفارم سنگھا کر آپریشن کیا جاتا ہے، پھر آپریشن بھی دو طرح کے ہیں، ایک سخت دوسرا ہلکا، کبھی بہت ہی ہلکا آپریشن کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہلکا کلوروفارم کافی ہوتا ہے۔ مسلمان کے ساتھ دوزخ میں یہی صورت پیش آئے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان صورت جہنم میں جائیں گے، حقیقت جہنم میں نہ جائیں گے۔ (۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ کفار جہنم میں تعذیب کے لئے جائیں گے، اس لئے ان کو عذاب کا احساس شدید ہوگا اور مسلمان محض تہذیب کے لئے جہنم میں جائیں گے، انہیں عذاب کا اس قدر احساس نہ ہوگا۔ جہنم مسلمانوں کے لئے حمام کے مثل ہے، وہ اس میں پاک صاف کئے جائیں گے۔ اگرچہ تکلیف حمام کے تیز پانی سے بھی ہوتی ہے۔ (۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ مسلمانوں سے وعدہ عذاب کے خاتمہ کا ہے، یہ وعدہ ایسا ہے، جو انہیں عذاب کا زیادہ احساس نہ ہونے دے گا۔ اس کو اس مثال سے سمجھئے، جیسے میعادی قیدی کا ایک وقت آرام کا ہوتا ہے اور ایک وقت کام کا۔ دونوں حالتیں قید ہی میں ہوتی ہیں تو ایک وقت ہلکا ہوا اور ایک وقت بھاری۔ اس سے بھی آگے توسیع کرتا ہوں، ایک وقت قید کی حالت میں سونے کا بھی ہوتا ہے، جس میں کچھ بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں کہاں ہوں اور کیا میں حالت عذاب میں ہوں۔؟ پھر ایک وقت رہائی کا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے قیدخانہ کی اذیت کم ہوتی ہے، یہ ساری باتیں

من گھڑت نہیں، بلکہ نصوص میں ہیں اور وہ بھی مسلم میں جو اصح الکتاب ہے۔ (صفحہ ۴۳۱)

سلوک کا مقصود، ملکہ خیر کا غالب ہونا

فرمایا، جو شخص خدا کے راستہ میں چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ سب سے پہلے اس کے ملکات کو بدلتے ہیں، جس سے اطاعت میں ہمیشگی اور استقامت حاصل ہوتی ہے، گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی ملتی ہے۔ کیونکہ افعال ملکات کے تابع ہوتے ہیں، جب ملکات درست ہوگئے تو گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور ملکہ ایسے داعیہ کا نام ہے، جو اندر سے عمل کی تقاضا کرتا ہے، جس کی وجہ سے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے، ملکات کی تبدیلی سے مطلب یہ ہے کہ خیر کے دواعی (رجحانات) قوی ہو جاتے ہیں، جبکہ شر کے دواعی (رجحانات) ضعیف ہوتے ہیں، نیکی کا ہر وقت تقاضا ہوتا رہتا ہے اور برائی کا تقاضا نہیں ہوتا، اطاعت اور عبادت سے اعراض اور گناہوں کا صدور اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے ارادہ سے ہی فرد محسوس کرتا ہے کہ وہ گویا ذبح ہوا ہے۔ ملکات کی اس تبدیلی کو تبدیلیٔ ذات یا فنائے حسی کہتے ہیں یعنی مثلاً غصہ کا گویا وجود ہی نہ رہا، بلکہ غصہ کی جگہ حلم پیدا ہوگیا۔ جب اس حالت پر ایک زمانہ گذر جاتا ہے، اس معاملہ میں اللہ کی جو حکمت کارفرما تھی کہ فرد اطاعت کا عادی ہو جائے اور اسے گناہوں سے نفرت ہو جائے، اطاعت سے جب یہ مقصود حاصل ہوگیا اور جب اس کی مزاحمت ومخالفت کی وجہ سے ملکات حسنہ کے راسخ ہونے میں آسانی ہوگئی تو اب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندہ کا اجر بڑھایا جائے، اس کے لئے اب حکمت یہ ہوتی ہے کہ طبعی امور پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں ابھرتے کہ وہ غالب ہو جائیں، بلکہ وہ اپنی اصلی فطرت پر آ جاتے ہیں۔ اب غصہ کے وقت لہجہ بھی سخت ہو جاتا ہے، الفاظ بھی سخت نکلنے لگتے ہیں۔ پہلے تو حالت یہ تھی کہ اگر کوئی جوتی بھی مار لیتا تھا تو چونکہ مجاہدہ کی حالت میں تھے، اس لئے غصہ بالکل نہ آتا تھا۔ اس وقت نہ غم کی باتوں سے غم ہوتا تھا، نہ خوشی کی باتوں سے خوشی ہوتی تھی۔ اب غم بھی ہوتا ہے، خوشی بھی محسوس ہوتی ہے، اس طرح کی صورتحال میں سالک یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں مردود ہوگیا۔ میری ساری محنت برباد ہوگئی۔ محنت برباد نہیں ہوئی، بلکہ پہلی تبدیلی کی عمر ختم ہوگئی۔ اب دوسری تبدیلی شروع ہوئی، تنزل نہیں ہوا، بلکہ ترقی ہوئی ہے۔ غم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے، پہلی

تبدیلی ذات کی تبدیلی تھی، اب صفات کی تبدیلی ہے۔ اس وقت غصہ کی جگہ حلم پیدا ہوگیا تھا اور یہاں غصہ کا وجود تو ہے، لیکن اس میں اثر وہ ہے جو حلم میں تھا، طمع، طمع ہی رہی، مگر اس میں وہ اثر ہے، جو سخاوت واستغناء میں ہوتا ہے، چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی عجیب وغریب تحقیق ہے کہ سالک کو نفس کی خرابیوں کا ازالہ نہ کرنا چاہئے، بلکہ ان کا امالہ کرنا چاہئے۔ بخل تو رہے، لیکن اس کا محل بدل دیا جائے۔ بخل کو کھو کر سخاوت پیدا نہ کی جائے، اسی طرح غصہ کا مادہ بھی بڑے کام کی چیز ہے، اگر غصہ کا مادہ نہ ہوتا تو اسلام کی توسیع نہ ہوتی، اسلام کی توسیع اسی مادہ کی بدولت ہوئی ہے، اس لئے کہ کافروں سے مقابلہ کے وقت اسی مادہ سے کام لے کر جان کی قربانی دینا آسان ہوجاتا ہے، یہی حالت بخل کی ہے، اگر بخل نہ ہوتا تو آدمی معاشرہ کے خراب افراد طوائفوں وغیرہ میں مال لٹاتا اور مستحقین میں اس کی تقسیم کی نوبت نہ آتی۔ اب مستحقین کو چھانٹ چھانٹ کر دیتے ہیں۔ غیر مستحقین کو نہ دینا، یہ بخل کی بدولت ہے، لیکن یہ بخل جو سخاوت کی ماں ہے، سخاوت خود اس کی محتاج ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا کہ تصوف میں آخر میں کیا چیز حاصل ہوتی ہے تو ہم اتنی محنت کیوں کرتے، مدتوں بعد معلوم ہوا کہ جس کے لئے اتنے مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں، وہ ذرا سی بات ہے، حضرت نے تو اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے وہ ذرا سی بات نہیں بتائی، لیکن میں اپنی کم ظرفی سے بتاتا ہوں کہ وہ ذرا سی چیز جس کو حاصل کرنے کے لئے اتنی محنتیں کرنی پڑتی ہیں کیا ہے، وہ یہی ہے، جسے میں نے تبدیلی ثانی کے عنوان سے بیان کیا ہے، کیونکہ یہی چیز تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے۔ اور یہی اس کی محافظ بھی ہے اور اضافہ کرنے والی بھی ہے۔ غرض وہ ذرا سی بات، جو تصوف کا حاصل ہے، یہ ہے کہ جس اطاعت میں سستی ہو، اس سستی کا مقابلہ کرکے اس اطاعت کو کیا جائے اور جس شخص کو یہ بات حاصل ہوگئی اس کو پھر نہ کسی شیخ کی، نہ سید کی، نہ مغل کی، نہ پٹھان کی۔ کسی کی ضرورت نہیں، اگر یہ چیز حاصل نہیں تو پھر چاروں ذاتوں کی ضرورت ہے۔

کشند از برائے دلے بارہا
خورند از برائے گلے خارہا

شیخ کا یہی کام ہے کہ اس ذرا سی بات کے حصول کی تدابیر بتاتا ہے اور کچھ نہیں کرتا، شیخ کے بغیر اس کا حصول مشکل ہے۔ قدم قدم پر گاڑی اٹکے گی۔ یہ علم نہ ہوگا کہ کس راستہ سے جاؤں۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں
درمیاں شان برزخ لایبغیاں
(صفحہ ۴۳۴-۳۵)

مقبول بندے کے فیوض کے اثرات

اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ ارادہ اور علم کے بغیر مخلوق کو ان سے نفع پہنچ رہا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس طرح کا مقبول بندہ مرتا ہے تو تجربہ ہے کہ اگر سارے قلوب نہیں تو بہت سے قلوب ایسے ہیں کہ انہیں اپنے اندر فوراً ایک تغیر محسوس ہوتا ہے کہ وہ نورانیت اور برکت جو، ان بزرگ کی حیات میں تھی، کم ہوگئی، حالانکہ لوگ ان کے پاس کبھی گئے بھی نہیں۔ خط وکتابت بھی نہیں کی، دعا بھی نہیں کرائی۔ پھر تغیر کیوں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے، ادھر سے کچھ روحانی مدد پہنچتی تھی، جو کم ہوگئی۔ (صفحہ ۴۳۶)

ایک عمل کی وجہ سے جنت وجہنم میں جانے کی وضاحت

فرمایا، حدیث میں جو آیا ہے کہ ایک شخص عمر بھر جنتیوں کے عمل کرتا ہے، پھر آخر میں وہ ایک ایسا عمل کرتا ہے، جو اس کے لئے جہنم کا سبب بن جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد جان بوجھ کر ایسا عمل کرتا ہے کہ باختیار خود جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ کسی غیر اختیاری عمل پر اس کو دوزخ میں بھیج دیا جاتا ہے یعنی ایک تو یہ کہ وہ بات جو جہنم کا موجب ہوجاتی ہے، وہ چھوٹی بات نہیں ہوتی، بلکہ بہت بڑی بات ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ وہ بات غیر اختیاری نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ دوزخ میں جانا اختیار میں ہے اور جنت میں بھی جانا اختیار میں ہے۔ (صفحہ ۴۳۶)

قبر کی حقیقت

فرمایا، شریعت کی اصطلاح میں قبر گڑھے کو نہیں کہتے، بلکہ عالم مثال کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ مشابہ ہے، آخرت کے اعتبار سے تو گویا دنیا ہے اور دنیا کے اعتبار سے گویا وہ

آخرت ہے۔ تو جس طرح باغ کا پھاٹک ہوتا ہے کہ باغ کے اندرونی حصہ کے اعتبار سے تو گویا وہ باغ نہیں ہے۔ لیکن باغ کے خارجی حصہ کی نسبت گویا وہ باغ ہے۔ یا جیسے حوالات کہ وہ عام دنیا کی بہ نسبت تو جیل خانہ ہے، مگر جیل خانہ کی بہ نسبت گویا وہ گھر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عالم مثال کو دنیا کا بھی نمونہ بنایا ہے تو آخرت کا بھی۔ (صفحہ ۴۳۷)

ایک حدیث کی روشنی میں جنت کی حیثیت

فرمایا، حدیث میں ہے کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت سبحان اللہ والحمدللہ، لاالٰہ الااللہ واللہ اکبر ہیں۔ اس سے بعض معتزلہ کو دھوکہ ہوا کہ جنت اور اس کی نعمتیں اس وقت موجود نہیں، بلکہ ہمارے اعمال سے اس کی شکل ظہور پذیر ہوتی رہیں گی۔ حالانکہ جنت کا اپنی ساری نعمتوں کے ساتھ موجود ہونا، نص سے ثابت ہے، لیکن اس کے باوجود وہ جنت اعمال ہی کے ثمرات ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کو افراد کے اعمال وافعال کا علم ہے، اس لئے ان کی مناسبت سے پہلے سے صورت بنا کر اس کے واقعی وجود کی خبر دینے کے لئے یہ فرمایا، اعدت للکافرین. اعدت للمتقین. جس طرح میزبان کو پہلے سے معلوم ہو کہ میرے مہمان کا مزاج علیل ہے، چنانچہ وہ پہلے سے اس کے مزاج کے مناسب کھانا تیار کرکے رکھ دے۔ پس فی نفسہ قیعان یعنی چٹیل میدان نہیں، بلکہ جنتیوں کے حق میں قیعان ہے، جس طرح ایک شخص نے اپنے خادموں کے لئے دس ہزار روپیہ خزانہ میں جمع کردیئے اور فی کام دس بیس روپیہ مقرر کردیئے، پھر وہ شخص سب کو خطاب کرکے یوں کہہ سکتا ہے کہ اتنا روپیہ خزانہ میں رکھا گیا ہے، اگر تم خدمت کروگے تو خزانہ میں سب کچھ موجود ہے، دوسری صورت میں یوں سمجھنا چاہئے کہ خزانہ خالی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدمت کے بغیر تمہارے لئے گویا خزانہ خالی ہے، اگر خدمت شروع کروگے تو گویا خزانہ موجود ہے، واقع میں تو وہ اب بھی موجود ہے، لیکن تمہارے حق میں وہ اس وقت موجود سمجھا جائے گا، جب تم کام کروگے تو حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ اعمال کے ثمرات تو پہلے سے موجود اور تیار ہیں۔ لیکن ابھی تم ان کے مالک نہیں بنائے گئے، جیسے جیسے بندے عمل کرتے جاتے ہیں، وہ ثمرات ان کے نامزد ہوتے جاتے ہیں۔ (صفحہ ۴۳۹)

پل صراط کی حقیقت

فرمایا، پل صراط کی حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور

اعمال اخلاق کی شاخ ہیں، اعتدال کا مرکز اخلاق ہیں، جس کے تین اصول ہیں یعنی تین قوتیں ہیں، جو سارے اخلاق کی بنیاد ہے یعنی جن قویٰ سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں، وہ تین ہیں۔ ایک عقلی قوت۔ دوم شہوت کی قوت۔ سوم غضب کی قوت۔ حاصل یہ کہ دنیا وآخرت کے منافع کے حصول اور نقصان سے بچنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک عقلی قوت ہے، جو فائدہ اور نقصان کے فہم کا ذریعہ ہے۔ دوم شہوانی قوت ہے، جو منفعت کو سمجھ کر اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سوم غضب کی قوت ہے، جو نقصان کو سمجھ کر اس سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ ان تینوں قوتوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں، ان اعمال کے تین درجے ہیں، افراط وتفریط واعتدال۔ چنانچہ عقلی قوت کی افراط (زیادتی) یہ ہے کہ وحی کا بھی انکار کیا جائے، جس طرح یونانیوں نے کیا۔ اس کی کمی یہ ہے کہ معاملہ جہل اور بے وقوفی تک پہنچے۔ اسی طرح شہوانی قوت کا ایک درجہ افراط ہے کہ حرام وحلال کی بھی تمیز نہ رہے۔ بیوی اور اجنبیہ سب برابر ہوجائیں، اس کا ایک درجہ تفریط ہے یعنی فرد ایسا پرہیزگار بن جائے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے یا مال کا ایسا حریص ہوجائے کہ اپنوں اور پرایوں سب کا مال ہضم کرنے لگے یا ایسا زاہد بن جائے کہ ضرورت کی ساری چیزوں کو چھوڑ دے۔

اسی طرح غیظ وغضب کی قوت کی زیادتی یہ ہے کہ فرد بالکل بھیڑیا بن جائے اور اس کی کمی یہ ہے کہ فرد اتنا نرم ہوجائے کہ لوگ جوتے مارنے لگیں اور دین کی تکذیب ہونے لگے تو بھی فرد بے حس بنا رہے، تینوں قوتوں کا اعتدال یہ ہے کہ جہاں شریعت نے اجازت دی ہو، وہاں تو ان قوتوں کا استعمال کیا جائے اور جہاں اجازت نہ دی ہو، وہاں ان قوتوں سے کام نہ لیا جائے۔ تو ہر قوت کے تین درجے ہوئے، افراط، تفریط اور اعتدال۔ ان قوتوں کے سارے درجوں کے نام الگ الگ ہیں، عقلی قوت کے افراط کا نام ہے جزیرہ، جو تفریط کا درجہ ہے، اس کو سفاہت کہتے ہیں۔ جو اعتدال کا درجہ ہے، اسے حکمت کہتے ہیں۔ اسی طرح شہوانی قوت کے افراط کا درجہ فجور ہے، تفریط کا درجہ جمود ہے۔ اعتدال کا درجہ عفت ہے۔ اور غضب کی قوت کا درجہ افراط تہور ہے۔ اور گھٹا ہوا درجہ جبن ہے۔ اعتدال کو شجاعت کہتے ہیں، یہ کل نو چیزیں ہوئیں، جو سارے اچھے اور خراب اخلاق پر محیط ہیں، ان نو درجوں میں مطلوب صرف تین درجے اعتدال کے ہیں، یعنی حکمت، عفت، شجاعت، باقی سب رذائل ہیں، اخلاق حسنہ کے اصل اصول تین ہی ہیں

اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے۔ اس لئے اس امت کا لقب امت وسط یعنی امت عادلہ ہوا۔ غرض انسان وہ ہے، جس میں اعتدال ہو، اب آپ دیکھیں کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں، لیکن انسان بہت کم ہیں چنانچہ شاعر لکھتا ہے۔

زاہد شدی و شیخ شدی ودانشمند
ایں جملہ شدی و لیکن انساں نہ شدی

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقیقی اعتدال سب سے زیادہ مشکل کام ہے، کیونکہ حقیقی اعدال وسط حقیقی کو کہتے ہیں، جس میں ذرہ برابر بھی نہ افراط ہو، نہ تفریط اور یہ چیز سب سے زیادہ دشوار ہے اور پل صراط اسی اعتدال کی مثالی صورت ہے، دراصل اس کی دشواری تلوار کی تیزی اور بال سے بھی زیادہ باریکی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ (صفحہ ۴۴۰ - ۴۴۱)

سماع ہر ایک کے لئے جائز نہیں

فرمایا، اگر قرآن شریف سن کر نفسانی کیفیت پیدا ہو تو وہ محمود نہ ہوگی، مثلاً کسی لڑکے سے قرآن شریف سن کر اس کی آواز یا صورت سے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہوئی تو اس وقت اسباب کو نہ دیکھیں گے، بلکہ آثار کو دیکھیں گے اور ظاہر ہے کہ وہ کیفیت یقیناً نفسانی ہوگی۔ اسی طرح سماع کو سمجھا جائے۔ اس کے بھی حدود ہیں، یہ ہر شخص کے لئے جائز نہیں، جیسا کہ آج کل ہر شخص کو اس کا شوق ہے۔ (صفحہ ۴۴۲)

گناہوں پر غلو کے ساتھ افسوس ہونا مضر ہے

فرمایا، یہ طریق (تصوف وسلوک) بہت نازک ہے، اس کے لئے رہبر کامل کی ضرورت ہے، بعض اوقات ماضی پر افسوس کرنا بھی مستقبل کا حجاب ہوجاتا ہے کہ فرد اس افسوس میں غلو کے ساتھ مشغول ہوکر آئندہ کے لئے معطل ہوجاتا ہے۔

دین پر عمل کا مدار، سلف صالحین کی عظمت پر ہونا

فرمایا، اہل علم کے کام کی ایک بات بتاتا ہوں کہ دین پر عمل کرنے کا مدار سلف صالحین کی عظمت پر ہے، اس لئے حتی الامکان ان پر اعتراض وتنقیص کی آنچ نہ آنے دینا چاہئے۔ (صفحہ ۴۴۵)

عُجب وناز کا علاج

فرمایا، اگر نعمت کے استحضار کے ساتھ اس بات کا خیال کیا جائے کہ یہ نعمتیں میرے استحقاق کی وجہ سے حاصل نہیں، بلکہ اللہ کا عطیہ ہیں، وہ اگر چاہیں تو ابھی سلب کرلیں اور یہ ان کی رحمت ہے کہ استحقاق کے بغیر انہوں نے عطا فرمائی ہیں اور دوسروں کے متعلق یہ تصور کیا جائے کہ اگر یہ لوگ ان خاص فضیلتوں سے خالی ہوں، لیکن ممکن ہے، انہیں دوسری اہم فضیلتیں دی گئی ہوں تو ان دونوں چیزوں کے استحضار کے بعد جو سرور رہ جائے گا، وہ عجب میں شامل نہ ہوگا یا تو طبعی فرحت ہوگی، جو مذموم نہیں یا شکر ہوگا، جو منعم کے استحسان کا بھی استحضار ہے، جس پر اجر ملے گا۔ (صفحہ ۴۴۶)

غیر اختیاری حالت کا منافع بخش ہونا

اس طریق میں غیر اختیاری طور پر جو بھی حالت پیش آجائے، اس میں مصلحتیں اور منافع ہوتے ہیں، جو بر وقت تو سمجھ میں نہیں آتے، لیکن آگے چل کر ایک وقت میں سب ازخود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ (صفحہ ۴۷۶)

اختلافی فقہی مسائل میں بہتر لائین

احناف اور غیر مقلدین، جو ایک ہی مسجد میں ایک جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، ایک مولوی صاحب بریلوی ان کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہتے تھے، اس پر احناف نے مسئلہ متعلقہ کے بارے میں دریافت کیا، فرمایا، اختلافی مسئلہ میں طرفین میں گنجائش ہوتی ہے، اس لئے ایک مثل کے قول پر بھی عصر کی نماز درست ہوجائے گی، اگرچہ احناف کے لئے احتیاط یہی ہے کہ وہ مثلین کے بعد نماز پڑھیں، لیکن چونکہ ہم فتنہ سے بچنا چاہتے ہیں، اگر فتنہ نہ مٹے تو اس مجبوری کی وجہ سے مثلین پر عمل کرنے سے ایک مثل پر عمل کرنا بہتر ہوگا، اسی طرح اگر حضرات اہل حدیث یہ اعانت کریں کہ اول وقت کی فضیلت کی تحصیل کے مقابلہ میں اتفاق کی فضیلت کو ترجیح دے کر مثلین کے بعد عصر نماز پڑھنا گوارا کرلیں تو اس میں زیادہ ثواب ہوگا اور زیادہ بہتر ہے، کیونکہ مثلین کے بعد تو بالاتفاق عصر کی نماز درست ہے اور مثل کے بعد بعض اقوال پر درست نہیں اور اگر مذکورہ صورت میں کوئی فریق آمادہ نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اہل حدیث ایک مثل کے بعد اذان دے کر نماز ادا

کریں اور اس کے بعد احناف اپنے وقت پر اسی اذان کو تسلیم کر کے نماز ادا کریں۔ (صفحہ ۴۴۷)

تعلق مع اللہ کے استحکام کے بغیر حقوق العباد کی ادائیگی مشکل ہے

فرمایا، جب تک اللہ کے ساتھ نسبت کا تعلق راسخ نہ ہو، اس وقت تک لوگوں کے ساتھ ضرورت کے بغیر تعلق سراسر نقصاندہ ہے۔ لوگوں کے ساتھ تعلق میں جو منفعت سوچی جاتی ہے کہ خلق کے حقوق ادا ہوں تو یہ حقوق بھی اس وقت ہی ادا ہو سکتے ہیں، جب اللہ کے ساتھ نسبت مضبوط ہو جائے، ورنہ نہ تو اللہ کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں نہ لوگوں کے۔ یہ ایک کا نہیں، بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا تجربہ ہے، ہم سے راسخ افراد نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا ہے، حضرت ابراہیم بلخی اور حضرت شاہ شجاع کرمانی کے واقعات تو معلوم ہیں، حضرات خلفا راشدین پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے۔ (۴۴۷)

صاحب مجاز کی، الارم کے بغیر آنکھ کا نہ کھلنا

ایک صاحب مجاز نے شکایت لکھی تھی کہ اب تک الارم کے بغیر تہجد کیلئے آنکھ نہیں کھلتی، افسوس ہے کہ خارجی چیزوں کی اب تک حاجت باقی ہے، اس پر جواباً فرمایا، کن کن خارجی چیزوں کی احتیاج سے بچو گے۔ کھانے کی احتیاج ہے، لحاف بچھونے کی احتیاج ہے، صدہا چیزوں کی احتیاج ہے، جس طرح باطنی کیفیات حق تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، الارم وغیرہ خارجی چیزیں بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی نعمتیں ہیں۔ کام نکلنا چاہئے، چاہے خارجی نعمتوں سے نکلے، خواہ باطنی نعمتوں سے، پھر فرمایا اس جواب سے ان کی بالکل تسلی ہوگئی، اگر کسی اور جگہ پوچھا جاتا تو نہ جانے کیا کیا مجاہدے تجویز کئے جاتے۔ (صفحہ ۴۴۸)

اپنی اطاعت کا ذکر لوگوں کے سامنے کرنا غیر اللہ کو مقصود بنانا ہے

فرمایا، بہتر یہ ہے کہ اپنی خوبیوں اور اطاعات کا ذکر نہ کیا جائے، بس اس مثل پر عمل کرنا چاہئے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ فرد کو یہ سوچنا چاہئے کہ میں نے جس کے لئے اطاعت کی ہے، اس کو تو علم ہے اور وہ کبھی بھولے گا نہیں، پھر کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی اطاعت کو جتلانا، درحقیقت غیر اللہ کو مقصود بنانا ہے، یہ کیا حماقت ہے۔ (صفحہ ۴۴۹)

نفسانیت والے کام سے لوگوں کا متنفر ہونا

فرمایا، جس بات میں نفسانیت شامل ہوتی ہے، اس کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ فرد کی طبیعت میں اپنے ساتھ حسن ظن موجود ہے، اس لئے اسے اپنے کام کی برائی معلوم نہیں ہوتی، چنانچہ محققین نے بھلے برے کی ایک شناخت یہ مقرر کی ہے کہ جس کام کے بارے میں یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ اچھا ہے یا برا اور اس میں نفسانیت شامل ہے یا نہیں، اس میں اس طرح غور کرو کہ یہ کام اگر دوسرا شخص آ کر کرے تو ہم کو برا معلوم ہوگا یا نہیں اور اس سے اکثر باتوں کی صحت وخرابی معلوم ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۵۹)

شرف کے حصول کا طریق

لوگوں میں ایک دوسرے کے اوپر بلندی اور رفعت صرف اس چیز سے حاصل ہوتی ہے کہ لوگوں کی تکلیف دہ باتوں پر صبر کیا جائے اور کثرت سے صدقہ اور احسان کیا جائے اور کسی سے حسد نہ کیا جائے اور بدی کرنے والوں کا بدلہ بدی سے نہ دیا جائے، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **جعلنا هم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا و كانوا باٰيٰتنا يوقنون.** (صفحہ ۵۴۰)

مؤمن کے قلب کا، صرف ایک پریشانی سے آشنا ہونا

ایک صاحب نے عرض کیا، میرے لڑکے بدشوق ہیں، انہیں تعلیم میں کوئی التفات اور رغبت نہیں، جس کی وجہ سے میرا قلب پریشان رہتا ہے، فرمایا، قلب کو پریشان رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مومن کو پریشان کرنے والی چیز صرف ایک ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ کی عدم رضا کا خطرہ ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ مومن کے قلب میں اس سے جتنی بھی پریشانی ہو، وہ کم ہے، اگر اپنی وسعت اور قدرت کے مطابق اللہ کی رضا کا اہتمام ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مومن کا قلب پریشان ہو، اس لئے کہ صرف تدبیر کرنا ہمارا کام ہے۔ مثلاً اولاد کی تعلیم کے لئے شفیق استاد کی تلاش، کاغذ، قلم اور دوات وغیرہ کا انتظام کرنا، کتابوں کا خرید کر دینا، علم کے منافع وفضائل سنانا۔ اس کے بعد جو نتیجہ ہو، اس پر رضا اور خود سپردگی سے ہی کام لینا مناسب ہے۔ (صفحہ ۴۵۳)

وہ مجلس جو قیامت کے دن باعث حسرت ہوگی

فرمایا، جب زبان کو ذرا بھی وسعت دی جاتی ہے تو فرد گناہ میں ضرور مبتلا ہوجاتا ہے، اس کی ایک تدبیر جو تدبیر ہونے کے ساتھ اس کا تدارک بھی ہے، یہ ہے کہ جب دوچار آدمی جمع ہوکر باتیں کریں تو باتیں ختم ہونے سے پہلے کچھ ذکر اللہ اور ذکر الرسول ﷺ بھی کر لیا جائے، اس کی ضرورت حدیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ ارشاد ہے **ماجلس قوم مجلسا لم یذکروا اللہ فیہ ولم یصلوا علی نبیہ ﷺ الا کانت علیھم ترۃ** جس مجلس میں لوگ باتیں کرتے ہیں اور اس میں حق تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے اور پیغمبر ﷺ پر درود نہیں بھیجتے، وہ مجلس ان کے لئے قیامت کے دن حسرت کا باعث ہوگی، دوسرا ذکر نہ بھی ہو تو یہی کہہ لیا کریں **سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین** یہ لفظ جامع ہے، ذکر اللہ اور ذکر رسول ﷺ دونوں اس میں شامل ہیں، علما نے لکھا ہے کہ یہ مجلس کا کفارہ ہے۔

کثرت گفتگو، کبر کا شاخسانہ ہے

فرمایا، کثرت کلام اس وقت ہوتی ہے، جب اپنی بڑائی ذہن میں سمائی ہوتی ہے اور اپنی بڑائی نظر میں اس وقت آتی ہے، جب حق تعالیٰ سے غفلت ہو۔ حاصل یہ ہے کہ کثرت کلام حق تعالیٰ سے غفلت کا نتیجہ ہے اور خدا سے غفلت ایک مرض نہیں، بلکہ مجموعۃ الامراض ہے، تو جس شخص کو دیکھو کہ وہ کثرت کلام میں مبتلا ہے تو سمجھ لو کہ وہ ایک مرض میں مبتلا نہیں، بلکہ بہت سے امراض میں مبتلا ہے۔ اور اس میں وہ تمام امراض موجود ہیں، جو ترفع اور تکبر کی شاخ ہیں۔ (صفحہ ۴۵۴)

اپنی افضلیت کا بت اور اس کا علاج

فرمایا، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، ایسا فعل ہے، جس میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں، فرد کو اپنے آپ کو کبھی بڑا نہ سمجھنا چاہئے، اگر آسانی سے یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو بہ تکلف اس کی مشق کی جائے، اہل اللہ نے اس کی تدابیر لکھی ہیں، وہ یہ ہیں کہ اپنے سے چھوٹے کو دیکھتے وقت یہ خیال کیا جائے کہ یہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے، اس نے گناہ کم کئے ہیں، میری عمر زیادہ ہے، اس لئے گناہ بھی میرے زیادہ ہوں گے اور اپنے سے بڑے کو دیکھتے

وقت یہ خیال کیا جائے کہ اس کی عمر زیادہ ہے، اس نے نیکیاں مجھ سے زیادہ کی ہوں گی، لوگ ان باتوں کو توہمات سمجھتے ہیں، لیکن یہ توہمات ہی کام دینے والی چیزیں ہیں۔ (صفحہ ۴۵۴)

ایک دوسرے سے محبت کا مرکزی نکتہ۔ سادہ معاشرتی زندگی

فرمایا، دو افراد کے درمیان محبت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب مساوات ہو اور مسلمانوں میں مساوات یا تو اس طرح ہوسکتی ہے کہ سب امیر ہوجائیں اور یا اس طرح ہوسکتی ہے کہ سب غریب ہوجائیں، ظاہر ہے کہ سب کا امیر بننا تو اختیاری چیز نہیں، ہاں غریب بننا اختیاری ہے، بس باہم محبت کی صورت یہی ہے کہ سب غریب بن کر رہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اپنی اپنی دولت کو ختم کر کے سب محتاج بن جائیں، بلکہ غریب بننے سے مراد عادات اور معاشرت میں غریب بننا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سادہ زندگی اختیار کی جائے، اسی سے محبت پیدا ہوسکتی ہے۔ آج کے وہ فلسفی کہاں ہیں، جو بظاہر ہمدردی کی باتیں کرتے ہیں، لیکن عملاً تنعم اور تکلف کی زندگی گذار رہے ہیں، کیا تنعم کے ساتھ ہمدردی و محبت جمع ہوسکتی ہے، ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ باہم محبت کے لئے مساوات شرط ہے۔ (صفحہ ۴۵۵)

زیور کے نقصانات۔ عورتوں کے لئے لمحہ فکریہ

فرمایا، زیور میں یہ نفع بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے مال محفوظ ہوجاتا ہے، کیونکہ نقد روپیہ خرچ ہوجاتا ہے اور زیور کی صورت میں اس کی حفاظت ہوجاتی ہے۔ میں اس کو کسی درجہ میں تسلیم کرتا ہوں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کوئی نقصان بھی ہے یا نہیں۔ غور سے معلوم ہوگا کہ اس میں قومی، ملکی، ذاتی ہر طرح کے نقصانات ہیں۔ قومی نقصان تو یہ ہے کہ زیور دکھاوے اور بڑا بننے کے لئے پہنا جاتا ہے اور اس سے مقصود دوسروں کی تحقیر ہوتا ہے اور جب کسی کی تحقیر ہوئی تو مساوات کہاں رہی اور قومی ترقی کا بنیادی اصول مساوات ہے۔ ملکی نقصان یہ ہے کہ زیور کی محبت، حب مال ہے اور جس قوم میں مال کی محبت ہوتی ہے، وہ قوم ملکی ترقی کا کوئی کام نہیں کرسکتی۔ مال پاؤں کی بیڑی ہے، جو فرد کو کہیں نقل و حرکت کرنے نہیں دیتی، واقعات اس کے شاہد ہیں کہ جس فوج کے دل میں حب مال داخل ہوگئی، اس سے کچھ بھی نہیں ہوسکتا، وہ لوٹ مار اور ظلم کے۔ دشمن نے جب کبھی

ان کو اپنے ساتھ ملانا چاہا، ذرا سا لالچ دے کر ملالیا اور اور ان کے بادشاہ اور ریاست سے ان کی وفاداری کا رشتہ توڑ کر بہت جلد اسے مغلوب کرلیا، نتیجہ یہ ہوا کہ گئے تھے، دشمن سے مقابلہ کے لئے اور ملک کی بہتری کے لئے، لیکن ذرا سی لالچ میں اپنے ملک کو تباہ و برباد کردیا، غرض ہزاروں تاریخی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ حب مال ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔اور اس کا سب سے پہلا ذاتی نقصان تو یہ ہے کہ اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے، فرد ہر وقت خطرہ میں رہتا ہے کہ زیور کوئی لوٹ کر نہ لے جائے۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ زیور پہن کر عورتیں کچھ کام نہیں کرسکتیں، اپاہج بن جاتی ہیں، جب وہ ہلنے جلنے کے کام کی بھی نہ رہیں تو صحت کی جوگت ہوگی، وہ معلوم ہے، غرضیکہ زیور صحت میں رکاوٹ ہے اور صحت ایسی چیز ہے، جس پر ہر کام کا انحصار ہے تو زیور کی زیادتی ہر مفید کام کی مانع ہوئی، تیسرا نقصان یہ ہے کہ کبھی کبھار زیور ٹوٹ جاتے ہیں یا گم ہوجاتے ہیں اور بناتے وقت سنار ان میں کھوٹ ملاتے ہیں، یہ سب مالی نقصانات ہوئے۔ ان دنیوی نقصانات کے علاوہ دینی نقصانات تو اس قدر ہیں کہ کوئی منفعت اس کا مقابلہ ہی نہیں کرسکتی، وقت کا ضیاء اور اسراف اور حب مال اور ریا، کبر اور تفاخر، یہ اس کے نتائج ہیں، جو افسوس ہے کہ ہماری نظر میں معمولی ہیں، ان کے متعلق جو وعیدیں قرآن وحدیث میں وارد ہیں، ان کو کوئی دیکھے تو کبھی زیور کا نام ہی نہ لے، مگر طبائع میں ایسا انقلاب برپا ہوا ہے کہ باوجود دینی ودنیوی نقصانات کے عورتوں کو دن رات اس سے فرصت ہی نہیں۔ (صفحہ ۴۵۶)

بڑا بن کر رہنے کی خواہش کا ہونا اور اس کا علاج

فرمایا، اگر بیبیاں یہ طریقہ اختیار کرلیں کہ جب کپڑے میلے ہوں تو بدل لیا کریں، ورنہ ہرگز نہ بدلیں، بلکہ جہاں جانا ہو، ویسے ہی ہو آیا کریں تو بہت سے فتنوں سے نجات ہوجائے گی۔ اس پر عمل کرکے دیکھئے، اس میں کتنے فائدے ہیں، اس کو معمولی بات نہ سمجھیں، بلکہ یہ دین کی دوسری ضروریات کی طرح ہے، کیونکہ بناؤ سنگھار کرکے جانے کا مقصد محض کبر ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں بڑا بن کر رہوں۔ اس عادت کو بدلئے، کیونکہ بڑا بننے کی سزا لایدخل الجنتہ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر بہت بڑی ہے، حدیث میں ہے یعنی جس شخص کے دل میں ذرہ برابر کبر ہوگا، وہ جنت میں نہ جائے گا۔ (صفحہ ۴۵۷)

کثرت سوال، کام نہ کرنے کی نشانی ہے

فرمایا، کثرت سوال کا مقصد کام نہ کرنا ہے (باریک بات ہے) کہ جس کو کام کرنا ہوتا ہے، وہ تو ذرا سا حکم پاکر اس کی تعمیل میں لگ جاتا ہے، بلکہ وہ ڈرتا رہتا ہے کہ اگر سوال کروں گا تو کام میں دشواری نہ پیدا ہوجائے، پھر مجھ سے کام نہ ہوسکے اور جسے کام کرنا نہیں ہوتا، تقریریں وہی جھاڑا کرتا ہے۔ (صفحہ ۴۵۷)

حضور ﷺ کا، اپنے لئے اور اپنے جگر گوشوں کے لئے دنیا کو پسند نہ کرنا

فرمایا، جس کی نظر اللہ اور ماعنداللہ پر ہے، اس کی نظر میں سونا چاندی تو کیا، دنیا وما فیہا بھی کچھ نہیں۔ حضور ﷺ نے، اپنے لئے اور اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لئے دنیا کو پسند نہیں کیا اور ایک دینار بھی رکھنا گوارا نہیں کیا۔ (صفحہ ۴۵۸)

مال کی قدر کرنا چاہئے

فرمایا، صاحبو، مال کی قدر کرو، مال دنیا کی زندگی کا سہارا ہے، اس کو ہوش وعقل کے ساتھ خرچ کرو اور خرچ کرنے کا ہی جوش ہے تو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (صفحہ ۴۵۸)

صاحب حق شخصیت کے اثرات دلوں پر ہوتے ہیں

فرمایا، عملیات سے جو اثر ہوتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی۔ دلوں پر تو اثر نہیں پڑتا، البتہ صاحب حق شخصیت سے دلیں متاثر ہوتی ہیں۔ اس کی صورت دیکھ کر کشش ہوتی ہے، جو بلا کرامت ہو تو اثر زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ کرامت میں تو فرد سوچ میں پڑجاتا ہے کہ کہیں دوسری بات نہ ہو۔ حق میں عجیب اثر ہے، کشش اتباع سنت میں ہے اور اتباع سنت میں دھوکہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ آدمی کہاں تک بناوٹ اختیار کرے گا۔ ایک نہ ایک روز راز کھل جاتا ہے۔ (صفحہ ۴۶۴)

ہر مسئلہ کا جواب دینا ضروری نہیں

فرمایا، جب تک کسی مسئلہ میں شرح صدر حاصل نہیں ہوتا۔ میں جواب نہیں دیتا، تردد کی صورت میں جواب دینا جائز نہیں، البتہ اطمینان ہوجانے کی صورت میں مواخذہ

نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مسئلہ کا جواب دیا جائے۔ خواہ اس میں تردد ہی ہو۔ بلکہ اگر کسی مسئلہ میں خود اطمینان نہ ہو تو دوسروں کے حوالہ کیا جائے کہ سائل دوسری جگہ دریافت کر لے۔ خواہ مخواہ جواب دینے میں یہ ہے کہ روزانہ کتابیں دیکھو، ٹکریں مارو، پھر اعتراض پڑے، جواب دو۔ یہ ساری خرابیاں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی ہیں۔ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم جواب نہ دیں گے تو لوگ کہیں گے کہ جواب بھی نہ دیا گیا۔ (صفحہ ۴۶۵)

غیر ضروری آداب کی بجا آوری سے تکلیف کا ہونا

فرمایا، مجھے تکلف پسند نہیں۔ لوگ مجھے حضرت حضرت کہا کرتے تھے، مجھے ناگوار ہوتا تھا، چنانچہ میں نے منع کر دیا۔ مولوی صاحب کہہ دیں۔ مولانا صاحب کہہ دیں، سیدی ومولائی وغیرہ الفاظ سے بھی مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ سید و مولا تو آقا کو کہتے ہیں، مجھے تو آقا بنایا اور اپنے آپ کو غلام اور غلام کے معنی ہیں ایسا شخص، جس میں تصرف کرو۔ حالانکہ مرید کہیں غلام تھوڑا ہی ہے۔ یہ تعظیم میں مبالغہ ہے، اسی طرح مجھے ہاتھ چومنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح مخدوم العالم کا لفظ بھی سخت ہے۔ جھکنا وغیرہ یہ سارے تکلفات ہیں۔ (صفحہ ۴۶۵)

خدا اور نفس کے لئے ہونے والے کام کی کسوٹی

فرمایا، آج کل دعویٰ اور اظہار بہت ہے، حالانکہ جو کام کیا جاتا ہے، وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اللہ کے لئے ہے یا نفس کے لئے۔ اگر اللہ کے لئے ہے تو اللہ میاں کا علم کافی ہے، اس لئے اظہار کی کیا حاجت ہے اور اگر نفس کے لئے ہے تو بے کار ہے، پھر اظہار کیوں ہے، اللہ کے لئے یا نفس کے لئے کام کی کسوٹی یہ ہے کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کے لئے آجائے تو فرد اس کام سے دستبردار ہو جائے اور غنیمت جانے کہ دوسرے شخص نے آکر میرا کام ہلکا کر دیا۔ لیکن آج کل تو حالت یہ ہے کہ اگر ایسا ہو تو ذبح ہو جائیں، نہ مولویوں میں اخلاص ہے، نہ مشائخ میں۔ الا ماشاء اللہ۔ (صفحہ ۴۶۸)

موجودہ پیری مریدی کی تصویر کشی

آج کل پیری مریدی محض دوکانداری و رسم پرستی بن گئی ہے، کہیں طلب مال ہے اور کہیں طلب جاہ ہے اور کہیں اگر صدق بھی ہے تو تحقیق نہیں۔ بعض مقامات پر اس بات

کی کوشش ہے کہ امراء کو کھینچا جائے، حالانکہ خاک نشینوں کا مرید ہونا، شیخ کے کامل ہونے کی علامت ہے، دنیادار امراء کا متوجہ ہونا، خود شیخ کے دنیادار ہونے کی علامت ہے، کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس یعنی جھکتا وہی ہے، جس میں مناسبت ہے۔ کہیں قاز اور مور ساتھ جا رہے تھے، لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ دونوں غیر جنس ایک ساتھ کیسے؟ کسی فہیم نے کہا کہ دونوں میں کوئی مشترک بات ضرور موجود ہے، غور کر کے دیکھا تو دونوں لنگڑے تھے، اگر اہل حق کے یہاں امراء آتے ہیں تو وہ مٹ کر آتے ہیں، چنانچہ امراء غرباء ہو کر رہتے ہیں، بڑا ہو کر چھوٹا ہو جائے، یہ ہے کمال۔ (صفحہ ۴۶۹)

ایک تعلق سے تعلقات کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کا شروع ہونا

ایک شخص نے دریافت کیا، یہاں مدرسہ میں روپیہ وغیرہ دینے سے رسید دی جاتی ہے، فرمایا، یہاں کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ یہاں تو یہ ہے کہ جس کا جی چاہے دے، جس کا دل چاہے نہ دے۔ رسید کا اہتمام تو اس وقت کریں، جب خود مانگیں، ہم جب مانگتے ہی نہیں تو کیوں جھگڑا کریں۔ ہمیں تو عنداللہ برأت چاہئے، تعلقات کم کرنے میں بڑی راحت ہے، ورنہ ایک تعلق سے دوسرا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے سے تیسرا، اس طرح یہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دو بھائی تھے، ایک بادشاہ دوسرا فقیر۔ فقیر لنگی باندھے پھرا کرتے۔ ایک روز بادشاہ نے اسے بلا کر کہا کہ بھائی تمہارے اس حال سے مجھے لوگوں کے سامنے بڑی غیرت آتی ہے۔ تم پاجامہ تو پہنو اور اچھی طرح رہو، وہ بولے پھر کرتے کے ساتھ ٹوپی بھی ہونی چاہئے۔ بادشاہ نے کہا ٹوپی بھی بہت، وہ کہنے لگے، پھر سواری کے لئے گھوڑا بھی ہونا چاہئے، بادشاہ نے کہا، گھوڑے بھی بہت۔ فقیر نے اس طرح سلسلہ وار بہت سی ضروریات بیان کی۔ بادشاہ نے کہا، سب چیزیں موجود ہیں، آپ چلئے، حتیٰ کہ تخت سلطنت بھی حاضر ہے، وہ صاحب کہنے لگے کہ میں پاجامہ ہی کیوں پہنوں، جس کے لئے اتنے جھگڑے کرنا پڑیں۔ اسی طرح یہاں کا قصہ ہے کہ ہم مانگیں کیوں، جس کے لئے رسید وغیرہ کے قصے کرنے پڑیں۔ (صفحہ ۴۷۰)

غیر ضروری چیزوں کو ضروریات زندگی میں شامل کر لینا

فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بغیر محنت کے عطا فرمائی ہیں، وہ واقعی سب ضروری ہیں اور ان میں بہت ساری مصلحتیں موجود ہیں۔ ان میں کوئی چیز زائد نہیں، جیسے دو ہاتھ

دو پاؤں دو آنکھیں وغیرہ وغیرہ، چنانچہ ان میں جب کوئی چیز کم ہوجاتی ہے تو اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے۔ غرض جن چیزوں میں افراد کی محنت کو دخل نہیں، وہ ساری چیزیں ضروری ہیں اور جن چیزوں میں انسان کی محنت کو دخل ہے، ان میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں، جو غیر ضروری ہیں، جنہیں ہم نے فضول طور پر ضروریات میں شامل کر لیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ضروری اور غیر ضروری چیزوں میں تمیز کر کے زائد سے وحشت ہوتی، مگر مزاج میں فساد کے عنصر کی شمولیت کی وجہ سے اس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال تمباکو جیسی ہے کہ اگرچہ اس کے کھانے سے بہت سے نقصانات ہیں، اس سے سر گھومنے لگتا ہے۔ دماغ خراب ہوتا ہے۔ منہ میں بدبو پیدا ہوتی ہے۔ جسم میں کاہلی آجاتی ہے، لیکن عادت ہوجانے کی وجہ سے یہ حالت ہوجاتی ہے کہ جب تک اس کو نہ کھالیا جائے، فرد کوئی کام نہیں کر سکتا، اتنے نقصانات کے باوجود اسے کھایا جاتا ہے اور بڑے مزے سے کھایا جاتا ہے۔ (صفحہ ۴۷۵)

کام کے بعد رقم لینے میں زیادہ خوشی کا ہونا

کسی کام کی پیشگی اجرت لینے کے تذکرہ میں فرمایا، پیشگی رقم لینے کے بعد کام پورا کرنا مشکل پڑجاتا ہے اور بیگار کی طرح کام پورا کیا جاتا ہے، اس لئے پیشگی رقم لینا ٹھیک نہیں، کام کرنے کے بعد رقم لینے میں زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ (صفحہ ۵۰۰)

معدہ کے کمزور ہونے کی خدائی مصلحت

فرمایا، معدہ کے کمزور ہونے میں بھی حکمت ہے کہ لذیذ چیزوں سے پرہیز ہوتی ہے۔ یہ بھی سرکاری انتظام ہے، کیونکہ زیادہ کھانے سے جسم تازہ اور قلب مکدر ہوتا ہے اور کم کھانے سے جسم کمزور ہوجاتا ہے، جب کہ قلب تازہ ہوتا ہے۔ (صفحہ ۵۰۳)

خالص دین تعلق باللہ کا نام ہے

فرمایا، محبت و تعلق مع اللہ۔ خدا کا خوف۔ خدا کا شوق۔ دنیا سے بے رغبتی، یہ اصل دین ہے۔ باقی کھانا کمانا دنیا ہے، جو غیر مقصود ہے۔ ہاں، بعض اوقات یہ چیزیں دین کے لئے معاون ہیں اور کبھی کبھار مقصود بھی ہوجاتی ہیں، لیکن مقصود بالذات نہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی کرامت دیں کہ اسے کھانے کی ضرورت ہی نہ رہے تو ایسا شخص پھر کھانے

کمانے کا ذمہ دار نہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بغیر محنت کے ملتا ہے یا پہاڑوں وغیرہ میں بعض بزرگ رہے ہیں، انہوں نے وہاں کے پھل وغیرہ کھا کر ہی گذر کی ہے تو ایسے افراد کو کمانے کی ضرورت نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی حیثیت دین کے خادم کی سی ہے اور خادم ہونے کے درجہ میں مرتبہ تابعیت میں اسے مجازاً دین کہہ دیتے ہیں۔ جیسے کسی شخص سے پوچھا جائے کہ شہر میں کھانا کتنے داموں میں پڑجاتا ہے، اس کے جواب سے معلوم ہو کہ دس روپیہ میں۔ حالانکہ ان دس روپیہ میں دو روپیہ کے کنڈے بھی شامل ہیں، بھلا کنڈوں کو کھانے سے کیا تعلق، مگر طبعاً وہ بھی کھانے سے متعلق ہیں۔ اسی طرح بال بچوں کے لئے کمانا فی نفسہ دین نہیں ہے، البتہ دین میں معین ہے، خالص دین تو نام ہے تعلق مع اللہ کا۔ البتہ دین کے موافق بال بچوں کی خدمت سے ثواب ملتا ہے۔ (۵۰۳)

شیطان کا، انسان ہی کے آلات سے کام لینا

فرمایا، شیطان کے پاس شہوت وغضب وغیرہ کے آلات جداگانہ نہیں ہیں، وہ انسان کے ان آلات سے ہی کام لیتا ہے۔ اسی لئے سالکین کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی وقت بھی فارغ مت سمجھیں، پھر فرمایا، اپنے آپ سے بھاگنا بہت مشکل ہے۔ جس شخص کی ہستی ہی اس کی دشمن ہو، اسے چین کہاں اور ہستی کا مٹانا، یہ ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دیا جائے، نفسانیت اور اپنے وجود کو کالعدم کر دے موتو قبل ان تموتو کا مصداق بنا وے۔ (صفحہ ۵۱۷)

دین سے مناسبت، صحبت صالحہ کے بغیر مشکل ہے

ایک انگریزی خواں صاحب تشریف لائے، انہوں نے بے موقع سوالات کرنے شروع کئے، اس پر فرمایا کہ انگریزی تعلیم کے دوران جو بری صحبت حاصل رہتی ہے، اس سے فرد کے اندر آزادی اور خودرائی پیدا ہوجاتی ہے، معلوم ہوا کہ سائل کتابیں بھی دیکھا کرتے ہیں، فرمایا، کتابوں کے مطالعہ سے دین کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر اس سے کہا کہ آپ جس حیثیت سے آئے ہیں، اس کے مناسب یہ ہے کہ سوالات کرنے کی بجائے یہاں کی باتیں سننی چاہئے۔ ابھی آپ کا دین ضابطہ کا دین ہے، ابھی آپ کو دین سے مناسبت پیدا نہیں ہوئی۔ جب یہ صاحب چلے گئے تو فرمایا، اگر وہ ایک ہفتہ رہتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ہاں، دین کوئی چیز ہے، اب تو لوگ اعمال کی ظاہری اصلاح کو دین کہتے

ہیں، اس پر ایک مولوی صاحب نے کہا، بظاہر صورت تو دین کی ہوتی ہے، لیکن حقیقت دین سے عاری ہوتے ہیں، اس پر فرمایا، جی ہاں، دین کے ساتھ محبت، صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ عام لوگوں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں، جنہیں دین کی صورت کی خبر نہیں ہوتی، لیکن ان میں یہ جوہر موجود ہوتا ہے، پھر فرمایا کہ یہ بڑی دولت ہے کہ دین رگ وریشہ میں سما جائے۔ یہ صحبت کے بغیر نہیں ہوتا، یہ ایک فطری بات ہے۔ (صفحہ ۵۲۰)

غیر ضروری گفتگو سے اذیت کا ہونا

ایک روز حاضرین کے سامنے مجلس میں اخباری قصے کچھ دیر تک ذکر ہوتے رہے، ایک صاحب نے آپ کی عدم موجودگی میں اعتراض کیا کہ یہ مشائخ کے شان کے خلاف ہے کہ غیر متعلق باتیں کریں، مشائخ کے یہاں تو حقائق ومعارف کے سواء کچھ نہ ہونا چاہئے۔ کسی نے یہ اعتراض حضرت والا کے کان تک پہنچا دیا تو فرمایا، ہاں یہ اعتراض صحیح ہے۔ اس طرح کی باتوں میں لوگوں کے ساتھ میری شرکت کا سبب مخاطب کی دل جوئی ہوتی ہے، جب کوئی شخص میرے پاس آ کر بات کرے اور میں دلچسپی نہ لوں تو اس کو صدمہ ہوگا۔ بالخصوص مہمان، جو دور سے آتے ہیں، ان کی دل شکنی بہت زیادہ بری معلوم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک غیر ضروری باتوں کی برائی دل شکنی سے کم ہے، ورنہ اس طرح کی گفتگو سے میرا دل بہت الجھتا ہے، مگر کیا کروں، دوسروں کی دلجوئی کی وجہ سے صبر کرتا ہوں۔ (صفحہ ۵۲۵)

اطباء، مریضوں کو فوائد نہیں بتاتے

ایک صاحب نے ناجائز آمدنی کی سیکڑوں صورتیں لکھ کر بے ڈھنگے طور پر سوالات پر مشتمل خط لکھا، انہیں لکھا: طالب ہو کر طلب کرنے والے پر اتنا غصہ کرنا، یہ عدم طلب کی علامت ہے، امید وار اہلکاروں کے ناز اٹھاتے ہیں (یہ سب کا مشاہدہ ہے) مریض اطباء کے ناز اٹھاتے ہیں، اگر وہ زیادتی بھی کریں تو برداشت کرتے ہیں، یہ نہیں کرتے کہ ان کو قواعد بتانے اور نصیحت کرنے بیٹھ جائیں۔ وہ بھی بے قاعدہ طور پر۔ (صفحہ ۵۴۴)

اپنی عبودیت کا اظہار

فرمایا، میں بقسم کہتا ہوں کہ مجھے کبھی آخرت کے درجوں کا وسوسہ تک بھی پیدا نہیں ہوا، بلکہ صرف یہ تمنا ہے کہ جنت میں جگہ مل جائے، چاہے جنتیوں کے جوتیوں میں ہی جگہ ملے اور یہ تمنا بھی استحقاق کے طور پر نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ عذاب کا تحمل نہیں۔ (صفحہ ۵۴۶)

قوت فکریہ کی صلاحیت، حق تعالیٰ کی دَین ہے

فرمایا، موجدانِ یورپ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے ایسی ایسی ایجادیں کی ہیں، حالانکہ ان ساری ایجادوں کی بنیاد قوت فکریہ ہے، جو کسی کے اختیار میں نہیں، یعنی صورت صنعت کا قوت فکریہ میں فائز ہو جانا، اگر یہ چیز ان کے اختیار میں ہوتی تو قوت فکر تو بیس برس پہلے بھی تھی، اس وقت وہ صورت ان کے ذہن میں نہیں آئی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ذہن سے اتر جاتی ہے تو قوت فکر کو کتنا ہی استعمال کیا جائے، وہ یاد ہی نہیں آتی۔ کسی بات کا سوجھا دینا، یہ تو حق تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ (صفحہ ۵۴۷)

خشیت حق

فرمایا، جب میں کسی ہدیہ کو رد کرتا ہوں تو اگرچہ اس کا سبب ہوتا ہے، لیکن بہت ڈرتا ہوں، کیونکہ غور کرنے سے کسی قدر کبر کا شبہ ہوتا ہے، جس سے خوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں، استغناء اور کبر میں فرق کرنا دشوار ہے۔ یہ دونوں بہت مشابہ ہیں، کبھی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ جسے ہم استغناء سمجھ رہے ہیں۔ وہ دراصل کبر ہوتا ہے۔ خدا ہی محفوظ رکھے تو انسان محفوظ رہ سکتا ہے، ورنہ ہمارا قول فعل، حال قال سب خطرات میں ہے۔ مجھے تو اب وہ شعر یاد آیا کرتا ہے جو کبھی بچپن میں پڑھا تھا۔

من نہ گویم کہ طاعتم بہ پذیر
قلم عفو برگناہم کش

(صفحہ ۵۴۷)

مدرسوں کے لئے چندہ کی اپیل کے سلسلہ میں موقف

فرمایا، میں تو علماء کا زبان سے چندوں کی اپیل کو پسند نہیں کرتا۔ لوگ بڑی تہمت لگاتے ہیں۔ بالکل یہ سمجھتے ہیں کہ مولویوں نے کھانے کمانے کے لئے مدرسے کھول رکھے ہیں۔ امیروں کے دروازہ پر چندے کے لئے کبھی نہ جانا چاہئے۔ پھر فرمایا، اپنی ذات سے

دین کی جو خدمت ہو، وہ کرنا چاہئے۔ اگر چندہ نہ آئے تو نہ سہی۔ اگر ہمارے قلوب درست ہوجائیں تو سلف صالحین کے طرز پر دین کی خدمت کریں، انہیں بڑے بڑے مکانوں کی ہرگز حاجت نہ تھی، عالم اپنے گھر پر درس دیتا تھا۔ لیکن اس صورت میں یہ رائے نہ دوں گا کہ مدرسے بند کئے جائیں، مدرسوں کا وجود خیر عظیم ہے، یہ بند نہ ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ زمانہ ہی ایسا ہے، مگر اعتدال پر قائم رہنا چاہئے۔ (صفحہ ۵۶۷)

مقاصد کی بجائے غیر ضروری کاموں میں مصروفیت

فرمایا، بحمداللہ یہاں رہ کر یہ تو ضرور حاصل ہوجاتا ہے کہ طریق اور غیر طریق میں تمیز ہوجاتی ہے۔ حق کی راہ پر چلنا یہ فرد کا اپنا فعل ہے، جب راستہ معلوم ہوگا، اس وقت ہی چلا جاسکتا ہے، لیکن آجکل تو یہ حالت ہے کہ کتابیں بھی ختم، مدرس بھی ہوگئے، مگر یہ خبر نہیں، راستہ کیا ہے۔ لوگ غیر ضروری کاموں میں مبتلا ہیں اور مقاصد کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ (صفحہ ۵۶۸)

خاص درجہ کے کام کو مقصود سمجھنا

ایک مدرس سے فرمایا، جتنی خدمت فرد کے اختیار میں ہو، وہ کرنا چاہئے۔ اگر پیسہ بالکل نہ ہو، مدرسین مدرسہ کو چھوڑ کر چلے جائیں تو خود اکیلا اپنے گھر پر طالب علموں کو لیکر بیٹھ جائیں، کیونکہ ایک عالم کو اس سے زیادہ کی قدرت نہیں رہی۔ کسی خاص درجے کے کام کو آخر مقصود کیوں سمجھا جائے۔ کام سے مقصود تو اللہ کی رضا ہے اور وہ غیر اختیاری امور پر منحصر نہیں، پھر فرمایا، یہ کلی قاعدہ ہے، جو عمر بھر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو اختیاری معاملات ہوں، جو فضول نہ ہوں، ان کا تو ارادہ کرنا چاہئے، اور غیر اختیاری کاموں کا ارادہ ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ اگر اس طرح زندگی بسر کی جائے تو فرد کی دین ودنیا دونوں درست ہوجائے گی۔ پریشانی تو ایسے شخص کے پاس پھٹک ہی نہیں سکتی۔ خدا سے دل لگائے رکھنا چاہئے۔ جس سے پریشانی نہ ہوگی، دل بھی اسی کا خدا کی طرف لگ سکتا ہے۔ ورنہ پریشانی کی حالت میں تو آدمی عبادت بھی نہیں کرسکتا، یکسوئی بڑی دولت ہے، مگر پریشانی بھی وہی مضر ہے، جو اپنے اختیار سے لائی جائے اور جس پریشانی میں اپنے اختیار کو دخل نہ ہو، وہ ذرا بھی مضر نہیں۔ بلکہ مفید ہے۔ (صفحہ ۵۶۸)

حیا وغیرت، گناہوں سے تحفظ کا ذریعہ ہے

فرمایا، غیرت ایسی چیز ہے، جس سے آدمی سیکڑوں گناہوں سے از خود محفوظ رہتا ہے۔ غیرت قریب قریب سارے گناہوں کے لئے محافظ ہے۔ بہت سارے ایسے باریک گناہ ہیں، جو عقل کی فہم میں بھی نہیں آسکتے، لیکن جس میں غیرت کا مادہ ہوتا ہے، اس کی طبیعت میں از خود وہ گناہ کھٹک جاتے ہیں، پھر سوچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ تو کھلا ہوا گناہ تھا۔ عقل کہاں تک سوچ سکتی ہے۔ اس لئے تو حضورﷺ نے ایمان کے شعبوں میں سے افضل اور ادنیٰ کا ذکر کرکے حیاء کا خاص طور سے ذکر فرمایا کہ الحیاء شعبة من الایمان حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ دوسرے شعبے بھی تو غیر مذکور تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاء اور غیرت، ایمان کا بہت اہم شعبہ ہے۔ (صفحہ ۵۷۰)

حقوق کی معافی کے حوالے سے اہم نکات

فرمایا، میں مدت سے یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ یا اللہ، میری وجہ سے اپنے کسی بندہ کا مواخذہ نہ کیجئے، کسی نے میرے ساتھ جو برائی کی ہو یا آئندہ کرے، میں نے اسے دل سے معاف کیا۔ اس لئے مخلوق خدا کو میری طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ بلکہ اگر کبھی ضرورت ہو تو میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ جو کچھ چاہے مجھے کہہ سن بھی لے۔ پھر فرمایا، اگر میں معاف بھی نہ کروں اور دوسرے کو عذاب بھی ہوا تو اس سے مجھے کیا نفع حاصل ہوا۔ حضرت خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ آپ کو اس کی نیکیاں جو ملیں گی۔ فرمایا، ایسی قانونی نیکیاں لے کر میرا کیا بھلا ہوسکتا ہے اور اگر معافی کا میرا یہ فعل مقبول ہوگیا تو اس کی بدولت ان شاء اللہ مجھے نیکیاں ملیں گی۔ اللہ میاں کے ساتھ قانونی حساب کتاب کرنے سے کہیں کام چل سکتا ہے؟ کیا انہیں یہ اختیار نہیں ہے کہ ایک شخص کو بلااستحقاق کے نیکیاں دیدے، کیا اللہ کے یہاں نیکیوں کی کمی ہے، یہی خیال کیوں نہ رکھا جائے، پھر فرمایا، میں تو اس لئے سب کے حقوق معاف کردیتا ہوں کہ اگر میرا یہ فعل مقبول ہوتو حق تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ دوسروں سے ان حقوق کو جو میرے ذمہ ہیں، خود ہی معاف کرالیں گے۔ (صفحہ ۵۷۵)

حسن ظن اور سوئے ظن کا مسئلہ۔ اہم تحقیق

فرمایا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ تو روایات سنتے ہی نہ تھے، شروع ہی میں راوی کو روک دیتے تھے اور حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا عجیب معمول تھا کہ سب سن لیتے تھے، دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت پر بڑا اثر ہو رہا ہے۔ لیکن جب بیان کرنے والا خاموش ہو جاتا تو حضرت بے تکلف فرمادیتے کہ سب غلط ہے، وہ شخص ایسا نہیں، اس کہنے کا یہ مطلب تھا کہ چاہے واقع میں بات صحیح ہو، مگر چونکہ شرعی شہادت موجود نہیں، اس لئے اس کے ساتھ کذب کا سا معاملہ کیا جائے، یہی محمل ہے اس آیت کا **فاذلم یاتوا بالشھداء فاؤلائک عنداللہ ھم الکاذبون عنداللہ۔** سے یہاں مراد ہے، اللہ کے دین میں اللہ کے قانون میں یعنی شریعت کے قانون کی رو سے تم جھوٹے ہو۔ تمہارا یہ کہنا سب غلط ہے، بس اس تقریر کے بعد یہ شبہ باقی نہ رہا کہ محتمل الصدق کو جزماً کیسے جھوٹا فرمادیتے تھے، اس سے یہ مسئلہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حسن ظن کے لئے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سوء ظن کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ (صفحہ ۵۸۱)

دوسروں کے ساتھ رعایت

فرمایا، اگر کوئی شخص اپنے معاملہ میں مباح شق کو اختیار کرے تو میں اس کے ساتھ موافقت کر لیتا ہوں، اس میں آدمی بہت ہلکا رہتا ہے۔ بحمداللہ، کسی شق کو ترجیح دیکر میں کسی پر حکومت نہیں کرتا، میری کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوتی، جس سے دوسرے کو یہ شبہ بھی ہو کہ یہ اختیار وحکومت کی راہ سے کہہ رہا ہے اور میں اس کا خیال اس لئے رکھتا ہوں کہ نہ معلوم دوسرے فرد کا دل کام کرنے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، اس لئے میں نہ کسی بات کے کرنے کا حکم دیتا ہوں اور نہ کسی بات سے منع کرتا ہوں۔ مولوی صاحب (جنہوں نے مدرسہ کی ذمہ داریوں سے معذرت کی تھی) کے جانے سے خیال ہوا کہ جو کام ان کے سپرد تھا، اب اس کام کو کون کرے گا، میں نے قوت سے اس خیال کی مخالفت کی اور یہ سمجھ لیا کہ **ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا وما یمسک فلامرسل لہ من بعدہ وھو العزیز الحکیم۔** ہوالعزیز میں بتادیا کہ وہ بڑے قادر ہیں، جو کام بند ہو، اس کو جاری کر سکتے ہیں اور جاری کام کو بند کر سکتے ہیں اور اگر اس بند ہونے سے یہی وسوسہ ہو کہ اس

سے تو دین کا نقصان ہوگا تو الحکیم میں فرمادیا کہ ہم حکیم بھی ہیں، اگر بند ہی کر دیں تو اس میں بھی حکمت ہوگی۔ (صفحہ ۵۸۴)

فرد کے لئے خوش فہمی کا راز

فرمایا: حدیث میں ہے **من فقه الرجل يصلح معيشته وليس من حب الدنيا طلب ما يصلحك** آدمی کی خوش فہمی کی بات ہے کہ وہ اپنے معاش کا مناسب انتظام کرے اور جو چیز فرد کی مصلحت کی ہو، اسے طلب کرنا، یہ حب دنیا میں داخل نہیں۔ فرمایا، اس حدیث سے ان لوگوں کا جہل ظاہر ہوگیا، جو اہل اللہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ درویش ہو کر تجارت کرتے ہیں یا جائیداد خریدتے ہیں یا ملازمت کرتے ہیں۔ (صفحہ ۵۷۷)

رات کے قیام کی نیت کا ثواب

فرمایا، حدیث میں ہے: **من اتى فراشه وهو ينوى ان يقوم يصلي من الليل فغلبته عينه حتى اصبح كتب له مانوى وكان نومه صدقته عليه من ربه** یعنی جو شخص (سونے کے لئے) اپنے بستر پر آنے کے وقت یہ نیت رکھے کہ بیدار ہو کر رات کی نماز پڑھوں گا، پھر صبح تک اس کی آنکھ لگ گئی تو اس شخص کے لئے اس کی نیت کے مطابق عمل (یعنی صلوٰۃ اللیل کا) اجر لکھا جائے گا۔ اور اس کا وہ سونا، اس کے رب کی طرف سے انعام ہوگا، فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی معذوری کی وجہ سے رات کے اٹھنے میں ناغہ پر زیادہ رنج نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اصل مقصود یعنی ثواب سے محرومی نہیں ہوئی اور محققین کا مذاق یہی ہے۔ اور عام سالکین اس سے حد سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں، جو ظاہراً علامت ہے دین سے محبت کی، جو نافع ہے، لیکن یہ پریشانی اپنے اثر کے اعتبار سے مضر ہوتی ہے کہ قلب کمزور ہوتا ہے، جس سے اعمال میں تعطل آ جاتا ہے۔ (صفحہ ۵۸۸)

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا قوی ہوتا ہے

فرمایا، حدیث میں ہے **من اتقى الله عاش قويا وسارا منافی بلاده** یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، وہ قوی رہ کر زندہ رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ملک میں بے فکری

سے چلتا پھرتا ہے، ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ اپنے دشمن کے علاقہ میں بے فکر پھرتا ہے۔ فرمایا کہ جس کا دل چاہے، مشاہدہ کرلے کہ اہل اللہ پر کسی کی ہیبت نہیں ہوتی، جس سے وہ پریشان ہوں، جب کہ ان کی ہیبت سب پر ہوتی ہے۔ (صفحہ ۵۸۸)

مشیخت کے منصب پر نا اہل کا فائز ہوجانا

الحدیث من تطبب ولم یعلم منه طب فهو ضامن یعنی جو شخص کسی کا علاج کرے اور اسے طب کا علم نہ ہوتو اس پر ضمان لازم ہے، اس سے کوئی غلطی ہوجائے تو آخرت میں معصیت کے سبب حساب ہوگا، فرمایا، یہی حکم اس شخص کا ہے، جو طب روحانی نہ جانتا ہو اور پھر مشیخت کے منصب کا مدعی بن کر طالبین کی رہبری کرنے لگے، بلکہ یہ جرم زیادہ سخت ہے، کیونکہ طبیب جاہل صرف جان بدن میں تصرف کرتا ہے، جب کہ جاہل پیر ایمان اور دین میں تصرف کرتا ہے فاین هذا من ذالک۔ (صفحہ ۵۸۹)

فرمایا، حدیث میں ہے من امر بمعروف فلیکن امره بمعروف یعنی جو شخص کسی فرد کو اچھی بات کی نصیحت کرے تو اسے چاہئے کہ اچھے طریقے سے نصیحت کرے (یعنی نرمی وخیر خواہی کے ساتھ) (صفحہ ۵۸۹)

عبادت کی وجہ سے نکاح ترک کرنا گناہ ہے

فرمایا، حدیث میں ہے من تبتل فلیس منا یعنی جو شخص نکاح نہ کرے (باوجود تقاضائے نفس وقدرت کے) تو وہ ہمارے طریقہ سے خارج ہے (کیونکہ یہ نصاریٰ کا طریقہ ہے کہ وہ نکاح کو وصول الی اللہ میں رکاوٹ سمجھ کر اس کے ترک کو عبادت سمجھتے ہیں) پھر فرمایا، اس سے ان صوفیوں کی غلطی ثابت ہوتی ہے، جو عبادت کی وجہ سے بے نکاح رہتے ہیں، باقی اگر کسی کو بدنی یا مالی یا دینی عذر ہوتو وہ مستثنیٰ ہے۔ بدنی ومالی عذر تو ظاہر ہے، دینی عذر یہ ہے کہ نکاح کے بعد جسم کے ضعف کے سبب فرد دین کی حفاظت کا کام نہ کرسکے۔ (صفحہ ۸۸-۵۸۹)

دنیاوی کاموں سے وحشت کا ہونا

فرمایا، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے دنیاوی کاموں کے مصالح سے مناسبت ہی نہیں۔ قلب کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک اللہ ورسول اللہ ﷺ کا ذکر رہتا ہے، طبیعت

خوش رہتی ہے۔ اور جہاں دنیوی قصے شروع ہوئے، وحشت شروع ہوجاتی ہے۔ (صفحہ ۵۸۹)

بعض اہم اعتقادی گمراہیوں کی نشاندہی

فرمایا، قبر پرستوں میں جو لوگ اہل قبور یا تعزیہ کی نسبت تاثیر غیبی کا اعتقاد رکھتے ہیں، وہ مشرک ہیں اور جو محض ظاہری تعظیم کے طور پر ان کو سجدہ وغیرہ کرتے ہیں اور ان کی تاثیر کا اعتقاد نہیں رکھتے، وہ عملی شرک کی وجہ سے فاسق ہیں۔ البتہ وہ کافر نہیں۔ تاثیر وعدم تاثیر غیبی کے اعتقاد کا معیار اور فرق یہ ہے کہ بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مخلوق کو جو اس کی مقرب ہے، اسے نفع ونقصان کی کچھ مستقل قدرت اس طرح سے عطا فرمادی ہے کہ وہ اپنے معتقد ومخالف کو نفع وضرر پہنچا سکتے ہیں اور اس میں مشیت جزیہ حق پر موقوف نہیں، اگر وہ روکنا چاہے تو پھر اللہ کی قدرت ہی غالب ہے، جیسے بادشاہ اپنے نائب حکام کو خاص اختیارات اس طرح دے دیتے ہیں کہ ان اختیارات کا عملا استعمال اس وقت سلطان اعظم کی منظوری پر منحصر نہیں ہوتا، اگر بادشاہ ان کے اختیارات وحکم کو رد کرنا چاہے تو سلطان ہی کا حکم غالب رہے گا، سو یہ عقیدہ تو اعتقاد تاثیر ہے (اور مشرکین عرب کا اپنے باطل الاہوں کے بارے میں یہی اعتقاد تھا) اور بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ کسی مخلوق میں ایسی مستقل قدرت تو موجود نہیں، مگر بعض مخلوق کو قرب وقبولیت کا ایسا درجہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے متوسلین کے لئے سفارش کرتے ہیں، پھر اس سفارش کے بعد بھی ان کو نفع وضرر کا اختیار نہیں دیا جاتا، بلکہ وہ نفع وضرر حق تعالیٰ ہی پہنچاتے ہیں، لیکن ان کی سفارش کی قبولیت کے خلاف کبھی نہیں ہوتا اور اس سفارش کے تحصیل کے لئے وہ اس سے بلاواسطہ یا بواسطہ عبادت کا معاملہ کرتے ہیں، اس طرح کا تصور اعتقاد تاثیر نہیں۔ لیکن شرعی دلیل کے بغیر بلکہ شرعی دلیل کے خلاف ایسا عقیدہ رکھنا اعتقادی گناہ ہے اور عبادت کے مشابہ معاملہ کرنا، یہ عملی گناہ ہے اور اسی مشابہت کے سبب شرعی اصطلاح میں اسے مشرک کہا جائے گا۔ (صفحہ ۵۹۸)

قتال- جزیے اور ارتداد کی سزا پر لطیف بحث

فرمایا، قتال میں (۱) عورت اپاہج، بوڑھے اور اندھے کا قتل باوجود اس بات کے کہ وہ کفر پر قائم ہیں، جائز نہیں، اگر قتال اسلام کے جبرا قبولیت کے لئے ہوتا تو انہیں ان کی

حالت پر کیسے چھوڑا جاتا (۲) جزیہ واجب کیا گیا، اگر قتال، کفر کی جزاء ہوتی تو کفر پر قائم رہنے کے باوجود جزیہ کیسے واجب ہوتا (۳) پھر جزیہ بھی سب کفار پر لاگو نہیں، چنانچہ عورت پر جزیہ نہیں، اپاہج اور نابینا پر نہیں، راہبوں پر نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قتال کی طرح جزیہ بھی کفر کا بدلہ نہیں، ورنہ جزیہ سب کفار کے لئے ہوتا، جب جزیہ جو قتال سے ہلکا ہے، وہ کفر کا بدلہ نہیں تو قتال جو زیادہ شدید ہے، وہ کفر کی جزاء کیسے ہوگی (۴) اگر کسی وقت مسلمانوں کی مصلحت شامل ہو تو کفار سے مال کی شرط کے بغیر بھی صلح کرنا جائز ہے (۵) اگر وقت کا تقاضا ہو تو خود مال دے کر بھی صلح جائز ہے۔ ان آخری دو دفعات سے معلوم ہوا کہ جزیہ جس طرح کفر کی جزاء نہیں، جیسا دفعہ نمبر۳ سے معلوم ہوا، اسی طرح وہ مقصود بالذات بھی نہیں، ورنہ مال کے بغیر صلح یا یہ بذل مال جائز نہ ہوتی۔ پس قتال یا جزیہ نہ تو کفر کی جزاء ہے اور نہ مقصود بالذات۔

حکمائے امت کی ان تصریحات کے مطابق قتال کا مقصد دین کی عظمت کو ہونے والے نقصان اور فساد کو روکنا ہے اور جزیہ کی غرض یہ ہے کہ جب ہم غیر مسلموں کی ہر طرح سے حفاظت کرتے ہیں اور اس حفاظت میں اپنی جان ومال صرف کرتے ہیں تو اس کا صلہ یہ ہے کہ وہ بھی حاجت کے وقت ہمارے ساتھ جانی مدد کرتے، مگر ہم نے انہیں اس سے قانونی طور بھی سبکدوش کردیا ہے، اس لئے کم از کم ان کو کچھ مختصر ٹیکس ہی ادا کرنا چاہئے۔ تاکہ یہ مالی مدد اس جانی مدد کا کسی قدر بدل ہوجائے۔ قتال اور جزیہ کے یہ ہیں اغراض۔ یہی وجہ ہے کہ جب دین کے مخالفوں سے فساد کا احتمال نہیں رہتا تو قتال کی ضرورت باقی نہیں رہتی، جس کی تحقیق کی ایک صورت جزیہ کا قبول کرنا ہے دوسری صورت صلح ہے۔ چنانچہ جو لوگ جان کے ساتھ مدد پر جو کہ عقلا ان پر واجب تھی، قادر نہیں، ان سے مالی مدد بھی معاف کردی گئی، رہا مرتد کا قتل، اسلام کی طرف واپس نہ ہونے کی حالت میں، سو اس کی حقیقت جبرا اسلام قبول کرانا نہیں ہے، بلکہ مسلمان ہونے کے بعد انہیں اسلام پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا ہے۔ اس کی بنیاد بھی وہی فساد کو دور کرنا ہے، جو قتال کی بنیاد ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ اسلام کی قبولیت سے پہلے کے کفر کا شر اور ضرر ہلکا ہے، اس لئے اس کا تدارک جزیے یا صلح سے جائز رکھا گیا اور اسلام کے بعد کا کفر یعنی ارتداد کا شر اور ضرر زیادہ سخت ہے، ایسا شخص طبعا بھی زیادہ مخالف وجنگ جو ہوتا ہے اور دوسرے اس کی اس حالت کو دیکھ کر کمزور لوگ حق سے تذبذب وشکوک میں بھی مبتلا

ہوجاتے ہیں، نیز اس میں اسلام کی توہین کا عنصر بھی شامل ہے، اس لئے اس کا تدارک قتل تجویز کیا گیا اور مرتدہ (یعنی عورت) چونکہ عادۃ جنگ جو نہیں ہوتی، صرف تذبذب وتوہین کے نقصان کو حبس دائم سے دفع کردیا گیا کہ سزا میں فطرۃ تنبیہ کی خاصیت ہے۔ (صفحہ ۶۰۰)

امارت اسلامی کے قیام کے سلسلہ میں تصریحات

ایک صاحب نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی غیر منظم حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ امارت الاسلام کی کوئی صورت نکالی جائے تو کیا ہمیں کل ہندوستان کے لئے یا کسی خاص علاقہ کے لئے اپنا امیر مقرر کرنے کا حق (۱) حاصل ہے یا نہیں (۲) اگر حق حاصل ہے تو اس کی کیا شرائط ہیں (۳) اور آپ کی رائے عالی میں اس کے حصول کے لئے کیا ذرائع اور صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ جواب نمبروار حسب ذیل فرمایا (۱) حق حاصل ہے، بشرطیکہ قدرت حاصل ہو اور مشاہدہ ہے کہ موجودہ حالات میں امارت کے نظام کے ارادہ پر تو قدرت ہے اور امارت کے عملی نظام پر قدرت حاصل نہیں (۲) دینداری اور عقل (۳) یہ شرعی نوعیت کا مسئلہ نہیں ہے، جس کا جواب اہل علم سے لیا جائے، بلکہ یہ تدبیر کا سوال ہے، اس کا جواب اہل تجربہ سے لینا چاہئے۔ (صفحہ ۶۰۹)

گستاخی رسول ﷺ کے سلسلہ میں وقتی حالات کے لئے موقف

ایک مقام پر ایک گستاخ کافر نے حضور اقدس ﷺ کی شان کے خلاف گستاخانہ حالات شائع کئے تھے، مسلمانوں کے مواخذہ پر اس نے علماء کی ایک باقاعدہ جمعیت سے معافی چاہی اور آئندہ کے لئے احتیاط اور فی الحال اپنی اس غلطی و درخواست معافی کا اخبارات میں اعلان دینے کا وعدہ کیا، اکثر مسلمانوں کی رائے ان کی معافی کی اس درخواست کو منظور کرلینے کی ہوگئی، بعض نے اختلاف کیا اور موجودہ حکومت میں استغاثہ دائر کرنے کی رائے دی اور استغاثہ کے ناکام ہونے کے احتمال پر بھی استغاثہ ہی کو ترجیح دی اور دلیل یہ بیان کی کہ یہ اللہ کا حق ہے، اس کی معافی کا حق صرف سلطان اسلام کو حاصل ہے، اس کے متعلق سوال آیا تھا، اس کا جواب حسب ذیل لکھا گیا۔

صاحب شبہ نے معافی کی جو حقیقت سمجھی، اس کے اعتبار سے معافی کے بعد

ناگواری کا نہ رہنا ہے۔ مذکورہ سوال میں معافی کی صرف صورت ہے، اسی لئے بعض حضرات کو شبہ ہوا ہے کہ حق تعالیٰ کے معاف کرنے کا، کسی کو حق حاصل نہیں، مگر یہ واقع میں معافی نہیں، بلکہ صلح ہے اور صلح میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں اور صلح جس طرح بلا شرط ہوسکتی ہے، اسی طرح شرط پر بھی ہوسکتی ہے، جیسے یہاں یہ شرط مقرر کی جاتی ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے، البتہ صلح میں شرعاً یہ قید ہے کہ مسلمانوں کے حق میں وہ مصلحت ہو اور یہاں مصلحت ہونا ظاہر ہے کہ فی الحال اسلام کی سربلندی اور کفر کی ذلت ہے اور مقصود ایک قبیح کفرِ منکر کی روک تھام ہے، خود معاہدہ میں بھی ہے، امید ہے کہ اس طرح سے دور دوسرے لوگ بھی کہ اس منکر کا نتیجہ دیکھنے سے عبرت حاصل کریں گے اور بعض مسلمانوں کی رواداری سے متاثر ہوں گے، حکومت سے استغاثہ میں اس کی توقعات کا نہ صرف گمان نہیں، بلکہ یہ توقعات مشکوک ہیں، چنانچہ موجودہ فضا اس کی شاہد ہے، پھر اگر خدانخواستہ استغاثہ میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی، ان کی روک تھام پر مسلمانوں کو کافی قدرت حاصل نہیں، چنانچہ پھر اس طرح کی جرأت ہمیشہ کے لئے بڑھ جائے گی، بلکہ ترقی کرکے کہا جاتا ہے کہ اگر کامیابی بھی حاصل ہوگئی تو ظاہر ہے کہ سزائے موت کا تو احتمال بھی نہیں، صرف قید یا جرمانہ کی سزا ہوسکتی ہے، سو بہت سے مفسد ایسے ہیں، جو قید وجرمانہ کی پرواہ بھی نہیں کرتے، اس سے ان کو ایک نظیر ہاتھ آجائے گی، اگرچہ اس صلح کے بعد بھی ایسے واقعات کا امکان موجود ہے، مگر اس سے جو شکوک، شدت کی انتہا اور گمان ضرور قابل نظر وقابل عمل ہے۔ رہا یہ شبہ کہ معافی کا حق صرف سلطان اسلام کو حاصل ہے، عام مسلمین کو حاصل نہیں، اس شبہ میں جو دلیل بیان کی گئی ہے کہ یہ اللہ کا حق ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سلطان کو بھی یہ حق حاصل نہیں، کیونکہ سلطان، حقوق اللہ کو معاف نہیں کرسکتا، باقی اگر اس دلیل سے قطع نظر کرکے اور اس معافی کو صلح نامہ قرار دے کر یا معافی کی تفسیر دنیا میں انتقام نہ لینا قرار دیکر یہ حکم کیا جائے تو اول تو اس حکم کے لئے ایسی دلیل کی حاجت ہے، جو سلطان کے ساتھ خاص ہو، سلطان اور عام مسلمین میں مشترک نہ ہو، دوسرے خود شریعت نے ضرورت کے وقت بہت سے احکام میں عام مسلمین کو سلطان کے قائم مقام ٹھہرایا ہے، جیسے امام وخطیب جمعہ کا تقرر اور وقف کے متولی کا تقرر وغیرہ، زیر نظر معاملہ مذکورہ احکام سے زیادہ مہتم بالشان ہے۔ لفقدان السلطان المسلم واللہ اعلم (صفحہ ۶۱۱)

رسموں کو چھوڑنے کی صورت

فرمایا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب مل کر رسمیں چھوڑیں تو چھوٹ سکتی ہیں، یہ بھی ایک طرح کا شیطانی دعویٰ ہے، تم تنہا ہی سب رسمیں ایک دم چھوڑو، برادری کا انتظار نہ کرو، اس لئے کہ اس طرح تو رسمیں قیامت تک بھی نہیں چھوٹیں گی، کیونکہ برادری میں مختلف مزاج اور مختلف خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک بات پر سب کا اجتماع نہیں ہوسکتا، خصوصاً نیکی کے کاموں پر۔ گناہوں کی بات پر تو اجتماع ہوجاتا ہے، جیسا کہ آجکل موجود ہے کہ ہر عاقل ادنیٰ واعلیٰ ان رسموں کے بارے میں متفق ہیں، جن سے بری ہونے کے وہ خود بھی قائل ہیں۔ (صفحہ ۳۱۳)

موجودہ دور میں مال کی اہمیت

فرمایا، جو شخص مال کو ضرورت کے درجہ میں رکھتا ہے، وہ محبِ مال نہیں ہے، فرد محبِ مال اس وقت کہلاتا ہے، جب مال کے حصول میں حرام وحلال کی تمیز نہ کرے یا خرچ کرنے میں واجب اور ضرورت کے مواقع پر تنگی کرے۔ مال مذکورہ شرائط کے تحت بری چیز نہیں ہے، لیکن ان شرائط کا پایا جانا ذرا کم ہے، سو میں سے ایک دو آدمی بھی ان کے پابند مشکل سے ملتے ہیں، اس واسطے حب مال کی روک تھام کے لئے اہل اللہ نے مال سے اجتناب کیا ہے اور اس کے خلاف موقف اختیار کیا ہے، ورنہ مال میں صرف مفاسد ہی نہیں، بلکہ اس میں کچھ فوائد بھی ہیں، مثلاً مال ضرورت کے مطابق پاس ہوتا ہے تو قلب کو اطمینان رہتا ہے، اس سے دنیا کے کام بھی ٹھیک ہوسکتے ہیں اور دین کے کام بھی۔ فراغ عجیب چیز ہے، جب یہ فراغ قلب جاتا رہتا ہے تو فرد سے کوئی کام نہیں ہوسکتا، جس شخص کو پورا توکل حاصل نہ ہو، اس کے لئے مال ہی کشادگی کا ذریعہ ہے، اسے خصوصیت کے کے ساتھ مال ہرگز ضائع نہ کرنا چاہئے۔ یعنی بے موقع خرچ نہ کرنا چاہئے۔ آجکل مضبوط دل کے لوگ کم ہیں اور یہ حالت ہے کہ ذرا سی تنگی پیش آئے تو بھٹکتے پھرتے ہیں، حتیٰ کہ نعوذباللہ بعض لوگ مرتد ہوجاتے ہیں۔ مال نہ رکھنا اور فقر وزہد اختیار کرنا، یہ مستحب کا درجہ ہے، اس کے لئے ایمان کھونا، کیسی سخت بات ہے، اس لئے اس دور میں عام لوگوں کو زہد کی تعلیم دینا صحیح نہیں۔ ہاں، اس تعلیم کی ضرورت ہے کہ مال حرام ذرائع سے نہ کماؤ، زہد کا یہ درجہ ہر حالت میں ضروری ہے۔ (صفحہ ۶۱۴)

باطنی اور ظاہری گناہوں سے بچنے کی صورتیں

فرمایا، کثرتِ گفتگو کا سبب بڑے پن کی بیماری ہے۔ اور کثرت سوال یعنی مانگنے کی جڑ بے حیائی ہے۔ اور کثرت سوال (یعنی زیادہ پوچھنا) یعنی علماء کو لایعنی سوالات سے دق کرنا، اس کی بنیاد عمل کا ارادہ نہ ہونا ہے۔ غرض یہ کہ زیادہ گفتگو وہی شخص کرتا ہے، جسے کام کرنا نہیں ہوتا۔ اور مال کے اسراف کی بنیاد شکر کی کمی ہے تو یہ چار چیزیں ہیں، جو ظاہری عمل کے مرتبہ میں ہوئیں، یعنی کثرت گفتگو، کثرت سوال، مال کا ضیاع، ان ظاہری اعمال کا مجموعی علاج یہ ہے کہ ہمت کر کے ان سب کو ترک کیا جائے اور چار باطنی بیماریاں جو ان چار ظاہری اعمال کی بنیاد ہیں یعنی بڑا پن، بے حیائی، عمل کا ارادہ نہ ہونا، اور شکر کی کمی، ان سب کا مجموعی علاج ذکر اللہ ہے۔ ذکر سے میری مراد زبانی ذکر نہیں، بلکہ قلبی ذکر ہے، جو مرکز ہے، ذکر لسانی کا، غرض یہ کہ ذکر کی اتنی کثرت کی جائے کہ وہ قلب میں رچ بس جائے، جب ذکر قلب میں رچ جاتا ہے تو دل گناہوں سے اچاٹ ہوجاتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ ہر کام کا انجام سوچا جائے، اس سے بھی قلب کی بہت اصلاح ہوتی ہے۔ اگر اس کا پورا انتظام کیا جائے تو نہ تو قیل وقال باقی رہ سکتا ہے، کیونکہ خیال ہوگا کہ کم ازکم اس کا نتیجہ لایعنی تو ضرور ہے اور نہ کثرت سوال باقی رہے گا اور اس کا انجام خیال میں آئے گا کہ ذلت ہے، جو طبعاً وشرعاً دونوں طرح مذموم ہے اور بیجا سوالات کا انجام یہ خیال میں آئے گا کہ اہل اللہ کو تکلیف دینا اور عمل کا ارادہ نہ کرنا، یہ بے ہودہ بات ہے یا کم سے کم لایعنی فعل تو ضرور ہے اور انجام سوچنے سے مال کا اسراف بھی نہ رہے گا، کیونکہ اس میں دنیا ودین دونوں کی خرابیاں پیش نظر ہوجائینگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ فکر کی ضرورت ہے اور اس کے لئے عمل وذکر دائم لازم ہے۔ (صفحہ ۶۱۴)

ذکر قلبی کی حقیقت

فرمایا، قلب سے اللہ تعالیٰ کی طرف باختیار توجہ کرنا، یہ ذکر قلبی ہے، دل کی حرکت کو ذکر قلبی نہیں کہتے اور قلب کا یہ اختیاری ذکر عادۃً دائم نہیں ہوتا اور جو بے اختیاری ہو، اگرچہ دائم ہو، وہ حال ہے، عمل نہیں اور اس سے ترقی لازم نہیں، وفی ھذا قیل۔

دربزم عیش یکدو قدح نوش کن برو
یعنی طمع مدار وصال دوام را

(صفحہ ۶۱۵)

تفکرات کے ہجوم سے نجات کی صورت

ایک طالب ان گناہوں کے بارہ میں جو خیال سے متعلق ہیں، سخت پریشانی میں رہتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے آپ کو قریب قریب مردود ہی سمجھ لیا تھا اور خراب خیالات کے ہجوم نے ان کی زندگی تلخ کردی تھی اور وہ اپنی اصلاح سے قریب قریب مایوس ہوچکے تھے۔

اس کے علاج کے سلسلہ میں فرمایا: سہل علاج یہ ہے کہ جب خیالات کا ہجوم ہو تو اپنے ارادہ واختیار سے فوراً کسی نیک خیال کی طرف متوجہ ہوا جائے اور متوجہ رہا جائے۔ اس کے بعد بھی اگر خیالات باقی رہیں یا نئے خیالات آئیں تو چونکہ ان کا رہنا یا آنا، یہ غیر اختیاری چیز ہے، کیونکہ مختلف قسم کے دو خیال ایک وقت میں جمع نہیں ہوسکتے، پس اشتباہ رفع ہوگیا، اور اگر اختیار سے اچھے خیال کی طرف توجہ کرنے میں غفلت ہوجائے اور جب تنبہ ہو تو استغفار سے غفلت کا تدارک کیا جائے، پھر اسی تدبیر پر استحضار سے کام لیا جائے۔ یہ طریقہ اتنا آسان ہے کہ اس سے سہل کوئی چیز نہیں، پس اس کو دستور العمل بنا کر بے فکر ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۶۱۷)

راہ سلوک میں سالک کو پیش آنے والے وسوسوں پر عمدہ بحث

فرمایا، ایک صاحب نے خط میں یہ شکایت لکھی ہے کہ جو قلبی یکسوئی حضرت والا کی خدمت بابرکت سے لیکر آیا تھا۔ وہ یہاں آکر رفتہ رفتہ رخصت ہوگئی۔ فرمایا، میں نے جواب میں لکھا ہے کہ اگر یہ کیفیت رخصت ہوگئی تو نقصان کیا ہوا۔ کیونکہ کیفیت مقصود ہی نہیں۔ حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نقصان تو ہوا ہے، فرمایا، کیا ضرر ہوا۔ عرض کیا گیا کہ ایک چیز جو نصیب ہوئی تھی، وہ جاتی رہی۔ فرمایا، اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ چیز اس کے لئے نافع ہی تھی، ممکن ہے کہ وہ اس کے لئے نقصاندہ ہوتی۔ حق تعالیٰ ہی مفید اور مضر کو خوب جانتے ہیں اور یہ بھی کہ اس بندہ کے لئے کس وقت کیا چیز مناسب ہے۔ لوگ تو کیفیات اور لذت کے طالب ہیں۔ ہے تو فحش بات، مگر میں تو اس لذت کی طلب پر کہا کرتا ہوں کہ اگر مزے ہی کی خواہش ہے تو مزہ تو مذی میں ہے۔ بیوی کو بغل میں لیکر بیٹھ جاؤ، چومو چاٹو۔ مذی نکلے گی، مزہ آئے گا۔ اگر یہ کہا جائے

باطنی اور ظاہری گناہوں سے بچنے کی صورتیں

فرمایا، کثرتِ گفتگو کا سبب بڑے پن کی بیماری ہے۔ اور کثرت سوال یعنی مانگنے کی جڑ بے حیائی ہے۔ اور کثرت سوال (یعنی زیادہ پوچھنا) یعنی علماء کو لایعنی سوالات سے دق کرنا، اس کی بنیاد عمل کا ارادہ نہ ہونا ہے۔ غرض یہ کہ زیادہ گفتگو وہی شخص کرتا ہے، جسے کام کرنا نہیں ہوتا۔ اور مال کے اسراف کی بنیاد شکر کی کمی ہے تو یہ چار چیزیں ہیں، جو ظاہری عمل کے مرتبہ میں ہوئیں، یعنی کثرت گفتگو، کثرت سوال، مال کا ضیاء، ان ظاہری اعمال کا مجموعی علاج یہ ہے کہ ہمت کر کے ان سب کو ترک کیا جائے اور چار باطنی بیماریاں جو ان چار ظاہری اعمال کی بنیاد ہیں یعنی بڑا پن، بے حیائی، عمل کا ارادہ نہ ہونا، اور شکر کی کمی، ان سب کا مجموعی علاج ذکر اللہ ہے۔ ذکر سے میری مراد زبانی ذکر نہیں، بلکہ قلبی ذکر ہے، جو مرکز ہے، ذکر لسانی کا، غرض یہ کہ ذکر کی اتنی کثرت کی جائے کہ وہ قلب میں رچ بس جائے، جب ذکر قلب میں رچ جاتا ہے تو دل گناہوں سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ ہر کام کا انجام سوچا جائے، اس سے بھی قلب کی بہت اصلاح ہوتی ہے۔ اگر اس کا پورا انتظام کیا جائے تو نہ تو قیل وقال باقی رہ سکتا ہے، کیونکہ خیال ہوگا کہ کم از کم اس کا نتیجہ لایعنی تو ضرور ہے اور نہ کثرت سوال باقی رہے گا اور اس کا انجام خیال میں آئے گا کہ ذلت ہے، جو طبعاً وشرعاً دونوں طرح مذموم ہے اور بیجا سوالات کا انجام یہ خیال میں آئے گا کہ اہل اللہ کو تکلیف دینا اور عمل کا ارادہ نہ کرنا، یہ بے ہودہ بات ہے یا کم سے کم لایعنی فعل تو ضرور ہے اور انجام سوچنے سے مال کا اسراف بھی نہ رہے گا، کیونکہ اس میں دنیا ودین دونوں کی خرابیاں پیش نظر ہو جائینگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ فکر کی ضرورت ہے اور اس کے لئے عمل وذکر دائم لازم ہے۔ (صفحہ ۶۱۴)

ذکر قلبی کی حقیقت

فرمایا، قلب سے اللہ تعالیٰ کی طرف با اختیار توجہ کرنا، یہ ذکر قلبی ہے، دل کی حرکت کو ذکر قلبی نہیں کہتے اور قلب کا یہ اختیاری ذکر عادۃً دائم نہیں ہوتا اور جو بے اختیاری ہو، اگرچہ دائم ہو، وہ حال ہے، عمل نہیں اور اس سے ترقی لازم نہیں، وفی ھذا قیل۔

در بزم عیش یکدو قدح نوش کن برو
یعنی طمع مدار وصال دوام را

(صفحہ ۶۱۵)

تفکرات کے ہجوم سے نجات کی صورت

ایک طالب ان گناہوں کے بارہ میں جو خیال سے متعلق ہیں، سخت پریشانی میں رہتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے آپ کو قریب قریب مردود ہی سمجھ لیا تھا اور خراب خیالات کے ہجوم نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی اور وہ اپنی اصلاح سے قریب قریب مایوس ہو چکے تھے۔

اس کے علاج کے سلسلہ میں فرمایا: سہل علاج یہ ہے کہ جب خیالات کا ہجوم ہو تو اپنے ارادہ واختیار سے فوراً کسی نیک خیال کی طرف متوجہ ہوا جائے اور متوجہ رہا جائے۔ اس کے بعد بھی اگر خیالات باقی رہیں یا نئے خیالات آئیں تو چونکہ ان کا رہنا یا آنا، یہ غیر اختیاری چیز ہے، کیونکہ مختلف قسم کے دو خیال ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتے، پس اشتباہ رفع ہو گیا، اور اگر اختیار سے اچھے خیال کی طرف توجہ کرنے میں غفلت ہو جائے اور جب تنبہ ہو تو استغفار سے غفلت کا تدارک کیا جائے، پھر اسی تدبیر پر استحضار سے کام لیا جائے۔ یہ طریقہ اتنا آسان ہے کہ اس سے سہل کوئی چیز نہیں، پس اس کو دستور العمل بنا کر بے فکر ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۶۱۷)

راہ سلوک میں سالک کو پیش آنے والے وسوسوں پر عمدہ بحث

فرمایا، ایک صاحب نے خط میں یہ شکایت لکھی ہے کہ جو قلبی یکسوئی حضرت والا کی خدمت بابرکت سے لیکر آیا تھا۔ وہ یہاں آ کر رفتہ رفتہ رخصت ہو گئی۔ فرمایا، میں نے جواب میں لکھا ہے کہ اگر یہ کیفیت رخصت ہو گئی تو نقصان کیا ہوا۔ کیونکہ کیفیت مقصود ہی نہیں۔ حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نقصان تو ہوا ہے، فرمایا، کیا ضرر ہوا۔ عرض کیا گیا کہ ایک چیز جو نصیب ہوئی تھی، وہ جاتی رہی۔ فرمایا، اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ چیز اس کے لئے نافع ہی تھی، ممکن ہے کہ وہ اس کے لئے نقصان دہ ہوتی۔ حق تعالیٰ ہی مفید اور مضر کو خوب جانتے ہیں اور یہ بھی کہ اس بندہ کے لئے کس وقت کیا چیز مناسب ہے۔ لوگ تو کیفیات اور لذت کے طالب ہیں۔ ہے تو فحش بات، مگر میں تو اس لذت کی طلب پر کہا کرتا ہوں کہ اگر مزے ہی کی خواہش ہے تو مزہ تو مذی میں ہے۔ بیوی کو بغل میں لیکر بیٹھ جاؤ، چومو چاٹو۔ مذی نکلے گی، مزہ آئے گا۔ اگر یہ کہا جائے

کہ مزہ سے اعمال میں سہولت پیدا ہوجاتی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ آخر سہولت کی طلب ہی کیوں ہے۔ انسان دنیا میں سہولتوں کے لئے بیجھا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں لقد خلقنا الانسان فی کبد ہم نے انسان کو مشقت کی حالت میں پیدا کیا اور یہ سہولت کا طالب ہے۔ الغرض اس غم میں ہی نہ پڑنا چاہیے۔ کیونکہ اس غم میں پڑنا کہ وہ حالت نہیں رہی۔ فلاں کیفیت جاتی رہی، اس سے قلب برباد ہوتا ہے۔ آخر یہ توجہ (خالق کی بجائے) مخلوق کی طرف نہیں تو اور کس کی طرف ہے۔ اس میں بھی عنوان کو اچھا اختیار کیا گیا ہے، مگر ہے نفس کا مکر کہ وہ لذت اور سہولت کا طالب ہے اور شیطان بھی (سالک کو) اس طرف مشغول رکھ کر اللہ کی طرف توجہ سے غافل رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرے قلب کی یکسوئی کا ذمہ دار شیخ کس طرح ہوسکتا ہے، کیونکہ یکسوئی تو غیراختیاری چیز ہے اور غیراختیاری چیز کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے۔ اچھا، یہاں تو شیخ کو ذمہ دار سمجھ لیا، اگر ناسور کی بیماری ہوجائے اور کسی طرح اچھا ہونے کی امید نہ ہو اور ہر وقت رستا رہے، تب بھی یکسوئی برباد ہوگی اور قلب ہر وقت پریشان رہے گا، اس کا کیا علاج کروگے، وہ تو نہ پیر کے بس کی بات ہے، نہ مرید کے بس کی، دیکھنا یہ ہے کہ ہم ذمہ دار کس بات کے ہیں اور مامور کس چیز کے ہیں۔ بڑی چیز تو حقیقت سے باخبر ہونا ہے۔ اس کے بعد بہت سی فضول اور بے کار چیزوں سے نجات حاصل ہوجاتی ہے۔ حق تعالیٰ تو نہایت شفقت سے فرماتے ہیں لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو تکلیف نہیں دیتے، مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ ایک خادم نے عرض کیا کہ حضرت، ان آثار کے ظواہر تو مطلوب ہیں۔ فرمایا، ظواہر تو مطلوب نہیں، تواشی مطلوب ہیں۔ منشا تو سب کا قوت شہویہ ہے، جو مباح فعل کے ساتھ بھی متعلق ہوجاتی ہے۔ کسی فقیہ یا کسی محقق صوفی کے کلام میں دکھاؤ کہ یہ چیزیں مطلوب ہیں، البتہ اس سے جو آثار ظاہر ہوتے ہیں، جیسے عبادت میں سہولت، وہ کسی درجہ میں مطلوب ہوسکتی ہیں، مگر بالذات نہیں۔ ایک باریک بات کہتا ہوں، جس کی طرف کم توجہ ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر قلب کی یکسوئی کی طلب ہے تو ہر وقت اس کی فکر میں رہنا کہ یکسوئی میسر ہو، خود یکسوئی کے بالکل منافی ہے، جب یہ فکر رہی تو یکسوئی کہاں رہی۔ اور اس صورت سے تو قیامت تک بھی یکسوئی میسر نہیں ہوسکتی، یکسوئی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے، جب قلب کو اس کی تحصیل سے خالی رکھا جائے اور اس سوچ

اور فکر میں ہی نہ پڑا جائے۔ ورنہ ہر وقت یہ فکر کہ یکسوئی میسر ہو۔ خود ایسی چیز ہے کہ اگر کچھ جمعیت نصیب بھی ہوئی تو اس فکر کے غلبہ کی وجہ سے وہ برباد ہوجائے گی، ایسا کرنا بالکل اس شعر کے مصداق ہے:

یکے برسر شاخ وبن ہے برید
خداوند بستاں نگہ گرو دید

جس شاخ پر بیٹھا ہے، اسی کو اپنے ہاتھ سے کاٹ رہا ہے۔ پریشان رہنے کی وجہ یہی ہے کہ غیراختیاری چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، جمعیت نہ ہونے کے سبب نماز میں بھی لوگوں کو وساوس آتے ہیں اور اکثر ان کی شکایت کیا کرتے ہیں اور دفع کی تدبیر پوچھا کرتے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس طرف خیال ہی نہ کیا جائے، بلکہ ایسے موقع پر مفید صورت یہی ہے کہ اپنے کام میں لگا رہا جائے۔ ان وساوس کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے، نہ جلبا نہ سلبا، کیونکہ یہ توجہ ایسی چیز ہے، جیسے بجلی کی تار کو ہاتھ لگانا کہ چاہے اس کے اثرات کے دفع کے لئے ہو یا اپنی طرف کھینچنے کے لئے ہو۔ دونوں صورتوں میں بجلی پکڑ لیتی ہے اور میں کہتا ہوں وسوسوں کی فکر کیوں ہے، قلب تو ایک سڑک کی طرح ہے۔ اگر سڑک پر بھنگی چمار بھی چل رہے ہیں۔ اور آپ بھی اس پر سے گذر رہے ہیں تو اس میں آپ کا حرج ہی کیا ہے۔ اگر سڑک کے خالی ہونے کے انتظار میں آپ کھڑے رہیں تو منزل مقصود تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے، البتہ نظام دکن کے لئے تو سڑک خالی بھی ہوسکتی ہے، مگر ہر شخص تو نظام نہیں۔ افسوس، اب تو ہر شخص نظام بننا چاہتا ہے کہ جیسے ان کے لئے سڑک روک دی جاتی ہے، اس طرح ہمارے لئے بھی سارے گذرنے والوں سے سڑک خالی کردی جائے۔ ارے بھائی، پہلے نظام کے درجہ کے تو ہوجاؤ، پھر یہ تمنا کرنا، جو نظام کے درجہ کے ہوتے ہیں، ان کے لئے سڑک بھی صاف کردی جاتی ہے، لوگ وساوس کو حضور قلب میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ خود حضور قلب ہی مقصود نہیں، صرف قلب کا حاضر ہونا مقصود ہے، حضور ہو یا نہ ہو، جب ہم شرعا اس کے پابند نہیں، پھر شرع پر زیارت چہ معنی۔

بزہد و ورع کوش وصدق وصفا
و لیکن میفزائے بر مصطفے

جیسے عقائد واعمال میں اس کی حدود سے زیادتی بدعت ہے، اس طرح احوال کی زیادتی بھی بدعت ہے، ظاہری وباطنی غیر اختیاری امور کا مطلوب نہ ہونا اور اختیاری کا مطلوب ہونا، یہ ایسی چیز ہے جو نص قطعی سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علیٰ بعض. للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن. واسئلو اللہ من فضلہ ان اللہ کان بکل شی علیما. ترجمہ۔ (اور تم ایسے امر کی تمنا مت کرو، جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض امتوں کو حصوں پر فوقیت بخشی ہے۔ مردوں کے لئے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) تفسیروں میں اس کی شان نزول یہی لکھی ہے کہ حضور ﷺ سے مجاہدین کے اجر کا ذکر سن کر حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ کاش ہم بھی مرد ہوتیں تو جہاد کرتیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ما فضل اللہ بہ چونکہ محنت کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے، اس لئے اس سے مراد غیر اختیاری امور ہیں، آیت کا حاصل یہ ہوا کہ فضائل دو قسم کے ہیں، ایک موہوبہ یعنی غیر اختیاری دوسرے مکتسبہ یعنی اختیاری، حق تعالیٰ نے ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ میں غیر اختیاری چیزوں کی تمناء سے روک دیا ہے اور للرجال نصیب مما اکتسبوا الخ میں اختیاری معاملات کی ترغیب دی ہے، پھر واسئلو اللہ من فضلہ میں اس کی اجازت دی ہے کہ اگر فضائل غیر اختیاری کے لئے دل چاہے تو بجائے اس کے درپے ہونے اور ہوس کرنے کے، اس کے لئے دعا کی جائے، اس لئے ارشاد فرماتے ہیں واسئلو اللہ من فضلہ یعنی ثمرات وفضائل کے لئے دعا کرنے کا اذن فرمایا ہے، بشرطیکہ اور دوسرا کوئی امر اس کے لئے رکاوٹ نہ ہو، مثلاً کسی امر کا غیر عادی ہونا جیسے عورت کا مرد بن جانا، پھر دعا کر کے بھی حصول کا منتظر نہ رہنا چاہیے، اس سے بھی پریشانی ہوتی ہے، بلکہ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان اللہ کان بکل شیء علیما پس اس میں تعلیم ہے کہ حق تعالیٰ ہی کو مصلحت اور حکمت معلوم ہے۔ وہ ہر ایک کی استعداد کے موافق فضائل وثمرات خود عطا فرماتے ہیں، کبھی دعا سے کبھی دعا کے بغیر، تم ایسی غیر اختیاری چیزوں کی ہوس مت کرو اور نہ ان کی افراط کے ساتھ تمنا کرو۔ اور آجکل اکثر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کی تمنا کرتے ہیں، جن کے حصول کے درپے ہونے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ

زیادہ تر لوگوں کی ناکامی کا سبب یہی ہے اور پریشانی کا بھی۔ (صفحہ ۶۱۸ سے ۶۲۲ تک)

بندہ کی پیدائش کا مقصود حالت کشمکش میں رہنا ہے

لذت مقصود نہیں۔ مقصود خوف وخشیت ہی ہے، لیکن لذت اس لئے دے دی جاتی ہے کہ خشیت کا سہارا ہو سکے۔ پھر بھی غلبہ خشیت ہی کا رہتا ہے اور کیوں نہ ہو، بندہ پیدا ہی اس واسطے ہوا ہے کہ وہ اس کشمکش میں رہے، ورنہ عالم ارواح سے آنے کی ہی کیا ضرورت تھی، اس امتحان ہی کے لئے تو یہاں بھیجے گئے ہیں اور یہی تو حکمت، روح کو جسم کے ساتھ وابستہ کرنے میں ہے۔ جب تک جسم کے ساتھ روح کا تعلق ہے، یہی کشاکش رہے گی، اس سے چھٹکارے کی تمنا کرنا ہی فضول ہے، انسان اس کشمکش کے لئے ہی تو پیدا کیا گیا ہے، ورنہ عبادت کے لئے فرشتے کیا کچھ کم تھے، شاہ نیاز اسی کو کہتے ہیں۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

مجذوب کہتا ہے۔

کہاں تھا کون تھا اور اب کہاں ہوں کیا ہوں میں
اس آب وگل کے جو دلدل میں آ پھنسا ہوں میں
تھے کہاں گردش تقدیر کہاں لائی ہے
بادہ پیمائی تھی یا بادیہ پیمائی ہے

یہ بندہ ہے، مگر خدا بن کر رہنا چاہتا ہے کہ جو میرا جی چاہے وہ ہو۔ بس حقیقت یہ ہے کہ لذت مقصود ہی نہیں۔ مقصود نصب ووصب ہے۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام بھی اس سے خالی نہ رہے۔ خود حضور ﷺ کو بخار میں شدت ہوئی، تاکہ ثواب میں اضافہ ہو۔ اگر یہ چیز مقصود نہ تھی تو انبیاء علیہم السلام بالخصوص ہمارے حضور ﷺ اس سے کیوں بری نہ رہے، مولانا فرماتے ہیں۔

زاں بلاہا کانبیاء برداشتند
سر بہ چرخ ہفتمیں افراشتند

خود حضور ﷺ نے فرمایا اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالا مثل دیکھئے اشد بلاء فرمایا، اکثر راحت نہیں، فرمایا اور وساوس کی طرف ہم کو بالکل مطمئن فرما دیا گیا ہے۔ حضرات صحابہ سے بڑھ کر تو ہم نہیں ہو سکتے، ان حضرات کو بھی ایسے ایسے وسوسے آتے تھے کہ جن کے بارے میں انہوں نے اس عنوان سے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کو ظاہر کرنے سے جل کر کوئلہ ہو جانا سہل ہے تو دیکھئے ان حضرات کو بھی کیسے کیسے خوفناک وسوسے آتے تھے، مگر حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ذالک صریح الایمان، ظاہر ہے کفر کے وسوسہ سے بڑا وسوسہ تو کوئی نہیں ہو سکتا، اس کا بھی یہی حکم ہے اور جب قلب پر اس قسم کے وساوس کا ہجوم ہو تو وہی نسخہ استعمال کرنا چاہئے کہ خیال کو کسی دوسری طرف متوجہ کرنا چاہئے، خواہ دنیا کی کسی چیز کی طرف مثلاً گاجر کا حلوا، شلجم کا اچار اور اس کے اوزان اور ترتیب میں قلب کو مشغول کرنا چاہئے۔ اس طرح قلب کو متوجہ کرنے میں چند روز تکلیف ہوگی، مگر پھر انشاء اللہ تعالیٰ بڑی سہولت سے وسوسوں پر قدرت ہو جائے گی۔ (صفحہ ۶۲۶ سے ۶۲۸ تک)

حصہ چہارم

ہمارے نفسی واجتماعی مسائل اور ان کا حل

الافاداۃ الیومیہ کی روشنی میں

اس وقت مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان سے زبانی جمع خرچ جتنا چاہے کرالو، لیکن عملی کام کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ ایک شخص نے کہا، اگر سارے مسلمانوں سے ایک ایک پیسہ لیا جائے تو لاکھوں کروڑوں روپے جمع ہوجائیں گے۔ پھر یہ رقم قومی کاموں میں صرف کی جائے، دوسرے نے جواب دیا کہ اگر ایک نشست میں سورۃ بقر سات مرتبہ پڑھ لو تو ہفت اقلیم کے بادشاہ بن سکتے ہو۔ بس مسلمانوں سے یہ کاغذی حساب پوچھ لو، عملی کام صفر کے برابر ہے، بالکل اس بنیے کی حالت ہے، جس کی حکایت ہے کہ وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ سفر کے لئے نکلا، راستے میں دریا آیا۔ اس نے پانی کا حساب لگایا، کہیں تو ٹخنوں تک پانی تھا، کہیں گھٹنوں تک اور کہیں ناف تک اور کہیں گلے تک اور کہیں سر سے اوپر تک۔ اس نے کاغذ پر اوسط لگایا تو گھٹنوں تک اوسط نکل آیا۔ اس نے گاڑی دریا میں ڈال دی۔ جب ڈوبنے لگے تو بنیہ کہنے لگا، ''حساب جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں'' بھائی وہ عملی حساب نہ تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا۔ یہی حالت باتیں بنانے والوں کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر تھوڑے سے مسلمان بھی کام کرنے والے ہوں، ہر گاؤں میں دس دس افراد، ہر قصبہ میں پچاس پچاس افراد اور ہر شہر میں سو سو افراد بھی، اگر اخلاص کے ساتھ کام کرنے والے تیار ہوجائیں تو دیکھیں، کس طرح مسلمانوں کی حالت بدلتی ہے۔

کام تو کام کے طریقے سے ہوتا ہے۔ بائیکاٹ سے کیا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کو جب تک قوت حاصل نہ ہوئی، آپ نے کس طرح صبر اور حلم سے کام لیا۔ جہاد کی بھی اجازت نہ ہوئی۔ جب قوت جمع ہوگئی، جہاد بھی فرض ہوگیا اور تلوار سے کام لیا گیا۔ پھر اتنا بڑا کام اظہر من الشمس ہے۔ یہ سب مناسب طریقہ اور حکمت عملی پر گامزن ہونے کا نتیجہ تھا۔

تحریک خلافت کے دوران پنجاب سے آئے ہوئے ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ تحریک خلافت میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ عظیم مقصد کے لئے قوت کی ضرورت ہے اور قوت اتفاق سے حاصل ہوتی ہے اور قوت کے دو درجے

http://knooz-e-dil.blogspot.com/

ہیں۔ ایک اجتماع واتحاد ایک بقا۔ اول تو اس وقت اجتماع بھی نہیں ہوا، لیکن اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو بقا کا کوئی سامان نہیں۔ کہنے لگے، بقا کیسے ہو۔ میں نے کہا کہ اس کے لیے امیر المؤمنین کی ضرورت ہے، جو اپنی طاقت سے اتحاد کو قائم رکھ سکتا ہے اور جماعت سے خروج پر سزا دے سکتا ہے اور یہاں کوئی امیر المؤمنین نہیں، کہنے لگے، ہم آپ کو امیر المؤمنین بناتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں بننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ مجھے امیر تسلیم کرنے پر سارے مشاہیر، علماء اور لیڈروں کا اتفاق ہو۔ اگر ایک نے بھی اختلاف کیا تو میں امیر نہیں بنتا۔ اس کے بعد اگر کسی نے گڑبڑ کی تو اس کو درست کیا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ میں جمہوری امیر بننے کی بجائے شخصی امیر (سلطان) بنوں گا، دوسروں کی رائے کا منتظر نہ ہوں گا۔ تیسرے یہ کہ ہندستان کے سارے مسلمان اپنا سرمایہ میرے حوالہ کردیں، تاکہ ملی ضرورتوں کے لئے مجھے بھیک نہ مانگنی پڑے۔ جب یہ سب ہوجائے گا تو میں امیر المؤمنین کی حیثیت سے سب سے پہلے جو حکم جاری کروں گا، وہ یہ ہوگا کہ دس سال تک ساری تحریک، سارا شور شرابہ بند۔ ان دس سالوں میں مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ جب ان کی اخلاقی اور دینی حالت اطمینان بخش ہوجائیگی، تب مناسب حکم جاری کیا جائے گا۔ (صفحہ ۷۶ جلد ۳)

آج کل مسلمانوں کا کام جوش کے ساتھ ہورہا ہے، اس میں ہوش موجود نہیں۔ اس لئے اس میں استقلال نہیں۔ ایک بات جو قابل لحاظ ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص جس کام کا اہل ہے، اس سے وہی کام لیا جائے، اس میں گڑبڑ نہ کی جائے۔ اس اصول کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ناکامی ہوتی ہے۔ جو کام لیڈروں کا ہے، وہ ان کو کرنا چاہیے۔ جو علماء کا ہے، وہ علماء کو کرنا چاہئے۔ جو عوام کا کام ہے، وہ عوام کو کرنا چاہئے۔ عام لوگوں کے بھی دو طبقے ہیں۔ ایک اہل مال ہیں، دوسرے اہل جان۔ اہل مال اپنا کام کریں اور اہل جان اپنا۔ عمل کی تقسیم سے بڑی سہولتیں پیدا ہوتی ہیں۔ علماء سے دوسرے کام کی توقع رکھنا ایسا ہے جیسے حکیم محمود خان (اس وقت کے بڑے حکیم) (مرتب) سے ٹوٹے ہوئے جوتے کی ترکیب پوچھی جائے یا اسے طبی کانفرنس میں جوتے گانٹھنے کے فوائد بیان کرنے کے لئے کہا جائے۔ اسی طرح علماء سے دنیا کے حصول کی تدابیر پوچھنے کی بجائے دینی مسائل ہی معلوم کیے جائیں اور ان کے حوالے دینی کام سپرد کیے جائیں۔ (صفحہ ۷۸ جلد ۳)

مسلمانوں کی ترقی کا مسئلہ

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب وہ صلاحیتیں اور صفتیں ہیں، جو انہوں نے مسلمانوں سے لی ہیں۔ یہ صفتیں منتظم ہونا، مستقل مزاج ہونا، وقت کا پابند ہونا، انجام سوچ کر کام کرنا، جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا، اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ باتیں ہیں، جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ ان کو اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے۔ ان کو چھوڑنے سے زوال ہوجاتا ہے۔ چاہے ان چیزوں کو کوئی بھی اختیار کرے۔ مسلمانوں نے ان احکام کو چھوڑ دیا ہے۔ نہ اتحاد واتفاق ہے، نہ ہی راز داری کا مادہ۔ نہ انتظام ہے اور نہ وقت کی پابندی۔ نہ انجام سوچ کر کام کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہوش سے کام کرنے کی صفت۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ساری ترقی زیروزبر ہوچکی ہے۔ (صفحہ ۱۴۲ جلد ۳)

ترقی اور کامیابی کا حصول

دوسری قوموں نے مسلمانوں کے گھر سے بہتر باتیں اور عمل چرا کر ان پر عمل شروع کردیا، چوں کہ ان اعمال کی خاصیتیں ترقی تھا۔ اس لئے وہ ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئے۔ لیکن چوں کہ یہ چوری ادھوری تھی، چور کو مسلمانوں کے گھر کے سارے خزانے کا علم نہیں تھا۔ ایمان، عقاید اور دین کے بنیادی فرائض کی قدروقیمت کا، ان کو اندازہ نہ ہوسکا، اس لئے چور نے ان چیزوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑدیا۔ اگر مسلمان اپنے گھر کی ان چیزوں پر عمل کرتے تو آج ان کو وہ ترقی حاصل ہوتی، جسے دوسری قومیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتیں۔ وعداللہ الذین آمنوا وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی ولا یشرکون بی شیئا

(جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے، ایسے لوگوں سے اللہ تعالی نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو ضرور ملک میں خلیفہ اور بادشاہ بنائیں گے اور ان کو دین پر جس کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے، امن قائم رکھیں گے اور خوف کے بعد امن دیں گے۔ تاکہ وہ میری عبادت کریں اور شرک نہ کریں۔ (صفحہ ۱۴۳ - جلد ۳)

ایک کاشتکار کی ترقی کاشت میں محنت کرنے سے ہوتی ہے۔ ایک ملازم کی ترقی ملازمت کے کاموں میں محنت سے ہوتی ہے۔ تاجر اور صنعت کار کی ترقی تجارت اور

تلوار اٹھاؤ تو جس نے تمہارے باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ کو قتل کیا ہو، اگر وہ عین اس حالت میں کلمہ پڑھ رہا ہو تو فوراً ہاتھ روک لو (صحابہ کرام نے ایسا کر کے دکھایا) کیا اب کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ شب و روز کے معمولات اور معاملات میں تو اسلامی احکام اور اسلامی حدود کی پابندی ہوتی نہیں، اس طرح کے سخت حالات میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا کیسے ہوں گے۔ غرض ہر چیز کے حدود و قواعد ہیں۔ پہلے طبیعتوں کو ان قواعد اور حدود کا خوگر بناؤ، پھر میدان میں آؤ۔ میں بقسم عرض کرتا ہوں، ایسا کرنے کے بعد اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ پھر تم سلف کی طرح دنیا پر حکومت کروگے۔ احکامِ اسلامی کے بغیر حکومت کا حاصل کرنا ایسا ہے، جیسا وضو کے بغیر نماز پڑھنا۔ یا بغیر منتر جانے ہوئے سانپ کو پکڑنا، جس کا انجام ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

اگر بالفرض یہاں کچھ دن حکومت کر بھی لی جائے تو آخرت کی زندگی تو برباد ہوجائے گی۔ اصل چیز جس کے لئے انبیائے کرام کی بعثت ہوئی۔ وہ ایمان اور عمل صالحہ ہیں۔ ایمان کی حفاظت کرو اور اعمال صالحہ اختیار کرو، اس کے بعد وہ خوشخبری ہے جو قرآن میں دی گئی ہے۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون. (اس زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے) (صفحہ ۲۷، ۲۸۔ جلد۵)

جوش کے ساتھ ہوش کی ضرورت

جس کام میں دوسروں کی مدد کی ضرورت ہو، اس کام کو کرنے کو جی نہیں چاہتا، اس لیے کہ ساتھ ہوجانے والوں سے یہ امید نہیں کہ وہ آخر وقت تک عہد پورا کریں گے (اور ساتھ دیں گے)۔ خلافت تحریک میں میری عدم شرکت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے لوگوں کی حالت کا تجربہ تھا، میں رات دن دیکھتا ہوں کہ اگر چھوٹے سے چھوٹا کام کسی کے سپرد کر دیتا ہوں تو بیٹھا انتظار کرتا رہتا ہوں اور جس کے سپرد کیا گیا ہے، اسے پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ لوگوں میں اس قدر غیر ذمہ داری آگئی ہے۔ حالت یہ ہے کہ جس کام کی آج ضرورت ہے، اس کام کے لیے پانچ دن تو مشورہ میں گذار دیتے ہیں۔ پھر طے ہوجانے کے بعد کچھ دن ٹال مٹول میں لگ جاتے ہیں۔ کام اس طرح تھوڑا ہوتا ہے۔ پھر تحریک کے وقت تو جوش ہوتا ہے، جب ہوش کا وقت آتا ہے تو ایک بھی فرد نظر نہیں آتا۔ جن لوگوں نے غدر (۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی) کا وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان سے

حالات پوچھ کر دیکھ لو، بہت سے علماء کو ان کے معتقدین نے آمادہ کیا، مگر جب وقت آیا تو سب غائب ہوگئے۔ بیچارے مولویوں پر آفت آئی۔ سب سے پہلے دین کو قلب میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد آگے قدم رکھنا چاہیے۔ یہاں تو دین میں رسوخ کے اعتبار سے معاملہ صفر ہے۔ اس لیے ان کی کوئی بات قابل اعتماد نہیں۔ (صفحہ ۹ جلد۲)

کام میں روڑے اٹکانا

موجودہ دور میں اسلام پر نہ خود چلتے ہیں، نہ ہی دوسروں کو چلنے دیتے ہیں۔ بالکل وہ حالت ہے، جو غدر (جنگ آزادی) کے دور کی ایک حکایت ہے۔ غدر کے دور میں ایک میدان میں کچھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں، ان میں ایک زخمی سپاہی بھی پڑا ہوا تھا، اس سپاہی کو خیال ہوا کہ دن تو کسی طرح گذر جائے گا۔ مگر شب کاٹنا مشکل ہوجائے گا۔ ایک لالہ جی اس طرف سے گذر رہے تھے، سپاہی نے آواز دی، لالہ جی آواز سن کر گھبرائے کہ لاشوں میں کیسی آواز ہے۔ اس سپاہی نے کہا کہ ڈرومت، میں مرا نہیں، زخمی ہوا ہوں۔ میری کمر کے ساتھ پیسے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر میں مرگیا تو یہ پیسے ضایع ہوجائیں گے، تم ہمیانی کھول کر لیجاؤ۔ لالہ جی کو پیسوں کا نام سن کر منہ میں پانی بھر آیا اور ڈرتے ڈرتے سپاہی کے قریب پہنچ گئے۔ جب وہ سپاہی کے قریب پہنچ گئے تو سپاہی نے تلوار اٹھا کر لالہ جی کے پیروں میں رسید کی۔ وہ گر پڑے، اس کے بعد وہ ہمیانی ٹٹولنے لگے۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ لالہ جی نے سپاہی سے پوچھا، تم نے یہ کیا کیا۔ سپاہی نے کہا کہ لالہ جی، بے وقوف ہوئے ہو، میدان جنگ میں کوئی پیسوں کی ہمیانی باندھ کر آتا ہے کیا۔ یہ تو تم کو اپنے پاس رکھنے کی ایک تدبیر تھی، لالہ جی نے کہا، اوت کا اوت، نہ خود چلے نہ دسروں کو چلنے دے۔ تو یہ زمانہ وہی ہے کہ نہ خود کوئی کام کریں، نہ دوسروں کو کرنے دیں۔ اگر خاموش ہی رہیں تو اچھا ہے، لیکن خاموش بھی تو نہیں بیٹھا جاتا، بلکہ کام میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ (صفحہ ۳۱۔ جلد۵)

مسلمانوں کے لیے دستور العمل

کون ہے، جو مسلمانوں کی کامیابی نہ چاہتا ہو، ہر مسلمان کی یہی خواہش ہے، مگر اس کی کوئی صورت بھی تو ہو۔ اس سلسلے میں اصل چیز قوت و وسعت ہے۔ اسے بھی تو دیکھا جائے گا۔ اگر دھوپ کھانا ہو اور دھوپ آنے میں دیوار حائل ہو تو اس دیوار کو ہٹانا ہوگا۔

صنعت میں محنت کرنے سے ہوتی ہے۔ جب یہ بات مسلمہ ہے کہ ہر شعبہ میں ترقی اس شعبہ میں محنت، صلاحیتیں اور کمال حاصل کرنے سے ہوتی ہے تو یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اسلامی اخلاق، عقاید، ایمان، معاملات وغیرہ میں کمال حاصل کرنے سے ہوگی۔ ترقی کا یہی اصول ہے۔ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین (تم ہی بلند اور کامیاب ہوگے اگر پورے مسلمان بن جاؤ)۔

صحابہ کرام اور تابعین واسلاف نے جو ترقی کی، وہ ایمان، عقاید، اعمال، معاملات اور اخلاق میں بہتری اور بلندی کی وجہ سے کی تھی۔ وہ ہر مسلمان کے لئے نرم، کمزور اور پست تھے، ایثار، اتحاد، بردباری، انتظام اور استقلال یہ ساری صفات ان کا خاصہ تھیں۔ انہی صفات کی وجہ سے انہوں نے عروج حاصل کیا۔

کاش کہ قوم کا درد رکھنے والے افراد، کمیٹیاں اور ادارے قائم کریں۔ ان اداروں کا مقصد لوگوں کے ایمان کو طاقت ور بنانا ہو اور ان کے "اندر اذلۃ علی المؤمنین، اعزہ علی الکافرین" (یعنی مسلمان آپس میں نرم ہیں اور کافروں کے لیے سخت ہیں) کی صفت پیدا کرتے ہوں۔ اگر ایسا ہوجائے تو ترقی، کامیابی اور حکومت سب ان مسلمانوں کی ہوجائے گی۔ (صفحہ ۱۴۵ - جلد ۳)

مسلمانوں میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت کا فقدان

میں نے بہت کوشش کی کہ مسلمانوں کا ایک مرکز ہو، جہاں وہ اپنی ضروریات کے متعلق مشورہ کیا کریں۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خلوص نہیں ہے۔ خلوص نہ ہونے کی وجہ دین کی کمزوری ہے۔ ہر شخص اپنی اغراض میں مبتلا ہے۔ مسلمانوں کی قوت کے اجتماع کا کوئی مرکز نہیں، ان کی یہ کمزوری بڑی زبردست کمزوری ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ مل کر کام کا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح کام کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھیے۔ ھو الذی ایدک بنصرہ میں وبالمؤمنین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ورنہ مومنین کا لفظ بڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتائی ہے کہ اتنی عظیم ہستی (رسول اللہ ﷺ) کی نصرت میں بھی سنت اللہ یہی کارفرما ہے کہ مل کر کام کیا جائے۔ غرض کہ ہر صورت میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ محض زبانی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ مگر آج کل مسلمانوں میں صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ کام کی بات ایک بھی نہیں۔ البتہ انہیں ایک کام کرنا ضرور

آتا ہے، وہ یہ کہ دشمن کی بغلوں میں جاکر گھسنا شروع کردیتے ہیں۔ کبھی گوروں کی بغل میں تو کبھی کالوں کی بغلوں میں، حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ گورے سے کالا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کا ڈسا ہوا پانی بھی نہیں مانگتا۔ (یہ لطیفہ ہے، سانپ کی دوقسموں کے بارے میں)۔ مسلمانوں کی حالت بالکل اس کے مصداق ہے کہ بارش سے بھاگا، پرنالہ کے نیچے کھڑا ہوا۔ میں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کہتا ہوں کہ ان کے بھروسے پر کام کرنا بے وقوفی ہے۔ وقت پڑنے پر سب الگ ہوجاتے ہیں۔ ساری بلا ایک ہی فرد کے سر پڑ جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے دوسرے سارے کاموں سے بھی محرومی ہوجائے گی۔ (صفحہ ۳۶ جلد ۷)

اسلامی حکومت کے لیے جدوجہد اور اس کے تقاضے

ہم حکومت حاصل کرنے اور ترقی حاصل کرنے کے مخالف نہیں۔ ترقی کرنے اور حکومت کے حصول کی خوب کوشش کرو۔ لیکن اس کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ احکام اسلامی کو ملحوظ رکھا جائے اور اسلامی حدود کو پیش نظر رکھا جائے۔ کیوں کہ ایسی حکومت مسلمانوں کے کس کام کی۔ جس میں پہلے سے (یعنی حکومت حاصل ہونے سے پہلے ہی) شرعی احکام کو پامال کردیا جائے۔ ایسی حکومت باعث ترقی کی بجائے موجب نحوست ہوگی۔ مجھے (اسلامی شریعت کے لئے حکومت چاہنے والوں سے) مقاصد میں اختلاف نہیں۔ طریق کار میں اختلاف ہے۔ میرا کہنا ہے کہ حکومت ہو یا مال ہو، عزت ہو یا آبرو ہو، اگر یہ ساری چیزیں خدا کے احکام کی حفاظت کرتے ہوئے اور ان پر کاربند رہتے ہوئے تم حاصل کرسکو تو تم کو ہزار بار مبارک ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں یہ چیزیں اسلامی احکام کی اشاعت کا ذریعہ ہوں گی۔ لیکن اگر حکومت کے حصول کی جدوجہد میں فاسد اغراض وابستہ ہوں، جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہوا ہے تو ایسی حکومت اور سلطنت پر ہزار بار لعنت ہے۔ ایسی حکومت خدا کی یاد سے غافل کردینے والی ہے اور اسلامی احکام سے دور کرنے والی ہے۔ حکومت کے حصول کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کی حکومت کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔ لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ حکومت کے ہوتے ہوئے انہیں اسلام کے ساتھ کتنی محبت تھی۔ وہ کتنی سختی کے ساتھ پابند اسلام تھے۔ قتال کے وقت جوش کی حالت میں وہ اسلامی احکام کو پیش نظر رکھتے تھے۔ مثلاً یہ مسئلہ ہے کہ اگر عین قتال کے وقت کسی کافر پر

تلوار اٹھاؤ تو جس نے تمہارے باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ کو قتل کیا ہو، اگر وہ عین اس حالت میں کلمہ پڑھ رہا ہو تو فوراً ہاتھ روک لو (صحابہ کرام نے ایسا کر کے دکھایا) کیا اب کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ شب و روز کے معمولات اور معاملات میں تو اسلامی احکام اور اسلامی حدود کی پابندی ہوتی نہیں، اس طرح کے سخت حالات میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا کیسے ہوں گے۔ غرض ہر چیز کے حدود و قواعد ہیں۔ پہلے طبیعتوں کو ان قواعد اور حدود کا خوگر بناؤ، پھر میدان میں آؤ۔ میں بقسم عرض کرتا ہوں، ایسا کرنے کے بعد اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ پھر تم سلف کی طرح دنیا پر حکومت کرو گے۔ احکامِ اسلامی کے بغیر حکومت کا حاصل کرنا ایسا ہے، جیسا وضو کے بغیر نماز پڑھنا۔ یا بغیر منتر جانے ہوئے سانپ کو پکڑنا، جس کا انجام ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

اگر بالفرض یہاں کچھ دن حکومت کر بھی لی جائے تو آخرت کی زندگی تو برباد ہو جائے گی۔ اصل چیز جس کے لئے انبیائے کرام کی بعثت ہوئی۔ وہ ایمان اور عمل صالحہ ہیں۔ ایمان کی حفاظت کرو اور اعمال صالحہ اختیار کرو، اس کے بعد وہ خوشخبری ہے جو قرآن میں دی گئی ہے۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون. (اس زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے) (صفحہ ۲۷، ۲۸۔ جلد۵)

جوش کے ساتھ ہوش کی ضرورت

جس کام میں دوسروں کی مدد کی ضرورت ہو، اس کام کو کرنے کو جی نہیں چاہتا، اس لیے کہ ساتھ ہو جانے والوں سے یہ امید نہیں کہ وہ آخر وقت تک عہد پورا کریں گے (اور ساتھ دیں گے)۔ خلافت تحریک میں میری عدم شرکت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے لوگوں کی حالت کا تجربہ تھا، میں رات دن دیکھتا ہوں کہ اگر چھوٹے سے چھوٹا کام کسی کے سپرد کر دیتا ہوں تو بیٹھا انتظار کرتا رہتا ہوں اور جس کے سپرد کیا گیا ہے، اسے پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ لوگوں میں اس قدر غیر ذمہ داری آ گئی ہے۔ حالت یہ ہے کہ جس کام کی آج ضرورت ہے، اس کام کے لیے پانچ دن تو مشورہ میں گذار دیتے ہیں۔ پھر طے ہو جانے کے بعد کچھ دن ٹال مٹول میں لگ جاتے ہیں۔ کام اس طرح تھوڑا ہوتا ہے۔ پھر تحریک کے وقت تو جوش ہوتا ہے، جب ہوش کا وقت آتا ہے تو ایک بھی فرد نظر نہیں آتا۔ جن لوگوں نے غدر (۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی) کا وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان سے

حالات پوچھ کر دیکھ لو، بہت سے علماء کو ان کے معتقدین نے آمادہ کیا، مگر جب وقت آیا تو سب غائب ہو گئے۔ بیچارے مولویوں پر آفت آ گئی۔ سب سے پہلے دین کو قلب میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد آگے قدم رکھنا چاہیے۔ یہاں تو دین میں رسوخ کے اعتبار سے معاملہ صفر ہے۔ اس لیے ان کی کوئی بات قابل اعتماد نہیں۔ (صفحہ ۹ جلد۲)

کام میں روڑے اٹکانا

موجودہ دور میں اسلام پر نہ خود چلتے ہیں، نہ ہی دوسروں کو چلنے دیتے ہیں۔ بالکل وہ حالت ہے، جو غدر (جنگ آزادی) کے دور کی ایک حکایت ہے۔ غدر کے دور میں ایک میدان میں کچھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں، ان میں ایک زخمی سپاہی بھی پڑا ہوا تھا، اس سپاہی کو خیال ہوا کہ دن تو کسی طرح گذر جائے گا۔ مگر شب کاٹنا مشکل ہو جائے گا۔ ایک لالہ جی اس طرف سے گذر رہے تھے، سپاہی نے آواز دی، لالہ جی آواز سن کر گھبرائے کہ لاشوں میں کیسی آواز ہے۔ اس سپاہی نے کہا کہ ڈرومت، میں مرا نہیں، زخمی ہوا ہوں۔ میری کمر کے ساتھ پیسے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر میں مر گیا تو یہ پیسے ضایع ہو جائیں گے، تم ہمیانی کھول کر لیجاؤ۔ لالہ جی کو پیسوں کا نام سن کر منہ میں پانی بھر آیا اور ڈرتے ڈرتے سپاہی کے قریب پہنچ گئے۔ جب وہ سپاہی کے قریب پہنچ گئے تو سپاہی نے تلوار اٹھا کر لالہ جی کے پیروں میں رسید کی۔ وہ گر پڑے، اس کے بعد وہ ہمیانی ٹٹولنے لگے۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ لالہ جی نے سپاہی سے پوچھا، تم نے یہ کیا کیا۔ سپاہی نے کہا کہ لالہ جی، بے وقوف ہوئے ہو، میدان جنگ میں کوئی پیسوں کی ہمیانی باندھ کر آتا ہے کیا۔ یہ تو تم کو اپنے پاس رکھنے کی ایک تدبیر تھی، لالہ جی نے کہا، اوت کا اوت، نہ خود چلے نہ دسروں کو چلنے دے۔ تو یہ زمانہ وہی ہے کہ نہ خود کوئی کام کریں، نہ دوسروں کو کرنے دیں۔ اگر خاموش ہی رہیں تو اچھا ہے، لیکن خاموش بھی تو نہیں بیٹھا جاتا، بلکہ کام میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ (صفحہ ۳۱۔ جلد۵)

مسلمانوں کے لیے دستور العمل

کون ہے، جو مسلمانوں کی کامیابی نہ چاہتا ہو، ہر مسلمان کی یہی خواہش ہے، مگر اس کی کوئی صورت بھی تو ہو۔ اس سلسلے میں اصل چیز قوت و وسعت ہے۔ اسے بھی تو دیکھا جائے گا۔ اگر دھوپ کھانا ہو اور دھوپ آنے میں دیوار حائل ہو تو اس دیوار کو ہٹانا ہوگا۔

اس کو ہٹانے کا کیا طریقہ ہے۔ کیا اس کا یہ طریقہ ہے کہ دیوار سے ٹکریں ماری جائیں۔ اس کا جو نتیجہ ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ اس وقت ہماری حالت تو یہ ہے کہ دو مسلمان آپس میں مل کر اتفاق سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں ایسے بلند خیالات۔

اگر مسلمانوں میں صلاحیت ہوتی تو حیاۃ المسلمین اور صیانۃ المسلمین ان کے دستور العمل کے لیے کافی ہیں۔ ان کتابوں میں مسلمانوں کی دنیا وآخرت کی فلاح وبہبود کے لیے کافی ذخیرہ ہے۔ کام تو کرنے سے ہوتا ہے۔ کئے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ طریقہ سے اصول وقواعد اور حدود شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کام کیا جائے۔ یہ ساری چیزیں ان کتابوں میں موجود ہیں۔ اگر مسلمان ان کو اپنا دستور العمل بنائیں تو خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں کہ وانتم الاعلون (اور تم ہی غالب رہوگے) کا ظہور ہوجائے۔ (صفحہ ۲۵۹۔ جلد۲)

انتظامی امور سے غفلت کے نتائج

چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔ مسلمانوں سے جو سلطنت چھن گئی ہے تو اس کا سبب چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اہتمام میں غفلت ہی تھا۔ اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی غفلتیں مل کر غفلتوں کا بہت بڑا مجموعہ ہوجاتا ہے۔ جو بالآخر سلطنت کے زوال کا سبب بن جاتی ہے، پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست سلطنت میں مخل ہیں۔ جب چھوٹی چیزوں کا اہتمام ہوگا تو عادت کی بنا پر بڑی باتوں کا اہتمام از خود ہوگا۔ چھوٹے امور میں کوتاہی کی وجہ سے باہمی معاملات بھی متاثر ہوتے ہیں اور باہم کدورت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر الفت باقی نہیں رہتی۔ حکومت اور سیاست کا مدار باہمی اتفاق پر ہے۔ اس اہتمام کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بار شب کے وقت حضرت علیؓ آ کر باتیں کرنے لگے، آپ نے چراغ فوراً گل کردیا۔ کیوں کہ اس وقت آپ بیت المال کا کام کررہے تھے اور چراغ میں تیل بھی بیت المال ہی کا تھا۔ یہ بات بظاہر کوئی بڑی بات نہیں تھی، لیکن جو شخص اس طرح کی چھوٹی باتوں کا خیال کرے گا، وہ بڑی بڑی باتوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ (صفحہ ۸۹۔ جلد۱۰)

اصلاح احوال کا طریقہ کار

مسلمانوں کی دنیاوی اور اخروی فلاح اور کامیابی کے لئے الحمدللہ کافی انتظام کردیا

ہے۔ اس سلسلے میں ”حیاۃ المسلمین“ کتاب میں سب کچھ لکھدیا ہے۔ اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو انشاء اللہ دین ودنیا کی فلاح اس میں موجود ہے۔ ریل میں سفر کے دوران ایک دیہاتی نے بڑی کام کی بات کہی تھی کہ ”نیک رہو اور ایک رہو“ حیواۃ المسلمین میں نیک ہونے کا راستہ بتایا گیا ہے۔ اور ”صیانۃ المسلمین“ میں ایک ہونے کا راستہ بتایا گیا ہے۔ اب عمل کرنا یہ لوگوں کی ہمت پر ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہر مقام پر دس دس افراد ہم خیال ہوکر پنچائیت کی صورت اختیار کرلیں اور کام شروع کردیں۔ ان شاء اللہ دس آدمیوں کے ہم خیال ہوجانے سے ساری بستی کی فضا تبدیل ہوگی۔ اس کے بعد جس شخص سے جو کام لینا چاہیں گے، کوئی انکار نہیں کرے گا۔ ”صیانۃ المسلمین“ کا حاصل یہی ہے۔ باقی اصلاح کا کام مبلغوں اور واعظوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کا تو کام راستے کی نشاندہی کرنا، طریقہ بتانا اور ترغیب دینا ہے۔ اصلاح عمل کے لئے عملی کام، یہ مقامی لوگوں کے کرنے کا ہے۔ وہ جماعتیں بنا کر یہ کام کرتے رہیں۔ مبلغین وقتاً فوقتاً وہاں جا کر نصیحت کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ اس کی برکت سے جلد ہی مسلمانوں کی حالت میں تبدیلی آئے گی۔ لیکن یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ پنچائتوں اور جماعت کی تشکیل میں مخلص لوگ شامل ہوں۔ غیر مخلص لوگوں کی شرکت سے سخت نقصان ہوگا۔ اس سے یہ ہوگا کہ لوگ صدر اور سیکریٹری ہونے پر اصرار کریں گے۔ (صفحہ ۳۱۷ جلد۴)

مسلمانوں کے لیے اخراجات کا نظام

مسلمانوں کی تباہی وبربادی کا بنیادی سبب بدانتظامی ہے، جو بے فکری کی دلیل ہے۔ اسی بے فکری کی بدولت ہزاروں زمیندار، رئیس اور نواب بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسی وجہ سے سلطنتیں ضائع کردیں۔ جس سے دنیا کے ساتھ ساتھ دین بھی برباد ہورہا ہے۔ لوگوں سے میری لڑائی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ بے فکری ختم ہو۔ (۴۴ جلد۸)

مسلمانوں کی حالت بہت افسوسناک ہے۔ عیاشی اور فضول خرچی میں اپنی دولت کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ اگر آمدنی کی کچھ فکر ہوتی بھی ہے تو خرچ میں کمی نہیں کرتے۔ میرٹھ میں ایک رئیس تھے، انہوں نے بڑے کام کی بات کہی تھی۔ کہتے تھے، لوگ آمدنی بڑھانے کی فکر تو کرتے ہیں، جو غیر اختیاری بات ہے۔ لیکن اخراجات میں کمی نہیں کرتے، موجودہ دور میں خاص طور سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمان فکر سے کام لیں

اور سوچ سمجھ کر خرچ کریں۔ اس کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ خرچ کرنے سے پہلے کم از کم تین بار مراقبہ کرلیا کریں کہ ہم جو خرچ کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور نقصان ہوگا۔ اگر یہ تحقیق ہوجائے تو خرچ کریں۔ اس کے بعد یہ مراقبہ کریں کہ اتنا ہی خرچ کریں یا اس سے کم میں کام چل سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے چند روز تک زحمت ہوگی۔ لیکن بعد میں سہولت ہوگی۔ اور اس پر عمل کرنا آسان ہوگا۔ الغرض یہ کہ فکر اور انتظام بنیادی چیزیں ہیں۔ بے فکری اور بد انتظامی نہایت مضر ہیں۔ (صفحہ ۴۴۔ جلد ۸)

یہ تجربہ ہے کہ پیسہ بخل کے بغیر جمع نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنے اندر ایک حد تک بخل کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔ یہ بخل شرعی نہیں، بلکہ لغوی بخل ہوگا۔ سخاوت اچھی چیز ہے، لیکن گناہوں کے کاموں میں رقم خرچ کرنا، لغتہ یہ بھی سخاوت ہی ہے، لیکن شرعا ممنوع ہے۔ (صفحہ ۱۱۴۔ جلد ۶)

ظاہری اسباب ووسائل کا ہونا

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک صاحب کو جس نے ان سے زمین وقف کرنے کا مشورہ طلب کیا تھا، ایسا کرنے سے منع فرمایا تھا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے انہیں ایک نیک کام سے روک دیا۔ مگر حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے بڑا حکیمانہ مشورہ دیا کہ ایسا کرنے سے معاشی اعتبار سے محتاجی ہوگی۔ اس سے جو پریشانی ہوگی، وہ برداشت سے باہر ہوگی۔ واقعی ہم کمزور ہیں۔ ہمیں ظاہری اسباب کی بھی ضرورت ہے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ، نفس بہت پریشان کرتا ہے کہ کل کے روزگار کا کیا انتظام کیا ہے۔ اس لیے روزی کا سامان اکٹھا دیا جائے تاکہ نفس کو دکھا دیا جائے کہ یہ ہے روزی کا سامان، روزی اور روزگار کے سلسلے میں یہ پریشانی اور کمزوری کمال کے خلاف نہیں، بلکہ یہ طبعی کمزوری ہے۔ (صفحہ ۱۸۳)

آپس کی محاذ آرائی

آج کل جو لوگ میدان میں آگئے ہیں، یہ لوگ کسی بھی کام کے نہ رہے۔ نہ تو میدان میں کچھ کیا اور نہ ہی آج کل کہیں جنگ ہے (جہاں ان کو گرجنے برسنے کا موقع ملتا) البتہ آپس میں لڑنے کے لیے انہوں نے میدان جنگ تیار کرلیا ہے۔ اپنی قوتیں ایک

دوسرے کو زیر کرنے میں صرف کررہے ہیں۔ بالکل وہی مثال ہے، جو راجا کے لڑکے کی حکایت بیان کی جاتی ہے۔ حکایت ہے کہ استاد نے راجا کے لڑکے کو مارا، وہ راجپوت تو تھا ہی، اس نے تلوار نکال کر استاد پر حملہ کردیا۔ استاد بھاگ گیا۔ اور راجا سے شکایت کی کہ لڑکے نے یہ گستاخی کی ہے۔ راجا نے کہا کہ یہ بڑی بدشگونی ہوئی کہ تم بھاگ گئے۔ یہ لڑکے کا پہلا وار تھا، جو ناکام ہوا۔ اب ساری عمر اس کے وار خالی اور حملے ناکام رہیں گے، اس لیے تمہیں سزائے قید دی جاتی ہے۔ یہی ان کی حالت ہے، جس طرح لڑکا استاد پر مشق کررہا تھا، اسی طرح یہ آپس میں مشق کررہے ہیں۔ (صفحہ ۲۵۵۔ جلد ۴)

مادی علوم کی حقیقت

آج کل لوگ جہالت کی وجہ سے مصنوعات (صنعت) کو علوم سمجھتے ہیں۔ ان کو علوم کہنا (اور سمجھنا) جائز نہیں۔ علوم اور مصنوعات دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ آج کل جو لوگ مادیات میں ترقی کررہے ہیں، ان کو تو علوم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اللہ تعالیٰ نے علوم کی دولت تو ایمان والوں کو دی ہے، ان کے اندر میں وہ چیز ہے، جس سے یہ ترقی یافتہ قومیں محروم ہیں۔ وہ نور ایمان ہے۔ اس دولت کے مقابلے میں ساری ترقیاں، دولتیں اور حکومتیں ہیچ ہیں۔ ایمان کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی ضرورت اور حاجت نہیں۔

مسلمانوں کو ایمان کی حفاظت اور قدر کرنی چاہیے۔ اگر مسلمان خدا کو راضی رکھنے کی فکر کریں تو میں بقسم عرض کرتا ہوں کہ تمام عالم سر کے بل ان کے قدموں میں آپڑے۔ اور مادیت کے یہ سارے علوم ہیچ نظر آنے لگیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھ کر مسلمان، دوسروں کی گداگری کرتے پھرتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ اللہ نے ان کے اندر کیا دولت اور نعمت رکھی ہے۔ (صفحہ ۱۹۲۔ جلد ۶)

مشورہ دینے کا مرض

آج کل یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ لوگ خود تو کچھ کرنا نہیں چاہتے، لیکن دوسروں کو مشورہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مشورہ دینا کون سی مشکل بات ہے۔ یہ بہت آسان کام ہے۔ مجھے جب کوئی مشورہ دیتا ہے تو میں اس مشورے کی حمایت کرکے راستہ ایسا بتاتا ہوں، جس میں اہل مشورہ کو خود بھی کام کرنا پڑے۔ اس وقت ڈھیلے پڑجاتے ہیں۔ جس کو دیکھو مشورہ دینے والا ہے۔ مگر کام کے وقت موت آجاتی ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ سارا

کام ...ریں۔ تدابیر بھی وہی سوچیں، چندہ بھی یہی جمع کریں۔ کام کو عملی جامہ بھی یہی پہنائیں، ...خود بن سنور کر آجائیں۔ (صفحہ ۱۵۱۔ جلد۵)

دوسروں کی فکر

...ے ماموں فرمایا کرتے تھے، میاں، دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت کی بدولت ...ٹھری نہ اٹھوا دینا۔ واقعی یہ بڑے کام کی بات ہے۔ لوگ دوسروں کی فکر میں ...اپنی فکر نہیں کرتے۔ جس سے دوسروں کی خفیف سی مصلحت تو محفوظ ہوجاتی ...غیر معمولی نقصان ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۵۔ جلد۴)

غلبہ، قلب کی قوت سے ہوتا ہے

...ت مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے کہ وہ دوسری قوموں کی روش اختیار کریں ...بیر یا ترقی کو اپنا ذریعہ ترقی سمجھیں۔ یا ان سے امداد کے خواہاں ہوں۔ ...تو اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا کرنا چاہیے۔ شرعی تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے۔ اپنے ...اموں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اسی میں ان کی خیر اور فلاح و بہبود ہے۔ اس ...ت بھی ہے تو شجاعت بھی، ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ غلبہ مادی سامان سے نہیں ...قلب کی قوت سے ہوتا ہے۔ اور قلب کی قوت، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ...حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ان کے احکام کے اتباع سے اور ...ہوئی تدابیر پر عمل کرنے سے بڑھتا ہے۔ یہ بات مسلمانوں کی دلوں میں کس ...ئے۔

...لہ کی تدابیر کو اتباع کی نیت سے نہ کریں۔ ایک تدبیر کا درجہ سمجھ کر ہی اختیار ...دوسری تدابیر بھی تو اختیار کی جارہی ہیں۔ ایک تدبیر یہ بھی سہی۔ (صفحہ

کامیابی وناکامی کا معیار

...رت کا مدار قلت وکثرت پر نہیں۔ وہ چیز ہی اور ہے۔ مسلمانوں کو صرف اسی ...کنا چاہیے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کا۔ پھر کام میں لگ جانا چاہیے۔ اگر ...تو شکر ادا کریں۔ ناکام ہوں تو صبر کریں۔ مومن تو حقیقت میں کبھی ناکام

ہوتا ہی نہیں۔ اگرچہ صورت ناکام ہوجائے، لیکن آخرت کا اجر تو اسے ہر وقت حاصل ہے۔ جو ہر مسلمان کا مقصود ہے "حضرت خالدؓ نے کفار کی ساٹھ ہزار فوج کے مقابلے کے لیے تیس آدمی تجویز کیے تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا کہ امت محمد ﷺ کو ہلاک کراؤ گے تب ساٹھ آدمی تجویز کیے۔ یعنی ایک ہزار کے مقابلے میں ایک آدمی۔ ان حضرات کو کثرت وقلت کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔

تحریر وتقریر میں معاندانہ روش اختیار کرنا

تقریر، (گفتگو اور تحریر) میں معاندانہ اور مخالفانہ طریقہ اختیار کرنے سے مخاطب کو وحشت ہوتی ہے اور وہ (فریق) اسے اپنی حقارت سمجھنے لگتا ہے اور اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے اس سے عداوت مزید پیدا ہوجاتی ہے۔ اور غلطی پر اصرار ہونے لگتا ہے۔ لہذا جب تک خاص ضرورت نہ ہو، خطاب اور (تحریر وغیرہ میں) نرم لب ولہجہ اختیار کرنا چاہیے۔ دیکھیے، حضور ﷺ سے زیادہ اصلاح کے طریقہ سے کون واقف ہوگا۔ لیکن حضور ﷺ کو مخلوق پر کتنی شفقت تھی، چنانچہ جب کفار نے حضور ﷺ کو سخت ایذا پہنچائی تو عرض کیا گیا کہ ان پر لعنت کیجیے اور بد دعا کیجیے اور جبرائیل علیہ السلام پہاڑ کے فرشتے کو لے کر نازل ہوئے، تاکہ آپ ﷺ سے اجازت لے کر وہ فرشتہ ان کفار کو ہلاک کردے۔ آپ ﷺ نے اس فرشتے سے فرمایا، نہیں، مجھے امید ہے کہ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہوں، جو اللہ تعالیٰ کی توحید کا علم تھامیں گے۔

باقی خطاب اور تحریر کے موقع پر معاندانہ طریقہ اختیار کرنا اور دوسروں کی تحقیر کرنا، یہ کام تو وہی شخص کرسکتا ہے، جو اپنے عیوب سے غافل ہو، دیکھیے، اگر دو شخصوں کو پھانسی کی سزا کا حکم ملا ہو، بعد میں ان میں سے ایک شخص کو رہائی کا حکم مل جائے تو کیا وہ شخص پھانسی کی سزا پانے والے دوسرے شخص پر ملامت کرے گا کہ تم نے ایسا جرم کیوں کیا کہ پھانسی کے سزاوار ہوئے، کیوں کہ وہ شخص سزا سے بال بال ہی بچا ہے۔ اور آئندہ کا حال معلوم نہیں۔ فلاں مقام پر چند گوجروں نے ایک مسلمان کو قتل کردیا تھا۔ مقدمہ چلا اور وہ گوجر ہائی کورٹ سے رہا ہوگئے۔ رہائی کی خبر سن کر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ اتنے میں نظر ثانی کی درخواست داخل ہوئی اور چند دنوں میں ہی انہیں دوبارہ پھانسی کا حکم ملا، اور پھانسی ہوگئی۔ تو یہاں اپنی حالت کی کیا خبر ہے کہ کل ہمارے ساتھ کیا ہوگا، جو دوسروں کو حقیر سمجھا

کام مولوی کریں۔ تدابیر بھی وہی سوچیں، چندہ بھی یہی جمع کریں۔ کام کو عملی جامہ بھی یہی پہنائیں۔ یہ خود بن سنور کر آجائیں۔ (صفحہ ۱۵۱۔ جلد۵)

دوسروں کی فکر

ہمارے ماموں فرمایا کرتے تھے، میاں، دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت کی بدولت کہیں اپنی گٹھری نہ اٹھوا دینا۔ واقعی یہ بڑے کام کی بات ہے۔ لوگ دوسروں کی فکر میں رہتے ہیں۔ اپنی فکر نہیں کرتے۔ جس سے دوسروں کی خفیف سی مصلحت تو محفوظ ہوجاتی ہے، لیکن اپنا غیر معمولی نقصان ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۵۔ جلد۴)

غلبہ، قلب کی قوت سے ہوتا ہے

یہ بات مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے کہ وہ دوسری قوموں کی روش اختیار کریں یا ان کی تدابیر یا ترقی کو اپنا ذریعہ ترقی سمجھیں۔ یا ان سے امداد کے خواہاں ہوں۔ مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا کرنا چاہیے۔ شرعی تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے۔ اپنے سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اسی میں ان کی خیر اور فلاح وبہبود ہے۔ اس تعلیم میں قوت بھی ہے تو شجاعت بھی، ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ غلبہ مادی سامان سے نہیں ہوتا، بلکہ غلبہ قلب کی قوت سے ہوتا ہے۔ اور قلب کی قوت، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ان کے احکام کے اتباع سے اور ان کی بتائی ہوئی تدابیر پر عمل کرنے سے بڑھتا ہے۔ یہ بات مسلمانوں کی دلوں میں کس طرح ڈالی جائے۔

اگر اللہ کی تدابیر کو اتباع کی نیت سے نہ کریں۔ ایک تدبیر کا درجہ سمجھ کر ہی اختیار کریں۔ آخر دوسری تدابیر بھی تو اختیار کی جارہی ہیں۔ ایک تدبیر یہ بھی سہی۔ (صفحہ ۱۲۴۔ جلد۴)

کامیابی وناکامی کا معیار

فتح ونصرت کا مدار قلت وکثرت پر نہیں۔ وہ چیز ہی اور ہے۔ مسلمانوں کو صرف اسی چیز کا خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کا۔ پھر کام میں لگ جانا چاہیے۔ اگر کامیاب ہوں تو شکر ادا کریں۔ ناکام ہوں تو صبر کریں۔ مومن تو حقیقت میں کبھی ناکام

ہوتا ہی نہیں۔ اگرچہ صورت ناکام ہوجائے، لیکن آخرت کا اجر تو اسے ہر وقت حاصل ہے۔ جوہر مسلمان کا مقصود ہے ''حضرت خالدؓ نے کفار کی ساٹھ ہزار فوج کے مقابلے کے لیے تیس آدمی تجویز کیے تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا کہ امت محمد ﷺ کو ہلاک کراؤ گے تب ساٹھ آدمی تجویز کیے۔ یعنی ایک ہزار کے مقابلے میں ایک آدمی۔ ان حضرات کو کثرت وقلت کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔

تحریر وتقریر میں معاندانہ روش اختیار کرنا

تقریر، (گفتگو اور تحریر) میں معاندانہ اور مخالفانہ طریقہ اختیار کرنے سے مخاطب کو وحشت ہوتی ہے اور وہ (فریق) اسے اپنی حقارت سمجھنے لگتا ہے اور اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے اس سے عداوت مزید پیدا ہوجاتی ہے۔ اور غلطی پر اصرار ہونے لگتا ہے۔ لہذا جب تک خاص ضرورت نہ ہو، خطاب اور (تحریر وغیرہ میں) نرم لب ولہجہ اختیار کرنا چاہیے۔ دیکھیے، حضور ﷺ سے زیادہ اصلاح کے طریقہ سے کون واقف ہوگا۔ لیکن حضور ﷺ کو مخلوق پر کتنی شفقت تھی، چنانچہ جب کفار نے حضور ﷺ کو سخت ایذا پہنچائی تو عرض کیا گیا کہ ان پر لعنت کیجیے اور بد دعا کیجیے اور جبرائیل علیہ السلام پہاڑ کے فرشتے کو لے کر نازل ہوئے، تاکہ آپ ﷺ سے اجازت لے کر وہ فرشتہ ان کفار کو ہلاک کردے۔ آپ ﷺ نے اس فرشتے سے فرمایا، نہیں، مجھے امید ہے کہ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہوں، جو اللہ تعالیٰ کی توحید کا علم تھامیں گے۔

باقی خطاب اور تحریر کے موقع پر معاندانہ طریقہ اختیار کرنا اور دوسروں کی تحقیر کرنا، یہ کام تو وہی شخص کرسکتا ہے، جو اپنے عیوب سے غافل ہو، دیکھیے، اگر دو شخصوں کو پھانسی کی سزا کا حکم ملا ہو، بعد میں ان میں سے ایک شخص کو رہائی کا حکم مل جائے تو کیا وہ شخص پھانسی کی سزا پانے والے دوسرے شخص پر ملامت کرے گا کہ تم نے ایسا جرم کیوں کیا کہ پھانسی کے سزاوار ہوئے، کیوں کہ وہ شخص سزا سے بال بال ہی بچا ہے۔ اور آئندہ کا حال معلوم نہیں۔ فلاں مقام پر چند گوجروں نے ایک مسلمان کو قتل کردیا تھا۔ مقدمہ چلا اور وہ گوجر ہائی کورٹ سے رہا ہوگئے۔ رہائی کی خبر سن کر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ اتنے میں نظر ثانی کی درخواست داخل ہوئی اور چند دنوں میں ہی انہیں دوبارہ پھانسی کا حکم ملا، اور پھانسی ہوگئی۔ تو یہاں اپنی حالت کی کیا خبر ہے کہ کل ہمارے ساتھ کیا ہوگا، جو دوسروں کو حقیر سمجھا

جائے۔ تقویٰ اور طہارت تو الگ چیز ہے، خود اپنا ایمان بھی اپنے اختیار میں نہیں۔ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں یہ دولت عطا فرما رکھی ہے۔ لیکن وہ جب چاہے، یہ دولت سلب کر سکتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۹۔ جلد ۱۰)

کامیابی کے لئے بنیادی شرط

حضور ﷺ کے زمانے میں غزوات میں کبھی کفار کو غلبہ ہوتا تھا تو کبھی مسلمانوں کو۔ مسلمانوں کا مغلوب ہونا خود مسلمانوں کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہوتا تھا۔ مسلمان اپنی کوتاہیوں کو محسوس کر کے، اپنی اصلاح فرما لیتے تھے، اس کے بعد وہ غالب آجاتے تھے۔ چنانچہ احد وحنین کی جنگ کے واقعات منقول ہیں۔ مگر ہماری حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ ہم شکست میں اپنے گناہوں کو نہیں دیکھتے، دن رات اللہ کی نافرمانیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن پروا بھی نہیں۔ جب کہ صحابہؓ کی حالت یہ تھی کہ حضرت عمرو بن العاص کی سرکردگی میں مصر کی فتح کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا، وہ ایک ماہ تک محاصرہ کرتا رہا۔ فتح حاصل نہ ہو سکی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؓ نے امیر لشکر کو لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں تقویٰ کی کمی ہوگئی ہے۔ آپ اس کا اعلان کریں کہ سب اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں۔ دیکھئے، صحابہؓ اس زمانے میں بے سروسامان تھے اور محاصرے کو ابھی مہینا ہی گذرا تھا، لیکن اس کے باوجود عمر فاروقؓ کو تعجب ہوا کہ فتح میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی ہے۔ نیز اس تاخیر کو بے سروسامانی پر محمول کرنے کی بجائے اس کا سبب دین کی کمزوری کو تصور کیا اور اس پر توجہ دلائی۔ چنانچہ سب نے مل کر توبہ کی، اس کے بعد جو حملہ کیا ہے تو ایک دن میں ہی شہر فتح ہوگیا۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ مسلمان (دشمن سے مقابلے کے سلسلے میں) دوسری تدابیر تو اختیار کرتے ہیں، لیکن گناہوں سے باز نہیں آتے اور توبہ نہیں کرتے۔ (صفحہ ۱۵۱۔ جلد ۱۰)

دعوت وتبلیغ اور قرآن فہمی کے مسائل

موجودہ درس وتدریس تو مقصد کا ابتدائیہ ہے۔ اصل مقصد تو دعوت وتبلیغ کا کام ہے، لیکن آج کل درس وتدریس کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے اور دعوت وتبلیغ کے کام سے کوتاہی برتی جارہی ہے اور اکثر علماء تبلیغ کی فضیلت سے محروم ہیں۔ حضرات انبیاء کرام کا

کام درس وتبلیغ ہی تھا۔ درس وتدریس اور علوم سے فراغت کے بعد دعوت وتبلیغ کا بھی فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔ یہ دونوں فریضے ادا ہونے چاہئیں۔ ایک کام کی طرف متوجہ ہو کر دوسرے فریضہ سے غفلت برتنا، یہ عظیم کوتاہی ہے۔ علماء کو اپنا وقت تبلیغ کے کام میں بھی صرف کرنا چاہیے۔ اس کی آسان اور بہتر صورت یہ ہے کہ مدارس کی طرف سے کچھ مبلغ مقرر کیے جائیں۔ اہل مدارس پڑھنے پڑھانے میں جو وقت صرف کرتے ہیں، اس کا آدھا حصہ بھی دعوت وتبلیغ کے کام میں صرف نہیں کرتے، یہ کوتاہی دور ہونی چاہیے۔ (صفحہ ۸۲ جلد ۶)

دعوت وتبلیغ کا کام اور اسکی شرائط

جس کے ذمہ افتاء وتبلیغ وتعلیم کا کام سپرد ہو، اسے کسی کی گواہی نہ دینی چاہیے اور اسے کسی کے معاملے کا فیصلہ کنندہ بھی نہیں بننا چاہیے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے وہ فریق بن جائے گا اور ایک جماعت میں شمار کر لیا جائے گا۔ اس طرح دوسری جماعتوں کے مسلمان، اس کے فیوض وبرکات سے محروم ہوجائیں گے۔ میں جھگڑوں میں فیصل بننے سے ہمیشہ احتراز کرتا ہوں۔ اس میں دین کا بڑا ضرر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہر شخص آزاد ہے۔ نہ تو اعتقاد ہے اور نہ ہی محبت، ایسی صورت میں لوگوں کے معاملات میں نہ پڑنا چاہیے۔ (صفحہ ۲۹۶ جلد ۷)

نصیحت کرنا ہر شخص کا کام نہیں، اس کی بھی شرائط ہیں۔ ان شرائط کے بغیر نصیحت کرنا ایسا ہے، جیسے وضو کے بغیر نماز پڑھنا۔ یہاں ایک مقیم شخص نے دوسرے کو نصیحت کی، جو یہاں کی تربیت اور قواعد کی مصلحتوں کے خلاف تھا، میں نے اس سے مواخذہ کیا، انہوں نے یہ جواب دیا کہ دینی خدمت سمجھ کر نصیحت کی تھی۔ میں نے کہا، نماز دین ہے، مگر اس کی بھی شرائط ہیں۔ اسی طرح دعوت وتبلیغ کی بھی شرائط ہیں۔ کیا وہ شرائط تمہیں معلوم ہیں۔ کہنے لگے، نہیں۔ میں نے کہا، جب تمہیں شرائط معلوم نہیں تو تم نے جو نصیحت کی، اس کے بارے میں تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ دین ہے، انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا کہ وہ شرطیں یہ ہیں۔ ادنیٰ شرط یہ ہے کہ جس کو نصیحت کی جائے، عین نصیحت کے وقت یہ سمجھا جائے کہ میں درجے میں اس سے کم تر ہوں اور وہ مجھ سے افضل ہے تو تم نے جس وقت ان کو نصیحت کی تھی، قسم کھا کر بتاؤ کہ کیا اس وقت تمہارے

دل میں یہ احساس تھا کہ میں اس سے ارذل ہوں، حقیر ہوں اور یہ مجھ سے افضل ہے۔ یا اس کے برعکس خیال تھا۔ کہنے لگے، اس کے برعکس خیال تھا۔ میں نے کہا پھر تو یہ تکبر ہوا، جو معصیت ہے، جب کہ تم کہتے ہو کہ تم نے دین سمجھ کر نصیحت کی۔ کیا جو چیز تکبر ہو، وہ دین ہوسکتی ہے۔ اب یہ دیکھو کہ تمہارے اندر تکبر کس چیز سے پیدا ہوا۔ یہ ذکر فکر سے پیدا ہوا، اسی سے تم اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگے۔ اس لیے آج سے ذکر وفکر کرنا چھوڑ دو، یعنی ایک جگہ بیٹھ کر ذکر فکر نہ کرو، چلتے پھرتے کیا کرو۔ تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ خانقاہ والوں کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھا کرو۔ اور ان کے وضو کے لیے لوٹے بھرا کرو، انہوں نے دس روز تک ایسا کیا، اس کے بعد ان کی یہ بیماری دور ہوئی۔ نفس اس طرح ڈھیلا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص لوگوں سے کہتا تھا کہ مجھے دس سال میں وہ نفع نہ ہوتا، جو دس دن میں ہوا۔

ایک شخص کا کہنا تھا کہ میں ایک گناہگار سے اپنے آپ کو کمتر کیسے سمجھوں۔ مثلاً میں نے نماز پڑھی، دوسرے نے نہ پڑھی، اب بے نمازی کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر کیسے سمجھا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بادشاہ نے کسی جرم کی بناء پر بھنگی کو شہزادے کو بید لگانے کا حکم دیا۔ اب بتاؤ، بید لگاتے وقت کیا بھنگی اپنے آپ کو شہزادے سے افضل سمجھے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی خیال کرے گا کہ شاہی، حکم کی بناء پر بید لگا رہا ہوں۔ ورنہ شہزادہ، شہزادہ ہے، جب کہ میں بھنگی ہوں۔ یعنی یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں۔ یعنی مجرم کو مجرم بھی سمجھا جائے اور اپنے آپ کو کمتر بھی۔ (صفحہ ۶۲۳ جلد ۷)

دعوت وتبلیغ کا کام اور اس کے نتائج

تبلیغ کے بھی کچھ حدود واصول ہیں۔ اس سلسلے میں ایسی پاکیزہ تعلیم دی گئی ہے کہ بڑے بڑے فلاسفر اس کی مثال پیش نہیں کرسکتے۔ قرآن مجید میں حضور ﷺ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ کفار ایمان ہی لے آئیں، آپ کا کام حکم پہنچا دینا ہے۔ اس تعلیم میں حکمت یہ ہے کہ کہیں نتائج کو مقصد نہ سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ اس تعلیم کی وجہ سے نہ الجھن ہوسکتی ہے اور نہ ہمت ٹوٹ سکتی ہے۔ تبلیغ کا کام کرتے رہنا، بذات خود مستقل خدمت ہے۔ اس کا مقصد اللہ کو راضی کرنا ہے اور یہ کام ہر وقت ہوسکتا ہے، خواہ تبلیغ مؤثر ہو یا نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ جو کام اختیاری ہیں، اس کی تو تکمیل ہوسکتی ہے،

لیکن جو کام بس سے باہر ہوں، ان کی فکر میں پڑ کر فرد اصل مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ سو تبلیغ کرنا تو اختیاری کام ہے، اس کے نتائج ظاہر ہونا یہ غیر اختیاری ہے۔ تو اختیاری کام کرنا چاہیے اور غیر اختیاری کام کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، ورنہ اختیاری کام بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۹ جلد ۴)

ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔ دعوت کا کام قلیل جماعت سے بھی ہوسکتا ہے، اس کے لیے کثیر جماعت کا ہونا ضروری نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ دعوت کے کام میں اللہ کی رضا مقصود ہونا چاہیے۔ یہی وہ بات ہے، جس کی آج کل کمی ہے۔ جب تک مسلمانوں میں رضائے الٰہی کا جذبہ موجود رہا، یہ دنیا پر غالب رہے۔ طلیحہ بن خویلد نے اپنے وزیر سے پوچھا تھا کہ ہمارے پاس سارا سامان اسلحہ وغیرہ موجود ہے، کثرت جماعت ہے۔ اس کے باوجود مسلمان ہم پر غالب آ جاتے ہیں، اس کا کیا سبب ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں اور ہمارے درمیاں ایک چیز کا فرق ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرد اپنے ساتھی سے پہلے مرنا چاہتا ہے اور دوسرے کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں ہر فرد خود تو زندہ رہنا چاہتا ہے، دوسرے کو موت کا شکار بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے ان پر کوئی طاقت غالب نہیں ہوسکتی۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بادشاہ نے کسی کی شکایت اور چغلی پر چند صوفیہ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جلاد نے جب ایک کی گردن مارنی چاہی تو دوسرا کہنے لگا، پہلے میری گردن اڑا دو، جب دوسرے کو قتل کرنا چاہا تو تیسرے نے کہا۔ مجھے پہلے قتل کرو۔ اس طرح جلاد چکرا گیا اور بادشاہ کو اطلاع دی، بادشاہ نے جان سے ان کی بے نیازی دیکھ کر انہیں چھوڑ دیا۔ (صفحہ ۲۴۰ جلد ۴)

دعوت وتبلیغ

دین میں دعوت وتبلیغ اصل ہے، درس وتدریس اس کے مقدمات ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ بلاضرورت کسی الجھن میں مبتلا نہ ہوا جائے۔ ایسی صورت میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ میں ایک بار ریل میں سفر کر رہا تھا۔ ہر موقع پر یہ خیال رہتا تھا کہ لوگوں کو تبلیغ کرنا چاہیے۔ ایک شخص کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اس کو درست کر لینا۔ اس نے چھوٹتے ہی شریعت کو ماں کی گالی دی۔ اس روز سے میں نے بلاضرورت لوگوں سے کہنا چھوڑ دیا ہے، پہلے تو صرف گناہ سرزد ہوتا تھا۔ اس

صورت میں کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۵۔ جلد ۴)

قرآن اپنے طور پر پڑھنا

جب کوئی کام بے قاعدہ اور بے اصول کیا جائے گا تو اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی ہوگا، آج کل کسی استاد سے ترجمہ پڑھنے کی بجائے خود ہی پڑھتے ہیں۔ فن نہ جاننے کی وجہ سے اگر شبہات پیدا ہوجاتے ہیں تو جاننے والے سے پوچھتے بھی نہیں، نتیجۃ وہ شبہات مستحکم ہوجاتے ہیں۔ جب کہ انگریزی جاننے کے لیے (ترجمہ والی کتاب کی بجائے) استاد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مقصد کے لیے سالہا سال صرف کیے جاتے ہیں، حالانکہ زبان سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے چھ ماہ کافی ہیں۔ لیکن اسکولوں اور کالجوں میں دس دس سال صرف کیے جاتے ہیں۔ آخر قرآن شریف کے لیے استاد اور وقت کی ضرورت کیوں نہیں، مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد کی بجائے اپنے طور پر قرآن شریف کو ترجمہ سے سمجھنا، ہدایت کی بجائے گمراہی کا ذریعہ بنتا ہے۔ دیکھیے، اردو میں اقلیدس بھی ہے، آخر اس کی شکلوں کو ماہر استاد کی مدد کے سوا اپنے طور پر کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ (صفحہ ۱۰۲۔ جلد ۵)

ھدی للمتقین

ایک بار ایک صاحب نے مولانا محمد قاسمؒ صاحب سے سوال کیا کہ یہ جو قرآن کے متعلق ارشاد ہے کہ ھدی للمتقین. سو متقین تو پہلے سے ہدایت پر ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوا۔ مختلف حضرات نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا۔ یہاں تقویٰ سے مراد اس کے اصطلاحی معنیٰ نہیں، بلکہ لغوی معنی ہیں۔ یعنی خوف اور کھٹک، تو آیت کے معنیٰ یہ ہوئے، جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے، فکر ہے، اور اضطراب ہے، اپنی اصلاح کا، قرآن ان کو ہدایت کرتا ہے، باقی جو شخص اپنی اصلاح کا ارادہ ہی نہ کرے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے، قرآن کا اس میں کیا قصور ہے۔ جب میں نے مولانا محمد قاسم صاحب کا یہ جواب سنا تو فوراً اس کی تائید میں قرآن کی ایک آیت سمجھ میں آئی۔ سورۃ اللیل میں ارشاد ہے۔ فاما من اعطیٰ والتقی وصدق بالحسنیٰ اس کے بعد ارشاد ہے۔ واما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ (اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا)۔

یہاں صفت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے، دوسری آیت میں اس کے مقابل بخل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اعطاء اور بخل میں تقابل ظاہر ہے۔ اس طرح پہلی آیت میں کذب ہے تو دوسری میں صدق، کذب اور صدق میں بھی تقابل موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں استغنیٰ ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل کوئی لفظ ہونا چاہیے۔ وہ لفظ اتقی ہے، پس اس تقابل کی وجہ سے یہاں تقویٰ کے وہ معنیٰ مراد ہوں گے، جو استغنیٰ کے مقابل ہوں یعنی بے فکری۔ تو یہاں تقویٰ کے معنیٰ ہوں گے، فکر اور کھٹک، ورنہ فصاحت کے خلاف ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ متقین کے وہ معنیٰ جو مولانا محمد قاسمؒ صاحب نے بیان فرمائے، وہ قرآن سے ثابت ہے۔ اب میں ان لوگوں سے جو محض ترجمہ کے مطالعہ سے قرآن کا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں، دریافت کررہا ہوں کہ کیا وہ اس اشکال کو محض ترجمہ سے حل کرسکتے ہیں۔ (صفحہ ۲۷۶۔ جلد ۱۰)

قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط

قرآن وحدیث کے متعلق دو چیزیں ہیں۔ ایک تو ان سے مسائل کا استنباط ہے، دوسرے تذکرہ وتذکیر، تو قرآن کو آسان فرمایا گیا ہے، وہ نصیحت اور تذکر کے لیے ہے۔ چنانچہ آیت میں یسرنا کے بعد الذکر کا لفظ موجود ہے۔ اسی سلسلے کی ایک دوسری آیت ہے۔ وانما یسرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ اس میں تصریح ہے کہ قرآن تبشیر انذار کے لیے آسان کیا گیا ہے۔ جہاں تک استنباط مسائل کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں قرآن وحدیث میں کہیں بھی ارشاد نہیں ہے کہ وہ آسان ہے۔ بلکہ قرآن وحدیث میں صراحت ہے کہ احکام کا استنباط صرف محققین کا کام ہے۔ ہر شخص اس کا اہل نہیں ہے۔

پانچویں پارے میں ارشاد ہے: واذا جآء ھم امر من الامن او الخوف اذاعو بہ ولو ردوہ الی الرسول والیٰ اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم. اس آیت کا شان نزول بالاتفاق یہ ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں جب جہاد وغیرہ ہوتا تھا تو جہاد سے جو خبریں آتی تھیں، بعض لوگ ان خبروں کو بلا تحقیق پھیلا دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم (یعنی) جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھے رہتے (اور لڑنے سے جی چراتے ہیں) اور کوئی عذر نہیں رکھتے، وہ اور جو خدا کی راہ

میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں، وہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ اس آیت میں ارشاد ہے کہ جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے، خواہ وہ امن کی ہو یا خوف کی تو اس کو مشہور کردیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اسے ایسے لوگوں کے پاس لے جاتے، جو ایسے امور کو سمجھتے ہیں تو وہ یہ بتادیتے کہ کون سی خبر قابل اشاعت ہے، کون سی نہیں۔ یہاں یستنبطونہ منھم فرمایا گیا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان میں سے بعض اہل استنباط ہیں، سب نہیں۔ حالانکہ جنگ کی خبروں کا تعلق شرعی احکام سے نہیں تھا، بلکہ واقعات سے تھا، جو احکام کے مقابلہ میں غیر اہم ہیں۔ جب ایسی خبروں کے بارے میں قوت استنباط کی اہمیت بیان کی گئی تو ظاہر ہے قرآن وحدیث سے احکام کا استنباط تو بدر جہا مشکل کام ہے، اس کا اہل ہر شخص کیسے ہوسکتا ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ کے زمانے کا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ لایستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاھدون نازل ہوئی۔ جس میں مجاہدوں کی، بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں افضلیت بیان کی گئی ہے۔ اس وقت اس آیت میں غیر اولی الضرر کا لفظ نہیں تھا۔ اس لیے صحابہؓ تک نہ سمجھ سکے کہ یہ حکم مخصوص ہے، قائدین غیر اولی الضرر کے ساتھ۔ حالانکہ لغوی حقیقت اور عذر کے نصوص کی بنا پر قائدین سے مراد یہاں وہی لوگ ہوسکتے تھے، جو بلا کسی عذر کے جہاد میں شریک نہ ہوسکے ہوں، ورنہ معذروین تو ہیں قائدین نہیں۔ مگر اس کے باوجود صحابہؓ اس کو نہ سمجھ سکے، اس لئے سوال کیا، جس پر غیر اولی الضرر بعد میں نازل ہوا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ فہم احکام کے لیے محض زبان دانی کافی نہیں۔ (صفحہ ۲۷۳۔ جلد دہم)

حدیث کا علم اور فہم

میرے پاس ایک غیر مقلد مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان کی موجودگی میں ایک شخص آیا، اس نے کہا کہ مجھ پر نفسانی خواہش کا غلبہ ہے۔ نکاح کی وسعت نہیں، مجھ سے پوچھا کہ ایسی حالت میں میں کیا کروں، میرے جواب دینے سے پہلے ہی غیر مقلد صاحب کہنے لگے، تم روزے رکھا کرو، حدیث میں اس کا یہی علاج بتایا گیا ہے، اس نے کہا کہ میں نے روزے بھی رکھے ہیں۔ مگر ان سے کوئی فائدہ نہ ہوا، جب وہ غیر مقلد صاحب خاموش ہوگئے تو میں نے اس شخص سے سوال کیا کہ تم نے کتنے روزے رکھے تھے، اس نے کہا، کبھی دو تین رکھ لیے، کبھی چار پانچ، میں نے کہا کہ حدیث میں ہے "فمن لم

یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاع" (جو شخص طاقت نہیں رکھ سکتا، اس پر روزہ ہے، بیشک یہ اس کا متبادل ہے) یہ بات میں نے غیر مقلد کو بتانے کے لیے کہی کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں کثرت سے اور مسلسل روزے رکھنا مفید ہوتا ہے۔ کبھی کبھار روزے رکھنا اس کا علاج نہیں۔ ان کو حیرت ہوئی کہ حدیث میں تو کثرت کا ذکر ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ علیہ لزوم پر دال ہے۔ اور لزوم کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک اعتقادی، ایک عملی۔ یہاں اعتقادی درجہ تو مراد نہیں، کیوں کہ یہ روزہ فرض نہیں، بلکہ عملی درجہ مراد ہے اور وہ تکرار سے ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی ظاہرا تائید رمضان شریف کے روزوں سے ملتی ہے۔ رمضان شریف میں شروع کے روزوں سے تو بہیمانہ قوت میں مزید ار تعاش پیدا ہوتا ہے۔ لیکن روزوں سے رفتہ رفتہ بہیمانہ قوتیں کمزور ہونے لگتی ہیں۔ آخر میں وہ بڑی حد تک کمزور ہوجاتی ہیں۔ میری اس گفتگو سے اس غیر مقلد مولانا کی آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھئے۔ حدیث تو انہوں نے پڑھ دی، لیکن اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔

قرآن کے ایک نکتہ کی وضاحت

قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے۔ فاتقو الله حق تقاته اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔ فاتقوا الله ماستطعتم۔ عموماً مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلی آیت دوسری آیت کی ناسخ ہے۔ لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ دوسری آیت اصل میں پہلی آیت کی توضیح وتشریح ہے، نہ کہ ناسخ، چوں کہ اس میں امر کا صیغہ اختیار فرمایا گیا ہے۔ امر گو حقیقت میں عموماً فور کو مقتضی نہیں ہوتا، لیکن محاورات میں متبادر فور ہی ہوتا ہے۔ اس لیے صحابہؓ غایت خشیت سے یہی سمجھے کہ تقویٰ کا حق اختیار کرنے کا جو حکم ہے، وہ فوری ہے۔ چوں کہ فوری طور پر تقویٰ کا حق اختیار کرنا استطاعت سے باہر تھا۔ اس لیے یہ آیت سن کر وہ پریشان ہوئے کہ فوراً اس درجہ کا تقویٰ کیسے اختیار کرسکیں گے۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔ اس میں یہ تفسیر کردی گئی کہ کامل تقویٰ اختیار کرنے کا فوری حکم نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ استطاعت کے مطابق کوشش کرو، رفتہ رفتہ کامل تقویٰ اختیار کرو۔ رہا روایات میں نسخ کہنا، سو نسخ متقدمین کی اصطلاح میں رفع حکم اور توضیح حکم کے لیے ہے۔ یعنی رفع حکم کو ہی نسخ نہیں کہتے، بلکہ حکم کی توضیح کو بھی نسخ سے ہی تعبیر کرتے ہیں۔ (صفحہ ۲۰۳۔ جلد ۱۰)

حکمت و دانائی کے نکات

تجربے و بصیرت کی باتیں

جہاد و قتال کا مقصد

ایک فاضل فلسفی (عبدالماجد دریا آبادی، مرتب) نے یورپ کے شبہات سے متاثر ہوکر پوچھا ہے کہ جہاد کیا چیز ہے؟ میں نے جواب دیا ہے کہ چوں کہ حق کی اشاعت ضروری ہے اور اس کے راستے میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ اس وقت ہوسکتا ہے، جب کفار مغلوب ہوکر رہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ یا تو وہ جزیہ دیں، اس سے بھی وہ مغلوب سمجھے جائیں گے۔ لیکن اگر وہ جزیہ نہ دیں تو پھر ان سے قتال ہوگا۔ یہ ہے جہاد کی حقیقت، کہنے لگے، اگر کفار صلح کرلیں تو اس سے اشاعت اسلام کی رکاوٹیں دور ہوجائیں گی، میں نے کہا، صلح کرنے سے وہ مغلوب نہ ہوں گے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں وہ جب چاہیں گے، صلح توڑ سکتے ہیں، اس لئے مغلوب ہونے کا جو مقصد ہے، وہ صلح سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ (صفحہ ۱۹۷-جلد ۶)

جہاد دفع شر کا ذریعہ ہے

بعض لوگ جو اسلام کے بڑے خیر خواہ اور ہمدرد بنتے ہیں، کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں پھیلا، بلکہ یہ ایک وحشیانہ حرکت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاد (بمعنی قتال) اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں (یعنی جہاد کا مقصد اشاعت اسلام نہیں) ورنہ جزیہ ضروری نہ ہوتا، مگر شر کو دفع کرنے کے لئے جہاد کرنا، کیا یہ وحشیانہ حرکت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پوری دنیا دفع شر کے لئے قتال کی قائل کیوں ہے۔ اور اس کے لئے جنگیں کیوں کرتی ہے۔ جب دنیا کر رہی ہے تو پھر اسلام پر ہی اعتراض کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ دفع شر کے لئے جہاد ایک فطری امر ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسلام ایک بات کہے تو اسے وحشیانہ حرکت کہا جائے اور دنیا خود ایسا کرنے لگے تو اسے انسانی حرکت سمجھا جائے۔ (صفحہ-جلد ۸)

کفار کے ساتھ جہاد کی حقیقت

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کے ساتھ قتال جہاد اصغر ہے اور نفس کے ساتھ مجاہدہ جہاد اکبر ہے۔ گویا کفار کے ساتھ مقاتلہ، مجاہدۂ نفس سے جو خلوت میں ہو، درجہ میں گھٹا ہوا سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں، بلکہ کفار کے ساتھ وہ جہاد جس میں اخلاص نہ ہو، وہ تو نفس کے ساتھ مجاہدہ کے مقابلہ میں کمتر ہے اور مجاہدۂ نفس اس سے افضل ہے۔ کفار کے ساتھ ایسے جہاد کو جہاد اصغر اور اس کے مقابلے میں مجاہدۂ نفس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔ لیکن کفار کے ساتھ اخلاص کے ساتھ جو قتال ہو، وہ جہاد اکبر ہی ہے۔

کفار کے ساتھ جہاد کی حقیقت

ایسے قتال اور جہاد کو جہاد اصغر کہنا، یہ غیر محقق صوفیاء کا غلو ہے۔ ایسا قتال، اس مجاہدۂ نفس سے جو خلوت میں ہو، افضل ہے۔ کیوں کہ کفار کے ساتھ جو قتال اخلاص کے ساتھ ہوگا، اس میں مجاہدۂ نفس بھی شامل ہوگا۔ ایسے قتال میں دونوں کی فضیلت شامل ہوجائے گی۔ (صفحہ ۳۰۰ جلد ۸)

فساد اور کفر کو روکنے کے لئے قوت کی ضرورت

ان چیزوں (فساد) کو روکنے کی اور کوئی صورت نہیں، ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ سیف ہاتھ میں ہو، قوت ہو، مقابلہ ہو، اس کے علاوہ دوسری صورت نہیں اور یہ بظاہر متوقع نہیں (یعنی قوت کے حصول کی بظاہر صورت موجود نہیں) بس اب تو یہی ہوسکتا ہے کہ خدا سے دعا کی جائے۔ چہار طرف سے گمراہی کے پھاٹک کھلے ہوئے ہیں۔ اسلامی ممالک اور اسلامی حکومتیں خود لادینیت کا شکار بنی ہوئی ہیں، خدا کے دین کے دشمن، دنیا میں بھرے ہوئے ہیں۔ حامی اور ناصر کوئی نظر نہیں آتا۔ خود مسلمان ہی اسلام کو پامال کر رہے ہیں، دوسروں کی کیا شکایت کی جائے، ایک دم سے بہت زبردست انقلاب برپا ہوگیا۔ (صفحہ ۲۸۶ جلد ۷)

اصلاح کے لیے مصلح کی ضرورت

دوسروں کی اصلاح کے لئے صالح ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ مصلح کی ضرورت ہے۔ جس طرح مریض کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ اس کا معالج (اور ڈاکٹر) تندرست ہو (تب اس سے علاج کرایا جائے) بلکہ اس کا طبیب ہونا کافی ہے۔ اس لئے کہ ہر تندرست

فرد طبیب نہیں ہوتا (اسی طرح ہر صالح آدمی مصلح نہیں ہوسکتا) (صفحہ ۳۳ جلد ۵)

غیر محقق شخص کی صحبت کے اثرات

ایک شخص جو پہلے غیر محقق بزرگ سے بیعت تھے، ان کے بارے میں فرمایا، اب چاہے اسے کتنی ہی مفید صحبت حاصل ہو اور کیسی ہی اصلاح کی جائے، مگر اس کے مزاج میں پہلے کی صحبت کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود رہیں گے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ مختلف محقق بزرگوں کی خدمت میں رہ کر بھی مذاق فاسد ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ کسی غیر محقق سے تعلق رہا ہو۔ اس صحبت کے نتیجہ میں مزاج میں جو بری باتیں پیدا ہو چکی ہیں، ان کا اثر موجود ہوتا ہے، چاہے ان کے صدور کی نیت نہ ہو، مگر بری باتیں تو بلانیت بھی بری ہیں۔ اس لیے شروع میں ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ صحیح فرد کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے۔ کسی اہل باطل کے ہاتھ میں پھنس جانے کی وجہ سے اصلاح کے بعد بھی وہ رنگ ضرور موجود رہتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جب ہنڈیا پک گئی اور خراب بھی ہوگئی ہے تو ٹھیک کرنے کے باوجود وہ خراب رہتی ہے۔ ایک دوسری مثال بھی ہے، وہ یہ کہ ایک تو کنواری لڑکی سے شادی کی جائے اور ایک بیوہ عورت سے۔ کنواری لڑکی کو جس ڈھنگ پر چاہو، لے آؤ، لیکن بیوہ عورت وہ چاہے دوسرے خاوند سے از حد محبت ہی کیوں نہ کرتی ہو، مگر اس میں پہلے خاوند کی صحبت اور تربیت کے اثرات ضرور موجود رہتے ہیں۔ اسی طرح جو مرید پہلے کسی شخص سے متعلق رہ چکا ہو، خواہ اس کی کیسی ہی اصلاح ہو جائے، مگر اس کے مزاج اور تربیت میں پہلے شیخ کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ضرور رہیں گے۔ اس لیے ابتدا ہی میں سوچ سمجھ کر کسی سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ (صفحہ ۱۱ جلد ۸)

کام کا آغاز تھوڑی مقدار سے ہونا چاہیے

یہ بڑی غلطی ہے کہ ایک دم بڑا کام شروع کر دیا جاتا ہے، جس کام کو سنبھالا نہ جاسکے، وہ کام کیوں کر ہاتھ میں لیا جائے۔ اگر چھوٹے پیمانے پر کام شروع کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت فرماتے ہیں، وہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے، جیسے بچہ بتدریج پرورش پاتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے ہر کام میں جوش ہی جوش ہے، ہوش باقی نہیں، کام شروع کرتے وقت تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کو شاید منتہا سے بھی آگے پہنچا دیں گے۔ لیکن تھوڑا ہی وقت گذرنے کے بعد خبرے نباشد۔ سوڈے کی بوتل کا سا جوش ہوتا ہے۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ چھوٹا سا کام بھی نہیں رہتا۔ (صفحہ ۲۸۱ جلد ۷)

ہر چیز طلب سے ملتی ہے

اصل چیز طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ طلب کی بنا پر ہی عطا فرماتے ہیں، جیسے بچے کو ماں کے دودھ کی طلب ہوتی ہے تو وہ دودھ اس کی طلب کی بنا پر اترتا ہے۔ اس پر ماں کو ناز نہ کرنا چاہیے کہ میں دودھ دیتی ہوں، اس لئے کہ دودھ تو بچے کی طلب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ البتہ بچے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماں کو اپنا محسن سمجھے۔ ایک بار حضرت حاجی صاحب امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شیخ اپنے پاس سے کچھ نہیں دیتا، بلکہ مرید میں سب ذخیرہ موجود ہوتا ہے، اس کا ظہور شیخ کی وساطت سے ہوتا ہے، البتہ مرید کو اپنے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ (اس لئے کہ کہیں اس کے اندر فخر نہ پیدا ہو جائے) (صفحہ ۲۲۸ جلد ۷)

علماء اور مالداروں کی صحبت

علماء کے اندر دو چیزیں نہ ہونی چاہیں۔ ایک کبر دوسری طمع، ان دو کمزوریوں کی وجہ سے بڑی دولت سے محرومی ہوتی ہے۔ علماء کو مالداروں سے بے پروا ہونا چاہیے۔ مالدار لوگ مولویوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ وہ مولویوں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ مولوی طمع اور لالچ رکھتے ہیں۔ چناں چہ اس سے ان کے دلوں میں علم اور اہل علم کی تحقیر اور حقارت پیدا ہوجاتی ہے۔ علماء کو ہر وقت اس آیت کا مراقبہ کرنا چاہیے۔ وللہ خزائن السماوات والارض. دین میں ضرور محبوبیت کی شان ہے، اگر علماء اپنی وضع پر رہیں تو وہ ضرور محبوب ہوں گے۔ (صفحہ ۲۴۷ جلد ۷)

مجھے امراء سے نفرت تو نہیں ہوتی، لیکن انقباض ہوتا ہے، میں جب کسی امیر کے پاس بیٹھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو، آج کل کے امراء تو اکثر متکبر ہوتے ہیں، وہ اہل دین کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں ہمیشہ علماء کو بالخصوص اہل مدارس کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ مالداروں سے چندہ نہ مانگیں، مگر وہ سمجھتے ہیں کہ چندے کے بغیر مدرسہ نہیں چل سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ مدرسہ کی کوئی خاص حد فرض یا واجب تو نہیں۔ تھوڑی سی آمدنی میں اگر مختصر مدرسہ ہو تو وہ بھی کافی ہے، آپ کے نزدیک جس طرح مدرسہ ضروری ہے، اسی طرح دین کی وقعت اور عظمت کی حفاظت بھی تو ضروری ہے۔ پھر مدرسہ کا کام تو غرباء سے بھی چل سکتا ہے، چندہ غریبوں سے کرلو۔ (صفحہ ۳۰۵ جلد ۲)

ایک بزرگ سے میں نے اپنے مدرسے کی بے سروسامانی کا ذکر کیا تھا، انہوں نے فرمایا تھا، جس قدرت نے تمام عالم سنبھال رکھا ہے، کیا وہ آپ کے ذرا سے مدرسے کو نہ سنبھال سکے گی، کیسا کم ہمتی کا خیال ہے۔ (صفحہ ۳۲۳ جلد ۲)

اصل چیز

مین بقسم کہتا ہوں کہ اگر مسلمان، اللہ کو راضی کرلیں تو ساری دنیا پر غلبہ اور عزت انہیں کو حاصل ہو اور ساری دنیا کے وہی مالک ہوجائیں۔ تدابیر یقیناً اختیار کرنی چاہیے، لیکن ان تدابیر کے ساتھ نظر اللہ کی ذات پر ہونی چاہیے۔ اس کو فرماتے ہیں:

عقل در اسباب می دارد نظر
عشق می گوید مسبب رانگر

عقل اسباب پر نظر رکھتی ہے اور عشق کہتا ہے کہ اسباب کے پیدا کرنے والے کو دیکھو۔ (۲۴۰ جلد ۴)

اقتدار کے طالب لیڈر کی حیثیت

یہ صاف بات ہے کہ جو شخص پورے ملک (کے اقتدار کا) خواہش مند ہو، اس کو عاقل کیسے کہا جاسکتا ہے، جب سود کے طور پر دو چار روپیہ بٹور کر کمانے والے کو عاقل نہیں کہتے تو جو شخص ایک صوبہ یا ملک کے حصول کا خواہشمند ہو، اسے عاقل کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اہل دنیا کے اپنے ہی اس قول کو دہراتا ہوں کہ سو روپیہ میں ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے اور نشہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عقل کو زائل کر دیتا ہے، تو ایک ہزار روپے سے دس بوتلوں کا نشہ ثابت ہوا۔ حیرت ہے کہ جو مہاجن اور شاہوکار سود کے ذریعہ چندروپے تم سے اینٹھنے کی فکر میں ہو، وہ تو کم عقل ہو، لیکن جو شخص سارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہو اور تمہارے ایمان کو برباد کرنے کی فکر میں ہوا، اسے عقل مند اور اپنا خیر خواہ شمارہ کیا جائے۔ (صفحہ ۱۰۵ جلد ۵)

مسلمانوں کے اجتماعیت کا راز

اس گئے گذرے دور میں بھی مسلمانوں کے اندر دوسروں سے زیادہ حکومت کرنے کی صفات موجود ہیں۔ مثلاً عدل و انصاف اور رحم کی صفت وغیرہ۔ بس کمی یہ ہے کہ نظم نہیں اور نظم نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان میں اتفاق اور اتحاد نہیں، اور اتحاد اتفاق کی بنیاد تواضع

ہے۔ اگر ہر شخص دوسرے کو افضل سمجھنے لگے تو پھر نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیونکہ نااتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھتا ہے اور اس سے بڑا بننا چاہتا ہے۔ تواضع اور انکساری و عاجزی اختیار کرنا یہ اختیاری چیز ہے (ہر شخص یہ رویہ اختیار کرسکتا ہے) دوسروں کے ساتھ تو تواضع کا برتاؤ اختیار کرنا چاہیے۔ چاہے نفس کو کتنا ہی ناگوار گذرے۔ اسی سے تواضع کی صفت پیدا ہوجائے گی، اگر یہ صفت پیدا نہ بھی ہو، صرف عمل ہی تواضع کے خلاف نہ ہو تو یہ بھی کافی ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ کسی کو بڑا تسلیم کرلینے میں عار آتی ہے، حالانکہ جب تک کسی کو بڑا تسلیم نہ کرلیا جائے، مرکزیت جو نظم کے لیے ضروری ہے، قائم نہیں ہوسکتی۔ (صفحہ ۷۸ جلد ۱۰)

انتظام کے فوائد اور نقصانات

انتظام بڑی برکت کی چیز ہے اور خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر انتظام نہ ہو تو سلطنت بھی باقی نہیں رہ سکتی، ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کا سبب بے فکری اور بدانتظامی ہی ہے۔ اس طرح جس گھر میں بدانتظامی ہوگی، اس میں برکت نہ ہوگی۔ اس وقت بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سبب یہی دو چیزیں ہے۔ بے فکری اور بدانتظامی، بے فکری کے معنیٰ ہیں، انجام اور نتیجہ کے بارے میں نہ سوچا جائے اور بدانتظامی کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ آمدنی کیا ہے اور خرچ کیا ہے۔ سوچے سمجھے خرچ کیا جائے۔ انتظام کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ سوچا جائے کہ خرچ کرنے سے دینی یا دنیوی ضررت تو وابستہ نہیں۔ آج کل فضول خرچی کا نام بلند حوصلگی رکھا گیا ہے، اس بلند حوصلگی کے نتائج یہ ہیں کہ اپنے مال سے گذر کر نظر دوسروں کے مال پر لگی رہتی ہے۔ قرض لیتے پھرتے ہیں، اگر قرض نہیں ملتا تو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے، اس طرح دین اور دنیا دونوں برباد ہوجاتی ہیں۔ (صفحہ ۲۴ جلد ۸)

کسی کام کے درپے پڑنا

دین کے جس کام اور مسئلہ میں الجھن پیدا ہوجائے (جو کام فرض و واجب نہ ہو) تو اس کو چھوڑ دیا جائے، اس کے پیچھے نہ پڑا جائے، بلکہ دین کے کسی اور کام میں مشغول ہوا جائے۔ کسی کام کے درپے پڑنے سے دو خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، ایک یہ کہ لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ اس کام میں غیر معمولی دلچسپی کا سبب ذاتی غرض ہے، دوم یہ کہ ضد کی وجہ سے

گروہ بندی اور فرقہ بندی ہوجاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ تیسری خرابی یہ بھی ہوجاتی ہے کہ شروع میں تو اخلاص ہوتا ہے، لیکن جب بات آگے بڑھنے لگتی ہے تو نفسانیت بھی شامل ہوجاتی ہے، پھر اس کام میں ثواب بھی نہیں ہوتا۔ **اما من استغنیٰ فانت لہ تصدیٰ وما علیک الا یزکیٰ**۔

آخر قلب کو ایسے کاموں میں کیوں مصروف رکھا جائے۔ اس کی مشغولی صرف ایک ذات سے ہونی چاہیے، وہ اللہ کی ذات ہے۔ مسلمان کے ہر کام کا مقصود رضائے حق ہے، جو اسے ہر وقت حاصل ہے۔ (صفحہ ۲۴۳ جلد ۸)

ناجائز ذریعہ معاش کو چھوڑنے کا مسئلہ

ذریعہ معاش یا ملازمت کو شدید شرعی عذر کے بغیر چھوڑنا مناسب نہیں۔ یہ ایک قسم کی ناشکری اور کفران نعمت ہے، حضرت حاجی امداداللہ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کمزور لوگوں کو اس وقت تک ناجائز ملازمت اور ذریعہ معاش نہیں چھوڑنا چاہیے، جب تک جائز ملازمت اور ذریعہ معاش نہ مل جائے۔ البتہ اس دوران استغفار اور جائز روزگار کی کوشش کرتے رہنا چاہیے، اس کی حکمت یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ ناجائز ملازمت کی وجہ سے فرد اب تک تو گناہ میں مبتلا ہے، لیکن معاش کا وسیلہ چھوڑنے کے بعد افلاس میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اب معصیت (گناہ) ہو رہی ہے، روزگار چھوڑنے کی صورت میں کفر ہوگا، کیسا حکیمانہ نکتہ ہے۔ (صفحہ ۵۴ جلد ۴)

کرنے کا اصل کام

اصل کام تو حقیقی مالک کو راضی کرنے کا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ گذشتہ نافرمانیوں سے تائب ہوکر آئندہ کے لئے صالح اعمال کرنے کا عزم کیا جائے، پھر دیکھو، کس طرح انقلاب برپا ہوتا ہے۔ ان کو راضی کرنے سے ذہن میں تدبیریں بھی صحیح آنے لگتی ہیں اور ان تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کی قوت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر مسلمان ایسا کرنے لگیں تو ان کے سارے مصائب اور آلام ختم ہوسکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حکومت (وقت) کی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی حمیت کو برباد کیا جائے، یہ بات بالکل بجا ہے، ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ قلوب میں مذہب کی اہمیت پیدا کی جائے۔ لیکن بدقسمتی سے جو کام کرنے کے ہیں، وہ نہیں کیے جاتے، اپنی

صلاحیتیں دوسرے کاموں میں صرف کر کے جان و مال برباد کیا جارہا ہے، صاحبو، اگر ہماری بات پر اعتماد نہیں تو آزما کر دیکھ لیں۔

سالہا تو سنگ بودی دل خراش
آزموار یک زمانے خاک باش

تو برسوں تک تو سخت پتھر بنا رہا، کچھ روز کے لئے خاک ہوکر بھی دیکھ لے۔ (۴۷ جلد ۵)

اسلام اور کفر کی لڑائی

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں عشرۂ محرم میں، اجمیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک تعزیہ کی وجہ سے جھگڑا ہوگیا۔ سنی علماء نے فتویٰ دیا کہ چوں کہ یہ بدعت اور کفر کی لڑائی ہے، اس لئے ہمیں اس سے الگ رہنا چاہیے۔ پھر اہل شہر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے سامنے عرض کیا، حضرت مولانا نے فرمایا، یہ بدعت اور کفر کی لڑائی نہیں، بلکہ اسلام اور کفر کی لڑائی ہے، اس لئے شیعوں کی حمایت کرنی چاہیے، چنانچہ اہل اجمیر نے ساتھ دیا اور مسلمانوں کی فتح ہوئی۔ (صفحہ ۱۰۴ جلد ۸)

نفس سے جہاد

نفس سے جہاد کرنا کفار سے جہاد کرنے سے زیادہ سخت ہے، وہاں تو ایک بار تلوار لگی اور کام تمام ہوا۔ یہاں ہردم، ہر سانس اور ہر وقت آرا چلتا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں ازغیب جانے دیگر است

(جو تسلیم و رضا کے خنجر کے مارے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو ہر وقت غیب سے ایک نئی روحانی زندگی ملتی ہے)۔

جو لوگ جہاد نفس میں مشغول ہیں، ان پر جو کچھ گذرتی ہے، اسے وہی جانتے ہیں، قبر کا حال مردے ہی کو معلوم ہے، ان کی جو حالت ہوتی ہے، اسے درج ذیل شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال نشیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تیرے پاؤں میں کبھی کانٹا بھی نہیں لگا، تجھے ان بہادروں کی حالت کیا معلوم، جو سر پر تلوار کھاتے ہیں)۔

یہ جہاد محض عشاق کا نشان ہے کہ وہ ہر وقت نفس کشی میں رہتے ہیں اور اس کی خواہشوں کو پامال کرتے رہتے ہیں، ان کی حالت کو دوسرا کیا سمجھ سکتا ہے۔ دل میں زخم اور گھاؤ ہوجاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے:

دروں سینہ من زخم بے نشان زدہ
بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کمان زدہ

(تونے میرے سینے میں ایسا زخم لگایا ہے، جس کا کوئی نشان نظر نہیں آتا، مجھے حیرت ہے کہ بغیر کمان کے کیسا تیر مارا ہے)

جہاد کی حقیقت

مجاہدہ کی حقیقت ہے، نہی النفس عن الھویٰ. نفس کو اس کی خواہشات (مذمومہ) سے روکنا اور اس کے حاصل ہونے کی تدبیر یہ ہے کہ خاف مقام ربہ (جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے) اگر یہ کہا جائے کہ شریعت میں مجاہدہ سے مراد کفار کے خلاف جہاد کرنا ہے تو اس حدیث کے کیا معنیٰ ہوں گے۔ المجاھد من جھد نفسہ۔ (مجاہد وہ ہے، جو نفس سے جہاد کرے) بلکہ مجاہدہ ظاہری میں مشغول ہونا تو آسان ہے، لیکن باطنی مجاہدہ میں مشغول ہونا مشکل ہے، اس میں سستی کرنا ایسا ہے کہ باہر کے دشمن کو تو مار دیا، اندر کے دشمن کی کوئی فکر ہی نہیں۔

درست و دشمن اندر خانہ بود
حیلہ فرعوں زین افسانہ بود

(دشمن تو گھر کے اندر موجود تھا اور دروازہ بند کرلیا، فرعون کی تدبیر کی ناکامی کی وجہ یہی تھی)۔

ای شاں کشتیم ما خصم بروں
ماند خصمے زوبتر دراندروں

کشتن این کار عقل و ہوش نیست
شیر باطن نخرہ خرگوش نیست

(حضرات، ہم نے باہر کے دشمن کو تو مار دیا ہے، مگر باہر کے دشمن سے بدتر دشمن اندر رہ گیا ہے۔ اس اندر کے دشمن کے مارنے کی تدبیر عقل کے بس کی نہیں ہے، کیونکہ یہ باطنی شیر خرگوش عقل و ہوش کے بس میں آنے والا نہیں ہے)

سب سے بڑی چیز کامل کی صحبت ہے، اس کے بغیر کامیابی مشکل ہے، اس لئے مولانا رومی فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرد
بے قلاوز اندریں صحرا مرد

سلوک طے کرنے کے لئے ساتھی کی ضرورت ہے، اس جنگل میں بغیر رہبر کے تنہا مت چلو۔ (صفحہ ۵۴-۴)

تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ جب تک اہل اللہ کی صحبت نہ ہو، بزرگی تو کیا انسانیت بھی نہیں آتی اور بزرگی اگر آ بھی جائے، مگر انسانیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ (صفحہ ۲۳ جلد ۴)

نفس کی مخالفت کرنا

ایک سوال تھا، اگر کوئی شخص اپنے اخلاق سیۂ اور رزائل نفس کی اصلاح نہ کرائے اور وہ رزائل اس کے اندر ہمیشہ موجود رہیں تو کیا قیامت میں اس سے مواخذہ ہوگا، فرمایا، دیکھنا یہ ہوگا کہ فرد نے نفس کے ان تقاضوں پر عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ اگر ان جذبات پر عمل کیا ہے پھر تو اس سے مواخذہ ہوگا۔ اگر عمل نہیں کیا ہے اور ان رزائل کے تقاضوں کی مخالفت کرتا رہا ہے تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔ مثلاً غصہ کا مرض تھا، اس مرض کے علاج کی ضرورت تھی، مگر مرض کی اصلاح نہ کرائی گئی، مگر غصہ کے تقاضوں پر عمل بھی نہیں کیا گیا، بلکہ غصہ کے موقعہ پر ہمیشہ ضبط سے کام لیا گیا ہو تو اگرچہ غصہ کا مرض موجود رہا، مگر چوں کہ بے جا غصہ کے تقاضے پر عمل نہیں ہوا، اس لئے مواخذہ نہ ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ منفی جذبات پر مواخذہ نہ ہوگا، بلکہ مواخذہ، افعال و اعمال پر ہوگا۔ مگر اس کے باوجود جذبات کی اصلاح کی ضرورت اس لئے ہے کہ ان کی اصلاح سے نفس کی مخالفت اور مقابلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اصلاح نہ کرنے کی صورت میں نفس کا مقابلہ

کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

شیخ کو بھی اصلاح سے غافل نہ ہونا چاہیے

تصوف میں سب سے اہم چیز نفس کی اصلاح ہے، مرید اور شیخ دونوں میں سے کسی کو بھی اپنے نفس کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ جس طرح مرید کو اپنی اصلاح کی ضرورت ہے، اسی طرح شیخ کو بھی چاہیے کہ وہ نفس کا محاسبہ اور اس کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ اس طریق میں اصلاحِ نفس ایک ایسا کام ہے، جو ساری عمر کا مسئلہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل شیوخ اپنے آپ کو اصلاح سے مستغنی سمجھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، جن شیوخ کو یہ فکر لاحق ہے، ان کے اندر ایک دوسری کمی ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے نفس کے متعلق ہر موقع پر اپنی رائے کو کافی سمجھتے ہیں اور اپنی باطنی حالت کے متعلق چاہے ان کو کتنا ہی بڑا اشکال پیش آتا ہو اور وہ اشکال ان سے حل بھی نہ ہوتا ہو، اس کے باوجود وہ اپنا علاج خود ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ طب ظاہری میں ایک طبیب وہ چاہے کتنا ہی بڑا طبیب ہو، وہ اپنا علاج خود نہیں کرتا۔ اسی طرح روحانی امراض میں روحانی معالج کو وہ چاہے کتنا ہی بڑا معالج ہو۔ اپنا علاج دوسرے سے کرانا ہوگا۔ لہٰذا شیوخ کو چاہیے کہ جب بھی ان کو ضرورت پیش آئے تو اپنے سے بڑے شخص کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اگرچہ وہ شخص جس کے سامنے اشکال پیش کیا جائے، اپنے سلسلے کا نہ ہو، بس اہل باطل سے نہ ہو۔ اگر اس طرح کا شخص نہ ملے تو پھر اپنے سے چھوٹوں میں سے متعدد اشخاص کے سامنے مسئلہ پیش کرکے ان سے مشورہ کرنا چاہیے، اور مشورہ کے بعد غور کرے کہ ان میں سے کس کا مشورہ دل کو اپیل کرتا ہے۔

مزید فرمایا، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی سے بیعت تھے۔ اور ایک مستقل شیخ تھے، مگر اس کے باوجود جب شاہ عبدالغنی صاحب کا انتقال ہوگیا تو شاہ رفیع الدین صاحب نے یہ خیال نہیں کیا کہ میری تو تکمیل ہوچکی ہے، اب مجھے کسی دوسرے بزرگ کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ شاہ عبدالغنی صاحب کے بعد وہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہوگئے۔ (صفحہ ۲۷ جلد ۹)

اختلاف اور محبت

آج کل حالت یہ ہے کہ کسی سے اختلاف ہوا اور فوراً اس پر کفر کا فتویٰ جاری کر دیا جائے گا۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، مولوی فضل حق صاحب، مولانا شاہ اسماعیل شہید کے مد مقابل تھے (وہابیت اور بدعت کے موضوع پر ان کے اختلافات تھے، مرتب) ایک بار مولوی فضل حق صاحب تھانہ بھون تشریف لائے۔ رئیس قاضی نجابت علی صاحب نے ان سے مولانا شاہ اسماعیل کے بارے میں پوچھا کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمایا، میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے کہ وہ میرے مقابل اور میرے معاصر ہیں، پھر قاضی صاحب نے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے بارے میں معلوم کیا (وہ بھی ان کے مد مقابل تھے) فرمایا، اس مجلس میں انسانوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب جبرائیل اور میکائیل کا ذکر ہوگا، اس وقت شاہ محمد اسحاق صاحب کا ذکر کیجئے گا۔ مخالفوں کے ساتھ عقیدت و محبت کی یہ حالت تھی کہ اختلاف کے ساتھ ساتھ مخالفوں کے کمالات بھی پیش نظر رہتے تھے۔
(صفحہ ۱۴۸ جلد ۸)

ایک بار مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دہلی تشریف لے گئے۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی اور امیر شاہ خان صاحب بھی ساتھ تھے، امیر شاہ خان صاحب نے سوتے وقت مولوی احمد حسن صاحب سے کہا کہ صبح کی نماز برج والی مسجد میں چل کر پڑھیں گے، سنا ہے وہاں کے امام قرآن شریف بہت اچھا پڑھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے کہا کہ وہ ہمارے مولانا محمد قاسم صاحب کی تکفیر کرتا ہے، کہا، ہم اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے؟ مولانا محمد قاسم صاحب نے ان کی بات سن لی اور فرمایا، احمد حسن، میں تو سمجھتا تھا کہ تم لکھ پڑھ گئے ہو، مگر جاہل ہی رہے، دوسروں کو جاہل کہتے ہو۔ کیا قاسم کی تکفیر سے وہ امامت کے قابل نہ رہا، میں تو اس سے اس کی دین داری کا معتقد ہوگیا۔ اس نے میری کوئی ایسی بات سنی ہوگی، جس کی وجہ سے میری تکفیر واجب تھی۔ اگرچہ روایت غلط پہنچی ہو تو یہ راوی کا قصور ہے۔ بہر حال اس کا سبب دینی حمیت ہی ہے، اب میں خود اس کے پیچھے نماز پڑھوں گا۔ غرض کہ مولانا نے صبح کی نماز اس کے پیچھے پڑھی۔
(صفحہ ۲۹۴ - جلد ۴)

سرسید کا پیغام

سرسید نے ایک صاحب پیر جی محمد عارف کو مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں بھیجا کہ وہ عرض کریں کہ مسلمانوں کی حالت دن بدن خراب ہو رہی ہے، غیر مسلم ترقی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے لئے ایک بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اگر اس میں ہاتھ بٹائیں تو جلد کامیابی ہوگی، پیر جی نے یہ پیغام مولانا محمد قاسم صاحب کو بھی دیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ وہ جس راستے سے مسلمانوں کو معراجِ ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں، وہی تو ان کی تنزلی کا سبب ہوگا۔ اور اسی سے تو ان کی تباہی و بربادی ہوگی، پیر جی نے کہا کہ حضرت نے سرسید میں جس چیز کی کمی محسوس کی ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہی تو آپ حضرات کی شرکت کی ضرورت ہے، حضرت مولانا نے کہا، ہاں یہ تو صحیح ہے، لیکن ہر ادارہ کی بنیاد میں اس ادارے کے بانی کے جذبات، احساسات اور ادارے کے آثار پیوست ہوجاتے ہیں، وہ اس سے جدا نہیں ہوسکتے۔ ایسی صورت میں اس ادارہ کی اصلاح نہ صرف مشکل ہے، بلکہ عادۃً محال ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک کڑوا درخت بویا جائے۔ اور ایک بزرگ کو شربت کی بوتل دے کر کہا جائے کہ وہ اس کی جڑ میں شربت کا پانی ڈالتا رہے۔ لیکن جب وہ درخت پھل اور پھول لائے گا تو وہ سارے کڑوے ہی ہوں گے۔ اسی طرح یہاں صورتحال ہے، کسی عالم اور بزرگ کی شرکت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، بلکہ ممکن ہے بزرگ کے حالات میں خود تغیر واقع جائے۔ (صفحہ ۱۰۰ جلد ۸)

سرسید احمد کے کردار کے واقعات

سرسید کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے، انگریزی تعلیم یافتہ ایک شخص بے روزگاری کی وجہ سے پریشان تھا، وہ ایک بڑے انگریز افسر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں سرسید کا داماد ہوں، مجھے ملازمت کی ضرورت ہے، انگریز افسر اس سے بہت بہتر طور سے پیش آیا۔ کہا کہ تم یہیں ٹھہرو، میں آتا ہوں، اس نے سرسید کو تار دیا کہ اس نام کا ایک شخص ملازمت کے لیے آیا ہے، وہ اپنے آپ کو آپ کا داماد بتاتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے۔ سرسید نے اس کو جواب دیا کہ بالکل صحیح ہے۔ اس کے لئے ضرور ملازمت کا انتظام کیا جائے۔ میں ممنون ہوں گا۔ چنانچہ اسے ملازمت مل گئی۔ ایک روز انگریز افسر نے غیر شعوری طور پر اس شخص کو

یہ واقعہ بتایا، وہ بہت شرمندہ ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد یہ شخص علی گڑھ آیا اور سرسید سے ملا اور ان کو پوری صورت حال بتا کر معافی مانگی۔ سرسید نے کہا کہ اگرچہ اس وقت یہ بات غلط تھی، تم میرے داماد نہیں تھے، لیکن اب یہ بات صحیح ہوجائے گی، داماد، بیٹی کے شوہر کو کہتے ہیں، اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ میری بیٹی تمہاری بیوی ہوتی، یہ تو نہیں ہوسکتا، مگر دوسری صورت یہ ہے کہ تمہاری بیوی کو میں اپنی بیٹی بنالوں، سو میں تمہاری بیوی کو اپنی بیٹی بناتا ہوں، وہ میری بیٹی، میں اس کا باپ، اس کے بعد سرسید نے زندگی بھر ان سے باپ بیٹی کا رشتہ قائم رکھا، ان کو دعوت دے کر بلانا، لینا دینا وغیرہ۔

سرسید کا ایک دوسرا واقعہ بھی یاد آیا، ایک بار سرسید علی گڑھ اسٹیشن سے ریل میں سوار ہوئے، اس ڈبے میں ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے، ان صاحب نے دریافت کیا کہ کون سا شہر ہے، سرسید نے کہا کہ علی گڑھ، انہوں نے کہا کہ وہی علیگڑھ جہاں سرسید (ایسا تیسا) رہتا ہے۔ سرسید نے کہا، جی ہاں، وہی علی گڑھ، اس نے کہا کہ سرسید تو بہت برا انسان ہے، اس نے تو دین کو بہت نقصان پہنچایا ہے، سرسید اثبات میں جواب دیتے رہے، یہ صاحب کئی اسٹیشنوں تک سرسید کے سامنے ان کو تبرا بیجھتے رہے، ان کی طبیعت میں ذرہ برابر تغیر نہیں ہوا، آخر میں ان صاحب نے کھانا نکالا، جب کھانے بیٹھے تو انہوں نے سرسید کی تواضع کی، سرسید نے کہا کہ مجھے عذر ہے، انہوں نے اس پر بھی اصرار کیا، سرسید نے کہا کہ مجھے واقعی عذر ہے، انہوں نے کہا کہ وہ عذر کیا ہے، سرسید نے کہا کہ بتانے کا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ بتانا ہوگا، سرسید نے کہا، اگر بتاؤں گا تو اس وقت تو آپ کھانا کھلانے پر اصرار کر رہے ہیں، اس کے بعد میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کریں گے، انہوں نے کہا، توبہ توبہ، ایسی کیا بات ہے، تب سرسید نے کہا کہ میں ہی ہوں، وہ شخص، جس پر آپ تبرا بیجھ رہے ہیں، یہ سن کر وہ صاحب بہت ششدر ہوئے اور سرسید سے معافی چاہی اور ان کے معتقد بن گئے۔ (۱۳۰-۱۳۱-۱)

ایک شخص کی فکری بے راہ روی کا قصہ

ایک شخص نے خط لکھا ہے، ایسا خط اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا، خط میں اس نے اپنی جو حالت ظاہر کی ہے، اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ کا

عتاب ہے، مگر ایسے مرض کا علاج بھی اللہ تعالیٰ ہی دل میں ڈالتے ہیں، میں نے اس خط کا جو جواب دیا ہے، وہ اس کے مرض کا ایسا علاج ہے کہ اگر انہوں نے اس علاج کو استعمال کیا تو ان شاء اللہ اس کی حالت درست ہوجائے گی، وہ خط یہ ہے۔

خاکسار کی مختصر سوانح عمری یہ ہے کہ کچھ دنوں والد بزرگوار سے تعلیم پائی، پھر فلاں مقام پر جاکر مولانا۔۔۔۔۔۔ سے مستفید ہوا، تین سال تک ان سے سند لیکر حضرت شاہ صاحب کے پاس پہنچا اور اب فتح پور میں امتحان مولوی فاضل کی تیاری کررہا ہوں، مگر اس ماحول میں رہنے کے باوجود میرے عقائد کچھ اس طرح ہوگئے ہیں، جن کے ماننے والے کو لوگ دہریہ کہتے ہیں، یوں تو بچپن ہی سے کسی کی شخصیت سے متاثر ہوکر کبھی کسی نظریے کو میں نے تسلیم نہیں کیا، مگر جب احادیث کی کتابیں نظر سے گزریں تو صاف غیر مقلد بن گیا، حضرت شاہ صاحب سے رخصت ہوتے وقت میرے اصول مذہب کے متعلق میرے پاس صرف ایک گورکھ دھندا تھا اور کچھ نہیں، مگر آج کل حالت یہ ہے کہ میں نہ خدا کا قائل، نہ کسی نبی کا، نہ قرآن کا، نہ کسی الہامی کتابوں کا، حشر ونشر کا تو سوال ہی نہیں، مذہب کو تجارتی منڈی اور پیغمبروں کو کامیاب لیڈر، جزا اور سزا کو بچوں کا ڈراوا سمجھ رہا ہوں۔ ومن علی ہذا۔ حضور کریم ﷺ اور خلفائے اربعہ (رضی اللہ عنہم) کی سوانح عمریوں میں ایسی ایسی پالیسیاں نظر آرہی ہیں کہ سر اقبال، مسٹر جینا اور سر شفیع میں دیکھ رہا ہوں۔

قرآن شریف حفظ کرچکا ہوں، قریب قریب روز مرہ تلاوت کرتا رہتا ہوں، نورانیت تو درکنار، ہر ہر آیت پر ہنسی آتی ہے کہ دیکھو، دنیا کو کس طرح بے وقوف بنایا جارہا ہے، کتابوں کا مطالعہ شروع کرچکا۔ تقریر دلپذیر، حجۃ اللہ البالغہ، الرسالۃ الحمیدیہ۔ سائنس اور اسلام وغیرہ دیکھ چکا ہوں، مگر مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی، مناظرہ کی طرف جب متوجہ ہوا تو اس چنگاری نے ایک ہولناک صورت اختیار کرلی۔ بلکہ تعجب یہ کہ اکثر نوجوانوں کو بلکہ متعدد عربی تعلیم یافتوں کو بھی اس مرض میں مبتلا پایا، اسباب مرض کو ابتداءً معمولی سمجھنا، شبہات کا تسکین بخش جواب نہ ملنا، بالشویکی مذہب پر کافی غور وخوض، نفسیات کا مطالعہ، خصوصاً کتاب فلسفہ جذبات اور موسیو لیبان کی کتاب روح اجتماع میرے تبدیلی خیالات کی کافی حد تک ذمہ دار ہیں، اپنے سے کم حیثیت والوں سے گفتگو کرکے ان کو چپ کرا دینا اور بڑے لوگوں سے بجائے ازالۂ وہم کبھی تو الزامی جواب اور کبھی گالیاں سننا۔

انگریزی دانوں سے تبادلہ خیالات، تاریخ مذاہب اور ان کی لم ٹٹول، ہر مذہب وملت کے آدمیوں سے ملنا۔ ان کے عقائد ومسلمات کا سننا، ان پر غور وخوض کرنا اور روشنی طبع اس مرض کے اسباب ہیں، اب جبکہ تحقیق کے تمام راستے میرے لئے مسدود ہیں تو صرف یہ صورت رہ گئی ہے کہ استدلالات منطقیہ کا سلسلہ چھوڑ کر روحانیت کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کروں کہ آیا واقعی میں مریض ہوں یا مفت کا نکو بنایا جارہا ہوں۔ اور اس مقصد کے لئے میری نظروں میں صرف خانقاہ امدادیہ ہی کام آسکتی ہے، ممکن ہے کہ حضور والا دستگیری فرمائیں، لہٰذا جو نسخہ جناب تجویز فرمائیں، اسے استعمال کروں گا، مگر مراقبہ نہیں کروں گا اور یہ بھی تسلیم نہیں کہ عقل کی پرواز محدود اور خدا تعالیٰ غیر محدود ہے، حسن عقیدت بھی نہیں رکھوں گا، ہاں کوئی خفیف وظیفہ ہو، جو مراقبہ کی حد تک نہ پہنچے تو پڑھوں گا۔ کتابوں کے مطالعہ کا اگر حوالہ دیا جائے تو اچھا ہوگا، ورنہ بدرجہ مجبوری اس سے بھی انکار نہیں۔ اور اگر ملاقات کی اجازت ملے تو زہے نصیب اور خط کشیدہ اسباب کو بھی نہیں چھوڑ سکتا (یعنی نفسیات کا مطالعہ، انگریزی دانوں سے تبادلہ خیالات، تاریخ مذاہب عالم اور ان کی لم ٹٹول، ہر مذہب وملت کے آدمیوں سے ملنا) مولانا، خط، میں بندہ نے سختی سے کام لیا ہے، مگر جب تک پوری تحقیق واضح نہ کی جائے، علاج کیوں کر ہوسکتا ہے، مجھے یقین ہے کہ جناب جواب ارسال فرمائیں گے۔

از مدرسہ فتح پوری ۔۔۔۔۔۔ اس کا جواب یہ ارسال کیا گیا ہے

''میرے نزدیک تمہارے علاج کی ابتدا دعا سے ہونی چاہیے، یعنی ساری تدابیر سے پہلے تم یہ عمل شروع کرو کہ دعا کیا کرو کہ یا اللہ، مجھے صراط مستقیم پر قائم فرما، رہا یہ شبہ کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے قائل ہی نہیں تو پھر دعا کس سے کی جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ تم اللہ تعالیٰ کے قائل نہیں، مگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں، جب تمہارے پاس نہ وجود کی دلیل ہے، نہ نفی کی تو تمہیں اللہ تعالیٰ کے وجود کے ممکن ہونے کا عقلاً قائل ہونا پڑے گا۔ اور دعا کے لئے احتمال کافی ہے، جس میں نہ تمہارا کوئی ضرر ہے اور نہ مشقت، جب تم میری اس تجویز پر عمل شروع کرکے مجھے اپنی حالت سے مطلع کروگے تو پھر آگے مشورہ دوں گا۔''

اس کے بعد فرمایا، اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھنا اور

مختلف مذاہب کے لوگوں سے ملنا بھی مضر ہے، حضرت صاحب نے ایک عرصہ کے بعد فرمایا کہ اگر یہ شخص میری تجاویز پر عمل کرتا تو ان شاء اللہ اس کی حالت درست ہوجاتی، مگر اس شخص نے اس کے بعد مجھے کوئی اطلاع نہیں دی۔ (صفحہ ۱۲۰-۱۲۱-جلد ۹)

سنت اور بدعت کی حقیقت

ایک مرتبہ دہلی میں آمین بالجبر کہنے پر مسجد میں کسی مسافر پر سختی کی گئی، شاہ اسماعیل شہید نے یہ دیکھ کر آمین بالجبر کہنا شروع کردیا کہ مجھے کوئی روکے، لوگوں نے شاہ عبدالعزیزؒ سے اس کی شکایت کردی، شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر میرے منع کرانے پر انہوں نے حدیث پیش کردی تو میں کیا کروں گا، اس کے بعد لوگوں نے یہی شکایت شاہ عبدالقادر رحمۃ علیہ سے کی۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے مولانا اسماعیل صاحب سے کہا کہ آخر زور سے آمین کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جب کہ اس سے عوام میں ناراضگی اور بددلی پیدا ہوتی ہے۔

مولانا نے جواب دیا کہ جو شخص مردہ سنت کو زندہ کرے، اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا، چوں کہ یہ سنت مردہ ہوچکی ہے، اس لئے اسے زندہ کر رہا ہوں، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ہم تو سمجھے تھے کہ تم مولوی ہوگئے ہو، لیکن معلوم ہوا کہ سمجھ نہیں آئی، یہ حدیث اس سنت کے بارے میں ہے، جس کے مقابلہ میں بدعت ہو اور جس سنت کے مقابلے میں بھی دوسری سنت ہو، وہ اس حدیث سے مراد نہیں۔ (صفحہ ۸-جل ۹)

امام صاحب کا فتویٰ

ام ابوحنیفہ رحہ کا فتویٰ ہے کہ آلات لہو کو توڑ ڈالنا، واعظ یا کسی عامی فرد کے لئے جائز نہیں، اگر کوئی توڑ ڈالے گا تو ضمان (جرمانہ) لازم آئے گا۔ کیوں کہ یہ کام سلطان (حکومت) کا ہے، حکومت ایسا احتساب کرسکتی ہے اسے سزا دے سکتی ہے، امام صاحب کے اس فتویٰ میں خیر کا کتنا پہلو ہے اور فساد سے تحفظ کا انتظام ہے، اگر عوام کو اس طرح کی چیزوں میں اختیار دیدیا جائے تو معاشرے میں جنگ و جدال برپا ہوجائے، ایک انگریز نے لکھا ہے کہ حکومت کسی فقہ پر نہیں چل سکتی، سوائے فقہ حنفی پر، یہ ایک سیاسی تجربہ کار کا قول ہے۔ (صفحہ ۴۵-جلد ۵)

علم کے فوائد اور آفتیں

علم حاصل کرکے بھی اگر خشیت پیدا نہ ہو تو ایسے علم سے جہل بہتر ہے، علم، نفع اور ضرر کے اعتبار سے تلوار کی دھار کی طرح ہے، اس سے دوست بھی کٹتا ہے تو دشمن بھی کٹتا ہے۔ اگر تلوار چلانے والا ماہر فن نہ ہو تو یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں وہ تلوار سے اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچائے، اس طرح کہ تلوار تو مارے دشمن کو، لیکن لوٹ کر اپنے اوپر لگ جائے۔ اسی طرح علم بڑی نازک چیز ہے۔ اس میں امن بھی ہے اور خوف بھی، غالب خیر اور امن ہی ہے، مگر حسن استعمال کی ضرورت ہے، سارے گمراہ فرقے تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے ہی ہیں۔ کسی جاہل نے بھی کوئی فرقہ بنایا ہے؟ جاہل کا معتقد ہی کون ہوگا، غلام احمد قادیانی کو دیکھ لیجئے، پہلے اس نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا، پھر محدث ہونے کا، پھر مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر کرشن ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر نبی ہونے کا، پھر پھیر پھار کر لفظوں میں خدا کے بیٹے ہونے کا دعویٰ کیا، پھر خود خدا ہونے کا دعویٰ کیا، کبھی عورت بنا، پھر اس کو حمل قرار پایا، کیا اس کو ہذیان نہ کہیں گے، مگر لوگ ہیں کہ معتقد ہیں۔ (صفحہ ۲۷۲-جلد ۷)

آج کل تصنیف کا ذوق

آج کل لکھنے کا ذوق بہت ہے، اس میں دوسروں پر تنقیدی پہلو غالب ہوتا ہے، صاحب! دین کی خدمت کرنا مقصود ہے یا لوگوں سے لڑائی لڑنی ہے۔ اس طریقے میں خلوص کی بجائے نفس کی آمیزش شامل ہو جاتی ہے، اور مخاطب پر اچھا اثر پڑنے کی بجائے بُرا اثر پڑ رہا ہے، خدا معلوم لوگوں کو تصنیف کا شوق کیوں ہوتا ہے، چپ چاپ بیٹھے رہیں، دنیا میں اور بہت سے کام ہیں، ان میں مشغول ہوں، یہ دنیا کے کاموں میں بھی ان کاموں کو پسند کرتے ہیں، جن میں شورش اور فتنہ ہو، طبیعت ایسے ہی کاموں میں لگتی ہے، عجیب طبیعتیں ہیں، بدفہمی اور بدعقلی کا غلبہ ہے، اللہ تعالیٰ فہم عطا فرمائے۔ (۱۴۸-جلد ۸)

علمی تحقیقات کو مقصد بنانا

آج کل علمی تحقیقات اور فلسفہ کو ہی مقصود بنالیا گیا ہے، اصل مقصد سے غفلت ہے، علمی تحقیقات اور فلسفہ کو مقصود بنانے سے کیا حاصل، ایک علم نحو کا ماہر شخص کشتی میں سوار ہوا، نحودانی کا جوش تھا، اس نے ملاح سے پوچھا، میاں نحو بھی پڑھی ہے، اس نے کہا، نہیں، اس

پر کہنے لگے، افسوس ہے، تم پر، آدھی عمر ضایع کردی، جب کشتی چلی تو اتفاق سے دریا کے بیچ پہنچ کر گرداب میں پھنس گئی، ملاح نے دریافت کیا، میاں تیرنا بھی سیکھا ہے یا نہیں، اس نے کہا نہیں، ملاح نے کہا، پھر تم نے اپنی ساری عمر ضایع کردی، میں تو تیرنا جانتا ہوں، تم ابھی ڈوبو گے، صاحب، یہاں نحو سے کام نہیں چلے گا، محو ہونے کی ضرورت ہے، محو سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل اللہ کے سپرد کیا جائے، اپنی رائے اور تحقیقات سے دست بردار ہوا جائے۔ (صفحہ ۳۰ جلد ۴)

عمل کے لئے محض علم کافی نہیں

تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ عمل کے لئے صرف علم کافی نہیں، بلکہ علم کے ساتھ عمل کا ارادہ بھی کافی نہیں، کیوں کہ علم کے ساتھ اگر عمل کا ارادہ بھی ہو تو اس سے عمل کا صدور تو ہوسکتا ہے، لیکن استقامت حاصل نہیں ہوسکتی، استقامت کے لئے قلب کے اندر عمل کی قوت کا ہونا ضروری ہے، قوت اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب عمل کا خاص اہتمام ہو اور اس کا کثرت سے مراقبہ کیا جائے، ورنہ عدم قوت کی صورت میں مسلسل غفلت اور سستی ہوتی رہی گی اور استقامت نصیب نہیں ہوسکتی۔ (۲۶۶-جلد۱۰)

علماء اور جدید تعلیم کا مسئلہ

ایک صاحب ثروت شخص نے مولانا کے سامنے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ وہ چند عربی طلبہ کو انگریزی تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ (کلکتہ یونیورسٹی میں) تاکہ یہ طلبہ دوسرے ممالک میں دعوت وتبلیغ کا کام کرسکیں، نیز یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم دیوبند میں انگریزی کی تعلیم بھی ہونی چاہیے (اس کا سارا انتظام یہ صاحب خود فرمائیں گے) اس کے جواب میں فرمایا۔

انگریزی تعلیم کے لئے ایک علیحدہ درس گاہ تیار کرادیجئے۔ ان کا نظم ونسق ان حضرات کے ہاتھ میں ہو، جو عربی تعلیم کا نظم ونسق سنبھال رہے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہو کہ عربی کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی درس گاہ میں تعلیم حاصل کریں۔ اور جب تک طلبۂ فارغ التحصیل نہ ہوجائیں، ان کو انگریزی تعلیم کی اجازت نہ ہو، فراغت کے بعد کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ فارغ التحصیل ہونے سے پہلے یہ خطرہ ہے کہ وہ جدیدیت کا حصہ نہ بن جائیں، اس کی دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ کتابیں ختم ہونے کے بعد جب تک دو چار مرتبہ کتابیں نہ

پڑھائی جائیں، تب تک علم محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے فارغ التحصیل طلبہ بیک وقت دونوں کام کرسکتے ہیں، البتہ دوسرے مقام پر انگریزی تعلیم حاصل کرنا نقصان سے خالی نہیں۔ وہاں کے ماحول اور فضا سے متاثر ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے وہاں جاکر وہ دعوت وتبلیغ کے کام کے نہیں بن سکتے، اس لئے وہ انگریزی بھی قدیم اساتذہ کی نگرانی میں حاصل کریں، تاکہ ان کے جذبات پر برا اثر نہ پڑے۔ اور ہدایت کی بجائے گمراہی کے زیر اثر نہ آجائیں، مدرسہ میں شروع سے انگریزی کو لازمی بنانے سے لوگوں پر خراب اثر پڑے گا، پھر وہ بچوں کو مدرسہ میں انگریزی تعلیم کے لئے بھیجنا شروع کردیں گے، وہ اسے دینی تعلیم کی شاخ کی حیثیت سے نہیں سمجھ سکیں گے۔

اس صورت میں ہر مصلحت محفوظ رہ سکتی ہے، اس لیے انگریزی درس گاہ کو دینی درس گاہ کے ماتحت رکھنا چاہیے، تاکہ انگریزی خانہ عربی خانہ سے زیادہ مقصود نہ ہوجائے گا، پھر اس اہتمام اور نگرانی کے بعد کوئی شخص بگڑ جائے تو اس کے ذمہ دار ہم نہ ہونگے، ورنہ دوسری صورت میں اس کے ذمہ دار ہم ہی ہوں گے، بلکہ میں تو آپ کی دردمندی کی قدر کرتے ہوئے یہاں تک کہتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کی بجائے انگریزی تعلیم کے لئے ہم یہاں تھانہ بھون میں انتظام کرسکتے ہیں، میں یہ کام اپنی نگرانی میں رکھوں گا۔ مدرسین وغیرہ کا انتخاب اپنی رائے سے کروں گا اور اس کے اصول وقوائد اپنی نگرانی میں مرتب کروں گا، یہ سب سے بہتر اور آسان صورت ہے، اہل علم میں سے بعض ایسے لوگ میرے ذہن میں ہیں، جو اس کا خوش اسلوبی سے انتظام کرسکتے ہیں، غرض جملہ امور تعلیم ونگرانی کا انتظام ہوجائے گا، آپ کے ذمہ صرف مالی اعانت کا بار ہوگا، اس کا انتظام آپ کیجئے گا، یہ ہمارے ذمہ نہیں، پھر دیکھئے انشاء اللہ کیسے مبلغ پیدا ہوتے ہیں۔ (صفحہ۷۲-۷۳-جلد۳)

دو چیزیں فرض عین ہیں

علوم میں تبحر (گہرائی، علم) اصل میں فرض کفایہ ہے، لیکن موجود دور میں وہ تقریباً فرض عین ہے، اس لئے کہ دین کی حفاظت فرض ہے، اور وہ علم کے بغیر نہیں ہوسکتی، چوں کہ لوگوں میں اتباع کا مادہ نہیں رہا ہے، اس لئے ہر شخص کو کافی علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے، علم میں گہرائی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری چیز بھی فرض عین ہے، وہ اہل اللہ کی صحبت ہے، اس لئے کہ علوم والے لوگ بھی عملاً دین سے دور ہورہے ہیں، میرے نزدیک اس دور

میں یہ دونوں چیزیں فرض عین ہیں، دین کی حفاظت، ان دونوں چیزوں پر منحصر ہے، بالخصوص صحبت اہل اللہ۔ (صفحہ ۲۸-جلد ۲)

علم، عمل اور حال

دین کے یہ تین شعبے ہیں، اگر علم نہیں تو احکام کی معلومات ہی حاصل نہ ہوگی، اگر عمل نہیں تو ایسی معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر عمل ہے تو بظاہر یہ عمل کافی نظر آتا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ حالت بھی کچھ (زیادہ) مفید نہیں، اس لئے کہ اس میں خلوص اور عمل کے پائدار ہونے کا یقین نہیں، حال سے مراد ملکہ (یعنی عمل میں پختگی کی حالت) ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کسی سے محبت ہوجائے، ایسی کہ اس محبت میں بے چینی ہونے لگے، یہ حال ہے، حال (حالت میں ملکہ پیدا کیے) بغیر عمل میں استقامت حاصل نہیں ہوتی، حال ہوجانے کے بعد عمل پائدار ہوتا ہے، مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کر کے اعمال بجا لاتا ہے، اگر ایک وقت کی نماز چھوٹ جائے تو زیادہ قلق ورنج نہیں ہوتا۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اگر ایک وقت کی نماز بھی چھوٹ جائے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔ اسی کو حال اور ملکہ کہتے ہیں۔

ان تینوں چیزوں کی ضرورت ہے، ان تینوں کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں، حال کی تعلیم قرآن کی اس آیت میں ہے۔ الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ۔ (کیا مومنوں کے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل کانپ جائیں) مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں جلدی کرو، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل میں سختی پیدا ہوجائے۔ (یہ ملفوظ حضرت مولانا کی کسی دوسری کتاب سے ماخوذ ہے)۔

علوم میں بے برکتی کا سبب

زمانہ سلف میں کتابیں زیادہ نہ تھیں، لیکن علوم زیادہ تھے، حضور کریم ﷺ کے قرب کے زمانے کی وجہ سے برکت زیادہ تھی۔ خیر کا غلبہ تھا، حافظے قوی تھے، نور ایمان بڑھا ہوا تھا۔ نیز علوم میں برکت اور ترقی تقویٰ سے بھی ہوتی ہے، موجودہ زمانے میں کتابیں زیادہ ہیں، مگر نہ وہ علوم ہیں او نہ فنون، نہ وہ برکت، بلکہ اب تو اکثر جہل کا نام علم رکھ لیا گیا ہے اور جہل کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک اسلاف واکابر پر اعتراض کرنے پر تیار ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا

کہ ان حضرات نے کیا خدمتیں سرانجام دیں، اس بے ادبی کی وجہ سے علوم میں برکت روز بروز اٹھتی جارہی ہے، اکابر اور بزرگان سلف پر بدنیتی سے تنقید کرنا، بڑی خطرناک بات ہے۔ اگر نیک نیتی سے اختلاف ہو تو وہ مستثنیٰ ہے، کیوں کہ ایسا اختلاف ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ (۲۵۱-جلد ۸)

کلمہ پڑھنے والے شخص سے رعایت

حکم ہے کہ جہاد میں قتل کرنے کے وقت بھی کوئی کافر کلمہ پڑھ لے تو ہاتھ روک لو، اگرچہ تمہارے اندازے کے مطابق وہ جان بچانے کی خاطر کلمہ پڑھ رہا ہو، کیوں کہ دل کا حال تو کسی کو بھی معلوم نہیں، کیا خبر کہ اس نے دل سے کلمہ پڑھا ہو، چنانچہ ایک صحابی نے ایسے ہی موقع پر کلمہ پڑھنے کے باوجود ایک شخص کو یہ سمجھ کر قتل کیا تھا کہ وہ جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے۔ حضور کریم ﷺ کو ان کی یہ حرکت اس قدر ناگوار ہوئی کہ صحابی تمنا کرنے لگے کہ کاش میں اس حرکت سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا، تاکہ میرا یہ جرم اسلام لاکر معاف ہوجاتا۔ حضور کریم ﷺ نے ان صحابی کے اس عذر پر ان کہ انہوں نے کلمہ دل سے تھوڑا پڑھا تھا، جان بچانے کے لئے پڑھا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ (صفحہ ۷۷ جلد ۷)

نماز اور مطالعہ قرآن کی اہمیت

مطالعہ قرآن اور کثرت نوافل سب سے افضل عبادت ہے اور مقاصد ہیں، نماز اور قرآن سے تعلق مستحکم کرنے کے لئے تصوف میں ذکر وفکر کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کی حیثیت مبتدی کی سی ہے، اس لئے اس میں شیخ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اس لئے کہ اس میں بعض اوقات خطرات بھی پیش آتے ہیں، جب کہ مقاصد میں کوئی خطرہ نہیں پھر تلاوت قرآن اور نوافل ذکر پر بھی مشتمل ہے، باقی مستقل اذکار سے تلاوت قرآن اور نماز افضل ہے۔ آج کل کے مشائخ کے دلوں میں تلاوت قرآن اور نوافل سے رغبت اور ذوق شوق نہیں، سارا زور ذکر پر دیا جاتا ہے، حالانکہ ذکر میں عجب بھی پیدا ہوجاتا ہے، جب کہ نماز اور تلاوت قرآن سے عجب کم پیدا ہوتا ہے، اس لئے کہ عوام ذکر کو خواص کا فعل سمجھتے ہیں اور نماز اور تلاوت قرآن کو عام لوگوں کا کام سمجھتے ہیں۔ (صفحہ ۳۷ جلد ۳)

ذاتی اصلاح اور اس کے تقاضے

جس شخص کو اپنی اصلاح میں کوتاہی محسوس ہوتی ہو، کم از کم اس کو تو یہ چاہیے کہ وہ اپنی کوتاہی کا مشاہدہ کرے اور شکستہ ہو کر رہے، بڑوں کی طرح نہ رہے، بلکہ بُروں کی طرح رہے، اور فقط دل میں بُرا سمجھنا کافی نہیں ہے، بلکہ اپنے ساتھ بُروں کا برتاؤ بھی کرنا چاہیے، اصل یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی اصلاح کی فکر نہیں رہی، میری تو رائے یہ ہے کہ ہزار میں صرف دو تین افراد ہی اصلاح کے طالب ہوتے ہیں، ورنہ کوئی کسی چیز کا طالب ہوتا ہے کوئی کسی کا۔ (صفحہ ۲۰ جلد ۱۰)

انسان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس کے ذمہ صرف یہ کام مقرر کیا ہے کہ وہ لگا رہے اور جتنا ہو سکے ذکر کرتا رہے، وہ طلب کو دیکھتا ہے، اگر بندہ کے اندر طلب موجود ہے تو ادھر علم بھی ہے، قدرت بھی اور رحمت بھی، اس لئے سب کچھ عطا ہو رہے گا۔ (۲۷۳ جلد ۳)

اگر فرد کے اندر دو چیزیں پیدا ہو جائیں تو پھر کبھی شبہات پیدا نہیں ہو سکتے، ایک عظمت، دوسری محبت، شبہات کا پیدا ہونا، خود محبت و عظمت کے نہ ہونے کی دلیل ہے، محض سوالوں یا تحقیقات اور مطالعہ سے شبہات دور نہیں ہو سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ محبت و عظمت کیسے پیدا ہو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کی جائے، اہل محبت کی صحبت کے بعد سارے شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر اتنا وقت نہ ہو کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہ سکے تو کم از کم ان سے خط و کتابت رکھی جائے، جب بھی موقعہ مل جائے، دو چار دن کے لئے ہی سہی، ان کی صحبت میں رہا جائے، اور بزرگوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ (صفحہ ۲۷۳ جلد ۳)

کم گوئی کی تعلیم کا سبب

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے ایک بار فرمایا، زیادہ بولنے کی فی نفسہ ممانعت نہیں، اصل میں فضول بولنے کی ممانعت ہے، مگر چوں کہ مبتدی کو اپنی زبان پر کنٹرول نہیں ہوتا، اس لئے بطور علاج اس کو کم گوئی کی تعلیم دی جاتی ہے، تاکہ اس کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے، اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک کاغذ جو مدت تک ایک رخ پر مڑا رہا ہو تو اس کو سیدھا کرنے کے لئے پہلے مخالف سمت کی طرف زور سے موڑیں گے، اس کے بعد جب اسے کھولیں گے، وہ سیدھا ہو جائے گا۔ (صفحہ ۲۵۰ جلد ۷)

ذکر و خلوت اور قلب کا نور

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان لک فی النھار سبحاً طویلا۔ یعنی دن میں کام زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ذکر کے لئے فراغت نہیں ہوتی، اس کے لئے رات کا وقت تجویز کیا گیا ہے، اس کا راز یہ ہے کہ برکت تعلیم کے لئے نور کی ضرورت ہے اور نور پیدا ہوتا ہے، ذکر کامل سے اور ذکر کامل کے لیے خلوت کی ضرورت ہے، اس کے لئے بزرگوں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ قلب کو سوائے ذات واحد کے کسی طرف متوجہ نہ کرنا چاہیے۔ (صفحہ ۱۴- جلد ۹)

خلوت کے لیے اگر شب و روز میں کچھ وقت مقرر کیا جائے تو وہ کافی ہے، جیسے کنواں کہ ہر وقت پانی کھینچنے سے ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے کچھ وقت کے لئے پانی کھینچنا بند کر دیا جائے، تاکہ چشمہ آب سے پر ہو جائے، اسی طرح شیخ کو ضرورت ہے کہ تعلیم و ارشاد سے فارغ ہو کر کچھ وقت خلوت کا مقرر کرے۔ (۵۱-۹)

اصل بات یہ ہے کہ سمجھ کے لیے نور کی ضرورت ہے اور یہ نور پیدا ہوتا ہے کثرت ذکر سے اور تقویٰ سے اور اس کے لیے صحبت اہل اللہ کی ضرورت ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے نئی تعلیم کے افراد کو اعراض ہے۔ (ص ۲۱۹- جلد ۸)

بزرگوں کی سوانح عمری اور قصے یاد کرنے اور ملفوظات پڑھنے سے (جب کہ فرد خود خالی ہو) کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے قلعہ کے چاروں طرف خندق ہو، جو میلوں چلی گئی ہو، جس نے قلعہ کو گھیر رکھا ہو، مگر اس میں پانی اپنا نہ ہو، پانی کے لئے نہر کنویں کی محتاج ہو، قلعہ کے اندر کنواں ہے، جو اگرچہ چھوٹا ہے، مگر اس کے اندر سے پانی جوش مارتا ہے۔ وہ باہر کا محتاج نہیں، تو خود وہ کام اور اعمال کرنے چاہییں، جس سے زبان سے از خود ملفوظات ابلنے لگیں۔ نقل کی حاجت نہ رہے، اگرچہ برکت و افادہ کے لیے نقل کا مضائقہ نہیں (۱۷۵- جلد ۸)

قلب کی ظلمت

بلا ضرورت گفتگو سے قلب میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے، اگر گفتگو کی ضرورت ہو وہ چاہے کتنی ہی ہو، اس سے ظلمت طاری نہیں ہوتی، مثلاً ایک کنجرہ سارا دن یہ اعلان کرتا پھرے کہ خربوزہ لے لو تو اس سے ظلمت پیدا نہ ہوگی، لیکن اگر بلا ضرورت یہ بھی پوچھا جائے

کہ کب جاؤ گے تو اس سے بھی ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ (صفحہ ۹۸ جلد ۲)

اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنا

انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے ظن کے ساتھ ہے، جیسا بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرماتا ہے۔ اس کی ذات بڑی کریم اور رحیم ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ماضی اور مستقبل کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے، اس سے فرد بڑی دولت سے محروم رہتا ہے، یہ بھی ماسوی اللہ کی مشغولی ہے، خلاصہ یہ کہ جان بوجھ کر ماضی اور مستقبل کے مراقبہ کی ضرورت نہیں، اگر بغیر ارادے کے خیال آجائے تو ماضی کی کوتاہیوں پر توجہ و استغفار کرنا چاہیے، بس یہ کافی ہے، کوشش سے ماضی کے گناہوں کو یاد کر کے بعض اوقات وہ حجاب کا باعث بن کر خسران کا ذریعہ بن جاتے ہیں، آئندہ کے لئے تجویزوں کی ضرورت بھی نقصان دہ ہے، یہ سوچنا کہ میں پہلے کیا تھا، اب کیا ہوگیا، میں کچھ ہوا یا نہیں، ان خیالات کو چھوڑ دینا چاہیے، کسی حال میں مایوسی کے قریب نہ جانا چاہیے، وہ دربار ہی عجیب ہے، کوئی شخص کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو۔

باز آ، باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گر و بت پرستی باز آ
ایں در گہ مادرگہ نومیدی نیست
صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

تم جو کچھ بھی ہو، اگر کافر، مشرک اور بے دین بھی ہو تو بھی توبہ کرلو، ہم قبول کریں گے، کیوں کہ یہ ہماری درگاہ ہے، یہاں مایوسی نہیں، اگر سو بار توبہ کر کے پھر توڑ دی ہو، پھر توبہ کرلو، تب بھی قبول ہے، رحمت حق ہر وقت اپنے بندوں کے لئے بخشش کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ (صفحہ ۲۷۲-جلد ۴)

اللہ کی رحمت و مغفرت

اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی کریم و رحیم ہے، اگر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا پوری طرح استحضار ہوجائے تو مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق کی حد تک محبت پیدا ہوجائے، اس لیے کہ یہ فطری بات ہے کہ محسن کی طرف کشش ہوتی ہے، لیکن لوگوں میں یہ بات رہی

نہیں، دلوں میں یہ بات کس طرح ڈال دی جائے، حدیث میں سابقہ قوموں کا ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص نے مرنے کے وقت اپنے لڑکوں کو وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو میری لاش کو جلانا اور اس کی راکھ کو باریک پیس کر رکھ دو، جب تیز آندھی آجائے تو ہوا میں اڑادینا اور کچھ دریا میں بہادینا کہ میں گنہگار ہوں اور سیہ کار ہوں، عذاب سے بچنے کی تدبیر کر رہا ہوں، چنانچہ مرنے کے بعد اس کے لڑکوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کون نکل کر جاسکتا ہے، فرشتوں کو اس کی مٹی جمع کرنے کا حکم ہوا اور سامنے کھڑا کر دیا گیا، سوال ہوا کہ ایسا کیوں کیا، عرض کیا، **یارب من خشیتک**. فرمایا، جاؤ، نجات ہے، علماء نے اشکال کیا ہے کہ اس سے اس شخص کا اللہ کی ذات پر اعتماد میں شک ثابت ہوتا ہے، پھر ایمان کہاں رہا، پھر غیر مومن کی مغفرت کیسے ہوئی۔ محققین کا کہنا ہے کہ اس شخص کی عقل ہی اتنی تھی، آخر مجنون بھی تو غیر مکلف ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ عذاب کا مدار عقل پر ہے، عقل میں جس قدر کمی ہوگی، اسی حساب سے نرمی ہوگی، بہرحال اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت ظاہر ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۸-جلد ۸)

بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھے، اگرچہ وہ حسن ظن جھوٹا ہی ہو، کیوں کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت فرمائے گا۔ (صفحہ ۲۶۰-جلد ۱۰)

اللہ تعالیٰ بخشنے کے لئے تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں، عذاب کے لئے نہیں ڈھونڈتے۔ ان کو کسی کو عذاب دینے سے کیا کام، فرماتا ہے۔ **ما یفعل اللہ بعذابکم**. اس میں شکر اور ایمان کا کوئی خاص درجہ بیان نہیں کیا، لہٰذا اگر ایمان اور شکر کا ادنیٰ درجہ بھی ہوگا تو وہ بھی مغفرت کے لئے کافی ہے۔ (صفحہ ۲۸۲-جلد ۱۰)

مناظرے کے نقصانات

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو مناظرے سے کبھی فائدہ نہیں ہوا۔ نفع جتنا بھی ہوا ہے، تبلیغ سے ہوا ہے اور وہ بھی اس تبلیغ سے جو، **جاء ھم بالتی ھی احسن**. کے تحت ہوئی ہو۔

آج کل کے مناظروں سے اصل مقصد ہوتا ہے کہ غلبہ حاصل ہو اور لوگوں کے اندر رسوائی اور سبکی نہ ہو، آخرت میں ذلت کی کوئی پروا نہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے

اپنے صاحبزادے کو مناظرہ سے منع فرمایا تھا۔ صاحبزادے نے عرض کی کہ آپ بھی مناظرہ کرتے تھے، امام صاحب نے فرمایا، ہمارے اور تمہارے مناظرہ میں فرق ہے، ہم دل سے چاہتے ہیں کہ مخالف کے منہ سے حق بات نکلے اور ہم اسے قبول کریں اور مناظرہ بند کریں، چاہے مناظرہ میں ہمیں شکست ہی کیوں نہ ہو اور تم یہ چاہتے ہو کہ مخالف کی زبان سے حق بات نہ نکلے، جو ہمیں قبول کرنا پڑے، اس لئے ہمارے لیے مناظرہ جائز، تمہارے لیے ناجائز۔ (صفحہ۵۲-جلد۳)

حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، جب تم سے کوئی شخص کسی معاملہ میں قیل وقال اور بحث وجدال کرنے لگے تو تم سب رطب ویابس اس کے سپرد کر کے الگ ہو جایا کرو۔ (صفحہ۶۹ جلد۳)

امیروں کی صحبت کے اثرات

امراء کے پاس بیٹھ کر قلب میں دین کا اثر کمزور ہو جاتا ہے اور دنیا کا اثر قوی ہو جاتا ہے، یہ اثر اس لیے ہوتا ہے کہ ان کے پاس تابع بن کر (ضرورت کی حیثیت سے) جایا جاتا ہے، جو شخص ارادہ کر کے کسی کے پاس جائے گا، اس پر ضرور اس کے اثرات ہونگے، چنانچہ اگر امراء قصد کر کے، اہل دین کے پاس آئیں تو ان پر دین کا اثر ہوگا، وہ اس سے نہیں بچ سکیں گے، غرض کہ اثر تابع پر ہوتا ہے، متبوع پر نہیں ہوتا، یہی قاعدہ نیک اور بد صحبت کا ہے، خراب آدمی اگر نیک آدمی کی صحبت اختیار کرے گا یعنی تابع بن کر اس کے پاس آئے گا، تو اس پر اثر ہوگا اور اس کی زندگی میں دین آئے گا۔ اگر نیک آدمی برے انسان کی صحبت اختیار کرے گا اور تابع بن کر اس کے پاس رہے گا تو اس پر بدی کا اثر ہوگا۔ (صفحہ۳۹-جلد۳)

بروں کی صحبت سے پرہیز کا مطلب

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ نیکوں کو تو حکم ہے کہ خراب لوگوں کی صحبت سے بچو اور بُروں کو حکم ہے کہ نیکوں کی صحبت اختیار کرو تو اس صورت میں نیک لوگ بروں کو اپنی صحبت میں کیسے آنے دیں گے، اس لئے کہ ان کو حکماً ایسا کرنے سے روکا گیا ہے۔

اللہ کی یہ سنت ہے کہ تابع کا اثر متبوع پر نہیں ہوتا، متبوع کا اثر تابع پر ہوتا ہے، اس لیے نیک لوگوں کو جو حکم ہے کہ خراب لوگوں کی صحبت اختیار نہ کریں اور ان سے بچیں، اس کا

مطلب یہ ہے کہ ان کے تابع بن کر ان کی صحبت اختیار نہ کریں۔ لیکن اگر وہ تمہارے پاس آئیں گے تو چونکہ وہ تابع ہو کر آئیں گے، اس لئے ان کو اپنے پاس آنے دیں۔ اس طرح برے لوگوں کو حکم ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے تابع بن کر جاؤ۔ (صفحہ۵-جلد۸)

ٹیپ ٹاپ

اہل کمال کو زیب و زینت کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ایسی فضولیات میں مصروف ہوں، میں جب کسی کو زیب وزینت کا اہتمام کرتے دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ یہ شخص کمال سے خالی ہے اور حصول کمال کی طرف متوجہ بھی نہیں۔ (صفحہ۲۷۰-جلد۲)

دنیا کی حقیقت

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے عجیب بات فرمائی ہے، اگر دنیا میں کوئی بھی عیب نہ ہوتو کیا یہ کم عیب ہے کہ وہ بہت جلد ہاتھ سے نکل جانے والی ہے، جب دنیا سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر موت کے وقت دنیا سے جدا کرنے والی ہستی پر طبعاً غصہ آنے لگتا ہے، یہ بہت بڑا نقصان ہے، دنیا بذات خود نفرت کی چیز نہیں۔

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است

(صفحہ۲۷۵-جلد۲)

حکومت دین کے منافی نہیں، انبیاء علیہم السلام میں بادشاہ بھی ہوئے، حضور ﷺ نبی بھی تھے اور حکمران بھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی تھی رب ھب لی ملکا لاینبغی لاحد من بعدی. اے رب، مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ ویسی سلطنت پھر کسی کو نہ ملے۔ اس لیے میں کہتا ہوں، آپ ایسی ترقی کیجیے کہ کوئی آپ کا مقابلہ نہ کر سکے، لیکن یہ ترقی جائز ہو، ناجائز نہ ہو، جہاں بزرگوں نے حکومت چھوڑی ہے تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ان کے مزاج کے مطابق نہ تھی، جیسے بعض لوگوں کو بھنا ہوا گوشت موافق نہیں ہوتا، جن بزرگوں نے

دنیا کو چھوڑا ہے، وہ علاج سمجھ کر چھوڑا ہے اور اس پرہیز کو عبادت تصور نہیں کیا ہے۔
(۱۸۲-جلد۱۰)

جس طرح طبیب بیماری کے دوران پرہیز کراتا ہے، صحت کے بعد پرہیز کی ضرورت نہیں، اسی طرح صوفی مجاہدات کے دوران پرہیز کراتا ہے، لیکن وہ اسے عبادت نہیں کہتا، بلکہ معالجہ سمجھتا ہے، ہاں اگر کسی کا مرض دائمی نوعیت کا ہو تو اس کی پرہیز بھی مستقل نوعیت کی ہوگی۔ ورنہ مرض ختم ہونے پر علاج بھی ختم ہو جاتا ہے۔ (صفحہ۱۸۳-جلد۱۰)

ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ دل سے بیوی بچوں کی محبت نہیں جاتی (اس کا علاج بتایئے) میں نے لکھا کہ بیوی کی محبت سے گھبراتے ہو، اور چیزیں بھی تو ہیں، جن سے محبت کی جاتی ہے، بھوک کے وقت کھانے سے محبت ہو جاتی ہے، نیند کے وقت سونے سے محبت ہو جاتی ہے، ان چیزوں کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا کہ ان کی محبت نہیں جاتی۔ کیا بیوی بچے ہی مشق کے لئے رہ گئے ہیں، اگر تمہارے نزدیک عارف وہی ہے، جسے غیر اللہ کی محبت بالکل نہ ہو تو عارف تو تم بیوی بچے چھوڑ کر بھی نہ ہوئے۔

معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی محبت عارف کے منافی نہیں، بشرطیکہ کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کی محبت کے مزاحم و متصادم نہ ہو۔ (صفحہ۱۷۹-جلد۱۰)

دو قسم کے نیک لوگ

نیک لوگ دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو کتابیں پڑھ کر نیک ہو جاتے ہیں، دوسرے وہ جو بزرگوں کی صحبت اور تربیت کے ذریعہ نیک ہو جاتے ہیں، ان دونوں میں فرق ہے، دین کی جو سمجھ بزرگوں کی تربیت اور صحبت سے حاصل ہوتی ہے، وہ خالی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتی، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص ماہر حکیم کے مشورہ کے بغیر طب کی کتابیں پڑھ کر مقویات کا استعمال کرے اور دوسرا حکیم کے مشورہ سے کرے۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

(صفحہ۹۳-جلد۹)

غیر تربیت یافتہ کی مثال

غیر تربیت یافتہ شخص ہمیشہ ڈانواڈول ہی رہتا ہے، اس میں رسوخ تو ہوتا نہیں، اس لیے وقت بے وقت اس کا قلب متوحش ہو جاتا ہے، قلب کو تھامنے والی تو کوئی چیز ہوتی نہیں، اس لیے زہد و تقویٰ، ذکر و فکر اور علم و عقل سب کا سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے، وہی مثال ہو جاتی ہے، کہ جیسے ایک بادشاہ نے ایک بلی کی تربیت کی، رات کے وقت اس کے سر پر چراغ رکھ دیتا۔ وہ چراغ لیے کھڑی رہتی، جب بادشاہ کو بلی کی تربیت پر اطمینان ہو گیا تو ایک روز وزیر سے اس کی تعریف کرنے لگا کہ ہماری بلی بڑی مہذب ہے، وزیر نے کہا کہ حضور نے امتحان بھی لیا ہے، بادشاہ نے کہا، امتحان کیسا، وزیر نے ایک چوہا پکڑ کر اسے چھپالیا، بلی کے سر پر چراغ رکھا گیا، اس وقت اس کے سامنے چوہا چھوڑ دیا، چوہے کو دیکھنا تھا کہ بلی ایک دم چوہے کی طرف جھپٹی۔ سال دو سال کی تربیت آن واحد میں ختم ہو گئی۔ یہی حالت غیر تربیت یافتہ کی ہو جاتی ہے، اس کی کسی بات پر اعتماد نہیں ہوتا۔ (جلد۸)

تربیت میں تنقید کا فائدہ

ایک شخص درخت کے نیچے سو رہا تھا، ایک گھوڑے سوار اس طرف سے گذرنے لگا، اس نے دیکھا کہ درخت سے ایک اژدہا اتر رہا ہے اور سونے والے کا کام تمام کردے گا، سوار نے سوئے ہوئے شخص کو چابک رسید کیا، جس سے وہ ایک دم چونک کر اٹھا اور بھاگا اور سوار کو گالیاں دینے لگا، اس نے اس سے کہا کہ وہاں دیکھیے، جب اس نے اس طرف دیکھا تو سانپ نظر آیا، اس پر وہ اس پر ہزار جان سے قربان ہونے لگا۔ اور دعائیں دینے لگا۔ (۱۷۱-جلد۸)

توکل کا غلط مفہوم

آج کل لوگ دنیا کے کاموں میں تو ممکن حد تک جدوجہد کرتے ہیں، جب جدوجہد کے باوجود ناکام ہوتے ہیں تو مایوس نہیں ہوتے۔ لیکن دین کے کاموں میں ہی بلا جدوجہد کے توکل رہ گیا ہے، اس توکل کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی قوم نکاح کرنا چھوڑ دے اور توکل پر اولاد کی تمنا کرنے لگے کہ جب اللہ تعالیٰ خود ہی قرآن کا محافظ ہے تو پھر قرآن

کا پڑھنا، لکھنا اور چھاپنا چھوڑ دیا جائے۔ انا لہ لحافظون. کے معنی یہ ہے کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ اور ایسی جماعت پیدا فرماتے رہیں گے، جو قرآن کی حفاظت کرتی رہی گی۔ اسی طرح دین کے کاموں کو سمجھا جائے کہ ان میں توکل کرنے کا مطلب تدابیر سے دست بردار ہونا نہیں، بلکہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ تدابیر کرو اور اللہ کو کارساز سمجھو۔ کیونکہ تدبیر کا حکم بھی اللہ ہی نے دیا ہے۔ (صفحہ ۸۰-جلد ۸)

فکر اور اخلاص میں توازن کا مسئلہ

جب آدمی فکر سے کام نہیں لیتا تو اکثر غلطیاں کرتا رہتا ہے، فکر سے کام لینے کی وجہ سے غلطیاں کم ہوتی ہیں، ایک حافظ صاحب تھے، ان میں بے فکری کا مرض زیادہ تھا، ان سے میں نے کہا کہ سوچ کر کام کیا کرو اور سوچ کر بات کیا کرو، لیکن جب اپنی عقل نہ ہو تو دوسروں کا مشورہ کہاں تک کام آئے گا، ان صاحب نے فکر اور سوچ سے کام لینے کا آغاز ریل سے کردیا۔ یہاں سے روانگی ہوئی، ریل سے اتر کر چنے لینے کا ارادہ کیا، اب کھڑے سوچ رہے ہیں کہ چنے لینے کی خواہش ہوئی، بیوی بچے ساتھ تھے، جب بچوں کو ریل میں سوار کر چکے تو چنے لینے کی خواہش نفس کی لذت کی وجہ سے تو نہیں، خریدوں یا نہ خریدوں، اسی سوچ میں تھے کہ ریل کے چلنے کی سیٹی بجی، اب یہ صاحب اسٹیشن پر، بچے گاڑی میں پریشان، مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ عقلمند، مراقبہ اس طرح کرنا چاہیے تھا کہ چنے خرید کر ریل میں سوار ہوجاتے اور پھر بیٹھ کر (اطمینان سے) سوچتے کہ ان کی واقعی ضرورت ہے یا محض حظ نفس کے لئے ہیں، اگر ضرور نہ سمجھتے تو دوسروں کو دیدیتے یا بیوی بچوں ہی کو دے دیتے۔ سو ایسا فکر غلو ہے۔

اسی طرح ہر فکر میں اعتدال چاہیے۔ مثلاً لوگ اخلاص کی فکر میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ اصل عمل رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص ریاء سے عمل کرتا ہو تو اسے کرتے رہنا چاہیے، ترک نہ کرنا چاہیے، ابتدا میں تو ریا کے ساتھ کام ہوگا، پھر عادت ہوجائی گی اور عادت سے عبادت ہوجائے گی، کیسی حکیمانہ تحقیق ہے، مایوسی کا نام ونشان ہی نہیں، بعض اوقات شیطان، ریا کا وسوسہ پیدا کر کے فرد کو عمل سے ساری عمر کے لئے سے روک دیتا ہے، جو بڑا خسارہ ہے، اخلاص کی فکر میں اتنا

غلو نہ کرنا ہے۔ (صفحہ ۱۵۳-جلد ۶)

اخلاق حمیدہ کا پیدا ہونا

ساری کوششوں اور جدوجہد سے حاصل یہ ہے کہ اخلاق حمیدہ میں پختگی اور کمال پیدا ہوجائے اور اخلاق رذیلہ دور ہوجائیں۔ خاتمہ مقصود نہیں، اس لیے کہ رزائل بذات خود مذموم نہیں، مثلاً بخل، بغض، شہوت اور عداوت وغیرہ یہ سارے جذبات بذات خود خراب نہیں، بلکہ محمود ہیں، لیکن جب یہ جذبات (اپنی) حدود سے گزر کر غلط چیزوں میں استعمال ہونے لگیں، اس وقت مذموم ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۶۷-جلد ۹)

معصیت کے نقصانات

معصیت نہایت ہی بڑی اور مہلک چیز ہے، اس سے اجتناب کی سخت ضرورت ہے، بندے کے لیے وہ گھڑی نہایت ہی مبغوض اور منحوس ہے، جس میں یہ اپنے خدا کا نافرمان ہوتا ہے، اگر حس بیدار ہو تو گناہ کے بعد قلب پر ظلمت محسوس ہوتی ہے، اور نافرمانی کا یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ آئندہ کے لیے عمل کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، ڈرنے کی بات ہے، گناہ کا شدید پہلو یہ ہے، کبھی بے فکری کی وجہ سے چھوٹے گناہ سے بڑا گناہ صادر ہوجاتا ہے۔ اور وہ کفر کا سبب ہوتا ہے، اس لیے گناہ کرنے کے بعد بے فکر نہ ہونا چاہیے، بلکہ توبہ واستغفار کرنا چاہیے، مگر یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ اس کے بعد پھر جب کبھی خیال آئے اس فکر میں پڑجائے بلکہ اللھم اغفرلی، کہہ کر آگے چلے اور کام میں لگے۔ توبہ کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے متعلق حضرت سلطان نظام الدین (اولیاء) قدس سرہ نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ فلاں گناہ کرنے کے بعد جو توبہ کی تھی، وہ قبول ہوئی یا نہیں، اس کا معیار یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ گناہ کے یاد آنے سے نفس میں حظ (لذت) پیدا ہوتی ہے یا نفرت اور کدورت، اگر نفرت ہوتی ہے تو توبہ قبول ہوچکی ہے، اگر حظ ہوتا ہے تو توبہ قبول نہیں ہوئی، دوبارہ توبہ کرنا چاہیے۔ (۱۱۲-جلد ۶)

اہل اللہ کی صحبت اور تصوف کے مسائل

بسمیت جعلی تصوف کی نشاندہی

تصوف کی حقیقت

اصل تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے، وہی چیز ہے، جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہے، کچھ اصطلاحات اور کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن چیز وہی ہے، جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن اصطلاحات تو علمائے محدثین اور فقہاء کی بھی اپنی خاص ہیں۔ جو ضرورت اور سہولت کی وجہ سے مقرر کی گئی ہیں۔ جنہیں بدعت ممنوع نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ یہ اصطلاحات احداث فی الدین نہیں ہے، جو منع ہیں، بلکہ احداث للدین ہے، جو منع نہیں، یہ تفصیل ہمارے اکابر نے بیان کی ہے، جو نہایت لطیف ہے اور بالکل صحیح ہے۔ اصطلاحوں کی ضرورت جو سہولت کے لئے ہے، وہ دراصل (صلاحیتوں) کی استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے پڑی۔ تقریر کا جو رنگ علمائے مصنفین کا ہے، وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا نہیں تھا، لیکن اس سے (یعنی تقریر کے مختلف رنگ ہونے کی وجہ سے) مقاصد میں فرق نہیں آیا۔ یہی حال تصوف کا بھی ہے کہ صرف بعض اصطلاحات مختلف ہیں، باقی مقاصد وہی ہیں۔ جو قرآن وحدیث میں ہیں۔

جہاں تک احوال ومواجید کا تعلق ہے تو ان احوال کا، تصوف کے فن یا مقاصد سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو احوال ہیں، جو ہر شخص پر اس کی استعداد کے موافق طاری ہوتے ہیں۔ ذکر وفکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں۔ بعض (اہل قلم صوفیہ نے) ان کو اس لیے مدون کیا ہے، تاکہ کسی پر اس قسم کے حالات طاری ہوں تو وہ اپنے حالات کو ان احوال پر منطبق کرسکے۔ وہ بھی شیوخ کی رائے سے، باقی طالبین کے لیے تو ان کا مطالع بھی سخت مضر اور ممنوع ہے، عرض کیا گیا کہ ایسے احوال حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیوں طاری نہیں ہوتے تھے، جب کہ ان کا عمل بھی قرآن وحدیث پر تھا۔ فرمایا استعداد (اور صلاحیت) کا

فرق ہے۔ (صفحہ ۹۸-۹۹-جلد ۱۰)

فنوں کے حصول کا طریقہ

یہ جو مقولہ مشہور ہے کہ تصوف ایسی چیز ہے، جو سینہ بسینہ منتقل ہوتا ہے، جو چیز سینہ بسینہ پہنچتی ہے، وہ علوم نہیں ہوتے، بلکہ وہ نسبت ہے، جو سینے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کا ذریعہ صحبت ہے۔ تصوف ہی نہیں، بلکہ ہر فن اسی طرح حاصل ہوتا ہے، جب تک کسی استاد کی صحبت میں رہ کر فن حاصل نہ کیا جائے، تب تک اس فن سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی شخص سال بھر کسی بڑھئی کو کام کرتا دیکھتا رہے، لیکن اس سے باقاعدہ فن سیکھنے کا عمل شروع نہ کرے تو سال بھر کے مشاہدے کے باوجود وہ لکڑی کو درست نہیں کرسکتا، غرض کہ ہر فن میں مناسبت اور مہارت اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب استاد کی رہنمائی میں وہ فن باقاعدہ سیکھا جائے۔ (صفحہ ۱۹۶-جلد ۱۰)

تصوف کے گہرے حقائق کے ذکر پر فرمایا، جو چیز باغ کے اردگرد جھاڑ جھنکاڑ کے درجے میں تصوف کے تابع اور محافظ تھیں، لوگوں نے ان چیزوں کو مقصود سمجھ لیا ہے، یہ چیزیں بذات خود تو غلط نہیں، لیکن ان کا درجہ متعین ہونا چاہیے، یہ خرابی اس لیے پیدا ہوئی کہ احوال اور کیفیات کو مدون کر کے کتابی صورت میں شائع کیا گیا، حالانکہ یہ چیزیں تصوف میں معاون کی حیثیت رکھتی ہیں، اس اعانت کی وجہ سے وہ خلوت میں کہنے کی تھیں اور وہ باتیں متعلقہ افراد کے لیے تھیں، تاکہ ان کو جب ذکر وفکر کے نتیجہ میں وہ حالات پیش آئیں تو وہ پریشان نہ ہوں اور اپنے حالات کو ان کی تحقیقات پر منطبق کرلیں، اس طرح واردات کے صحیح اور غلط ہونے کے معیار کو سمجھ لیں، اس مقصد کے لیے تصوف کے یہ علوم مدون ہوئے، لیکن اب تو فصوص الحکم، جیسی کتابوں کے ترجمے ہوکر مارکیٹ میں آرہے ہیں، ایسی کتابوں سے نقصان ہوا ہے۔

طب کی کتاب کا ترجمہ پڑھ کر مسل نہیں دیا جاسکتا۔ (اس سے نقصان کا خطرہ ہے) حالانکہ کتابیں صحیح ہیں (اور نسخے بھی صحیح ہیں) لیکن یہ کتابیں مریض کے لیے نہیں، بلکہ طبیب کے لیے ہیں، مریض کی کتاب تو خود طبیب ہے اور طبیب کی کتاب وہ کتاب ہے۔ (صفحہ ۱۸۵-جلد ۱۰)

تصوف میں طبیب جسمانی کی طرح علاج کرنا پڑتا ہے اور ہر پیچیدہ بات پر نظر رکھنی

پڑتی ہے، اس علاج کی مثال سمجھ لیجیے۔ مثلاً ایک شخص گناہ کرنا چاہتا ہے، اس کو روکنے کی کیا تدبیر ہے، کیا اس کو یہ کہا جائے گا کہ گناہ کے وقت رحمت خداوندی پر نظر کرو، یقیناً اعتقاد تو رحمت پر رکھنا چاہیے، لیکن اس وقت نظر اور توجہ، اللہ کے غضب پر ہونا چاہیے، جیسے سخت بیماری کی حالت میں طبیب کی دوائی کے ساتھ ساتھ ایک خاص وقت تک کے لیے غذا کا استعمال چھوڑ دینا چاہیے، یہ خاص وقت کا تعین طبیب کرتا ہے، اسی طرح روحانی بیماری کے علاج میں ہوتا ہے، اگر یہ تدبیر بھی بدعت ہے تو طبیب نے جو تدبیر اختیار کی ہے، وہ بھی ضرور بدعت ہونی چاہیے، اگر یہ بدعت نہیں تو وہ بھی بدعت نہیں، اس کی نظیر حدیث میں ہے۔ ان اللہ لاینظر الیٰ صورکم ولاکن ینظر الیٰ اعمالکم. اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا ہے، بلکہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ (صفحہ ۶- جلد ۷)

تصوف میں اشغال وغیرہ کی حیثیت تدابیر کی ہے، یہ سب دوائیں ہیں، غذا نہیں ہیں اور دوا کبھی مقصود نہیں ہوا کرتی۔ ہاں مقصود کی معین ضرور ہوتی ہے، مقصود تو صحت ہے، تصوف میں مقصود اعمال واجبہ کی اصلاح ہے اور استقامت ہے، یہ تدابیر اس مقصد کے لیے معاون ہیں۔ (۸۸- جلد ۷)

تصوف کے نام پر خرافات

آج کل مقصد کو غیر مقصد اور غیر مقصد کو مقصد سمجھ لیا گیا ہے اور ورد و وظائف کو تو طریق (راستہ) سمجھتے ہیں، اور کیفیات اور لذات کو مقصد کا ثمرہ سمجھتے ہیں، کتنا دھوکا ہے، جس میں لوگ مبتلا ہو گئے ہیں، حالانکہ مقصد اعمال ہیں اور اس کا ثمرہ اللہ کی رضا ہے، یہ ہے تصوف کی حقیقت۔ اس مقصد کے ہوتے ہوئے اگر ساری عمر بھی کیفیات اور لذات حاصل نہ ہوں تو کوئی نقصان نہیں، کام کرنے والے کی تو شان ہی دوسری ہوتی ہے، وہ نہ تو لذات کو دیکھتا ہے اور نہ دل لگی کو، اگر اس پر کام موقوف رکھا جائے تو یہ تو خدا پرستی نہ ہوئی، یہ تو لذت پرستی ہوئی، اپنی ہی پوجا پاٹ ہوئی، خدا کی عبادت کہاں ہوئی۔ (صفحہ ۵۰- جلد ۷)

عوام نے بزرگوں کی چند علامتیں مقرر کی ہیں، وہ علامتیں یہ ہیں، رنگے ہوئے کپڑے، بڑے دانوں کی تسبیح، خاموش رہنا، بڑا چوغا زیب تن ہو۔ سر پر عمامہ ہو، پھر چاہے ڈاکو ہو، چور ہو، زانی ہو، جھوٹا ہو، مکار ہو، فریبی ہو، مگر یہ درویشی ایسی بحر ذخار سمندر ہے کہ اسے کوئی ناپاک نہیں کرسکتا۔

تسبیح لیں گے تو ایسی لیں گے کہ میدان کارزار میں تلوار کی ضرورت نہ ہو، وہ تسبیح لٹھ کا کام دے سکے، لباس ایسا پہنیں گے کہ دور سے معلوم ہو کہ کوئی بہت بڑے شاہ صاحب ہیں، مگر یہ شاہ صاحبی کیسی، جس کے لئے وردی کی ضرورت ہے، جن کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، ان کو بناؤ سنگھار کی کہاں فرصت ہے، تصوف اور درویشی اللہ سے صحیح تعلق کا نام ہے، باقی سب فضول ہے۔ (صفحہ ۵۰- جلد ۷)

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ آج کل بعض خشک علماء بھی تصوف کے بعض اجزاء کی مخالفت کرتے ہیں، جیسے بعض ریاضتیں اور بعض اشغالات ہیں، فرمایا، بدعت کی حقیقت تو یہ ہے کہ اس کو دین سمجھ کر کیا جائے، اگر علاج سمجھ کر کیا جائے تو بدعت کیسے ہوسکتی ہے، بس ایک چیز احداث للدین ہے، (یعنی دین حاصل کرنے کے لئے کوئی نئی بات پیدا کرنا) احداث للدین سنت ہے جبکہ احداث فی الدین بدعت ہے، اس پر الحمدللہ کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ تصوف زیادہ تر جہلاء صوفیوں کی بدولت بدنام ہوا ہے، ان کے ہاں محض گدی نشین ہونا مقصود ہے۔ (صفحہ ۲۳۰- جلد ۷)

جن چیزوں کی شیخ تعلیم دیتا ہے، ان کا درجہ طبیب جسمانی کی تدابیر سے زیادہ نہیں، مقصود نہیں، محمود ہیں اور مقصد کی معین ہیں، تصوف کے اشغال اور تدابیر کو بدعت اس وقت کہا جاتا، جب ان کو دین اور مقصد سمجھ کر کیا جاتا، رہا یہ سوال کہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے، جو ان اشغال کو دین اور مقصد سمجھ کر کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہلاء اور اہل باطل کے رویے یا قول سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔ (صفحہ ۱۸۴- جلد ۶)

تصوف میں اتباع سنت کی اہمیت

بزرگان کرام کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حالات آجکل کے مشائخ کے حالات سے بالکل مختلف تھے، موجودہ مشائخ وصول الی اللہ کے لیے اتباع شریعت کو چنداں ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ شریعت اور طریقت کو جدا قرار دیتے ہیں، جب کہ بزرگان سلف تقویٰ، طہارت اور اتباع سنت میں صحابہ کرام رضہ کا نمونہ تھے، حضرت خواجہ معین الیین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ ایک بار دوران وضو انگلیوں کا خلال کرنا بھول گئے، تو غیب سے آواز آئی کہ محبت رسول کا دعویٰ اور سنت رسول کا ترک۔ آپ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کروں گا۔ لکھا ہے کہ آپ کی حالت یہ تھی کہ

اہل اللہ کی صحبت اور تصوف کے مسائل

بسمیت جعلی تصوف کی نشاندہی

تصوف کی حقیقت

اصل تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے، وہی چیز ہے، جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہے، کچھ اصطلاحات اور کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن چیز وہی ہے، جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن اصطلاحات تو علمائے محدثین اور فقہاء کی بھی اپنی خاص ہیں۔ جو ضرورت اور سہولت کی وجہ سے مقرر کی گئی ہیں۔ جنہیں بدعت ممنوع نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ یہ اصطلاحات احداث فی الدین نہیں ہے، جو منع ہیں، بلکہ احداث للدین ہے، جو منع نہیں، یہ تفصیل ہمارے اکابر نے بیان کی ہے، جو نہایت لطیف ہے اور بالکل صحیح ہے۔ اصطلاحوں کی ضرورت جو سہولت کے لئے ہے، وہ دراصل (صلاحیتوں) کی استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے پڑی۔ تقریر کا جو رنگ علمائے مصنفین کا ہے، وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا نہیں تھا، لیکن اس سے (یعنی تقریر کے مختلف رنگ ہونے کی وجہ سے) مقاصد میں فرق نہیں آیا۔ یہی حال تصوف کا بھی ہے کہ صرف بعض اصطلاحات مختلف ہیں، باقی مقاصد وہی ہیں۔ جو قرآن وحدیث میں ہیں۔

جہاں تک احوال ومواجید کا تعلق ہے تو ان احوال کا، تصوف کے فن یا مقاصد سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو احوال ہیں، جو ہر شخص پر اس کی استعداد کے موافق طاری ہوتے ہیں۔ ذکر وفکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں۔ بعض (اہل قلم صوفیہ نے) ان کو اس لیے مدون کیا ہے، تاکہ کسی پر اس قسم کے حالات طاری ہوں تو وہ اپنے حالات کو ان احوال پر منطبق کرسکے۔ وہ بھی شیوخ کی رائے سے، باقی طالبین کے لیے تو ان کا مطالع بھی سخت مضر اور ممنوع ہے، عرض کیا گیا کہ ایسے احوال حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیوں طاری نہیں ہوتے تھے، جب کہ ان کا عمل بھی قرآن وحدیث پر تھا۔ فرمایا استعداد (اور صلاحیت) کا

فرق ہے۔ (صفحہ ۹۸-۹۹-جلد ۱۰)

فنوں کے حصول کا طریقہ

یہ جو مقولہ مشہور ہے کہ تصوف ایسی چیز ہے، جو سینہ بسینہ منتقل ہوتا ہے، جو چیز سینہ بسینہ پہنچتی ہے، وہ علوم نہیں ہوتے، بلکہ وہ نسبت ہے، جو سینے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کا ذریعہ صحبت ہے۔ تصوف ہی نہیں، بلکہ ہر فن اسی طرح حاصل ہوتا ہے، جب تک کسی استاد کی صحبت میں رہ کر فن حاصل نہ کیا جائے، تب تک اس فن سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی شخص سال بھر کسی بڑھئی کو کام کرتا دیکھتا رہے، لیکن اس سے باقاعدہ فن سیکھنے کا عمل شروع نہ کرے تو سال بھر کے مشاہدے کے باوجود وہ لکڑی کو درست نہیں کرسکتا، غرض کہ ہر فن میں مناسبت اور مہارت اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب استاد کی رہنمائی میں وہ فن باقاعدہ سیکھا جائے۔ (صفحہ ۱۹۶-جلد ۱۰)

تصوف کے گہرے حقائق کے ذکر پر فرمایا، جو چیز باغ کے ارد گرد جھاڑ جھنگاڑ کے درجے میں تصوف کے تابع اور محافظ تھیں، لوگوں نے ان چیزوں کو مقصود سمجھ لیا ہے، یہ چیزیں بذات خود تو غلط نہیں، لیکن ان کا درجہ متعین ہونا چاہیے، یہ خرابی اس لیے پیدا ہوئی کہ احوال اور کیفیات کو مدون کر کے کتابی صورت میں شایع کیا گیا، حالانکہ یہ چیزیں تصوف میں معاون کی حیثیت رکھتی ہیں، اس اعانت کی وجہ سے وہ خلوت میں کہنے کی تھیں اور وہ باتیں متعلقہ افراد کے لیے تھیں، تاکہ ان کو جب ذکر وفکر کے نتیجہ میں وہ حالات پیش آئیں تو وہ پریشان نہ ہوں اور اپنے حالات کو ان کی تحقیقات پر منطبق کرلیں، اس طرح واردات کے صحیح اور غلط ہونے کے معیار کو سمجھ لیں، اس مقصد کے لیے تصوف کے یہ علوم مدون ہوئے، لیکن اب تو فصوص الحکم، جیسی کتابوں کے ترجمے ہوکر مارکیٹ میں آرہے ہیں، ایسی کتابوں سے نقصان ہوا ہے۔

طب کی کتاب کا ترجمہ پڑھ کر مسل نہیں دیا جاسکتا۔ (اس سے نقصان کا خطرہ ہے) حالانکہ کتابیں صحیح ہیں (اور نسخے بھی صحیح ہیں) لیکن یہ کتابیں مریض کے لیے نہیں، بلکہ طبیب کے لیے ہیں، مریض کی کتاب تو خود طبیب ہے اور طبیب کی کتاب وہ کتاب ہے۔ (صفحہ ۱۸۵-جلد ۱۰)

تصوف میں طبیب جسمانی کی طرح علاج کرنا پڑتا ہے اور ہر پیچیدہ بات پر نظر رکھنی

کا پڑھنا، لکھنا اور چھاپنا چھوڑ دیا جائے۔ انا لہ لحافظون. کے معنی یہ ہے کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ اور ایسی جماعت پیدا فرماتے رہیں گے، جو قرآن کی حفاظت کرتی رہی گی۔ اسی طرح دین کے کاموں کو سمجھا جائے کہ ان میں توکل کرنے کا مطلب تدابیر سے دست بردار ہونا نہیں، بلکہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ تدابیر کرو اور اللہ کو کارساز سمجھو۔ کیونکہ تدبیر کا حکم بھی اللہ ہی نے دیا ہے۔ (صفحہ ۸۰-جلد ۸)

فکر اور اخلاص میں توازن کا مسئلہ

جب آدمی فکر سے کام نہیں لیتا تو اکثر غلطیاں کرتا رہتا ہے، فکر سے کام لینے کی وجہ سے غلطیاں کم ہوتی ہیں، ایک حافظ صاحب تھے، ان میں بے فکری کا مرض زیادہ تھا، ان سے میں نے کہا کہ سوچ کر کام کیا کرو اور سوچ کر بات کیا کرو، لیکن جب اپنی عقل نہ ہو تو دوسروں کا مشورہ کہاں تک کام آئے گا، ان صاحب نے فکر اور سوچ سے کام لینے کا آغاز ریل سے کردیا۔ یہاں سے روانگی ہوئی، ریل سے اتر کر چنے لینے کا ارادہ کیا، اب کھڑے سوچ رہے ہیں کہ چنے لینے کی خواہش ہوئی، بیوی بچے ساتھ تھے، جب بچوں کو ریل میں سوار کرچکے تو چنے لینے کی خواہش نفس کی لذت کی وجہ سے تو نہیں، خریدوں یا نہ خریدوں، اسی سوچ میں تھے کہ ریل کے چلنے کی سیٹی بجی، اب یہ صاحب اسٹیشن پر، بچے گاڑی میں پریشان، مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ عقلمند، مراقبہ اس طرح کرنا چاہیے تھا کہ چنے خرید کر ریل میں سوار ہوجاتے اور پھر بیٹھ کر (اطمینان سے) سوچتے کہ ان کی واقعی ضرورت ہے یا محض حظ نفس کے لئے ہیں، اگر ضرور نہ سمجھتے تو دوسروں کو دیدیتے یا بیوی بچوں ہی کو دے دیتے۔ سو ایسا فکر غلو ہے۔

اسی طرح ہر فکر میں اعتدال چاہیے۔ مثلاً لوگ اخلاص کی فکر میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ اصل عمل رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص ریاء سے عمل کرتا ہو تو اسے کرتے رہنا چاہیے، ترک نہ کرنا چاہیے، ابتدا میں تو ریا کے ساتھ کام ہوگا، پھر عادت ہوجائی گی اور عادت سے عبادت ہوجائے گی، کیسی حکیمانہ تحقیق ہے، مایوسی کا نام ونشان ہی نہیں، بعض اوقات شیطان، ریا کا وسوسہ پیدا کر کے فرد کو عمل سے ساری عمر کے لئے سے روک دیتا ہے، جو بڑا خسارہ ہے، اخلاص کی فکر میں اتنا

غلو نہ کرنا ہے۔ (صفحہ ۱۵۳-جلد ۶)

اخلاق حمیدہ کا پیدا ہونا

ساری کوششوں اور جدوجہد سے حاصل یہ ہے کہ اخلاق حمیدہ میں پختگی اور کمال پیدا ہوجائے اور اخلاق رذیلہ دور ہوجائیں۔ خاتمہ مقصود نہیں، اس لیے کہ رزائل بذات خود مذموم نہیں، مثلاً بخل، بغض، شہوت اور عداوت وغیرہ یہ سارے جذبات بذات خود خراب نہیں، بلکہ محمود ہیں، لیکن جب یہ جذبات (اپنی) حدود سے گزر کر غلط چیزوں میں استعمال ہونے لگیں، اس وقت مذموم ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۶۷-جلد ۹)

معصیت کے نقصانات

معصیت نہایت ہی بڑی اور مہلک چیز ہے، اس سے اجتناب کی سخت ضرورت ہے، بندے کے لیے وہ گھڑی نہایت ہی مبغوض اور منحوس ہے، جس میں یہ اپنے خدا کا نافرمان ہوتا ہے، اگر حس بیدار ہو تو گناہ کے بعد قلب پر ظلمت محسوس ہوتی ہے، اور نافرمانی کا یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ آئندہ کے لیے عمل کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، ڈرنے کی بات ہے، گناہ کا شدید پہلو یہ ہے، کبھی بے فکری کی وجہ سے چھوٹے گناہ سے بڑا گناہ صادر ہوجاتا ہے۔ اور وہ کفر کا سبب ہوتا ہے، اس لیے گناہ کرنے کے بعد بے فکر نہ ہونا چاہیے، بلکہ توبہ واستغفار کرنا چاہیے، مگر یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ اس کے بعد پھر جب کبھی خیال آئے اس فکر میں پڑجائے بلکہ اللھم اغفرلی، کہہ کر آگے چلے اور کام میں لگے۔ توبہ کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے متعلق حضرت سلطان نظام الدین (اولیاء) قدس سرہ نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ فلاں گناہ کرنے کے بعد جو توبہ کی تھی، وہ قبول ہوئی یا نہیں، اس کا معیار یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ گناہ کے یاد آنے سے نفس میں حظ (لذت) پیدا ہوتی ہے یا نفرت اور کدورت، اگر نفرت ہوتی ہے تو توبہ قبول ہوچکی ہے، اگر حظ ہوتا ہے تو توبہ قبول نہیں ہوئی، دوبارہ توبہ کرنا چاہیے۔ (۱۱۴-جلد ۶)

جہاں آگ دیکھتے تھے، کانپ اٹھتے تھے کہ کہیں قیامت کے روز آگ کی سزا نہ ہو، اتباع سنت میں ان کا صحابہ کرام والا معاملہ تھا۔ البتہ نفس کشی کے لیے صحابہ کرام نے کم مجاہدات کیے، اس کا سبب یہ تھا کہ صحابہؓ کی استعداد قوی تھی، پھر حضور ﷺ کا فیض صحبت تھا، اب سوال یہ ہے کہ جب مجاہدات کی، صحابہ کرام کو ضرورت نہ تھی تو حضور ﷺ کو تو بدرجہ اتم اس کی حاجت نہ تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مجاہدات کیوں کیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپؐ کے مجاہدات کا مقصد تہذیب اور معالجہ نفس نہ تھا، بلکہ اس کا سبب ذوق وشوق اور محبت تھی۔ جس طرح صحابہ کرام کو فیض صحبت کی وجہ سے سخت مجاہدات کی ضرورت نہ تھی، اسی طرح موجودہ حالات میں طبیعتوں کے ضعف کی وجہ سے سخت مجاہدات کی ضرورت نہیں، سخت مجاہدات سے صحت برباد ہو جانے کا خطرہ ہے، اصل چیز اعمال ہیں، مجاہدات و ریاضات ان کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، حق تعالیٰ کا فضل اس پر موقوف نہیں کہ اس زمانے میں بھی بزرگان سلف جیسے مجاہدات کیے جائیں۔ اِس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا فضل بقدر امکانی کوشش کرنے سے متوجہ ہوجاتا ہے۔ (صفحہ۹۶-جلد۹)

تصوف کی کتابیں

تصوف کی کتابیں منتہی کے لیے ہیں، مبتدی کے لیے نہیں، جیسے طب کی کتابیں طبیب کے لیے ہیں، مریض کے لیے نہیں، قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون. (کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہوسکتے ہیں) سو دونوں ہر معاملے میں مساوی کیسے ہوسکتے ہیں۔ ایک جاہل مقلد ایک حدیث کی کتاب دیکھ رہے تھے، کتاب اردو میں تھی، اس میں ایک حدیث تھی، من ام منکم فلیخف' (جب تم میں سے کوئی امامت کرے تو ہلکی نماز پڑھے) انہوں نے ہلکی کو ہل کی پڑھا، جس کے معنی جنبش کے ہیں، چنانچہ امامت کے وقت وہ خوب ہلا کرتا۔ اسی طرح ایک شخص نے مسائل کی کتاب میں دیکھا کہ دو رکعت بھری اور دو رکعت خالی پڑھی جائیں تو انہوں نے سنتوں میں بھی دو بھری اور دو خالی پڑھنا شروع کردیا۔ سالہا سال تک اسی طرح پڑھتا رہا۔ (صفحہ۳۳۴-جلد۲)

اہل اللہ کی صحبت

تصوف کا حاصل نفس کا تزکیہ ہے اور جس چیز سے تزکیہ کیا جاتا ہے، وہ چیزیں ہیں،

شہوت اور کبر، اس کا علاج اہل اللہ کی صحبت ہے، کیوں کہ وہ اس راہ سے گزر چکے ہیں، ان کو اس راہ کی تمام گھاٹیاں معلوم ہیں۔ وہ طالب کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے لے جا کر کھڑا کرتے ہیں، طالب کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے۔ وہ جو تعلیم دے، اس پر عمل کرے اور اس سے بالکل انحراف نہ کرے۔ آج کل جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، وہ ساری بیماری خود رائی کی پیدا کردہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

فکر خود و رائے خودو در عالم رندی نیست
کفرست دریں مذہب خودبینی وخود رائی

کیف اور عشق کی دنیا میں اپنی رائے اور اپنی فکر کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے، خود بینی اور خود رائی اس راہ میں کفر کے برابر ہے۔ (صفحہ۳۱۲-جلد۴)

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ جو اہل اللہ کے پاس نہیں رہے، ان کے قلوب حقیقت کے ادراک سے بالکل مردہ (محروم) ہیں۔ (صفحہ۶۹۹-جلد۴)

خیر و برکت کے رخصت ہونے کا سبب

دین تو بڑی چیز ہے، اگر قلب میں اہل دین اور بزرگوں کی ہی عظمت موجود ہو تو اس سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے، ایمان قوی ہوتا ہے، ایمان میں رسوخ ہوتا ہے، کیوں کہ عظمت کی نشانی دین ہے تو اہل دین کی تعظیم گویا دین کی تعظیم ہے، اگرچہ یہ بالواسطہ دین کی تعظیم ہے، لیکن اگر بجائے خود دین کی محبت ہو تو اس کا کیا پوچھنا، اس وقت معاشرے سے جو خیر و برکت رخصت ہوگئی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ دلوں سے دین اور اہل دین کی عظمت نکل گئی ہے، اگرچہ بے عملی اور بدعملی بھی بری چیز ہے، لیکن دین کی وقعت وعظمت کا نہ ہونا، نہایت ہی خطرناک چیز ہے، اس سے ایمان کے سلب ہوجانے کا خطرہ ہے، اس لیے جس دل میں دینی عظمت نہ ہو، اسے جلد سے جلد توبہ کرنا چاہیے۔ (صفحہ۱۵۲-جلد۵)

جذب کی حیثیت

جذب (اللہ کے ساتھ کشش اور محویت) معمولی چیز نہیں، یہ بڑی نعمت ہے، جذب کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ شیطان کے متعلق آیا ہے کہ وہ محض سالک تھا، اس میں جذب نہیں تھا، اس لیے وہ گمراہ ہوا۔ جذب کی قدر کرنا چاہیے، جو چیز جذب کے پیدا کرنے کا ذریعہ

ہے، اس کی بھی قدر و احترام کرنا چاہیے، وہ اہل اللہ کی صحبت ہے۔ ان کی صحبت کی برکت سے جذب حق (اللہ کے ساتھ کشش و محویت) پیدا ہوتی ہے۔ اصل وصول جذب ہی ہوتا ہے، ایسا واصل پھر راجع نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۳۱- جلد ۹)

مربی کے انتخاب میں احتیاط

کسی مصلح سے تعلق تو ضرور پیدا کرنا چاہیے، لیکن تعلق پیدا کرنے سے پہلے دیکھ بھال کی سخت ضرورت ہے۔ اس راہ میں ہزاروں رہزن اور ڈاکو پھرتے ہیں، جنہوں نے مخلوق کی گمراہی کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ صورت درویشی کی اختیار کر رکھی ہے، حقیقت میں بہروپیے ہیں۔ خدا معلوم، لوگ ایسوں کے معتقد کیوں ہوجاتے ہیں، عجیب بات ہے کہ جو شریعت سے جتنا زیادہ دور ہو، اسے اتنا ہی درویش اور مقبول (بارگاہ) سمجھا جاتا ہے۔ درویشی کا کوئی معیار ہی نہیں، چند مصنوعی چیزوں کا نام درویشی رکھ لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب کو مکار نہیں کہا جاسکتا، اس لیے کہ بعض درویش غلطی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ان کی نیت بری نہیں ہوتی، مگر ایسے لوگوں سے بھی تعلق نہیں رکھنا چاہیے، اس لیے کہ جو شخص خود غلطی میں مبتلا ہے، وہ دوسروں کی (بھلا) کیا رہبری کرسکتا ہے۔ دوم یہ کہ اس سے عوام کے عقائد خراب ہونے کا اندیشہ ہے، بالخصوص اگر تعلق رکھنے والا شخص صاحب علم ہو تو اس سے شریعت کے انتظام میں خلل واقع ہوگا۔ یہ ساری روک ٹوک شریعت مقدسہ کی حفاظت کے لیے کی جارہی ہے، ورنہ کسے معلوم کہ کون مردود ہے اور کون مقبول۔ (صفحہ ۲۵۳- جلد ۶)

شیخ پر اعتراض و اشکال کا مسئلہ

تصوف کا مسئلہ یہ ہے کہ (اخلاص اور دلجمعی کے ساتھ) شیخ کی تعلیمات کا اتباع کیا جائے، چاہے وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن اس میں میری ایک ترمیم ہے، جو اہل طریق سے تو منقول نہیں، لیکن ضروری ہے، اس لیے کہ شریعت ایسی چیز نہیں ہے کہ بے سمجھے اس کے خلاف کیا جائے۔ اگر شیخ کی تعلیم میں خلجان (اور اشکال) پیدا ہو تو اول تو اس خلجان کو خود دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر دور ہوجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ شیخ کے سامنے ادب سے اپنا اشکال پیش کیا جائے۔ اگر وہ سچا شیخ ہوگا تو اشکال دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر اس کے باوجود اطمینان نہ ہو تو پھر شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے۔

اگر احتیاط سے شیخ کا انتخاب کیا جائے تو پھر خلجان اور اشکال کم ہی پیدا ہوتا ہے، اس

لیے کہ محقق شیخ خود الزام سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے۔ خود حضور ﷺ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے۔ صحابہ کرام حضور ﷺ پر فدا رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود ایک بار جب آپ حالت اعتکاف میں حضرت صفیہؓ سے گفتگو فرما رہے تھے، اسی اثنا میں دو صحابی ادھر سے گذرے تو آپ (ﷺ) نے ان دونوں سے فرمایا۔ یعنی ذرا ٹھرو، پھر آپ نے حضرت صفیہؓ کو رخصت کیا اور ان دونوں سے فرمایا۔ انھا صفیۃ، یہ صفیہؓ ہیں، جن سے میں باتیں کررہا تھا، یہ کوئی اجنبی عورت نہیں، انہوں نے عرض کیا، حضور (ﷺ) کو یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی، بھلا آپؐ کی ذات پر کوئی دوسرا گمان ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں، شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے، مجھے گمان ہوا کہ کہیں وہ میرے خلاف تمہارے دل میں وسوسہ نہ ڈال دے، جس سے تمہارے ایمان میں خلل پیدا ہوجائے، اس لیے میں نے صاف بات کردی۔ (صفحہ ۲۷- جلد ۱۰)

ولایت کی تلاش

آدمی سب کچھ بن سکتا ہے، بزرگ، قطب، ابدال لیکن انسانیت کا پیدا ہونا اور انسان بننا مشکل ہے، جب تک یہ نہ بنیں، اہل نظر کی نظر میں کوئی حیثیت حاصل نہیں، میں نہ تو بزرگی تقسیم کرتا ہوں، نہ کرامت، نہ قطبیت، نہ غوثیت، کسی کو ان چیزوں کی ضرورت ہو تو کہیں اور جائے، میں تو صرف انسان بناتا ہوں، اگر انسان بننا ہو تو یہاں آؤ۔ (صفحہ ۱۵۳- جلد ۶)

اپنی اصلاح کرائے بغیر دوسرے فضائل اور صفات تو پیدا ہوسکتی ہیں، لیکن آدمیت پیدا ہونا مشکل ہے، دیکھیے، گھوڑا سب میں شریف جانور ہے، لیکن اگر اس کو بھی سدھایا نہ جائے تو وہ کام نہیں دے سکتا اور وہ گرا سکتا ہے، مگر لوگوں کو اصلاح کی طرف بالکل توجہ نہیں، ہاں ولایت، قطبیت، غوثیت اور بزرگی کی ضرور تلاش ہے۔ (۱۲۶- جلد ۶)

تصوف کے بغیر کام نہیں چل سکتا، کیوں کہ تصوف میں اصل چیز تواضع کی تعلیم ہے، جس کو اصطلاح میں فنا کہا جاتا ہے۔

تصوف میں عام طور فنا کو آخری مقام سمجھا جاتا ہے، لیکن دراصل سب سے اول مقام بھی فنا ہی ہے اور سب سے آخری مقام بھی فنا ہے، تواضع کے بغیر اس راستے میں ایک قدم بھی نہیں چلا جاسکتا، چاہے لاکھ درود وظائف پڑھے جائیں اور لاکھ تسبیحیں پھیری

جائیں، کہا جاتا ہے کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا، میدان میں آنا چاہیے، میں کہتا ہوں، حجرے میں بیٹھنے سے ہی میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے، جیسے ریڈیو حجرے میں ہی رکھا جاتا ہے، پھر اسی سے تقریریں نشر کی جاتی ہیں، جس سے پوری دنیا میں ہلچل برپا ہوجاتی ہے، وہ حجرے میں بیٹھ کر ہی کمان کر رہا ہے اور اسی کمان سے چاروں طرف تیر چل رہے ہیں۔ (صفحہ ۸۷-جلد ۱۰)

مجاہدوں کا حاصل

سلوک (راہ تصوف) میں اصل مجاہدہ گناہوں کو ترک کرنے کا ہے، نفس چاہے گناہوں کا کتنا ہی تقاضا کرتا ہو، مگر اللہ کی نافرمانی کے قریب نہ جانا چاہیے، باقی رہے دوسرے مجاہدات تقلیل طعام (کم کھانا) تقلیل منام (کم سونا) تقلیل کلام (کم بولنا) تقلیل اختلاط مع الانام (کم ملنا) یہ مجاہدایت بذات خود مقصود نہیں، بلکہ چوں کہ یہ گناہوں سے بچنے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں، اس لیے اس ضرورت کی وجہ سے یہ مجاہدات کرائے جاتے ہیں، اس میں بھی جو دو ابتدائی مجاہدات کم کھانا، کم سونا ہے، چوں کہ موجودہ دور میں طبائع ضعیف ہیں، اس لیے یہ دونوں مجاہدے ترک کردیے گئے ہیں، ان کا استعمال کبھی کبھار کسی خاص ضرور کے تحت ہی ہوتا ہے، البتہ آخر کے دو مجاہدات ضروری ہیں، ان پر اب بھی عمل کرایا جاتا ہے، غرض کہ تصوف میں سے بڑا مجاہدہ گناہوں کا ترک ہے، مگر افسوس ہے کہ آج کل بزرگی اس بات کو سمجھا جاتا ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا جائے۔ گناہوں سے بچنے کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ (صفحہ ۸۹-جلد ۹)

بیعت کے لیے مناسبت کی ضرورت

لوگ آج کل بیعت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، میرے سامنے جو شخص بیعت کے لیے اصرار کرتا ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ مقصود کام کرنا نہیں ہوتا، بلکہ نام مقصود ہوتا ہے کہ ہمارا بھی فلاں شخص سے تعلق ہے، یہ حب جاہ کی نشانی ہے، اس طریق میں مناسبت ہونا اولین شرط ہے، مناسبت کے بغیر فیض حاصل نہیں ہوسکتا اور جاہ (عزت و شہرت کے جذبے کے ہوتے ہوئے) مناسبت کیسے پیدا ہوسکتی ہے، میں بیعت کرنے کے لئے دو چیزوں کو پیش نظر رکھتا ہوں، ایک اعتماد، دوم مناسبت۔

مناسبت پر یاد آیا کہ ایک عالم دین، حضرت مظہر جان رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مرید

ہونے کے لیے آیا، حضرت مرزا صاحب کی لطافت طبع مشہور ہے، حضرت نے ان کی صورت دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا، کہو، میاں! کیا کہتے ہو اور کیا چاہتے ہو، جلدی کہو، عرض کیا، مرید ہونے کے لیے آیا ہوں، فرمایا، فیض کے لیے مناسبت شرط ہے، انسان اور ریچھ میں کیا مناسبت ہوتی ہے، یہ صاحب جھلاتے ہوئے چلے آئے کہ یہ کیا بزرگی ہے، مگر چوں کہ اصلاح کے شائق تھے، اس لیے شیخ کی تلاش میں نکلے، مگر کہیں بھی ایسا شیخ نہ مل سکا۔ چنانچہ داڑھی ٹھیک کرا کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، دریافت فرمایا، کون صاحب ہو، عرض کیا، فلاں شخص ہوں، فرمایا، ہاں، اب دیکھو، آدمیوں کی سی شکل ہے، اب مرید کریں گے، دیکھیے، محض ظاہری شکل پر عدم مناسبت کا حکم لگادیا۔ (۲۳۳-جلد ۷)

امراض کی تشخیص کا مسئلہ

امراض کی تشخیص اور تجویز مصلح ہی کرسکتا ہے، طالب امراض کو سمجھ ہی نہیں سکتا، جیسے مرض کو طبیب ہی پہچان سکتا ہے اور علاج تجویز کرسکتا ہے، مریض اپنا علاج خود نہیں کرسکتا، مجھے ایک مرتبہ کم خوابی کی شکایت تھی، حکیم صاحب سے تدابیر پوچھا کرتا تھا، مگر فائدہ نہ ہوا تو میں نے سمجھا کہ حکیم صاحب زیادہ دل چسپی نہیں لے رہے ہیں، اس لئے میں خود کتاب دیکھ کر (اپنا نسخہ) تجویز کروں گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے میں حکیم صاحب سے شرح اسباب کتاب لایا اور اس کو دیکھنا شروع کیا۔ مگر اس کے مطالعہ سے یہ ہوا کہ بیماری کی لکھی ہوئی جو علامتیں تھیں وہ سب میں اپنے اندر پاتا تھا۔ چنانچہ اپنے لیے کچھ بھی تجویز نہ کرسکا۔ اس وقت یہ بات سمجھ آئی کہ کلیات کو جزئیات پر صاحب فن ہی منطبق کرسکتا ہے۔ یہ فن سے ناواقف افراد کا کام نہیں، حافظ فرماتے ہیں:

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

درویشوں کی سی شکل بنالینے سے حقیقت درویشی حاصل ہوجانا ضروری نہیں، بلکہ اس راستے میں بال سے بھی بہت زیادہ باریک باتیں ہیں، جن کے لیے نور باطن کی ضرورت ہے۔ (صفحہ ۱۲۴-جلد ۳)

تصوف اور اہل علم طبقہ

اہل علم کے بارے میں تعجب ہے کہ وہ بھی تصوف کی حقیقت سے ناواقف ہیں، اہل علم اور طلبہ کو سخت ضرورت ہے کہ وہ اس فن سے واقف ہوں۔ ان کی غفلت کی وجہ سے جاہلوں اور نااہلوں کو مخلوق کو گمراہ کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ دوسروں کی اصلاح اور فکر تو بعد کی بات ہے، پہلے اپنی خیر منانی چاہیے۔ نہ جاننے کی وجہ سے انسان بہت ساری غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ درسی کتابوں کی تعلیم میں تو دس سال صرف کر لیں گے۔ مگر اصلاح باطن کے لیے چھ ماہ بھی صرف نہیں کریں گے۔ بعض لوگ تو ساری عمر نحو میں صرف کر دیتے ہیں۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

مولانا روم فرماتے ہیں

جملہ اوراق وکتب در نار کن (یعنی کتب مانعہ)
سینہ را از نورِ حق گلزار کن

جو علوم اللہ کی راہ میں حائل ہیں، ان کو آگ لگا دو۔ او سینے کو نورِ حق سے گلزار بنا لو۔

فرماتے ہیں:

چند خوانی حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں راہم خواں

(یونانیوں کی حکمت کب تک پڑھو گے ایمان والوں کی حکمت بھی پڑھ کر دیکھ لو) مگر یہ چیز کسی کامل کی صحبت کے بغیر پیدا ہونا مشکل ہے۔ کسی کی جوتیاں سیدھی کرو۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

بے عنایت حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

اللہ تعالیٰ اور اس کے خاص بندوں کی عنایتوں کے بغیر اگر فرشتہ بھی ہے تو اس کا نامہ اعمال سیاہ ہے۔

یار باید راہ را تنہا مرو
بے قلاؤ اندریں صحرا مرو

(راہ سلوک کے لیے رہبر کی ضرورت ہے، اس جنگل میں رہبر کے بغیر تنہا مت جاؤ)

مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ سب کچھ وہی کرے گا۔ آج کل یہ بڑی غلط فہمی ہے، طلب یہ ہے کہ چوں کہ وہ راہ سے واقف ہے اور راہ کو طے کر چکا ہے، اس لیے وہ تمہیں تدابیر بتائے گا۔ کام تمہیں خود کرنا پڑے گا۔ وہ کام اگر نفس کو دشوار ہو تو اس کا سبب محبت کی کمی ہوگی۔ ورنہ محبت مشکل سے مشکل کام کو آسان بنا دیتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۸-جلد ۲)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا، ان کے اور ہمارے درمیاں فرق ہے، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص کو مٹھائیوں کی فہرست تو معلوم ہے، لیکن اس نے کبھی مٹھائی کھائی نہ ہو۔ ایک وہ شخص ہے، جس کو ایک بھی مٹھائی کا نام یاد نہیں، مگر وہ مٹھایاں کھاتا رہتا ہے، یہی فرق ہے اہل الفاظ اور اہل معنیٰ کے درمیاں۔ اہل الفاظ اہل معنیٰ کے محتاج ہیں۔ (صفحہ ۳۳۴-جلد ۲)

کسی شخص نے امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ بشر حافی امی ہیں' آپ ان سے کیا لینے کے لیے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم کتاب کے عالم ہیں، وہ صاحبان کتاب کے عالم ہیں۔ سائل نے کہا کہ میں بشر حافی سے مسائل پوچھ سکتا ہوں۔ امام صاحب نے منع فرمادیا۔ مگر اس کے باوجود اس شخص نے ان سے دو مسئلے پوچھے، ایک یہ کہ اگر نماز میں خطرات آنے سے سہو ہو جائے تو کیا حکم ہے، فرمایا کہ ایسے قلب کو سزا دینی چاہیے کہ خدا کے سامنے کھڑا ہو کر خطرات اور وسوسات کو جگہ دیتا ہے۔ دوسرا مسئلہ پوچھا کہ زکواۃ کا کیا حکم ہے۔ کتنے مال میں کتنی زکواۃ ہے۔ فرمایا، کس کی زکواۃ ہماری یا تمہاری، عرض کیا کہ دونوں کی۔ آپ نے فرمایا، تمہاری زکواۃ تو نصاب کے مالک ہونے کی صورت میں سال گذر جانے پر چالیسواں حصہ ہے۔ اور ہماری زکواۃ یہ ہے کہ اتنا مال ہی جمع نہ ہونے پائے کہ زکواۃ دی جائے۔ اگر اتفاقاً مال جمع ہو جائے تو وہ سب مال خرچ کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ اتنا ہی مزید مال کما کر وہ بھی جرمانے کے طور پر خرچ کیا جائے۔ (صفحہ ۳۳۵-جلد ۲)

اہل اللہ اور خاصانِ خدا کی صحبت اس دور میں فرض عین ہے، بڑے ہی خطرے کا وقت ہے، جو چیز مشاہدہ سے ایمان کا ذریعہ ہو، اس کے فرض عین ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ (صفحہ)

ابن تیمیہ کے بارے میں

ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ابن تیمیہ بھی بہت بڑے صوفی تھے۔ مگر مزاج میں سختی ہے۔ اہل کمال کا رنگ مختلف ہے، کسی کا مزاج نرم ہے، کسی کا سخت۔ بزرگوں کا اختلاف اصل میں مشرب کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کا سبب مزاج کا فطری اختلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف مزاج کے لوگ پیدا فرمائے ہیں۔ انہی میں سے بعض بزرگ بھی ہوگئے تو چوں کہ جبلت نہیں بدلتی، اس لیے اصلاح اور بزرگی کے بعد بھی مزاج کا فطری رنگ کچھ نہ کچھ ضرور رہتا ہے، اسی وجہ سے ابن تیمیہ میں فطری طور پر سختی معلوم ہوتی ہے۔ (صفحہ ۳۰-جلد ۱۰)

حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شان ادب دیکھیے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ اسود افضل ہیں یا علقمہ، فرمایا، ہماری زبان اس قابل کہاں کہ وہ ان حضرات کا نام بھی لے سکے۔ ان کی فضیلت کے فیصلے کرنا تو دور کی بات ہے، دیکھیے امام صاحب کے مزاج میں ادب کا کتنا غلبہ ہے۔ اسی طرح ایک صحابی کو دیکھیے، جب ان سے کسی نے پوچھا کہ حضور ﷺ بڑے ہیں یا آپ، مطلب یہ تھا کہ عمر میں کون بڑے ہیں۔ اس کے لیے اکبری کا لفظ استعمال کیا۔ ان صحابی نے فرمایا، رسول اللہ اکبر وانا اسن، یعنی بڑے تو حضور ﷺ ہی ہیں۔ لیکن عمر میری زیادہ ہے۔ اب یہ رنگ ہر ایک کا تو نہیں ہوسکتا، ابن تیمیہ بزرگ ہیں، عالم ہیں، متقی ہیں، اللہ و رسول پر فدا ہیں۔ دین پر جاں نثار ہیں، دین کے بڑی خدمت کی ہے، مگر ان کے مزاج کی تیزی کی وجہ سے تشدد ہے۔

کامل اور محقق وہ ہے، جو ادب اور علم دونوں میں جامع ہو، اس سلسلے میں ہمارے حضرات سبحان اللہ دونوں چیزوں میں جامع ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ابن تیمیہ کے بھی معتقد ہیں اور حسین بن منصورؒ کے بھی۔ جو حسین بن منصور کو بھی قدس سرہ کہتے ہیں تو ابن تیمیہ کو بھی۔ حالانکہ ان دونوں میں شدید اختلاف ہے۔ ایسا اختلاف کہ اگر آمنا سامنا

ہوجائے تو شاید لڑائی ہوجائے۔ ابن حجر کا قول ہے کہ کثرتِ اعتراض علم کی کمی کی دلیل ہے۔ جس کا علم کافی ہو، اس کی ہر ایک کے قول و فعل کے منشا پر نظر ہوتی ہے۔ (صفحہ ۳۱-جلد ۱۰)

اہل اللہ سے بدگمانی

بڑے فتنے کا زمانہ ہے، جس کو دیکھو، الگ ڈیڑھ انچ کی مسجد بنائے بیٹھا ہے۔ ایک طبقہ مدعیان اجتہاد کا ہے، اس طبقہ میں خصوصیت سے ایک ایسی بُری عادت ہے جو ساری خرابیوں کی جڑ ہے، وہ بدگمانی کا مرض ہے۔ ایسی بدگمانی سے بدزبانی پیدا ہوتی ہے۔ نیز بزرگوں کی شان میں بدزبانی کرنا یا ان کی طرف سے بدگمانی کرنا نہایت ہی خطرناک چیز ہے۔ بزرگوں سے عقیدت رکھنا فرض نہیں، لیکن بدگمانی سے بچنا تو فرض ہے۔ اگر ان لوگوں میں یہ بات نہ ہوتی تو خیر یہ بھی ایک طریق ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ دیانت اور نیک نیتی ہو، اگر یہ نہیں تو یہ طبقہ بھی شیعوں کی طرح تبرائی فرقہ ہے، یہ جس چیز کی نفی کرتے ہیں، وہی تو ان کو سنوار سکتی ہیں اور وہ چیز کسی کامل کی صحبت ہے۔ بغیر صحبتِ کامل کے انسانیت اور آدمیت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر یہ جماعت نہ تو قرآن و حدیث کو صحیح طور پر سمجھتی ہے اور نہ تصوف کو۔ محض برا بھلا کہنا، ان کا مذہب ہے، کسی کو بدعتی، کسی کو مشرک، کسی کو فاسق، کسی کو فاجر بنانا خوب جانتے ہیں اور خود اپنی خبر نہیں کہ قلب میں ہزاروں بت یعنی رذائل جمع کر رکھے ہیں۔ بالخصوص کبر تو اس جماعت کے لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ (صفحہ ۵۲-جلد ۷)

اہل اللہ سے تعلق والوں کی مثال

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اہل اللہ کے تعلق کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے بچے کو ماں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، بچے سے مراد نادان بچہ ہے۔ بچے کو ماں سے جو تعلق ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے بچے کو کسی چیز کا ڈر نہیں ہوتا، نہ شیر کا، نہ بھیڑیے کا اور نہ ہی ظالم بادشاہ کا۔ اہل اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسی طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کے ایک خادم مبارز خان راستے میں جارہے تھے، بادشاہ کے صوبیدار گھوڑے پر سوار ہٹو بچو کرتے ہوئے آرہے تھے، اتفاق سے حضرت کے یہ خادم راستے سے دور نہ ہوئے تو

اس عہدیدار نے خادم کو طمانچہ رسید کیا۔ انہوں نے حضرت صاحب سے شکایت کی۔ حضرت صاحب کو جوش آگیا، انہوں نے اسی وقت قلم دوات منگا کر ایک ردی کاغذ پر بادشاہ کو خط لکھا، خط کے الفاظ یہ تھے۔ شحنہ دہلی لااعلام آنکہ (نہ بادشاہ نہ کوئی القاب نہ آداب) پیش بریدہ (یہ صوبہ خواجہ کا تھا اس لیے پیش بریدہ کہا) ناحق طمانچہ بردکہ درویش کشیدہ آہش از عرش رسید، یا بجائے او دیگر فرست یا بجائے تو دیگر رسیدہ۔

(درویش کے منہ پر ناحق طمانچہ مارا کہ اس کی آہ عرش پر سنی جاتی ہے یا تو اس کے بجائے کسی دوسرے کو بھیجو یا تمہاری بجائے کوئی دوسرا پہنچ جائے گا)۔

خادم یہ پرچہ لے کر دہلی پہنچا، بادشاہ کو اطلاع ہوئی، بادشاہ نے فوراً دربار میں بلایا۔ بادشاہ خط پڑھ کر کانپنے لگا۔ بادشاہ نے اسی وقت متعلق شخص کو معطل کر دیا۔ (صفحہ ۲۳۲-جلد ۲)

جاہل صوفیوں کی پیدا کردہ گمراہیاں

جاہل صوفیوں کو کیا معلوم کہ (تصوف) طریقت اور شریعت کیا ہیں۔ اصطلاح میں ظاہری احکام کو شریعت کہتے ہیں اور باطنی (اندرونی) احکام کو طریقت (تصوف) اصل میں یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، اس کے یہ دو درجے ہیں۔ نجات کا دارومدار ان دونوں چیزوں پر ہے۔ جس چیز کو شریعت رد کردے، وہ بے دینی ہے، ایسے بددینوں اور جاہلوں نے تصوف کو بدنام کیا ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ مگر اس نے نظام عالم قائم رکھنے کے لیے اشیاء پر ہمارا نام رکھ دیا ہے (اور ہمیں اس کا مالک قرار دیا ہے) ورنہ حقیقت میں بندوں کے مال، نفس اور عزت وآبرو سب کے مالک وہی ہیں۔ غرض اس حقیقت کی حکمت کے لیے مال اور جان کی نسبت ہماری طرف کردی۔ تاکہ نظام عالم قائم رہ سکے اور یہ نسبت شریعت ہے۔ اگر شریعت نہ ہوتو ساری دنیا میں فساد برپا ہوجائے اور مال و دولت، اور ہر چیز پر باہم جھگڑا اور تصادم ہونے لگے۔ یہ شریعت ہی ہے، جس نے ان بڑے بڑے مفاسد کو روک رکھا ہے۔ (صفحہ ۲۸۲-جلد ۴)

موجودہ دور کی درویشی

آج کل درویشی کے بھیس میں ہزاروں راہزن اور ڈاکو مخلوق کے دین پر ڈاکہ مارتے پھرتے ہیں، قسم قسم کے شعبدے اور طلسم دکھا کر لوگوں کو پھنساتے رہتے ہیں۔ ادھر

لوگوں میں بھی عقل اور فہم کا اس قدر قحط ہوگیا ہے کہ ایسے ڈاکوؤں کو درویش اور بزرگ سمجھ کر ان کے ہاتھوں اپنے دین و ایمان کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ بھوپال میں ایک ایسے ہی درویش پہنچے، بڑے بڑے دنیادار لوگوں کو اپنے تصرف کی قوت سے تابع بنالیتے تھے، وہاں ایک بار حافظ ضامن صاحب کے صاحب زادے حافظ محمد یوسف صاحب (جو وہاں تحصیلدار تھے) کے پاس بھی پہنچے اور ان کے سامنے کھڑے ہوکر توجہ سے تصرف کرنا شروع کردیا، حافظ صاحب کو اس کا احساس ہوگیا۔ انہوں نے اس کی طرف متوجہ ہوکر یہ شعر پڑھا۔

سنبھل کے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

شعر پڑھنا تھا کہ درویش صاحب زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آنے کے بعد ہاتھ جوڑ کر حافظ صاحب سے معافی مانگنے لگے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ کیوں مخلوق کو گمراہ کرتے پھرتے ہو، ان باتوں کو چھوڑو، اتباع سنت اختیار کرو۔

ایسے تصرفات مشق سے حاصل ہوسکتے ہیں، اس کا بزرگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مسمریزم والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اصل چیز اسلامی احکام کا اتباع ہے۔ بعض اوقات یہ چیزیں منزل مقصود سے دور کردیتی ہیں۔ کشف وکرامات، تصرف، کیفیت وغیرہ ان میں سے اگر کوئی چیز بھی نہ ہو، مگر اتباع ہوتو مقصد حاصل ہوگیا۔ (صفحہ ۲۳۸-جلد ۵)

اہل بدعت

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ جو لوگ اولیاء اللہ کے نام پر کوئی جانور ذبح کرتے ہیں یا ان کی مزار پر راز و نیاز کی مٹھائی چڑھاتے ہیں، اس میں دو قسم کے عقائد کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اولیاء اللہ کو حاجت روا سمجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ ان کے اس کام میں شرک ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ذبح تو اللہ کے نام پر کرتے ہیں، مگر اولیاء اللہ کو ایصال ثواب کرتے ہیں اور ان کو مقبول سمجھ کر ان سے دعا کے طالب ہوتے ہیں۔ اس بارے میں کیا حکم ہے۔ فرمایا، اس کی حرمت کی کوئی دلیل تو نہیں۔ مگر عوام کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے اس میں احتیاط کی ضرورت ہے، عوام کی نیت یہ ہوتی

ہے کہ وہ (اولیاء) نذر ونیاز سے خوش ہوکر ہماری حاجت پوری کریں گے۔ بس یہی شرک ہے۔ (صفحہ۴۲-جلد۳)

بدعتوں پر زور

ایک صاحب نے ادب سے جھک کر بات کرنی چاہی۔ اس پر فرمایا، اسی سے تو شرک و بدعت تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ حضور ﷺ نے سلام کے وقت بھی جھکنے کو ناجائز فرمایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دین اپنی اصلی حالت پر آجائے۔ لیکن محض میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو لوگ متبع سنت ہیں اور اپنی جماعت کے ہیں، ان کے ہاں تو یہی دوچار چیزیں بدعت ہیں، میلاد، عرس، تیجا، دسواں، اس کے علاوہ دوسری بدعتوں کو وہ بدعتیں ہی نہیں سمجھتے۔ چاہے وہ سخت بدعتوں میں شمار ہوتی ہوں۔ مثلاً بیعت ہی کو دیکھ لیجئے، جس ہیئت اور عقیدے سے آج کل لوگ بیعت کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ بالکل بدعت ہے اور غلط عقیدہ ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ ذکر کو اصلاح کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ذکر سے بعض اوقات بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور صاحب ذکر اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے۔ نفس کی اصلاح تو ایک مستقل چیز ہے، جو مخالفت نفس سے ہی ہوسکتی ہے۔ (سطح۲۰-جلد۱۰)

بزرگوں کے مزارات پر شرک

آج کل جاہلوں نے بزرگان دین کے مزارات پر نہایت ہی خرافات برپا کر رکھی ہیں۔ کھلم کھلا شرک و بدعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ منع کرنے والوں کو بزرگوں کا مخالف اور نہ ماننے والا ظاہر کرتے ہیں۔ اجمیر میں دیکھ لیجئے کیسے کیسے بزرگ ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمتہ جیسی ہستی، جنہوں نے ساری عمر توحید اور اسلام کی خدمت اور کفار سے مقابلہ میں گذار دی۔ اب ان سے عقیدت رکھنے والے اور محبت کا دعویٰ کرنے والے شرک و بدعت میں مبتلا ہیں۔ یہ متبعین ومعتقدین ہیں، جنہوں نے مقام عبرت کو تماشہ گاہ اور فسق وفجور کا مرکز بنا رکھا ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں رہا۔ حالات سن کر قلب دکھتا ہے۔ یہ بدفہم بزرگوں کو بھی بدنام کرتے ہیں کہ وہ بھی ان خرافات شرک و بدعت میں مبتلا ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (صفحہ۲۱جلد۴)

گرو کے اندر مرض سلب کرنیکی صلاحیت کا ہونا

پہلے مرتاض لوگ طویل عرصہ تک حبس دم کی مشق کرتے تھے۔ اب طبیعتوں کی کمزوریوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا، پہلے ہندو بھی بڑی بڑی ریاضتیں کرتے تھے۔ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ کے دور میں ایک جوگی تھا، اس نے یہ مشق کر رکھی تھی کہ مریض پر نظر ڈال کر مرض کو سلب کرلیتا تھا۔ ایک بار حضرت نظام الدین صاحب قدس سرہ سخت بیمار پڑ گئے، بے ہوش ہوگئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد خدام نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو فلاں جوگی کے ہاں جو مرض کو سلب کرلیتا ہے۔ پلنگ لے چلیں، آپ نے فرمایا کہ خبردار، ایسا نہ کرنا، اس سے لوگوں کے عقائد میں خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

حضرت صاحب کی حالت خراب ہوگئی، چوں کہ مریدوں کو اپنے شیخ سے محبت ہوتی ہے اور شیخ کی تکلیف برداشت کرنا دشوار ہوتا ہے، اس لیے آپس میں مشورہ کرکے پلنگ اٹھا کر جوگی مکان پر لے آئے۔ جوگی نے دیکھا کہ اتنا بڑا شخص میرے مکان پر آیا ہے، وہ بہت خوش ہوا، اس نے فوراً توجہ کی، چنانچہ مرض سلب ہوگیا اور حضرت یکدم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی مرض لاحق ہی نہ تھا۔ آپ نے جب دیکھا کہ جوگی کا مکان ہے اور سمجھ گئے کہ یہ لوگ محبت کی وجہ سے میری تکلیف برداشت نہ کرسکے، اس لیے کسی کو کچھ نہ کہا، بلکہ جوگی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور دریافت فرمایا کہ تمہاری اس تاثیر کی حقیقت کیا ہے اور یہ کس عمل کا نتیجہ ہے۔ اس نے کہا کہ میرے پاس میرے گرو کی تعلیم ہے، جس پر میں عمل کرتا ہوں۔ تعلیم یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیشہ ہر کام میں نفس کی مخالفت کرتے رہنا، میں ان کی اس تعلیم پر عمل کرتا ہوں، اس کی بدولت تصرف کرتا ہوں اور مرض سلب کرلیتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ نے دریافت فرمایا، اچھا یہ بتاؤ، تمہارا نفس مسلمان ہونے پر تیار ہے، عرض کیا نہیں، فرمایا، پھر گرو کی تعلیم پر کہاں عمل رہا، ادھر تو یہ فرمایا، ادھر توجہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے یکدم کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہوگیا۔ (صفحہ۲۰-جلد۴)

بدعتوں کے بارے میں فرمایا کہ (مداہنت اور) ڈھیلے پن کی وجہ سے بدعتیں فروغ پذیر ہوتی ہیں۔ اگر اس سلسلے میں سخت روش اختیار کی جائے تو بدعتوں کی روک تھام ہوسکتی

ہے۔ بعض بدعتیں ایسی (اور اتنی) گہری ہوتی ہیں کہ بعض بزرگوں کو اندازہ نہیں ہو پاتا۔
نانچہ شیخ محمد عابد صاحب نے حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ وہ
اہتا ہے کہ ترک حیوانات کے ساتھ ایک چلہ کھینچے، حضرت نے فرمایا، یہ تو بدعت ہے۔ تب
ن کو اس کے بدعت ہونے کا علم ہوا۔ (صفحہ ۲۴۹-جلد)

حضرت مولانا محمد احسن صاحب نے (بدعتوں کے سلسلے میں میری سخت روش کو دیکھ
کر) فرمایا جس قدر عوام کی حالت اسے (مجھے) معلوم ہے، وہ ہمیں معلوم نہیں، اس لیے وہ
ی چیزوں سے روکتے ہیں، یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مجھے اپنے اکابر سے نعوذ باللہ زیادہ علم
ہے۔ اصل میں عوام کی حالت کا علم محسوسات کا علم ہے۔ محسوسات کا علم کوئی کمال نہیں، بلکہ
حکام کا علم کمال ہے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محفل مولود میں شرکت کے
رے میں جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے تو میں بزرگوں کا سکھایا ہوا یہ جواب دیتا ہوں کہ
ضرت حاجی صاحب کو عوام کی حالت کا زیادہ علم نہیں تھا، ہمیں الحمدللہ عوام کی حالت کا
یادہ علم ہے۔ (کہ معمولی چیزیں کس طرح بدعت کی صورت اختیار کرجاتی ہیں)
صفحہ ۳۴۸ جلد ۴)

اصلاح کے لیے مجاہدہ کی ضرورت

آج کل لوگ مریض بن کر اصلاح کرانے کی بجائے طبیب بن کر یا طبیب بننے کی
سبت سے آتے ہیں۔ فن کی تحقیقات شروع کر دیتے ہیں اور اس کے حکم اور اسرار کی جستجو
کرنے لگتے ہیں، کتنی حماقت کی بات ہے۔ اگر اس طرح فن آتا ہو تو آج کل دنیا میں
سارے لوگ طبیب ہوتے، ایک بھی غیر طبیب نہ ہوتا۔ اسی طرح یہاں ہر شخص مصلح نہیں
بن سکتا، اصلاح کے لیے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنی ہوں گی، بلکہ جوتیاں کھانی ہوں گی۔
ماغوں سے خناس نکالنا ہوگا، اپنے آپ کو کسی کے سپرد کرنا ہوگا، اس کے بعد اگر کچھ مل
جائے تو اسے اللہ کا فضل سمجھنا چاہیے، لیکن لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ کرنا نہ پڑے۔ گھر بیٹھے
ٹھائے یہ دولت حاصل ہوجائے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی
شخص کیمیاگر کے پاس جاکر یہ چاہے کہ بغیر محنت کے کیمیا بنانے کا فن حاصل ہوجائے۔ وہ
بھی کہے گا کہ پہلے معلوم تو کیا ہوتا کہ کیا مجھے یہ فن اسی طرح حاصل ہوا ہے، جس طرح تم

حاصل کرنا چاہتے ہو۔

ایک عالم ہے، جو مسند پر بیٹھا ہوا تکیہ لگائے علوم بیان کر رہا ہے۔ ایک عامی شخص آکر کہنے لگے کہ مجھے یہ علوم سکھادو، وہ یہی کہے گا کہ پہلے کسی مدرسہ میں داخل ہوکر دس برس تک استادوں سے حاصل کرو، ان کی جوتیاں سیدھی کرو، دن رات محنت کرو، راتوں کی نیندیں حرام کرو، تب کہیں جاکر یہ نعمت حاصل ہوگی۔ تو صاحب، کام تو کام کے ہی طریقے سے ہوتا ہے۔ بغیر کوشش کے کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۱۹۲-جلد ۲)

کشف والہام کی حیثیت

ہمارے لیے اصل چیز شریعت ہے، کیوں کہ شریعت سے ہمیں جناب رسول مقبول ﷺ کی معرفت پہنچتی ہے۔ اور آپ کی شان وہ ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین۔ اس لیے جو چیز آپ (ﷺ) ہمارے لیے لائے ہیں، وہ بھی ہمارے لیے سراسر رحمت ہی ہوگی۔ باقی دوسرے علوم جو حضور ﷺ کے بغیر حاصل ہوں، خواہ کشف کے ذریعہ حاصل ہوں، وہ خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ شیخ اکبر (ابن عربی) نے لکھا ہے کہ امتی کو جو علم حضور ﷺ کے واسطہ کے بغیر حاصل ہو، خواہ وہ کشف ہو یا الہام ہو، وہ خطرے سے خالی نہیں۔ بلکہ اس میں خطرے پوشیدہ ہیں۔ ایک خطرہ تو یہ پوشیدہ ہے کہ اس شخص میں کبھی عجب پیدا ہوجاتا ہے، وہ اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے۔ دوسرا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص کہیں اپنے آپ کو حضور ﷺ کی تعلیم اور اپنے شیخ سے خود کو مستغنی نہ سمجھنے لگے۔

اگر یہ دونوں خطرے نہ بھی ہوں، تب بھی وحی کے بغیر حاصل ہونے والے امور میں شیطانی تصرف کا خطرہ رہتا ہے، چنانچہ شیخ اکبر لکھتے ہیں۔ بعض مرتبہ سالک کو شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ اپنی قوت متخیلہ سے اسے آسمان دکھاتا ہے۔ اس آسمان میں اسے اجسام نورانیہ چلتے پھرتے دکھاتا ہے اور ان کی زبان سے بعض خلاف شرعیہ باتیں سنتا ہے، وہ شخص سمجھتا ہے کہ اس وقت مجھ پر عالم ملکوت منکشف ہو رہا ہے۔ یہ جو صورتیں نظر آرہی ہیں، یہ ملائکہ ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والی باتیں الہام ہیں۔ حالانکہ وہ باتیں خلاف شرع ہوتی ہیں۔

ے۔ بعض بدعتیں ایسی (اور اتنی) گہری ہوتی ہیں کہ بعض بزرگوں کو اندازہ نہیں ہو پاتا۔ انچہ شیخ محمد عابد صاحب نے حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ وہ ہتا ہے کہ ترک حیوانات کے ساتھ ایک چلہ کھینچے، حضرت نے فرمایا، یہ تو بدعت ہے۔ تب ں کو اس کے بدعت ہونے کا علم ہوا۔ (صفحہ ۲۴۶-جلد)

حضرت مولانا محمد احسن صاحب نے (بدعتوں کے سلسلے میں میری سخت روش کو دیکھ ر) فرمایا جس قدر عوام کی حالت اسے (مجھے) معلوم ہے، وہ ہمیں معلوم نہیں، اس لیے وہ ی چیزوں سے روکتے ہیں، یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مجھے اپنے اکابر سے نعوذ باللہ زیادہ علم ہے۔ اصل میں عوام کی حالت کا علم محسوسات کا علم ہے۔ محسوسات کا علم کوئی کمال نہیں، بلکہ کام کا علم کمال ہے، حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی محفل مولود میں شرکت کے رے میں جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے تو میں بزرگوں کا سکھایا ہوا یہ جواب دیتا ہوں کہ ضرت حاجی صاحب کو عوام کی حالت کا زیادہ علم نہیں تھا، ہمیں الحمدللہ عوام کی حالت کا یادہ علم ہے۔ (کہ معمولی چیزیں کس طرح بدعت کی صورت اختیار کر جاتی ہیں) صفحہ ۳۴۸ جلد ۴)

اصلاح کے لیے مجاہدہ کی ضرورت

آج کل لوگ مریض بن کر اصلاح کرانے کی بجائے طبیب بن کر یا طبیب بننے کی سبت سے آتے ہیں۔ فن کی تحقیقات شروع کر دیتے ہیں اور اس کے حکم اور اسرار کی جستجو کرنے لگتے ہیں، کتنی حماقت کی بات ہے۔ اگر اس طرح فن آتا ہو تو آج کل دنیا میں سارے لوگ طبیب ہوتے، ایک بھی غیر طبیب نہ ہوتا۔ اسی طرح یہاں ہر شخص مصلح نہیں ن سکتا، اصلاح کے لیے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنی ہوں گی، بلکہ جوتیاں کھانی ہوں گی۔ ماغوں سے خناس نکالنا ہوگا، اپنے آپ کو کسی کے سپرد کرنا ہوگا، اس کے بعد اگر کچھ مل جائے تو اسے اللہ کا فضل سمجھنا چاہیے، لیکن لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ کرنا نہ پڑے۔ گھر بیٹھے بٹھائے یہ دولت حاصل ہو جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی شخص کیمیا گر کے پاس جا کر یہ چاہے کہ بغیر محنت کے کیمیا بنانے کا فن حاصل ہو جائے۔ وہ بھی کہے گا کہ پہلے معلوم تو کیا ہوتا کہ کیا مجھے یہ فن اسی طرح حاصل ہوا ہے، جس طرح تم

حاصل کرنا چاہتے ہو۔

ایک عالم ہے، جو مسند پر بیٹھا ہوا تکیہ لگائے علوم بیان کر رہا ہے۔ ایک عامی شخص آکر کہنے لگے کہ مجھے یہ علوم سکھا دو، وہ یہی کہے گا کہ پہلے کسی مدرسہ میں داخل ہو کر دس برس تک استادوں سے حاصل کرو، ان کی جوتیاں سیدھی کرو، دن رات محنت کرو، راتوں کی نیندیں حرام کرو، تب کہیں جا کر یہ نعمت حاصل ہوگی۔ تو صاحب، کام تو کام کے ہی طریقے سے ہوتا ہے۔ بغیر کوشش کے کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۱۹۲-جلد ۲)

کشف والہام کی حیثیت

ہمارے لیے اصل چیز شریعت ہے، کیوں کہ شریعت سے ہمیں جناب رسول مقبول ﷺ کی معرفت پہنچتی ہے۔ اور آپ کی شان وہ ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ **وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین.** اس لیے جو چیز آپ (ﷺ) ہمارے لیے لائے ہیں، وہ بھی ہمارے لیے سراسر رحمت ہی ہوگی۔ باقی دوسرے علوم جو حضور ﷺ کے بغیر حاصل ہوں، خواہ کشف کے ذریعہ حاصل ہوں، وہ خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ شیخ اکبر (ابن عربی) نے لکھا ہے کہ امتی کو جو علم حضور ﷺ کے واسطہ کے بغیر حاصل ہو، خواہ وہ کشف ہو یا الہام ہو، وہ خطرے سے خالی نہیں۔ بلکہ اس میں خطرے پوشیدہ ہیں۔ ایک خطرہ تو یہ پوشیدہ ہے کہ اس شخص میں کبھی عجب پیدا ہو جاتا ہے، وہ اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے۔ دوسرا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص کہیں اپنے آپ کو حضور ﷺ کی تعلیم اور اپنے شیخ سے خود کو مستغنی نہ سمجھنے لگے۔

اگر یہ دونوں خطرے نہ بھی ہوں، تب بھی وحی کے بغیر حاصل ہونے والے امور میں شیطانی تصرف کا خطرہ رہتا ہے، چنانچہ شیخ اکبر لکھتے ہیں۔ بعض مرتبہ سالک کو شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ اپنی قوت متخیلہ سے اسے آسمان دکھاتا ہے۔ اس آسمان میں اسے اجسام نورانیہ چلتے پھرتے دکھاتا ہے اور ان کی زبان سے بعض خلاف شرعیہ باتیں سنتا ہے، وہ شخص سمجھتا ہے کہ اس وقت مجھ پر عالم ملکوت منکشف ہو رہا ہے۔ یہ جو صورتیں نظر آ رہی ہیں، یہ ملائکہ ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والی باتیں الہام ہیں۔ حالانکہ وہ باتیں خلاف شرع ہوتی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ شیطان جب دیکھتا ہے کہ سالک اللہ تعالیٰ کا طالب ہے اور اس کے راستے پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اسے قدم قدم پر بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقع پر شیطان کے شر سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ شریعت کی طرف کان لگائے جائیں اور شریعت جو حکم دے، اس پر عمل کیا جائے۔
(صفحہ ۵۸-۵۹-جلد ۹)

کیفیات کی تبدیلی میں حکمتیں

کیفیات کے دوام نہ ہونے میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضوری میں جو لطف ہوتا ہے، وہ دوری کی بدولت ہوتا ہے۔ اس لیے لطف اسی میں ہے کہ کبھی حضوری ہو، کبھی دوری، کبھی سونا ہو، کبھی جاگنا ہو، کبھی بولنا ہو، کبھی خاموش رہنا، کبھی قبض ہو کبھی بسط، انسان فطرۃً کبھی ایک حالت پر نہیں رہ سکتا۔ غرض ہر چیز میں اللہ کی حکمتیں اور اسرار ہیں، جن کو بندہ نہیں سمجھ سکتا، اس لیے تمناؤں کو فنا کر کے تفویض اختیار کرنا چاہیے۔ (صفحہ ۲۶۵-جلد ۷)

عقلی محبت کا معیار

محبت ایک طبعی ہوتی ہے، دوسری عقلی، طبعی محبت معمور بہ نہیں، بلکہ عقلی محبت مامور بہ ہوتی ہے۔ اس پر اتفاق ہے کہ طبعی محبت پیدا ہوجائے تو ہوجائے، لیکن نہ ہونے میں کوئی حرج نہیں اور یہی عقلی محبت ہے، جو اس حدیث میں وارد ہے۔ عَنْ اَنَسٍ: لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَلَدِهٖ وَ وَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ. (مسلم)

عقلی محبت کا معیار یہ ہے کہ محبوب کی کبھی مخالفت نہ کی جائے۔ نہ ظاہراً نہ باطناً، نہ ہی مخالفت کا عزم کرے، بس اگر ساری عمر بھی ظاہری ذوق وشوق (اور کیفیات) پیدا نہ ہوں تو ذرہ برابر نقصان نہیں۔ یہی عقلی محبت بالکل کافی ہے۔ نہ صرف نجات کے لیے بلکہ درجات اور مقبولیت کے لیے بھی یہ محبت کافی ہے۔ اکثر اہل تصوف کو عقلی محبت سے غفلت ہے، لوگ طبعی محبت، کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، کیوں کہ اس کا رنگ نمایاں ہے اور عقلی محبت کا رنگ نمایاں نہیں۔ (صفحہ ۱۷۱-جلد ۹)

حضور ﷺ کی زیارت اور شعوری محبت کا مسئلہ

آج کل لوگ غیر ضروری اور غیر اختیاری باتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں: ایک صاحب نے خط لکھا ہے کہ ایسا عمل بتائیے، جس سے حضور ﷺ کی زیارت حاصل ہوجائے۔ یہ معاملہ ایسا ہے، جو غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری کے پیچھے پڑنے سے باطنی نقصان کا خطرہ ہے، وہ نقصان یہ ہے کہ ایسی چیزیں قلب کی تشویش کا باعث بن جاتی ہیں اور قلب کی تشویش اس طریق (تصوف) میں مقصد کی راہ میں شدید رکاوٹ ہے۔ دوم یہ کہ اگر زیارت حاصل ہو بھی جائے تو یہ زیارت بیداری میں تو ہوگی نہیں۔ خواب میں ہوگی۔ جب خواب میں ہو تو اس سے مقصد کو کیا فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ اس سے اصلاح تو ہو نہیں سکتی۔ جو اصل مقصود ہے۔ یقیناً حضور ﷺ کی زیارت برکت کی چیز ہے۔ مگر جب اصلاح نہ ہو تو اس کا کیا نفع ہوا۔ کیا عرب کے کفار کو حضور ﷺ کی زیارت نہیں ہوئی تھی، مگر ان کو ان سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بعض لوگوں کو محبت کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ محبت شوق کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر خالی محبت سے کیا ہوتا ہے، جب تک اطاعت نہ ہو۔ دیکھیے، ابوطالب کو حضور سے کتنی محبت تھی اور حضور ﷺ کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا، مگر وہ ایمان نہ لائے، باوجود حضور ﷺ کی کوشش کے، انتقال کے وقت بھی کلمہ نہ پڑھا۔ سبب یہ تھا کہ وہ طبعی محبت تھی، عقلی اور شعوری محبت نہ تھی۔ اصل چیز شعوری محبت ہے جو اتباع میں معین ومددگار ہوتی ہے۔ مگر آج کل شعوری محبت کا فقدان ہے۔ (صفحہ ۲۳۴-جلد ۵)

خواب کی حیثیت اور حقیقت

آج کل لوگ خواب کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں، اتنی بڑی کہ اتنی وقعت تو لوگوں کے ذہنوں میں وحی کی بھی نہیں۔ حالانکہ ہمارے خواب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ہمارے خواب کی حقیقت تو اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ دن بھر کے خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر کوئی خواب تصرف انسانی یا تصرف شیطانی سے پاک بھی ہو اور واقعی وہ خواب رویائے صالحہ میں شمار ہوتا ہو، تب بھی شریعت میں ایسے خواب کا درجہ صرف اتنا ہے کہ حدیث میں اسے مبشرات فرمایا گیا ہے۔ یعنی خواب میں نظر آنے والی اچھی چیز دل خوش کن ہے، نہ تو وہ کوئی شرعی حجت ہے اور نہ ہی اس کا درجہ احکام شرعیہ کے برابر ہے۔ بلکہ اگر کوئی خواب ایسا ہو کہ اس پر عمل

کرنے سے کسی شرعی حکم کی مخالفت لازم آتی ہو تو ایسے خواب پر عمل کرنا ہرگز جائز نہیں ہوگا۔ مصر میں ایک بار کسی بادشاہ نے خواب دیکھا تھا کہ حضور ﷺ اس شخص سے ارشاد فرمارہے ہیں کہ اشرب الخمر یعنی تم شراب پی لو۔ تو اس شخص نے علماء سے تحقیق کیا تو علماء نے بالاتفاق جواب دیا کہ ہرگز جائز نہیں، بلکہ تمہیں حضور ﷺ کا ارشاد یاد نہیں رہا۔ اگر میں اس مجمع میں ہوتا تو جواب دیتا کہ اگر صحیح بھی یاد ہوتا۔ تب بھی شراب سے یہ دنیوی شراب مراد نہیں، بلکہ شراب محبت ہے۔ یعنی حضور ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے اندر خدا اور رسول کی محبت پیدا کرو۔ (صفحہ ۹۹۔ جلد۹)

مدرسہ دیوبند کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بار دارالعلوم میں ایک طالب علم آئے، جو مدرسہ میں داخل ہونا چاہتے تھے، چنانچہ ان کو داخل کرلیا گیا، مگر وہ اس پر مصر تھے کہ میں شرح جامی پڑھوں گا، حالانکہ جب ان کا امتحان لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ان کے اندر اتنی استعداد نہیں کہ وہ شرح جامی پڑھ سکیں، بلکہ ابتدا میں اسے نحو کی کوئی کتاب پڑھنا چاہیے۔ تو جب ان سے کہا گیا کہ تمہارے اندر ابھی اتنی استعداد پیدا نہیں ہوئی کہ تم شرح جامی پڑھ سکو، لہٰذا فی الحال تم کو شرح جامی میں شریک نہیں کیا جاسکتا، وہ اس وقت خاموش ہوگئے۔ اگلے روز انہوں نے بیان کیا کہ میں نے جناب رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپ فرمارہے ہیں کہ تم شرح جامی پڑھو۔ لہٰذا مجھ کو شرح جامی پڑھوں کی اجازت دی جائے۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے ان کو یہ جواب دیا کہ حضور ﷺ کے ارشاد کے متعلق تو ہم حضور ﷺ سے خود عرض معروض کرلیں گے، مگر تم کو فی الحال شرح جامی کے بجائے نحو کی کوئی کتاب پڑھنی ہوگی۔ سو اس جواب کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہم دعویٰ رویت کی تکذیب نہیں کرتے، لیکن اس کا کیا اطمینان کہ انہوں نے ارشاد کو صحیح سنا اور سمجھا بھی (صفحہ ۹۹۔ جلد۹)

جو لوگ واردات اور کیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں، یہ لوگ جاہل درویشوں کے معتقد ہوجاتے ہیں، مگر اس میں خطرے کی بات یہ ہے کہ محققین نے فرمایا ہے کہ ایسے لوگ دجال کے دھوکے میں بھی آجائیں گے، اس دھوکے میں آجانے کا سبب یہ ہوگا کہ دجال پر سکر غیبت اور بے خودی اور مدہوشی کی کیفیت طاری ہوگی، جو مجاذیب کے مشابہ ہوجائیگی تو ایسے لوگ جو کیفیات ہی کو مقصود سمجھتے ہیں، وہ اس کو مجذوب سمجھ کر اس کے معتقد ہوجائیں گے اور خلاف شرع باتوں کی تاویل کریں گے نیز اس کی باتوں سے متاثر ہوکر اس کا اتباع کرنے

لگیں گے اور گمراہ ہوں گے۔

دجال پر یہ جو بے خودی طاری ہوگی، حالانکہ وہ صاحب باطن نہ ہوگا، بلکہ کافر ہوگا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات تو یہ حالت کسی باطنی سبب سے طاری ہوتی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کے پاس شیاطین کی آمدورفت ہوتی ہے تو ان شیاطین کے اثر کے غلبہ کی وجہ سے بھی یہ کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کاہنانِ عرب کے متعلق کتابوں میں ہے کہ ان پر ایک قسم کی مدہوشی سی رہتی تھی تو اس کی وجہ بھی ان شیاطین کے اثر کا غلبہ تھا، اور کاہنوں کا تو شیاطین سے خاص تعلق ہوتا ہے، کیوں کہ وہ شیاطین ہی سے اِدھر اُدھر کی خبریں دریافت کرتے ہیں تو چوں کہ دجال کے پاس بھی شیاطین کی آمدورفت ہوگی، اس لیے اس پر بھی شیاطین کے اثر کا غلبہ ہوگا، اس وجہ سے دجال پر بھی ایک قسم کا سکر اور بے خودی طاری ہوگی۔ (۱۰۳۔۹)

غلام احمد قادیانی کو ابتدا میں خیالِ فساد پیدا ہوا۔ پھر یہ خیالی حالت جمتی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ فساد متخیلہ کیسے پیدا ہوا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ انہوں نے کچھ محنت اور ریاضت کی، جس کی وجہ سے اس کے دماغ پر اثر ہوا۔ ایک سمجھدار شخص اس سے ملے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ میری اس سے گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے وقت بالخصوص مسیح ہونے کے دعویٰ کے وقت اس کے اندر ایک جوش پیدا ہوجاتا تھا۔ مسیلمہ کذاب کی بھی یہی کیفیت ہوجاتی تھی۔ اصل میں اس حالت میں شیخ کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سنبھال لیتا ہے۔ ورنہ سالک تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔ قادیانی کو ایسا شیخ نہیں ملا۔ (صفحہ ۱۷۔ جلد۷)

باطنی بیماریاں

اور تواضع کی حقیقت

تکبر اور اس کی مختلف صورتیں

بڑے بڑے گناہ زنا، شراب وغیرہ ہیں، لیکن ان سے بڑا گناہ تکبر ہے۔ اس لیے کہ تکبر شرک کا ایک شعبہ ہے۔ خدا کے بڑے ہوتے ہوئے اپنے کو بڑا سمجھنا شرک ہے، کیوں کہ متکبر آدمی اللہ کے بڑے ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے وہ صفت ثابت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ (صفحہ ۳۵۔ جلد دہم)

کبر ہمیشہ حمق سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر حمق نہ ہو تو انسان کو اپنی بڑائی کا کبھی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوسکتا، اور نہ خیال آسکتا ہے۔ آج کل خواص وعوام سبھی تقریباً اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ہر شخص خود کو مجتہد مطلق سمجھتا ہے۔ (صفحہ ۱۱۸ جلد ۶)

جو شخص متکبر ہوتا ہے، اس کے دماغ میں خلل ضرور پیدا ہوتا ہے۔ (صفحہ ۹۳۔ جلد ۹)

آج کل خودرائی اور کبر کا مرض عام ہوگیا ہے۔ یہ نفس کم بخت بڑا ہی دشمن ہے۔ کسی کو اس پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے بڑے بڑوں کو پلک جھپکتے میں کہیں سے کہیں پھینک دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ شیطان ہمیں بہکاتا ہے، لیکن شیطان کو کس نے بھکایا تھا۔ نفس نے ہی تو اسے بہکایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس کا شر شیطان کے شر سے بڑھ کر ہے، بلکہ صاحب مجاہدہ اور صاحب ریاضت افراد کو بھی نفس کے بارے میں مطمئن ہوکر نہیں بیٹھنا چاہیے، اس لیے کہ بعض اوقات اسباب (حالات) ووسائل نہ ہونے کی وجہ سے نفس دبا رہتا ہے اور اسباب مہیا ہونے کے بعد وہ سرکش ہوجاتا ہے۔

نفس اژدہاست او کے مردہ است
از غم بے آلتی افسردہ است

آج کل تکبر کا مرض ہر شخص میں عام ہوگیا ہے۔ الا ماشاء اللہ، کسی کو اس بیماری سے بچنے کی فکر ہی نہیں۔ اس مرض کے مختلف اسباب ہیں، کسی میں یہ مرض حسن وجمال کی وجہ سے آتا ہے۔ کسی کے اندر علم وفضل کی وجہ سے اور کسی کے اندر زہد وتقویٰ کی وجہ سے اور

کسی کے اندر قوت وشجاعت کی وجہ سے اور کسی کے اندر مال ودولت وجائیداد کی وجہ سے آتا ہے۔ غرض کہ یہ بیماری قریب قریب سب کے اندر ہے۔ خاص طور پر لیڈروں کے اندر تو بھری ہوئی ہے اور ان کے اندر کبر کے ساتھ ساتھ حسد کا مرض بھی پیدا ہوگیا ہے، اس لیے ان کو مصلحین اور علماء میں خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے اعتراضات کا اصل سبب کبر وحسد اور جذبۂ آزادی ہے، تاکہ ان کو کوئی کہنے والا باقی نہ رہے۔ مصلح بھی وہ خود ہی ہوں، پھر جو چاہے کرتے پھریں، یہ حریت ہے۔ پہلے تو انگریزوں کے دلدادہ تھے اور دل سے اس پر فریفتہ تھے۔ اب کچھ روز سے قوم کی فلاح وبہبود کی غرض سے بزعم خود مذہب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو سب کچھ خود ہی بننا چاہتے ہیں۔ مفسر بھی، محدث بھی، فقیہ بھی۔

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی

(صفحہ ۷۸ جلد ۶)

بندہ ہوکر دعویٰ کیسا، یہ دعویٰ خواہ علم وفضل پر ہو یا حسن وجمال پر یا زہد پر تقویٰ پر یا شجاعت اور قوت پر۔ عطا پر دعویٰ کرنا ایسا ہے، جیسے ایک چمار کو بادشاہ اپنے خزانے سے قیمتی موتی عطا کرے، کیا وہ چمار اپنے آپ کو اہل سمجھ کر اس پر فخر وناز کرے گا۔ یا بادشاہ کی اس نظر عنایت پر اس کے اندر مزید عجز وانکسار پیدا ہوگا۔ کہ مجھے اتنی بڑی نعمت سے نوازا گیا، میں اس قابل نہیں تھا۔ اسی طرح سمجھا جائے۔ ہر چیز اس کی عطا فرمائی گئی ہے۔ اور اس کو ہماری طرف منسوب کیا گیا ہے ورنہ حقیقت کیا ہے۔

کہاں میں اور کہاں نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

(صفحہ ۷۹۔ جلد ۶)

کبھی سادگی کبر کی وجہ سے بھی ہوتی ہے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ بہت متواضع شخص ہے۔ کبھی کبر تواضع کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ نفس بڑا مکار ہے۔ میرے ماموں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نفس سب کا مولوی ہے، اپنی غرض کے لیے ایسی باتیں سجھاتا ہے کہ بڑے بڑے علماء کو بھی نہیں سوجھتی، بالخصوص پڑھوں لکھوں کا نفس تو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (صفحہ ۹۰۔ جلد ۵)

بعض علمی اداروں میں تکبر اور ترفع کو خودداری سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی کے ہاں ہوذائل

(خراب وصفیں) کمالات سمجھے جائیں اور ان پر فخر کیا جائے، تو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے مریض اپنی بیماریوں کو کمال سمجھے۔ ایسی صورت میں طبیب بے چارہ کیا کرسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ (صفحہ ۴۶۔ جلد ۵)

ایک جدید پڑھے لکھے شخص (جو یہاں آئے تھے) وطن واپس جاکر لکھا کہ میرے اندر کبر کا مرض ہے۔ نفس آمادہ نہیں کہ اپنے مرض کا اظہار کروں، (تحریری صورت میں لکھوں) میں نے لکھا کہ تم یہی مضمون کہ نفس تکبر کو اپنی طرف منسوب کرنے پر آمادہ نہیں۔ مجھے پانچ مرتبہ لکھ کر بھیجدو۔ وہ پانچ مرتبہ بھی لکھنے نہیں پائے تھے کہ مرض سے شفا ہوگئی۔

جو لوگ تصوف کو بدعت سمجھتے ہیں، وہ بتائیں، اس میں کون سی بدعت کی بات ہے یہ تو تدابیر ہیں۔ جیسے طبیب جسمانی تدابیر اختیار کرتا ہے، اسی طرح یہاں تدابیر ہیں۔ مستقل فن ہوجانے کی وجہ سے ان تدابیر کا نام تصوف رکھ دیا گیا ہے۔ یہ تدابیر بذات خود مقصود نہیں۔ اصل تو اعمال واجبہ ہیں۔ البتہ یہ تدابیر اس مقصد کے لیے معاون ہیں۔ (صفحہ ۱۰۱۔ جلد ۴)

استحقاق کا دعویٰ

نیک عمل کی سعادت کا حاصل ہونا، اسے اپنا کمال نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھنا چاہیے۔ اپنا کمال سمجھنے سے قلب میں استحقاق کا دعویٰ پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ بات سخت نقصاندہ ہے۔ اپنے آپ کو ناقص سمجھنا چاہیے اور اپنے استحقاق کی نفی کرنی چاہیے۔ اسی میں خیر ہے۔ فضل کسی کمال پر نہیں ہوتا۔

اپنے تقدس پر ناز

ایک صاحب کی متکبرانہ روش پر مواخذہ کرتے ہوئے فرمایا۔ آج کل بڑی بزرگی اور ولایت یہ ہے کہ ہاتھ میں تسبیح لی جائے اور آہستہ آہستہ جھک کر چلائی جائے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ شیخ المشائخ آرہے ہیں یا خضر علیہ السلام دریا سے نکل کر آگئے ہیں۔ اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ ہمارے اندر تہذیب اور انسانیت بھی پیدا ہوئی یا نہیں۔ تمہاری غلطی کا سبب محض تکبر ہے۔ مجلس میں دوسرے مسلمان بھائیوں کو پیٹھ دے کر بیٹھ جانا، اس کا مطلب جذبۂ بڑائی کے علاوہ اور کیا ہے۔

اس طریق میں (تصوف میں) سب سے پہلی چیز اپنے آپ کو فنا کرنا اور ذلیل کرنا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو ذلیل وخوار سمجھے، اگر یہ بات پیدا نہ ہوئی تو پھر محرومی ہی

محرومی ہے۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ بعض لوگوں کو اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے کا مرض ہوجاتا ہے۔ مگر جس شخص کو اپنے خاتمۂ ایمان کا یقین نہ ہو۔ (ظاہر ہے یہ یقین کسی کو بھی نہیں ہوسکتا) تو اپنے تقدس پر ناز کیسا۔ (صفحہ ۲۰۹ جلد ۴)

اکمل ہونا افضل ہونیکی دلیل نہیں

کسی معاملہ میں اپنے آپ کو دوسروں سے اکمل سمجھنا تو جائز ہے، اس لیے کہ یہ حسی چیز ہے۔ البتہ خود کو دوسروں سے افضل سمجھنا جائز نہیں۔ کیوں کہ وہ غیبی چیز ہے، فضیلت کی حقیقت ہے، اللہ کی طرف سے اجر اور اللہ کے ہاں مقبول ہونا۔ مثلاً ایک شخص کی ایک آنکھ ہے، دوسرے شخص کی دونوں آنکھیں ہیں تو دو آنکھوں والے شخص کو یہ سمجھنا کہ میں اکمل ہوں، میرے پاس خدا کی دی ہوئی نعمت ہے۔ یہ جائز ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ کو ایک آنکھ والے شخص سے افضل سمجھنا، ناجائز ہے، کیوں کہ آنکھ کو اللہ کے قرب میں کوئی دخل نہیں۔ یا ایک شخص عالم ہے، دوسرا جاہل، تو عالم اکمل تو ہے، مگر اس کا جاہل کے مقابلے میں افضل ہونا یہ اللہ کو معلوم ہے، اس لئے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ عالم کے لئے افضل ہونا بھی لازم ہو۔ ممکن ہے کہ جاہل کے قلب میں ایسی چیز (اخلاص وغیرہ) موجود ہو، جو اللہ کے نزدیک علم کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہو۔ تو اپنی صلاحیت کی بنا پر اپنے آپ کو افضل سمجھنا، برا ہے۔ یہی وہ علوم ہیں جو باخبر کی صحبت سے میسر ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۱۸۷ جلد ۷)

تواضع کا سبق

یہاں ایک بڑے فاضل (مولانا سید سلیمان ندوی، مرتب) آئے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجیے، میں نے کہا کہ آپ خود عالم ہیں۔ میں آپ کو کیا نصیحت کروں، انہوں نے پھر اصرار کیا، میں نے کہا کہ مجھے تو بس ایک سبق یاد ہے، اسی کو دہرائے دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مٹانا چاہیے۔ میری اس بات کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ رونے لگے۔ (صفحہ ۱۷۱۔ جلد ۱۰)

تواضع

پیر صاحب کو اس پر ناز نہیں کرنا چاہیے کہ میں مریدوں کے لیے ذریعہ اصلاح ہوں۔ بلکہ کبھی مرید پیر کے لیے ذریعہ نجات ہوجاتے ہیں۔ جیسے باپ کبھی بیٹے کا محتاج ہوتا

ہے کہ بھائی لاٹھی پکڑا لو اور کبھی بیٹے کو باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مرید پر اللہ کی طرف سے رحمت ہوگی تو پیر کو بھی ہمراہ لیگا۔ اس بنا پر حضرت حاجی امداد اللہؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو اس نیت سے مرید کر لیتے ہیں کہ اگر اپنے تعلق والے پر رحمت ہوگئی تو ہم بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ واقـــعة ایسے ہی حضرات اپنے آپ کو مٹائے ہوئے تھے۔ (صفحہ ۳۷ جلد ۴)

اپنی ذات کی نفی

میں بقسم کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو تمام موجودات سے کمتر سمجھتا ہوں تو میں فخر کیا کرتا، محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ دولت نصیب فرمائی۔ فخر کا دعوٰی تو بہت دور کی بات ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایمان کے ساتھ دنیا سے چلا جاؤں تو یہی بڑا فضل ہے، باقی درجات (کے حصول) کا تو کبھی دل میں خیال اور وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا۔ ہم درجات کی کیا تمنا کریں۔ ہماری ہستی ہی کیا ہے اور سب اس کی عطا ہے۔ اور عطا پر کوئی دعوٰی اور فخر کیا کر سکتا ہے۔ دعوٰی تو وہی کر سکتا ہے، جو اسے اپنا کمال سمجھتا ہو، یہاں تو اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ جو کچھ ہے، اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے ہے۔ میں نے دعائیں ہر مسلک کے بزرگوں سے لی ہیں۔ ایسے بزرگوں سے بھی جو بظاہر بدعتی کہلاتے تھے، کیوں کہ پہلے ایسے لوگ بھی اللہ اللہ کرنے والے ہوتے تھے۔ ان میں دین تھا، عناد اور شہرت نہ تھی، جیسے آج کل کے بدعتی اکثر بددین بلکہ فاسق فاجر تک ہیں۔ (صفحہ ۸ جلد ۸)

کچھ حاصل نہ ہونے کا احساس

اعمال بڑی چیز ہیں۔ احوال نہیں۔ اعمال میں جو کیفیات ہیں، وہ نہایت ہی لطیف ہیں، وہ محسوس نہیں ہوتیں۔ یہ روحانی کیفیات ہوتی ہیں۔ جو اعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور احوال اکثر نفسانی ہوتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اعمال میں جو کیفیات ہوتی ہیں۔ ان میں سکون ہوتا ہے۔ اور احوال نفسانی میں ایک قسم کا زور و شور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ محسوس نہیں ہوتے۔ لیکن اصل چیز اعمال ہی ہیں۔ لیکن چوں کہ ان کے ثمرات باطنی لطیف ہوتے ہیں اور محسوس نہیں ہوتے، اس لئے سالک یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں ایک بار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ساری عمر کی ریاضتوں اور مجاہدات کے بعد سالک یہ سمجھے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تو

اس کو سب کچھ حاصل ہوگیا، بشرطیکہ اعمال میں خلل نہ ہو، کیوں کہ ایسی صورت میں اس کی کیفیاتِ روحانی ہی حقیقی کمالات ہیں۔ دوسرے یہ سمجھنا فنا (اپنی ذات کی نفی) کی علامت ہے جو سلوک کی انتہا ہے۔

ایک شخص نے مجھے لکھا کہ ذکر و فکر کرتے ہوئے اتنا وقت گذر چکا ہے، لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میں نے لکھا کہ یہ یوم عید ہے، جس میں یہ خیال ہوا کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا، جس روز یہ خیال پیدا ہوگا کہ مجھے کچھ حاصل ہوگیا ہے وہ یوم ماتم ہوگا۔ (صفحہ ۱۹۴ جلد ۶)

تربیت وتواضع کے کچھ واقعات

حضرت شبلیؒ کا ایک قصہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ایک خادم کو عجب کا مرض پیدا ہوگیا تھا، اس کی شکایت پر آپ نے اس کو اخروٹوں کا ایک ٹوکرا دے کر یہ علاج تجویز فرمایا کہ تم اپنے معتقدین کے محلے میں جا کر اعلان کرو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا، میں اس کو ایک اخروٹ دوں گا۔ اس طرح یہ سب اخروٹ ختم کر کے آؤ۔ اسی طرح ابو سعید گنگوہیؒ کا ایک قصہ ہے۔ آپ نے جب ذکر و فکر کیا تو آپ کے شیخ حضرت مولانا نظام الدین بلخیؒ کو محسوس ہوا کہ حضرت ابو سعیدؒ کے اندر عجب پیدا ہوگیا ہے تو انہوں نے حضرت ابو سعیدؒ سے ذکر و فکر چھڑا کر شکاری کتوں کی خدمت ان کے سپرد کی۔ (صفحہ ۲۵۸۔ جلد ۱۰)

مولانا شاہ اسماعیل شہید کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے مرشد سید احمد شہیدؒ کی مجلس میں شرکت کرنے اور بیٹھنے کو خلاف ادب سمجھتے تھے، حضرت صاحب کی جوتیاں لیے ہوئے مجلس کے آخر میں بیٹھے رہتے تھے، اگر کبھی بیٹھے بیٹھے نیند آ جاتی تو وہیں جوتیاں سر کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتے تھے۔ جب سید احمد شہید کی پالکی چلتی تھی تو اس کے ساتھ دوڑا کرتے تھے۔ اس کو اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ چاندنی چوک دہلی میں پالکی جا رہی ہے، آپ ساتھ دوڑ رہے ہیں، دہلی میں اس خاندان (شاہ ولی اللہؒ) کے خاندان کے ہزاروں سلامی تھے، مگر حضرت شاہ صاحب کو اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔

ہے کہ بھائی لاٹھی پکڑا لو اور کبھی بیٹے کو باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مرید پر اللہ کی طرف سے رحمت ہوگی تو پیر کو بھی ہمراہ لیگا۔ اس بنا پر حضرت حاجی امداد اللہؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو اس نیت سے مرید کر لیتے ہیں کہ اگر اپنے تعلق والے پر رحمت ہوگئی تو ہم بھی اس کے ساتھ شامل ہوجائیں گے۔ واقعہ ایسے ہی حضرات اپنے آپ کو مٹائے ہوئے تھے۔ (صفحہ ۳۷ جلد ۴)

اپنی ذات کی نفی

میں بقسم کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو تمام موجودات سے کمتر سمجھتا ہوں تو میں فخر کیا کرتا، محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ دولت نصیب فرمائی۔ فخر کا دعویٰ تو بہت دور کی بات ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایمان کے ساتھ دنیا سے چلا جاؤں تو یہی بڑا فضل ہے، باقی درجات (کے حصول) کا تو کبھی دل میں خیال اور وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا۔ ہم درجات کی کیا تمنا کریں۔ ہماری ہستی ہی کیا ہے اور سب اس کی عطا ہے۔ اور عطا پر کوئی دعویٰ اور فخر کیا کر سکتا ہے۔ دعویٰ تو وہی کر سکتا ہے، جو اسے اپنا کمال سمجھتا ہو، یہاں تو اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ جو کچھ ہے، اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے ہے۔ میں نے دعائیں ہر مسلک کے بزرگوں سے لی ہیں۔ ایسے بزرگوں سے بھی جو بظاہر بدعتی کہلاتے تھے، کیوں کہ پہلے ایسے لوگ بھی اللہ اللہ کرنے والے ہوتے تھے۔ ان میں دین تھا، عناد اور شہرت نہ تھی، جیسے آج کل کے بدعتی اکثر بددین بلکہ فاسق فاجر تک ہیں۔ (صفحہ ۸ جلد ۸)

کچھ حاصل نہ ہونے کا احساس

اعمال بڑی چیز ہیں۔ احوال نہیں۔ اعمال میں جو کیفیات ہیں، وہ نہایت ہی لطیف ہیں، وہ محسوس نہیں ہوتیں۔ یہ روحانی کیفیات ہوتی ہیں۔ جو اعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور احوال اکثر نفسانی ہوتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اعمال میں جو کیفیات ہوتی ہیں۔ ان میں سکون ہوتا ہے۔ اور احوال نفسانی میں ایک قسم کا زور وشور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ محسوس نہیں ہوتے۔ لیکن اصل چیز اعمال ہی ہیں۔ لیکن چوں کہ ان کے ثمرات باطنی لطیف ہوتے ہیں اور محسوس نہیں ہوتے، اس لئے سالک یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں ایک بار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ساری عمر کی ریاضتوں اور مجاہدات کے بعد سالک یہ سمجھے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تو

اس کو سب کچھ حاصل ہوگیا، بشرطیکہ اعمال میں خلل نہ ہو، کیوں کہ ایسی صورت میں اس کی کیفیاتِ روحانی ہی حقیقی کمالات ہیں۔ دوسرے یہ سمجھنا فنا (اپنی ذات کی نفی) کی علامت ہے جو سلوک کی انتہا ہے۔

ایک شخص نے مجھے لکھا کہ ذکر وفکر کرتے ہوئے اتنا وقت گذر چکا ہے، لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میں نے لکھا کہ یہ یوم عید ہے، جس میں یہ خیال ہوا کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا، جس روز یہ خیال پیدا ہوگا کہ مجھے کچھ حاصل ہوگیا ہے وہ یوم ماتم ہوگا۔ (صفحہ ۱۹۴ جلد ۶)

تربیت وتواضع کے کچھ واقعات

حضرت شبلیؒ کا ایک قصہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ایک خادم کو عجب کا مرض پیدا ہوگیا تھا، اس کی شکایت پر آپ نے اس کو اخروٹوں کا ایک ٹوکرا دے کر یہ علاج تجویز فرمایا کہ تم اپنے معتقدین کے محلے میں جا کر اعلان کرو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا، میں اس کو ایک اخروٹ دوں گا۔ اس طرح یہ سب اخروٹ ختم کر کے آؤ۔ اسی طرح ابو سعید گنگوہیؒ کا ایک قصہ ہے۔ آپ نے جب ذکر وفکر کیا تو آپ کے شیخ حضرت مولانا نظام الدین بلخیؒ کو محسوس ہوا کہ حضرت ابو سعیدؒ کے اندر عجب پیدا ہوگیا ہے تو انہوں نے حضرت ابو سعیدؒ سے ذکر وفکر چھڑا کر شکاری کتوں کی خدمت ان کے سپرد کی۔ (صفحہ ۲۵۸۔ جلد ۱۰)

مولانا شاہ اسماعیل شہید کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے مرشد سید احمد شہیدؒ کی مجلس میں شرکت کرنے اور بیٹھنے کو خلاف ادب سمجھتے تھے، حضرت صاحب کی جوتیاں لیے ہوئے مجلس کے آخر میں بیٹھے رہتے تھے، اگر کبھی بیٹھے بیٹھے نیند آجاتی تو وہیں جوتیاں سر کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتے تھے۔ جب سید احمد شہید کی پالکی چلتی تھی تو اس کے ساتھ دوڑا کرتے تھے۔ اس کو اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ چاندنی چوک دہلی میں پالکی جارہی ہے، آپ ساتھ دوڑ رہے ہیں، دہلی میں اس خاندان (شاہ ولی اللہؒ) کے خاندان کے ہزاروں سلامی تھے، مگر حضرت شاہ صاحب کو اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔

تکبر کی سزا اور اس سے بچنے کی صورت

دنیا میں بعض مقامات ایسے ہیں، جہاں کے اکثر لوگ بے وقوف ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض جگہوں کے اکثر لوگ عاقل ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بے وقوف لوگوں میں خوشحالی زیادہ ہے اور عاقل لوگوں میں اکثر افلاس اور غربت زیادہ دیکھی گئی ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں بعض اوقات عقلمندی خود نحوست اور افلاس کا سبب بن جاتی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ان عقلاء کے اندر اپنے آپ کو بڑا اور افضل سمجھنے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس طرح ان کو تکبر کی یہ سزا دی جاتی ہے کہ ان کو مفلس بنا دیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تکبر اور دعویٰ کا علاج کیا ہے اور وہ کیا تدبیر ہے کہ کمال کے حصول کے بعد بھی دعویٰ پیدا نہ ہو؟ اس کا طریقہ اس کے سوا کوئی نہیں کہ بزرگوں کی یعنی اولیاء اللہ کی جوتیاں درست کی جائیں اور ان کی صحبت میں رہا جائے تو پھر یہ حالت ہوجاتی ہے کہ کمال تو بڑھتا جاتا ہے، مگر دعویٰ گھٹتا جاتا ہے۔ اور بزرگوں کی صحبت میں رہنے سے دعویٰ کے فنا ہوجانے کا سبب یہ ہے کہ ان کی صحبت کی برکت سے افراد کی نظر کمال کی حقیقت تک یعنی کمال کے انتہائی درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ چوں کہ فرد کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی حالت کا دوسروں سے موازنہ کرنے کی بجائے اصل حقیقت سے اپنی حالت کا موازنہ کرتا ہے۔ اس وقت وہ دیکھتا ہے کہ حقیقت کے مقابلے میں میری حالت بالکل ہیچ ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو کامل سمجھنے کی بجائے ناقص اور ہیچ در ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔ مثلاً ایسے شخص کی نظر عقل کی حقیقت پر ہوتی ہے تو جب وہ اس حقیقت سے اپنی عقل کا موازنہ کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ عقل کی حقیقت کے مقابلے میں میری عقل کچھ بھی نہیں۔ اس لیے وہ اس کے مدعی ہونے کی بجائے اپنی عقل کو ہیچ سمجھتا ہے۔ اس طرح اس شخص کی نظر علم کی حقیقت پر ہوتی ہے۔ علم کی جو حقیقت ہے، اس سے جب وہ اپنے علم کا موازنہ کرتا ہے تو وہ اپنے علم کو انتہائی ناقص اور بے معنیٰ تصور کرنے لگتا ہے اور اپنے کو علم کا مدعی ہونے کی بجائے اپنے علم کو کالعدم سمجھنے لگتا ہے۔ اگرچہ علم و فضل میں وہ ممتاز مقام پر فائز ہوتا ہے، لوگ اس کے فضل و کمال کے قائل بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو، ہیچ سمجھتا ہے۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کتنے بڑے عالم تھے، وہ فرمایا کرتے

تھے کہ زندگی بھر کے پڑھنے پڑھانے سے علم تو حاصل نہ ہوا، مگر یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اپنے جہل یعنی لاعلمی کا علم ہوگیا۔ (صفحہ ۳۳۔ جلد ۹)

حب جاہ

ایک رئیس کا خط آیا، لکھا ہے کہ کوشش کے باوجود میرے دماغ سے حکومت اور مان مرتبہ کی خواہش نکلتی نہیں، میں نے لکھدیا کہ آپ صرف نکالنے کے ذمہ دار ہیں، نکلنے کے نہیں۔ اگر کوشش کے باوجود یہ خواہش نہیں نکلتی تو رہنے دیجئے، اس کا نقصان ہی کیا ہے۔

اہل کمال کی صفت

اہل کمال میں تصنع نہیں ہوتا۔ یہ کمال کی خاصیت ہے، خواہ وہ کمال کسی قسم کا ہو۔ ہر اہل فن اور اہل کمال کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے انکی لذت اور طمانیت کے لیے خود کمال کافی ہے۔ انہیں اپنے کمال کے اظہار اور تصنع کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے اہل کمال کا ظاہر اور باطن ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کو اس بات کی پروانہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ دوسرے جو کچھ کہیں گے، اس سے زیادہ خود کو کہنے کے لیے تیار ہیں۔ (صفحہ ۲۶۲ جلد ۶)

حب دنیا کا مسئلہ

انسان کو دنیا کے ساتھ جو طبعی محبت ہے، وہ تو موجود رہے گی۔ لیکن دنیا کے ساتھ جو عقلی محبت ہے، انسان اس کے ازالہ (دور کرنے) کا ذمہ دار ہے۔ کتاب وسنت میں ایک جگہ دنیا کی محبت کی مذمت کی گئی ہے تو دوسری جگہ ارشاد ہے۔ **لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا** (یعنی انسان اپنی طاقت سے زیادہ ذمہ دار نہیں) اور یہ مشاہدہ ہے کہ کوشش کے باوجود دنیا کی طبعی محبت زائل نہیں ہوتی۔ دنیا کی محبت یقیناً مذموم ہے، لیکن اس سے دنیا کی وہ محبت مراد ہے جو طبعی نہ ہو، کیوں کہ دنیا کی طبعی محبت کا ازالہ کرنا طاقت سے باہر ہے اور جو چیز وسعت سے باہر ہو، انسان اس کا ذمہ دار نہیں۔ لہٰذا انسان طبعی محبت کے ازالہ کا ذمہ دار نہیں۔ باقی جس محبت کا ازالہ کرنا انسان کے اختیار میں ہے، وہ اس کے ازالہ کا ضرور ذمہ دار ہوگا۔ اسی اختیاری محبت کا نام عقلی محبت ہے۔ (صفحہ ۱۳۶۔ جلد ۹)

ایک بزرگ کے پاس ایک شخص آیا، بزرگ کو فراست سے اندازہ ہوا کہ اس شخص

کے قلب میں دولت سے محبت ہے۔ دریافت فرمایا، تمہارے پاس کچھ مال ہے۔ عرض کیا سو دینار ہیں۔ فرمایا، ان کو پھینک کر آؤ، وہ چلنے لگا تو بزرگ نے بلایا اور پوچھا کہ کیا کرو گے، عرض کیا، کسی کو دیدوں گا، فرمایا نہیں۔ اس سے تو نفس کو لذت حاصل ہوگی کہ ہم نے دوسرے کو نفع پہنچایا۔ یہ پیسے دریا میں ڈال کر آنا، وہ چلنے لگا۔ پھر بلایا اور پوچھا کس طرح ڈالو گے، عرض کیا، ایک دم پھینک آؤں گا، فرمایا نہیں، ایک دینار روزانہ ڈالنا، شیخ کا مطلب یہ تھا کہ روزانہ نفس پر آرا چلے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ تو مال کا ضیاع ہے۔ میں نے کہا، مال کا ضیاع اسے کہتے ہیں، جہاں کوئی نفع نہ ہو۔ یہاں تو نفع ہے، جو شیخ نے تجویز کیا۔ مصلح اور صوفی مجتہد اور حکیم ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ ایک نور عطا فرماتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی نظر میں حقیقت آجاتی ہے۔ (صفحہ ۶۱ جلد ۵)

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں ملازم پیشہ شخص ہوں، تنخواہ بھی کافی ہے، لیکن اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ ترقی ہو اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر دنیا سے محبت کا مرض ہے، لہٰذا میرے اس مرض کا علاج کیا جائے۔ ان کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باطنی مرض کی حقیقت سے واقف نہیں۔ باطنی مرض کی تعریف یہ ہے کہ جو بات معصیت (گناہ) ہو، وہ مرض ہے۔ جو معصیت نہیں، وہ مرض نہیں۔ اب مثلاً حب دنیا (دنیا کی محبت) کو جو مرض کہا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حُب دنیا کی ہر قسم مرض ہے۔ بلکہ حُب دنیا کی وہ قسم معصیت ہے، جس میں دنیا اور مال کے حصول کے لیے حرام وحلال کی تمیز باقی نہ رہے، اسی طرح حرص ہے کہ اس کو بھی مرض قرار دیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں اور نہ یہی معنی ہیں کہ ہر قسم کا حرص گناہ ہے۔ بلکہ کسی منکر اور خراب چیز کی حرص مرض ہے۔ اگر کسی جائز چیز کی حرص ہو تو وہ لغت کے اعتبار سے تو حرص ہوگی، مگر اس قسم کی حرص باطنی امراض میں شمار نہ ہوگی۔ (صفحہ ۱۴۳۔ جلد ۹)

ریا

شہرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ذاتی کوشش اور طلب سے شہرت حاصل ہو، یہ مضر ہے۔ دوم یہ کہ بلا کوشش کے حاصل ہو، وہ نعمت ہے۔ بلکہ اس غیر اختیاری شہرت میں خاص حکمتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ شہرت گمنامی سے بھی افضل ہے۔ عموماً اللہ کے بندے گمنام ہونا چاہتے ہیں اور اپنے کو مٹاتے اور فنا کرتے رہتے ہیں۔ مگر نتیجۃً انہیں اور زیادہ

شہرت حاصل ہوتی ہے۔ باقی فی نفسہٖ شہرت والے شخص پر مخلوق حسد کرنے لگتی ہے اور غصہ اور طعن بھی۔ گمنامی بڑی عافیت کی چیز ہے۔ جہاں تک ہو سکے، شہرت سے بچنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر شہرت ہو تو ہونے دیں۔ (۲۵۶۔ ۸)

کسی مؤمن کو خوش کرنا، یہ بھی نیکی ہے۔ چاہے نیکی کی نیت نہ بھی ہو۔ اس کی تائید میں ایک حدیث موجود ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری ایک بار آواز سے تلاوت کر رہے تھے، آواز حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ رہی تھی اور ان کو اس کا علم نہ تھا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کی خوش آوازی کی تعریف فرمائی اور فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسی خوش آوازی دی ہے، جیسی داؤد علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔

حضرت موسیٰؓ نے عرض کیا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے ہیں تو میں مزید خوش آوازی سے پڑھتا۔ اس حدیث سے مجھے یہ مسئلہ سمجھ میں آیا کہ اگر دین کا کوئی کام مخلوق کی رضا کے لیے کیا جائے تو ایسا کرنا ہر حال میں ریا نہ ہوگا۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے مخلوق کے ساتھ تعلق کا سبب کیا ہے۔ دین یا دنیا، اگر تعلق خالص دین کی وجہ سے ہے تو ریا نہیں، اگر دنیا کی وجہ سے ہے تو ریا ہے۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنا دین تھا، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق دین کی وجہ سے تھا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لیے سنوار سنوار کر قرآن پڑھنا ثواب تھا۔ ریا نہ تھا۔

قاریوں کا، سامعین کی رضا کے لیے خوش آوازی سے قرآن پڑھنا، اس کی حیثیت بھی یہی ہے، اگر اس سے مقصود مال وجاہ ہو کہ لوگ خوش ہو کر پیسہ دیں یا معتقد ہو جائیں تو یہ ریا ہے، اگر یہ جذبہ نہیں تو پھر دین کی خدمت ہے۔ (صفحہ ۲۴۔ جلد ۱۰)

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ کی کتابیں

ایک نظر میں

امام مالکؒ کا قول ہے ''ناتجربہ کاری افلاس سے زیادہ بُری ہے'' جس طرح افلاس زدہ فرد، روٹی کے ٹکڑوں کے لئے محتاج ہوتا ہے، اسی طرح اپنے دور کے حالات، افکار، فتنوں اور تحریکوں وجماعتوں کے نظریات سے ناآشنا فرد اپنے سارے اخلاص کے باوجود ان افکار ونظریات سے فریب زدگی کا شکار ہوسکتا ہے یا ان کے سلسلہ میں معتدل اور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ رائے قائم کرنے میں ناکام ہوسکتا ہے، ہماری کتابیں اپنے دور کے ملحدانہ نظریات مادہ پرست عالمی تہذیب کی نظریاتی بنیادوں پر تعارف کی کوشش میں تنقید اور مفکروں کی فکری نوعیت، سلف صالحین کے فکر سے ان کے تقابلی مطالعہ اور دور جدید کی تحریکوں اور متحرک تنظیموں کے صحیح تعارف وتجزیہ کے سلسلہ میں مؤثر اور مفید ترین کتابیں ہیں۔

مغربی افکار کی علمی غلطیوں کے فہم کے ساتھ دور جدید میں صحیح اسلامی فکر کے تعین اور دین کی صحیح ترتیب اور اس کے صحیح نصب العینی تصور، نفسی قوتوں کے تعارف اور سبیل المؤمنین کی بھرپور نشاندہی کے سلسلہ میں ہماری کتابیں وقت کی اہم ترین کتابیں ہیں۔ بالخصوص جدید نسلوں کی ذہن سازی اور اخلاقی وروحانی تربیت کے سلسلہ میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔